مجاہد ملت نمبر

خصوصی شمارہ

روزنامہ
الجمعیۃ
دہلی

بیادِ عزیز
مجاہدِ ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب
قدس اللہ سرہ

خصوصی شمارہ

روزنامہ الجمعیۃ دہلی

تاریخ اجراء: ۱۵۔ مارچ ۱۹۶۳ء ۔ ۱۸۔ شوال ۱۳۸۲ھ یوم جمعہ

ایڈیٹر: محمد عثمان فارقلیط

قیمت فی کاپی پانچ روپے 5—00

محمد حسین پرنٹر پبلشر نے رنگین صفحات بیکو آفسیٹ پریس دہلی اور مجموعہ کے صفحات الجمعیۃ پریس دہلی میں چھپوا کر دفاتر الجمعیۃ گلی قاسم جان دہلی سے شائع کیا۔ — (پروپرائٹر جمعیۃ علماء ہند)

ندوۃ المصنفین دہلی

حضرت مولانا محمد حفظ الرحمن رحمۃ اللہ علیہ رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی کے علمی کارنامے

قصص القرآن

قصص القرآن کا شمار ندوۃ المصنفین کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے انبیاء علیہم السلام کے حالات، دعوت حق اور پیغام کی تفصیلات پر اس درجہ کی کوئی کتاب اردو میں شائع نہیں ہوئی۔ اس متبرک اور محققانہ کتاب کی اشاعت پر ملک کے تمام علمی اور مذہبی حلقوں نے مبارکباد دی اور کتاب کی افادیت و اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔

جلد اول میں حضرت آدم سے حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہم السلام تک مکمل حالات آ گئے ہیں۔ قیمت آٹھ روپے

جلد دوم حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ تک مکمل حالات۔ قیمت چار روپے

جلد سوم انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی اور تاریخی واقعات کا عبرت آموز بیان۔ قیمت چھ روپے آٹھ آنے

جلد چہارم حضرت عیسیٰؑ اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دعوت حق کا مفصل بیان۔ قیمت آٹھ روپے (کامل سٹ ۲۵/۵۰)

سیرت رسول کریمؐ سیرت سرور کائناتؐ پر اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بے مثال کتاب، بہترین ترتیب، بہترین معلومات، آسان اور دل پذیر انداز بیان، اوپر کی جماعتوں کے کورس میں داخل ہونے کے لائق کتاب۔ قیمت چار روپے

اسلام کا اقتصادی نظام

جس میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کے تمام معاشی نظاموں میں اسلام کا اقتصادی نظام ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال کا راستہ نکالا ہے اور جس پر عمل کرنے سے محنت و سرمایہ کی کشمکش ہمیشہ کیلئے ختم ہو جاتی ہے، اس کتاب کا مطالعہ سوشلزم کے موجودہ صنعتی اور معاشی نظام کو سمجھنے اور اسلام کے نظامِ اقتصاد کی برتری معلوم کرنیکے لئے نہایت مفید ہے۔

صفحات ۴۰۸ بڑی تقطیع **قیمت** چھ روپے

اخلاق و فلسفۂ اخلاق

اس کتاب میں اگر ایک طرف علمی اعتبار سے اخلاق کے تمام گوشوں پر مکمل بحث کی گئی ہے تو دوسری طرف ابواب اخلاق کی تشریح علمی نقطۂ نظر سے اس طرح کی گئی ہے کہ اسلام کے مجموعہ اخلاق کی برتری دوسری ملتوں کے ضابطہ ہائے اخلاق پر ثابت ہو جاتی ہے، کتاب کے اس جدید ایڈیشن میں بہت کچھ رد و بدل کیا گیا ہے اور متعدد مباحث نئے سرے سے شامل کئے گئے ہیں۔ بڑی تقطیع۔ قیمت چھ روپے آٹھ آنے

ادارہ کی فہرست کتب اور قواعد و ضوابط ایک خط لکھ کر طلب فرمائیے

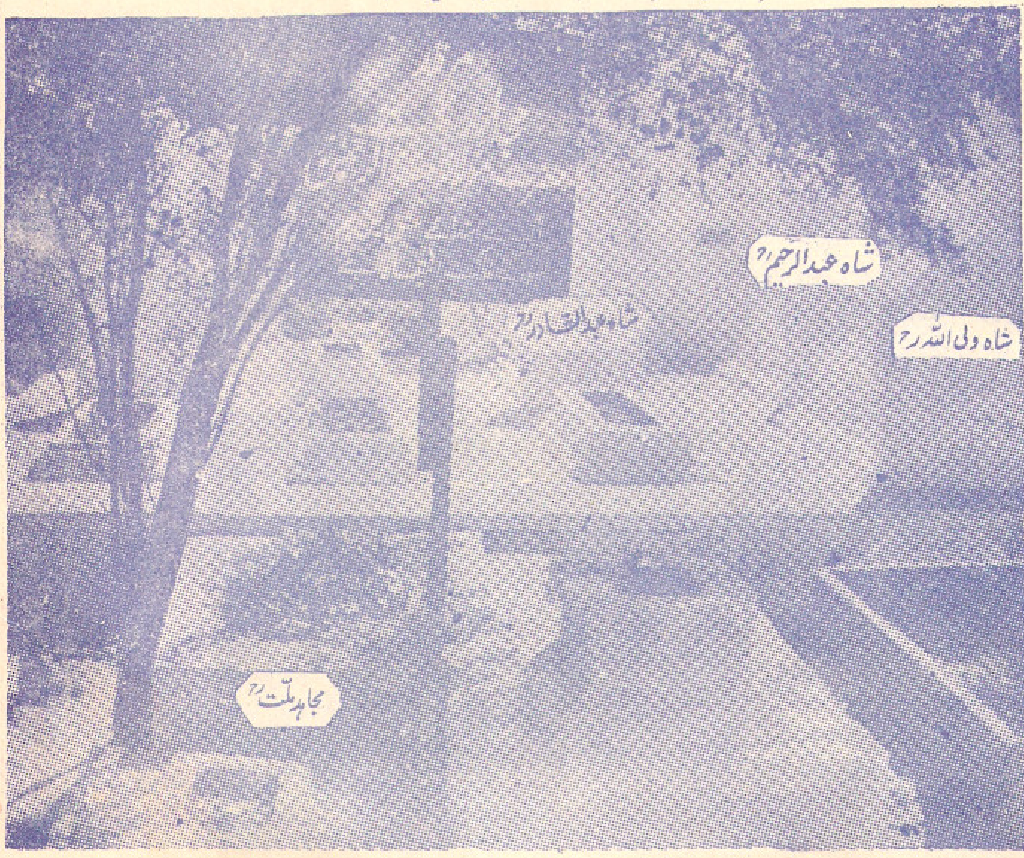
قرآن اور تصوف ۲/۰	لغات القرآن کامل ۶ جلد ۳۱/۰	ندوۃ المصنفین دہلی کی اہم مطبوعات				فرقہ بندی کا افسانہ ۱/۵۰	جدید سیاسی معلومات تین حصے ۱۹/۰
فہم قرآن ۳/۰	قرآن اور تعمیر سیرت ۵/۵۰	فاروق اعظمؓ کے سرکاری خطوط ۱۱/۰	تاریخ ادبیات ایران ۸/۰	اسلام کا نظام حکومت ۶/۰	عروج و زوال کا الٰہی نظام ۳/۰	عرب دنیا ۱/۵۰	اسلامی کتب خانے ۵/۰
وحی الٰہی ۳/۰	ترجمان السنہ کامل ۲۹/۵۰	تاریخ ملت کامل ۳۵/۷۵	اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں ۵/۰	اسلام کا نظام مساجد ۴/۰	حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۶/۰	مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ۴/۰	نیل سے فرات تک ۳/۰
تفسیر مظہری عربی ۶۶/۰	تاریخ علم فقہ ۲/۰	تاریخ اسلام پر ایک نظر ۶/۰	جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ۷/۰	اسلام کا نظام عفت و عصمت ۴/۰	عرب اور اسلام ۴/۰	العلم والعلماء ۴/۵۰	فلسفہ کیا ہے ۲/۰
تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹/۳۰ ۱۰/۵۰	تاریخ گجرات ۷/۰	مسلمانوں کا عروج و زوال ۵/۵۰	۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ۳/۵۰	اسلام کا زرعی نظام ۴/۰	خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام ۱/۷۵	امام غزالیؒ کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ۹/۰	مصباح اللغات ۱۶/۰
تفسیر مظہری اردو جلد اول ۱۰/۵۰	صدیق اکبرؓ ۸/۰	مسلمانوں کا نظم مملکت ۵/۵۰	اسوۂ حسنہ ۳/۰	اسلام میں غلامی کی حقیقت ۵/۰	تذکرہ شیخ محمد بن طاہر محدث ۱/۵۰	قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات ۵/۷۵	خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ ۳/۰
تفسیر مظہری اردو جلد دوم ۱۱/۰	صدیق اکبرؓ کے سرکاری خطوط ۴/۰	ملنے کا پتہ ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶				سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ۸/۰	اسلام کا اقتصادی نظام ۶/۰

مکینِ خلدِ بریں

از: سید صبیح الحسن اختر ہاشمی

جنگِ آزادی کے عظیم سپہ سالار، کانگریس کے مقتدر رہنما، ہند پارلیمنٹ کے مشہور ممبر، اور آٹھ کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے پُشت پناہ و مسلّمہ لیڈر کے لئے بآسانی ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرایا جاسکتا تھا لیکن اِس مردِ حق آگاہ کی اَبدی آرام گاہ کے لئے آستانۂ خاتم المحدثین حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا ہی انتخاب ہوا۔

حضرات محدثین کے مزارات۔ قبرستان مہندیان۔ بیرون دہلی دروازہ دہلی



دُنیا جانتی ہے کہ مجاہدِ ملت بیک وقت عالِم دین مفسرِ قرآن، مصنف و خطیب، مدبّر و مجاہد، درد مند خادمِ خلق، پیکرِ ایثار اور اتحادِ قومی کے علمبردار تھے ان اوصاف کو ذہن میں رکھئے! اور مولانا کے مزار کا حدودِ اَربعہ ملاحظہ فرمائیے! اِس ہمہ گیر شخصیت کے عناصر ترکیبی خود ہی تصوّر میں اُبھر آئیں گے

جب کوئی فتنہ زمانے میں نیا اُٹھتا ہے
وہ اِشارے سے بتا دیتے ہیں تربت میری

(حادثۂ جبل پور پر پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے)

جنوب مشرق میں مولانا آزاد میڈیکل کالج کی پُرشکوہ عمارت ہے۔

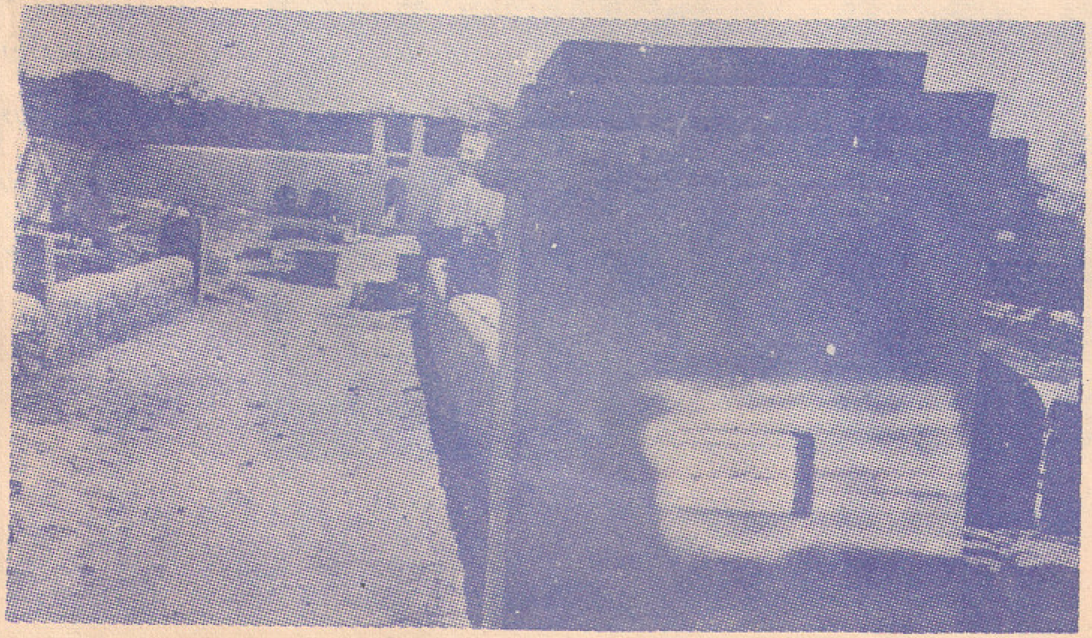
اُس عظیم اور تاریخ آفریں عہد کی یادگار جس سے برسوں مجاہدِ ملت کا جسم و جاں کا تعلق رہا۔ وُہ خطیبِ اعظم جس کی گرج سے کبھی قصرِ استبداد کے ستون دہل جاتے تھے لیکن ۱۹۴۷ء کی قیامت خیز تباہی کے بعد سراسیمہ مسلمانوں کو اس کی دِلآویز خطابت میں میٹھی لوریاں سُنائی دیں۔ اَور وُہ زمانہ کی ستم ظریفیوں کو بُھلا کر ایک مرتبہ بھرپُوری لگن کے ساتھ وطنِ عزیز کی تعمیرِ نو میں لگ گئے۔



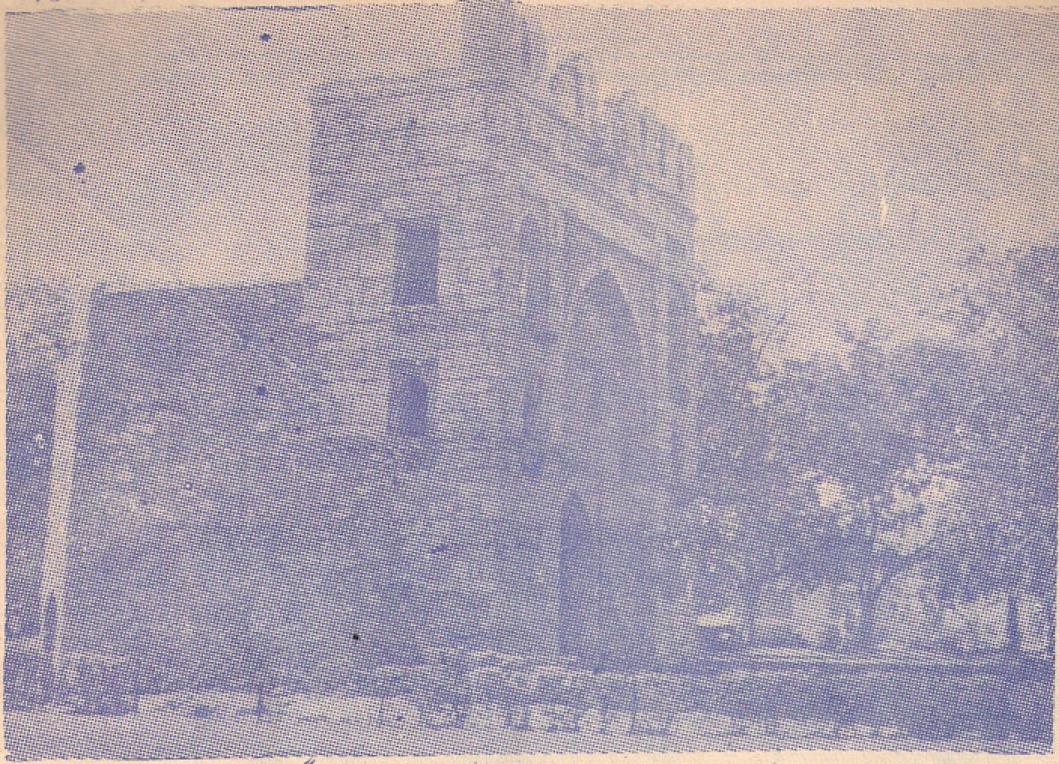
قبرستان مہندیان کا زیرِ تعمیر دروازہ، پسِ منظر میں مولانا آزاد میڈیکل کالج کی عمارت ہے

اِس پُرآشوب دَور میں مولانا آزاد اَور عام مسلمانوں کا معز زرابطہ مجاہدِ ملت ؒ ہی تھے مولانا آزاد ؒ مجاہدِ ملت ؒ سے حالات سنتے اور پھر باہمی مشورہ سے آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کرتے۔

مولانا آزاد کی صحیح رہنمائی مجاہدِ ملت کی بھرپُور کوششوں کے ساتھ ٹھکانے لگی۔ اور ایک عظیم قوم گرتے گرتے سنبھل گئی۔



بابِ حفظ الرحمٰن
مجاہدِ ملت ؒ کی
اَبدی آرام گاہ واقع
درگاہ حضرت
شاہ ولی اللہ ؒ
کا راستہ

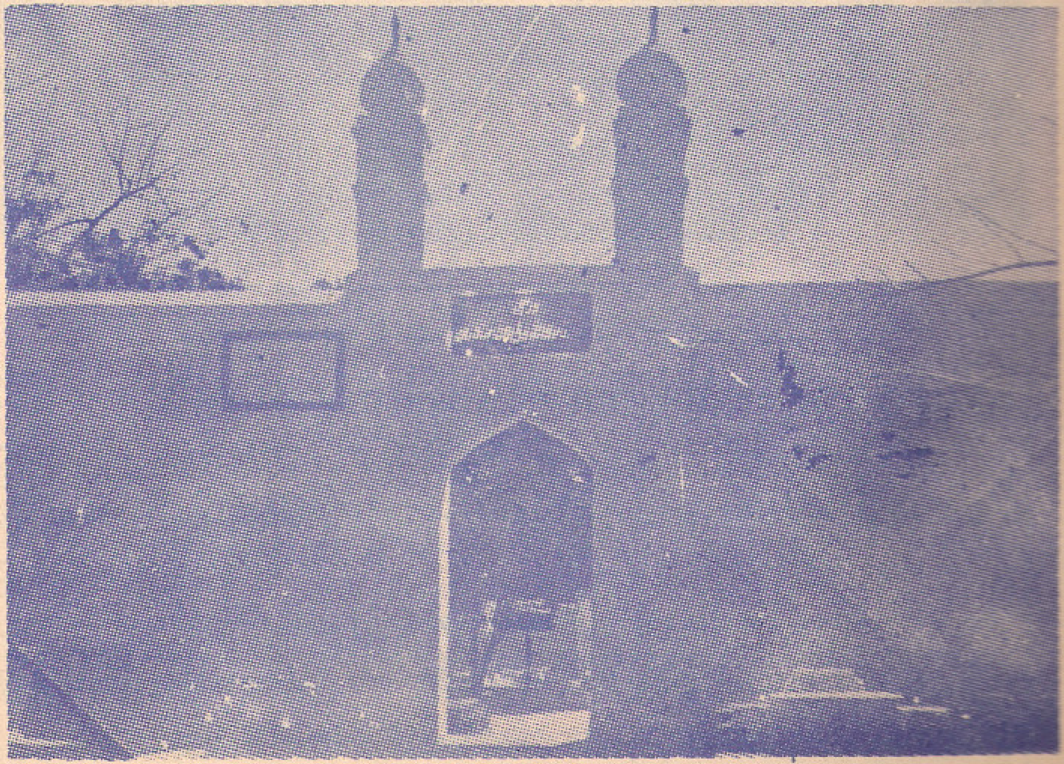


مولانا آزاد میڈیکل کالج بننے سے پہلے یہاں ڈسٹرکٹ جیل کی عمارت تھی جس میں نہ جانے کتنے جاں بازوں نے آزادیٔ وطن کی خاطر مصیبتیں جھیلی تھیں۔ خود مجاہد ملتؒ بھی کچھ عرصہ اس جیل میں نظر بند رہے۔ سڑک کی دوسری جانب دہلی کا وہ پرانا تاریخی دروازہ ہے جو خونی دروازہ کے نام سے مشہور ہے۔ کہتے ہیں غدر ۱۸۵۷ء میں یہیں بہادر شاہ ظفر کے جگر پاروں اور جنگِ آزادی کے مجاہدوں کو سولی پر چڑھایا گیا تھا۔

دہلی کا مشہور خونی دروازہ جہاں بہادر شاہ ظفر کے جگر پاروں کو سولی دی گئی

مغرب میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدثؒ دہلوی کی وہ مسجد ہے جو نہ جانے کتنے محدثین اور علماء حق کی سجدہ گاہ رہی ہے یہیں حضرت شاہ صاحبؒ کا مدرسہ تھا۔ مسجد کے باہر اردو کے مشہور شاعر حکیم مومن خاں مومن کا مزار ہے۔ شمال میں میر درد روڈ ہے۔ خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کی یادگار۔ شمال کی طرف کچھ اور آگے بڑھ کر پرانی دہلی کا وہ تہذیبی شہر ہے جو مجاہد ملتؒ کا گویا دوسرا وطن ہو گیا تھا۔ دہلی کی مجلسی زندگی کے آپ ہی روحِ رواں تھے۔

جنوب میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ
شاہ عبدالعزیز صاحبؒ
شاہ عبدالقادر صاحبؒ
شاہ رفیع الدین صاحبؒ
شاہ عبدالغنی صاحبؒ
اور
اُن دوسرے محدثین اور بزرگوں کے مزارات ہیں جو ان علماء حق کے اخلاف اور صحیح معنیٰ میں نمونۂ اسلاف تھے۔
وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا



مسجد و درگاہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کا بیرونی دروازہ

مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رح اپنے علم و فضل اور عظیم الشان دینی و ملی خدمات کے اعتبار سے عُلمائے حق کے عظیم اور تاریخی سِلسلۂ ولی اللّٰہی کی آخری کڑی تھے جس کے ہاتھوں سرزمینِ ہند پر دو صدیوں سے حق و صداقت کے پرچم سربلند رہے ہیں ۔ اِس سِلسلۂ مبارکہ کے علماء میں قرونِ اُولیٰ اور بزرگانِ سلف کی سی ہمہ گیری ہوتی تھی ۔ یہ ہی نفوسِ قدسی اپنے دَور میں علم و عمل زہد و تقویٰ جہد و ریاضت ، تدبّر و فراست ، ہمدردی خلق و فریاد رسی ، جرأتِ ایمانی ، ایثار اور اشاعتِ دین کے علمبردار رہے ہیں ۔ یہ دین اور دُنیا دونوں ہی کی ذمہ داریاں محسوس کرتے اور ہر قسم کی افراط و تفریط سے دامن بچاتے ہوئے خود کو اِنّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کا صحیح مصداق بناتے اور انسانیت کی اس معراج کو چھوتے جہاں فرشتے بھی سر جھکاتے ہیں ۔

مجاہدِ ملت سِلسلۂ ولی اللّٰہی کی روایات کا بھرم تھے ۔

اِس گوہرِ آب دار کے ترشے ہوئے پہلوؤں میں شاہ وَلی اللہ رح کا تفکر شاہ عبدالعزیز رح کا تقویٰ شاہ عبدالقادر رح کی بے باکی شاہ رفیع الدین کی سلامت رَوی شاہ اسمٰعیل شہید رح کا جذبۂ جہاد اور سید احمد شہید رح کی استقامت جھلکتی تھی کردار کی جامعیت نے انھیں ہر طبقۂ خیال میں ممدوح و مقبول بنا دیا تھا یہاں تک کہ اُن کی بزم میں وہ مختلف الخیال جو دِن رات آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی رہتے تھے ۔ اکثر یکجا ہو جاتے تھے ۔ اور ایک دوسرے سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے آپ کی بزم میں ہندو مُسلمان ، سِکھ عیسائی سب ہی ہوتے ، اُردو والے بھی اور ہندی وَالے بھی ۔ احناف کے عُلماء بھی اور اہلِ حدیث حضرات کا بھی ۔ دیو بند کے بزرگ بھی ہوتے اور اجمیر شریف وغیرہ کے سجادے بھی دینی تقدس کے حامل شیوخ واکابر بھی ہوتے ، اور دُنیاوی فضل و کمال کے ستون ۔ بڑے بڑے تاجر ۔ لیڈر ۔ فلاسفر ۔ پروفیسر ۔ وکلاء اور بیرسٹر بھی ۔



مُجاہدِ ملت سِلسلۂ وَلی اللّٰہی کے دیگر بزرگوں کے ساتھ آغوشِ رحمت میں ـــ !

صبا کیسی کہاں کے پھُول ہاں آندھی جب آتی ہے ٭ چڑھا جاتی ہے چادر گرد کی گورِ غریباں پر

غرضیکہ سِلسلۂ ولی اللّٰہی کے آخری نِشان ، ایک بُوریا نشین کی محفل تھی جہاں بیک وَقت اپنے پرائے چھوٹے بڑے ۔ اَمیر و غریب سب ہی کو یکساں سکونِ قلب و نظر حاصل ہوتا تھا ۔ یہی بُوریا نشین جو قوم کا رہبر بھی بنا تو ۔

"سیّد القوم خادمہم" کی زندہ تصویر بن کر ـــ !

آئے عُشّاق گئے ، وعدۂ فردا لے کر ٭ اب اُنھیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

رحمہُ اللہ واسکنہ فسیح جناتہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
مادہائے مزین بتاریخ
١٣٨٢ھ
١٩٦٢ء

صدق اللہ العلی العظیم
تذکرۂ جاوید بحقائق ومعارف
١٣٨٢ھ
١٩٦٢ء

جید عظیم مجاہد نمبر

١٣٨٢ھ

بیادگار مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب علیہ رحمۃ اللہ القدوس

١٣٨٢ھ ١٩٦٢ء = ٣٣٤٤

ادارۂ ترجمان الحق روزنامہ الجمعیۃ دہلی

١٩٦٢ء

مجاہد اعظم نمبرہ طیب
١٣٨٢ھ

قدیم ایڈیٹر محمد عثمان فارقلیط
١٩٦٢ء

کتبہ العاصی محمد عثمان
١٣٨٢ھ

مادہائے مزین بتاریخ	تذکرۂ جاوید بحقائق ومعارف	جید عظیم مجاہد نمبر	بیادگار مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب علیہ رحمۃ اللہ القدوس	
١٣٨٢ھ	١٩٦٢ء	١٣٨٢ھ	١٣٨٢ھ ١٩٦٢ء = ٣٣٤٤	
ادارۂ ترجمان الحق روزنامہ الجمعیۃ دہلی	قدیم ایڈیٹر محمد عثمان فارقلیط	مجاہد اعظم نمبرہ طیب	کتبہ العاصی محمد عثمان	
١٩٦٢ء	١٩٦٢ء	١٣٨٢ھ	١٣٨٢ھ	

تاریخ وفات

تاریخ وداع ١٣٨٢ھ

ایں عمر رواں حضرت مبارک تاریخی

١٩٦٢ء

بسم اللّٰہ الکبیر البصیر الرحمٰن الرحیم ١٣٨٢ھ

[illegible] عثمان [illegible] ١٩٦٢ء

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ١٩٦٢ء

[illegible] ١٣٨٢

وداع ناظم عمومی جمعیت علماء ہند ١٩٦٢ء

[illegible] حفظ الرحمٰن [illegible] ١٩٦٢ء

رکن جلیل مجلس دار العلوم دیوبند و مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

١٩٦٢

حفظ الرحمٰن [illegible] ١٣٨٢ھ

[illegible] اجرِ عظیم ١٣٨٢ھ

[illegible] نقش [illegible] ١٣٨٢ھ

[illegible] ١٣٨٢ھ

مقبول الہند جناب
مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب

١٩٦٢ء

بردّ مضجعہٗ الولی العلیم

١٣٨٢ھ

کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذی الجلال والاکرام البدیع ٥ (الآیۃ) کل نفس ذائقۃ الموت

١٩٦٢ء　　١٩٦٢ء

ان اللّٰہ المحصی لیرفع العلم برفع العلماء ● موت عالم القوم موت العالم

١٣٨٢ھ　　١٣٨٢ھ

اماکان قیس ھلکہٗ ھلک واحد - ولکنہٗ بنیان قوم تھدّما

١٣٨٢ھ

آہ گل ہو گیا ہے چراغ وطن ١٣٨٢ھ

قافلہ والے وہ میر القافلہ جاتا رہا ١٣٨٢ھ

گئے حضرت مجاہد ملت ٭ جان رحمت میں واصل جنت

١٩٦٢ء　　١٣٨٢ھ

ہے اکسٹھ سال چھ ماہ بیس دن عمر مجاہدؒ کل
٦١ برس ٦ مہینہ ٢١ دن
تری دس جنوری انیس سو اک میں ولادت ہے
١٠ جنوری ١٩٠١ء
ولادت سال ہجری ہے مگر تیرہ سو اٹھارہ
١٣١٨ھ

ہیں دن بائیس ہزار و چار سو اور پھر تراسی کل
٢٢٤٨٣
دریغا دو اگست انیس سو باسٹھ میں رحلت ہے
٢ اگست ١٩٦٢ء
ہے تیرہ سو بیاسی میں تری فرقت سے دل پارہ
١٣٨٢ھ

نالائق خادم جمعیت بپورہ معروف　١٩٦٢ء
...... عثمان اعظم گڈھی مدرس مدرسہ معروفیہ پورہ معروف
١٣٨٢ھ ١٩٦٢ء = ٣٣٤٤

روزنامہ الجمعیۃ کا یہ شایانِ شان مجاہد نمبر

۱۹ ع ۶۲

تاریخ انسانیت کا ایک سبق آموز ورق

۱۹ ع ۶۲

ایک مردِ مجاہد کی زندہ جاوید جامع شخصیت

۱۹ ع ۶۲

ایک راہنمائے اعظم مجاہد اکبر کی سبق آموز زندگی

۱۹ ع ۶۲

ازعاجز سلطان الدین قمر سنبھلی لال مسجد بلیماران دہلی

۱۳ ھ ۸۲

عازمینِ حج کیلئے خوش خبری!

حج کے ایام میں ملک کے مختلف مقامات دوران سفر بمبئی اسٹیشن و مسافر خانہ اور جہاز میں بہت سے ایجنٹ قسم قسم کے لالچ اور غلط مشورے دے کر حجاج کرام کو ایسے معلم کے سپرد کر دیتے ہیں جو نہ ان کی زبان سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ان سے ہمدردی اور محبت رکھتے ہیں جس سے انکو دشواریوں اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے حتیٰ کہ حج کے ارکان بھی صحیح ادا نہیں ہو پاتے۔ لہٰذا آپ اپنے ہی ملک کے رہنے والے معلم عبدالکریم میاںجان کی خدمات حاصل کریں اور اپنے احباب و اعزار کو ہمارے یہاں قیام کا مشورہ دیں۔ ہم آپ کی زبان سے بخوبی واقف ہیں اور حجاج کرام کی بے لوث خدمت کرتے ہیں۔ ہزاروں حاجی گواہ ہیں کہ ہم اپنے مہمانوں سے حقیقی بھائی جیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہمارے یہاں حجاج کرام کی آسائش کا بہترین انتظام کیا جاتا ہے۔ آرام کی ہر سہولت کے ساتھ ساتھ ارکان حج مسنون طریقہ پر ادا کرائے جاتے ہیں و مکانات حرم شریف کے قریب ہیں جہاں پانی کے نل، ہسپتال، ڈاکخانہ اور بازار ساتھ ہی ہیں۔ آپ کسی سے وعدہ نہ کریں اور جدّہ پہونچ کر اپنے معلم کا نام عبدالکریم میاںجان بتائیں اپنے سامان پر اپنا اور اپنے معلّم کا نام عبدالکریم میاںجان موٹے حرفوں میں لکھ دیں یا اس مقصد کے لئے ہم سے چھپے ہوئے لیبل منگا کر کام میں لائیں تاکہ ایجنٹ لوگ پریشان نہ کریں اور آپ کے سامان کو گمشدگی کا اندیشہ نہ رہے مزید معلومات مندرجہ ذیل پتہ پر کی جا سکتی ہیں

خط و کتابت کا پتہ:-

معلم عبدالکریم میاںجان اینڈ سنز معرفت گڈ لک پلاسٹک انڈسٹریز نیو کٹلری مارکیٹ۔ بمبئی نمبر ۲۔

ملنے کا پتہ:- معلم عبدالکریم میاںجان مدینہ بلڈنگ۔ سی بلاک۔ روم نمبر ۲۷۔ بہلا مالا۔ مسافر خانہ روڈ۔ بمبئی ۱

عکسِ تحریر

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ کے ایک مکتوب کا عکس ملاحظہ فرمایئے۔

یہ مکتوب حضرت مولانا نے ۱۵ دسمبر ۱۹۴۲ء کو بحالت اسیری، راولپنڈی جیل سے حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب (موجودہ جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند) کے نام ارسال فرمایا تھا۔ اس وقت کی قانونی پابندیوں اور حکومت کے تعاقب اور سخت گیری کے باعث اس مکتوب میں حضرت مولاناؒ نے اپنا مقصد کچھ اشاروں میں ظاہر فرمایا ہے "الہ آباد کی کل ہند کمپنی" سے مراد آل انڈیا کانگریس کمیٹی ہے جس کا صدر دفتر اس زمانہ میں الہ آباد میں تھا۔ "ایجنٹ" سے مراد ممبر اور "ڈیوٹی" کا اشارہ گرفتاری کی طرف ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اُن دنوں کسی اعلان کے ذریعہ اپنے تمام ممبران کی خواہ وہ اس وقت جیل میں ہوں یا پہلے سزایاب ہوچکے ہوں، فہرست اور حالات زندگی طلب کئے تھے۔ حضرت مولانا بھی اے آئی سی سی کے ایک سرگرم رُکن تھے۔

بائیس سال پُرانا، مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ اصل مکتوب جس کا کاغذ بھی اب کافی بوسیدہ ہوگیا ہے ہمیں ایک عزیز دوست اور مجاہد ملت کے ایک مخلص جان نثار جناب عبدالسلام صاحب ہاشمی مرادآبادی سے دستیاب ہوا۔

ہاشمی صاحب کے دلی شکریہ کے ساتھ حضرتؒ مولانا کی یہ تحریر "مجاہد ملت نمبر" کے صفحات کی زینت بنائی جارہی ہے۔

"سید انیس الحسن"

۸ فروری ۱۹۶۳ء

۷۸۶

از راولپنڈی جیل

معظم و محترم مولانا محمد میاں صاحب زاد مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزاج گرامی

امید کہ آپ مع متعلقین بخیر ہونگے، اور سب ہی بزرگ و احباب بھی فضل خدا سے بخیر ہونگے۔

اسوقت یہ عریضہ اسلئے لکھ رہا ہوں کہ اخبارات میں شائع ہوا کہ الہ آباد کی "کل ہند کمپنی" نے یہ اعلان کیا ہے کہ جو ایجنٹ کمپنی کے اعلان کے وقت سے ڈیوٹی پر لگے ہیں اُن کی بھی فہرست اور جو اس سے قبل ڈیوٹی پر جاچکے ہیں اُن کی بھی فہرست مع حالات زندگی صدر دفتر میں بھیجدی جائے۔ میں چونکہ آج کل ضلع سے کمپنی کا ایجنٹ بنا کر آیا ہوں اسلئے آپ براہ کرم بحیثیت انچارج مرادآباد میرے متعلق صدر دفتر کو اطلاع کردیں، اگرچہ شخصی تعارف کے اعتبار سے اسکی مطلق ضرورت نہیں لیکن ضابطے کے طور پر آپ کے ضلع کے ایجنٹوں کی فہرست میں ضرور نام شماری ہونا چاہئے۔

امید کہ آپ بصورت ضرورت بسہولت ملاقات کرنے کے قابل ہوسکیں گے۔ سب کی خدمت میں سلام مسنون۔ خصوصاً قاری صاحب کی خدمت میں نیازمندانہ سلام

۱۵ دسمبر ۴۲ء محمد حفظ الرحمن غفرلہ الکریم خادم ملت

بگرامی خدمت معظم و محترم حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب ارشاد جامعہ قاسمیہ

شاہی مسجد مرادآباد (یوپی)

مجاہدِ ملت کی یاد میں

از

جنابِ روشؔ صدیقی

گذری وہ زندگی کہ عبادت کہیں جسے
پائی وہ موت تونے شہادت کہیں جسے

روزِ ازل تجھے وہ سعادت نصیب ہو
خلقِ خدا کے درد کی دولت کہیں جسے

بے شبہ جلوہ گر ترے قول و عمل میں تھی
ہم اہلِ دل وطن کی محبّت کہیں جسے

باطل کے سامنے نہ ترا سر کبھی جھکا
یہ وہ ادا تھی جانِ صداقت کہیں جسے

مانندِ برق تھا تری رگ رگ میں موجزن
وہ ولولہ، کہ جوشِ حمیت کہیں جسے

تیرا شعار خدمتِ خلقِ خدا رہا!
خدمت بھی وہ کہ روحِ طریقت کہیں جسے

تونے صحیفۂ دلِ گیتی سے چن لیا
وہ ایک حرف، حرفِ محبّت کہیں جسے

اک وضعِ خاص تیری سیاست میں تھی نہاں
ہر رنگ میں نمودِ شرافت کہیں جسے!

تجھکو ترے شیوخ نے بخشا تھا بالیقیں
وہ علم، اہلِ دل کی امانت کہیں جسے

وہ دل ملا تجھے جو سراپا گداز تھا!
پروانۂ چراغِ رسالت کہیں جسے

آیا تھا تیری شکل میں اِک مردِ باخدا
درویش در لباسِ شریعت کہیں جسے

تقدیم — اور — تعارف

روزنامہ الجمعیۃ دہلی کی زندگی میں نہایت ہی اہم، قیمتی اور بے مثال پیش کش **"مجاہد ملت نمبر"**
جو اس کے مربی اور سرپرست اعلیٰ - مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز - کی تابناک زندگی کا یادگار مرقعہ اور ہماری تاریخ کا ایک سنہرا ورق ہے، اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

وطن عزیز کے گوشہ گوشہ میں جس اشتیاق اور اضطراب کے ساتھ الجمعیۃ کے اس خاص نمبر کا انتظار کیا گیا ہے، ہمیں اس کا پورا احساس — اور اعتراف ہے۔

بلا شبہ اس نمبر کی ترتیب اور تیاری میں ہمارا کافی وقت صرف ہوا اور آپ کو بھی معمول سے زیادہ انتظار کی زحمت گوارا کرنی پڑی لیکن آج ہم پورے اعتماد کے ساتھ آپ کو یقین دلا سکتے ہیں کہ اس تمام تاخیر کا باعث ہماری کوئی کوتاہی اور تساہل نہیں بلکہ خود اس عظیم الشان نمبر کی رفعتِ قدر اور تاریخی اہمیت ہے، جس کا احساس اس پورے عرصہ میں مسلسل اشتغال وانہماک کے ساتھ ہمارے ذہنوں پر چھایا رہا ہے۔ شروع ہی سے دل کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی علم وعمل سے بھرپور جادی اور مصروف ترین مجاہدانہ زندگی کے روشن نقوش جمع کئے جائیں اور اُن کا کوئی تذکرہ مرتب ہو تو ہر لحاظ سے اس قدر مکمل - جامع اور شایانِ شان ہو کہ کم از کم اپنا ضمیر مطمئن ہوسکے اور حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کی مجاہدانہ زندگی کے تمام پہلو، اُن کی دورآفریں خدمات ومساعی جمیلہ - اور قائدانہ افکار واعمال کی ایک تصویر سامنے آسکے - ساتھ ہی اپنی افادیت اور ظاہری ومعنوی محاسن کے لحاظ سے اتنا بلند پایہ اور باوقار ہو کہ حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ اقدس سے اپنی نسبت کو نباہ سکے۔

بحمد اللہ - تقریباً چھ ماہ کی شبانہ روز محنت اور مسلسل کاوش کے بعد آج ہم اپنے اس فرض سے سبکدوشی کی سعادت حاصل کر رہے ہیں اور اپنے محدود وسائل اور اپنی بے ایصلاحیتوں کے ساتھ اس عظیم نمبر کی تکمیل وتزئین کے لئے ہم جتنا کچھ کر سکتے تھے، اُس کا نتیجہ اب آپ کے سامنے ہے اور اس کا اندازہ آپ ہی فرمائیں گے کہ ہمیں اپنے ارادوں اور کوششوں میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوسکی ہے۔

نشاندہی کے طور پر یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اس نمبر کی ترتیب وتدوین میں ہم نے شروع ہی سے اس کا التزام کیا ہے کہ :-

(۱) حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اولوالعزم شخصیت - ملکی وملی خدمات - قائدانہ افکار واعمالِ جلیلہ پر ملک بھر کے مسلم وغیر مسلم ہر طبقہ اور ہر خیال کے اربابِ علم وفضل اور احباب ومخلصین کے قلبی تاثرات اور مشاہدات پورے اہتمام اور جستجو کے ساتھ حاصل کر سکیں۔ چنانچہ مسلسل کاوش اور تقاضوں کے بعد جتنے بھی مقالات ومضامین ہم حاصل کر سکے وہ نمبر کے صفحات میں شاملِ اشاعت کر دیئے گئے ہیں۔

(۲) حضرت مجاہد ملت سے تعلق خاطر رکھنے والے جن احباب نے از خود بھی اپنے مقالات ارسال کئے، جہاں تک ہو سکا اُن کو بھی ہم نے نظر انداز نہیں کیا ہے۔ صرف دو مقالے ضرور محفوظ رکھے گئے۔ اُن میں سے ایک مقالہ ہمارے مخلص اور فاضل رفیق مولانا شرقی العثمانی نائب صدر جمعیۃ علماء بھوپال کا ہے اور دوسرا مضمون عزیز دوست اور مجاہد ملتؒ کے مخلص فدائی سید عبد السلام صاحب ہاشمی مراد آبادی کا -

اوّل الذکر فاضلانہ مضمون میں مولانا شرقی عثمانی صاحب نے مجاہد ملتؒ کی ہمہ گیر خدمات کا یکجائی اجمالی خاکہ پیش کیا ہے لیکن چونکہ وہ تمام عنوان تفصیل کے ساتھ دوسرے مضامین میں آچکے ہیں اس لئے تکرارِ بیان کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے اپنے خلوص تعلق اور اس اعتماد کے ساتھ اس مضمون کو محفوظ کر لیا گیا کہ مولانا شرقی عثمانی صاحب ہماری اس جرأت کو معاف فرمائیں گے۔

دوسرے مضمون میں رفیقِ مکرم ہاشمی صاحب نے حضرت مجاہد ملتؒ کے تین بار پارلیمنٹری الیکشنوں کی سرگذشت بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے اور چونکہ

ہاشمی صاحب نے خود بھی ان تینوں موقعوں پر بڑی تندہی کے ساتھ حضرت مولانا کی انتخابی مہم کو سر کیا تھا' اس لئے ان کا حق تھا اور واقعۃً بڑی محنت سے اُنھوں نے اپنی یادداشتوں کو ترتیب دیا۔ لیکن نتیجہ میں مضمون کی طوالت اتنی بڑھ گئی کہ نمبر کے عام طلبگار شاید اس کو بار سمجھتے' اس لئے اپنے ایک دوست کی وقتی ناگواری کا رسک لینا اور پھر اس کو منا لینا ہمیں آسان معلوم ہوا۔

(۳) ترتیب کے لحاظ سے اس نمبر کے مضامین حسب ذیل پانچ حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں

۱۔ الجمعیۃ کے ادارتی مقالہ کے بعد زعمائے ملک و ملت کے مختصر پیغامات اور تاثرات ہیں۔

۲۔ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت' سوانح اور ان کے فکر و کردار پر مختلف مقالات کا سلسلہ ہے جس میں مخدوم حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب اور راقم السطور کے طویل مضمون بھی ہیں اور خاص طور پر مجاہد ملتؒ کی قلمی خدمات پر مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب (صفحہ ۱۵۳) مولانا قاضی زین العابدین صاحب (صفحہ ۱۶۹) حافظ غفران احمد صاحب (صفحہ ۲۰۴) اور خواجہ عبدالحئی صاحب (صفحہ ۲۱) کے مقالات بھی۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی گھریلو زندگی' بچپن اور نوعمری کے حالات پر مولانا مقبول احمد صاحب سیوہاروی (صفحہ ۱۹۵) مولانا مفتی جمیل الرحمٰن صاحب (صفحہ ۱۹۹) اور شاکر جلیل صاحب صدیقی (صفحہ ۲۰۰) کے مقالات بھی اسی باب میں شامل ہیں۔

۳۔ حضرت مجاہد ملت رح کے افکار و عزائم کا آئینہ' اُن کی کچھ یادگار تقریریں۔ بیان اور بعض مکاتیب ہیں۔

۴۔ اُردو صحافت نے حضرت مولاناؒ کی شخصیت اور کردار پر جو تاثرات اپنے اداریوں میں شائع کئے' ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں۔

۵۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے رفقاء کار اور مخلصین کے عام مقالات ہیں۔

اس نمبر کے ظاہری اوصاف میں کتابت و طباعت کا پورا اہتمام نمایاں ہے:-

(الف) ضخامت کے لحاظ سے صفحات چار سو سے زائد ہیں لیکن باریک اور بھرپور کتابت کے بل پر بلا مبالغہ کتابی معیار کے دو ہزار صفحات کا مواد اس میں سمو دیا گیا ہے۔

(ب) کاغذ بھی بہت قیمتی' نگلیز اور پائیدار استعمال کیا گیا ہے کہ تادیر باقی رہ سکے۔

(ج) پروف ریڈنگ اور تصحیح کے اہتمام میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی گئی ہے

(د) طباعت بھی اتنی ستھری اور روشن ہو کہ انشاء اللہ قارئین کرام کو کوئی شکایت محسوس نہ ہوگی۔

(ہ) ترتیب و تدوین میں اس کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر مضمون از اول تا آخر مسلسل ایک ہی جگہ سما جائے۔ کسی بھی مضمون کے ٹکڑے نہ ہوں کہ اس کا بقیہ تلاش کرنے کے لئے ورق گردانی کی نوبت آئے۔

(و) ٹائیٹل کے نقش و نگار بھی اس حقیقت کی تعبیر ہیں کہ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ اپنے بعد خدمت و عمل کے وہ نقوش باقی چھوڑ گئے ہیں جو زندگی کی تاریکیوں اور رکاوٹوں میں آنے والی نسلوں کے لئے مشعل ہدایت اور سامان بصیرت ہوں گے (انشاء اللہ)

آخر میں ہم انتہائی احسانمند اور شکر گذار ہیں اُن تمام رہنماؤں اور حضرات مقالہ نگار' شعراء کرام اور اصحاب علم و فن کے جنھوں نے اپنی کاوش فکر و قلم سے ہمیں ممنون فرمایا اور اُن تمام دوستوں کے جنھوں نے کسی بھی طور سے اس عظیم نمبر کی تکمیل میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ اپنے ادارہ اور پریس کے رفقاء کار کے لئے شکر گذاری کا اظہار تو شاید رسمی بات ہو' مگر واقعہ یہ ہے کہ قدم قدم اُن کے تعاون ہی سے یہ ایک بڑا کام انجام پا سکا ہے۔

خدا کرے کہ یہ تمام محنت اور کوشش خلق خدا کے کام آئے۔ عنداللہ مقبول ہو اور ان صفحات کے پڑھنے والے حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ کو اور اُن کے خدام کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

سید انیس الحسن
جنرل منیجر الجمعیۃ دہلی

یکم شوال المکرم ۱۳۶۲ھ
۲۶ رفروری ۱۹۶۳ء

فہرست

عنوان ابواب	مقالہ نگار	صفحات
۱۔ عکسِ تحریر حضرت مجاہد ملت رح	فراہم کردہ جناب عبدالسلام ہاشمی صاحب	۲
۲۔ اداریہ	مولانا محمد عثمان فارقلیط	۹ تا ۱۲
۳۔ تاثرات اور پیغامات	——————	۱۳ تا ۳۸

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نائب صدر جمہوریہ ہند
السید جمال عبدالناصر صدر متحدہ عرب جمہوریہ
ڈاکٹر ریاض العطر (سفارت متحدہ عرب جمہوریہ)
ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ ہند
ارونا آصف علی
مسز اندرا گاندھی
پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند
ڈاکٹر سید محمود ایم پی
السید یوسف الفوزان سفیر سعودی عرب برائے ہند
پروفیسر ہمایوں کبیر وزیر حکومت ہند
جناب لال بہادر شاستری وزیر داخلہ حکومت ہند
جناب صادق علی جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی
مسٹر عظیم حسین سفیر ہند مقیم قاہرہ
مسٹر بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش
سردار پرتاپ سنگھ کیروں وزیر اعظم پنجاب
بیرسٹر نور الدین احمد میئر دلی کارپوریشن
جناب بخشی غلام محمد وزیر اعظم کشمیر
شری آچاریہ کرپلانی
ہر ہائی نس والی بھوپال
مولانا محمد بدر عالم مدینہ منورہ
جناب ملا طاہر سیف الدین امیر جماعت اسماعیلیہ بوہرہ
الشیخ مفتی محمود شلتوت شیخ الازہر۔ قاہرہ

سکریٹری موتمر اسلامی مکہ مکرمہ
حضرت مفتی اعظم کشمیر
مولانا ناصر میاں فرنگی محل
خان بہادر محمد جان صاحب کلکتہ
مسٹر محمد صادق وزیر تعلیم کشمیر
شری جگموہن داس وزیر مدھیہ پردیش
مسٹر شورش کاشمیری ایڈیٹر چٹان۔ لاہور
مولانا اسماعیل کارڈی جنوبی افریقہ
جمعیۃ علماء ٹرانسوال " "
" " برما رنگون
پورٹ حج کمیٹی بمبئی
پرنس ملا یوسف نجم الدین بمبئی
جناب نواب صاحب آف محمد گڑھ
مولانا شاہ عبدالسلام مجددی کابل
حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند
مولانا داؤد غزنوی (پاکستان)
مولانا عبدالحامد بدایونی صدر جمعیۃ علماء پاکستان
حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن ناظم ندوۃ المصنفین دہلی
حضرت مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور
قرارداد تعزیت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
حضرت مولانا عبدالوہاب آروی صدر کل ہند اہل حدیث کانفرنس
قرارداد تعزیت جمعیۃ علماء ہند

۴ - ایک عظیم رہنما اور مجاہد کی سبق آموز زندگی ________ ۳۹ تا ۲۳۰

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند
سید انیس الحسن بی اے۔
مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی
مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم اے
پروفیسر آل احمد سرور جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند
الحاج احمد غریب صاحب سکریٹری انجمن خدام الدین بمبئی
مسٹر ایس پی سنہا ایڈوکیٹ سپریم کورٹ
مسٹر محمد احمد ایم اے ایڈوکیٹ (دہلی)
خان بہادر سید الطاف احمد خیری (جے پور)
شری گوپی ناتھ امن لکھنوی (دہلی)
حکیم مختار احمد اصلاحی صاحب (بمبئی)
جناب احمد فاطمی صاحب (بنارس)
مولانا عبید الرحمٰن شروانی (علی گڑھ)
پنڈت سندر لال صاحب (نئی دہلی)
جناب حیات اللہ انصاری ایڈیٹر قومی آواز لکھنو
سید اوصاف علی صاحب سابق ایڈیٹر پیسج دہلی
مولانا شاہ معین الدین احمد ایڈیٹر معارف (اعظم گڑھ)
مسٹر سلیمان صابر (رکن ادارۂ تحریر الجمعیۃ)
کنور مہندر سنگھ صاحب سحر بیدی ڈپٹی کمشنر سنگرور
ہز ہائینس نواب سرور علیخاں صاحب آف کوڑائی
شاعر انقلاب علامہ انور صابری دہلی
جناب حمیدہ سلطان صاحبہ دہلی
مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی
مولانا قاضی محمد اطہر صاحب مبارکپوری
قاضی محمد عدیل عباسی صاحب ایڈوکیٹ بستی
جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب
جناب ضیاء الحق انصاری صاحب (جلینا)
ڈاکٹر محمود قادری صاحب رکن ادارۂ تحریر الجمعیۃ
مولانا مقبول احمد صاحب سیوہاروی
مولانا مفتی جمیل الرحمٰن صاحب سیوہاروی
جناب شاکر جلیل صدیقی صاحب
حافظ غفران احمد صاحب
پروفیسر خواجہ عبد الحی صاحب
ہز ہائینس مرزا امین الدین صاحب آف لوہارو
مولانا محی الدین الوائی فاضل ازہر
مولانا محمد عاقل صاحب الہ آبادی
مسٹر شام ناتھ ڈپٹی منسٹر انفارمیشن حکومتِ ہند
مولانا عبد الحمید نعمانی صاحب مالیگاؤں
مسٹر ظہیر الدین صدیقی ایم اے ایل ایل بی

---

۵ - حضرت مجاہد ملتؒ کی چند یادگار تقریریں - بیان اور مکتوب } ________ ۲۳۱ تا ۲۸۰

۶ - اردو صحافت کا خراجِ عقیدت ________ ۲۸۱ تا ۳۳۶

۷ - مجاہد ملتؒ، احباب و مخلصین کی نظر میں ———— ۳۳۷ تا ۴۰۰

مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی (دہلی)
مسٹر ریاض الدین احمد پرنسپل مجیدیہ اسلامیہ کالج الہ آباد
جناب میر مشتاق احمد صاحب (دہلی)
جناب سید نصیر الحق صاحب رضوی
مولانا ابوالبقاء ندوی
مولانا غلام حسین صاحب بھاگل پوری
قاضی محمد سفیان صاحب (علی گڑھ)
مولانا وحیدی الحسینی (بھوپالی)
مولانا عبدالحق عارف صاحب (ناگپور)
مولانا نجم الدین اصلاحی صاحب
جناب امین سلونوی (لکھنؤ)
مولانا عبدالحمید اعظمی صاحب
مولانا اشرف علی سہواروی
مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر
مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری
جناب رحمت نجمی صاحب میرٹھی
منشی عیسیٰ بھائی ابراہیم صاحب (ضلع بھروچ)
مولانا عبدالصمد صارم سہواروی
مولانا عبدالجلیل خطیب صاحب ایڈیٹر روشنی بنگلور
جناب عبدالعظیم خاں عرجی بنگلور
جناب سید قسیم الحق گیاوی

قطعات — تاریخی مادّے

مولانا محمد عثمان صاحب، پورہ معروف۔ (اعظم گڑھ)
مولانا محمد حسن بدر سنبھلی
مولانا مفتی جمیل الرحمٰن سیوہاروی
حکیم نور العین حسن راغب چھتاروی
مولانا صادق بستوی
مولانا شہباز صدیقی امروہوی
مسٹر سلطان الدین قمر سنبھلی
جناب ثمر چھتاری
جناب شمیم الحسن زیدی
جناب شوکت دھامپوری
جناب ظفر الاسلام بن مولانا ارشد

منظومات

جناب روش صدیقی
علامہ انور صابری
مولانا ابوالحسن حیدری
جناب بہار برنی رکن ادارہ تحریر الجمعیۃ
مولانا شہباز صدیقی امروہوی
مولانا فرحت القاسمی گیاوی
مولانا زبیر فاروقی جونپوری
مولانا احسن مفتاحی
زہرہ سخن سیدہ اختر صاحبہ
مولانا قاری فخر الدین صاحب (گیا)
جناب مطرب سلطان لکھنوی
جناب حفیظ بنارسی
مولانا وارث القادری
جناب اسلم لکھنوی
جناب صدر الدین صدر بھوپالی
جناب کوثر بھارتی
جناب اکرم نعمانی
مولانا محمد مسلم شاہ گنج
مولانا عثمان احمد قاسمی جونپوری
جناب اطہر صدیقی
جناب امیر دھامپوری
جناب عزیز احمد حسین پوری
جناب محمد عمر خان صدیقی
جناب ناجی ایم اے علیگ (مالیر کوٹلہ)

اداریہ

(مولانا) محمد عثمان فارقلیط

بے نظیر مجاہد...... بے بدل قائد

گزارشِ احوالِ واقعی

(سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا)

فن سوانح نگاری دوسرے فنون کی طرح آج کل بہت ترقی کر گیا ہے اور اہل قلم نے جو اس فن میں مرتبہ اختصاص رکھتے ہیں اس کے نوک پلک خاصے درست کر لئے ہیں۔ مگر یہ فن جس قدر مقبول اور قابل قدر ہے، اسی قدر نازک بھی ہے، کیوں کہ پڑھنے والوں کی اکثریت ان شخصیتوں سے جن کے حالات وہ مطالعہ میں لانا چاہتی ہے بذات خود متعارف نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے مرتبہ یقین کا زیادہ تر اعتماد سوانح نگار کی دیانت داری، اصابت، غیر جانب داری اور بیساختہ واقعہ نگاری پر ہوتا ہے اور وہ ان ہی رنگوں سے متاثر ہوتی ہے جو وقائع نگار کے قلم سے ان کی زندگی کے نقشوں میں بھر دیئے جاتے ہیں۔ اگر پڑھنے والے محتاط اور زیرک ہوئے تو وہ ایسی تحریروں سے دروغ برگردنِ راوی کہہ کر گزر جاتے ہیں۔ اگر سادہ لوح ہوئے تو وہ عقیدت کے سہارے ہر رطب و یابس کو قبول کر لیتے ہیں اور ان کی قوت استنباط و استخراج میں کجی اور گمراہی پیدا ہو جاتی ہے اس لئے اگر ایک طرف سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہیرو کو دنیا کے سامنے بلا کم و کاست پیش کرے اور اپنی رنگین عینک کو اتار کر رکھ دے، وہاں پڑھنے والوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ توہمات کا شکار نہ ہوں اور سریع الاعتقادی سے اپنا دامن بچائیں اور اچھی باتوں کو قبول کرتے ہوئے غیر امکانی اور بعید القیاس باتوں کو رد کر دیں۔ فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ

ہمیں ان ابتدائی سطور میں حضرت مجاہد ملت نور اللہ مرقدہ کے بارے میں کچھ لکھنا نہیں ہے۔ اس کے لئے آپ کے سامنے پوری کتاب زندگی پیش کی جا رہی ہے یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ اس نمبر میں حضرت مولانا مرحوم کی زندگی اور ان کے یادگار زمانہ کارناموں اور خدمات کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ ان میں اشارات کی نوعیت کیا ہے، اور تفصیلات کو کس ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے اور کن گوشوں پر حقائق کی روشنی ڈالی گئی ہے اور کن پہلوؤں کو قارئین کے اختیار تمیزی پر چھوڑا گیا ہے اور آپ کو ان تمام پہلوؤں پر کس نقطۂ نگاہ سے غور کرنا اور کن طریقوں سے ان کا جائزہ لینا ہے، لکھنے والوں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اور انھیں جو کچھ معلوم تھا اسے وقف عام کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ اب یہ کام پڑھنے والوں کا ہے کہ وہ بھی اپنے ذوق اور تعلق خاطر کا جائزہ لیں اور اس خصوصی شمارہ کی قدر افزائی فرماتے ہوئے مجاہد ملت کے اس مشن کو پورا کرنے کی کوششیں کریں، جس پر انھوں نے اپنی صحت اپنے آرام، اپنے اوقات اور اپنی جان تک کو قربان کر ڈالا اور اسی کے عشق میں اپنی جان شیریں جان آفریں کے سپرد کر دی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

اگر یہ کلیہ درجہ وثوق کو پہنچ چکا ہے کہ انسان کا علم اور دنیا کی ہر چیز اضافی ہے اور اشیاء کی شناخت میں تعرف الاشیاء باضدادہا کا اصول کار فرما ہے تو اس کلیہ سے اشخاص اور شخصیتیں بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ زندگی کے واقعات اضافی حیثیت سے بعض کے نزدیک بڑے اہم ہوتے ہیں۔ بعض کے خیال میں معمولی اہمیت رکھتے ہیں اور بعض کے نقطہ سے ان میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ مسلم یونیورسٹی کے بانی سر سید احمد خاں مرحوم و مغفور نے اپنی بے مثال قربانیوں اور

ان تھک لگن کے باعث اپنی جو شخصیت بنائی تھی وہ بھی ان ہی سہ گانہ خانوں کے اندر تقسیم ہو گئی ہے ایک طبقہ صحیح معنے میں ان کو ریفارمر تسلیم کرتا ہے، دوسرا بین بین راہ اختیار کرتا ہے اور تیسرا انھیں کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں ہے آپ اس انداز فکر کو خواہ مبالغہ کا نام دیں یا تنقیص کا یا پھر اسے اضافی اصول کی طرف لوٹائیں حقیقت اپنی جگہ باقی رہے گی کہ ہر شخص کا ہر شخص کے نزدیک محبوب اور معیوب ہونا ضروری نہیں۔ درجات کا تفاوت ہر شخص کے علم اور مزاج کے مطابق ہوتا ہے، البتہ تاریخ میں بعض ایسی شخصیتوں کا پتہ لگتا ہے جو تھوڑے بہت تفاوت کے ساتھ سب کے نزدیک عقیدت کی تکیہ گاہ رہی ہیں اور جن کے سامنے مخالفین اور موافقین کا سر احترام کے لئے جھکتا رہا ہے۔ ان میں سے ایسی ایک شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کی ہے کہ مخالفوں نے بھی ان کی عظمت کا اعتراف کیا اور عقیدت مندوں نے بھی ان کی راہ میں اپنی آنکھیں بچھائیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم ان ہی شخصیتوں میں مجاہد ملت کو بھی شمار کر سکتے ہیں۔ ماننے والوں نے ان کو زندگی میں بھی مانا اور وفات کے بعد بھی ان کی خوبیوں کے معترف رہے جنھوں نے زندگی میں تیور بدلے وہ بھی ان کی خدمات سے انکار نہ کر سکے اور وفات کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ قوم و ملت کی ایک بہت بڑی اور قیمتی امانت ہاتھ سے نکل گئی۔ ہم نے زندگی میں تجربہ کیا کہ شدید مخالفت کے باوجود لوگوں کو کہتے ہی بنی کہ کیا کریں مقابلہ میں کوئی دوسرا دکھائی بھی نہیں دیتا۔ دم غنیمت ہے اور ملت ابھی بے سہارا نہیں ہوئی ہے۔

تاریخی شخصیتیں کبھی یک رُخی اور یک طرفہ نہیں ہوا کرتیں۔ ان کے بننے میں دو عوامل برابر کام کرتے رہے ہیں۔ ایک یہ کہ خود ان کے اندر بننے کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں انکے بنانے میں ان کی ذہانت، ذکاوت، قوت عمل، خلوص، لگن، ایثار اور قربانی نے بڑا کام کیا اور وہ خادم بن کر مخدوم بنیں، دوم انھیں آنکھوں پر بٹھانے کے لئے عقیدت مندوں کا ایک طبقہ ہمیشہ موجود رہا اور اس نے ان کے مشن کو کامیاب بنانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائی۔ اگر کسی وقت ایسا ہوا کہ شخصیت تو اپنی تمام ضروری شرائط کے ساتھ وجود میں آگئی۔ مگر حامیین اور انصار کا طبقہ پیدا نہ ہو سکا، اس حالت میں یا تو اس عظیم شخصیت کو وقت کا انتظار کرنا پڑا یا ناکامی میں بقیہ ایام گزار دیئے یا پھر کوئی ایسی شخصیت وجود میں آئی جس کے استقبال کے لئے عقیدت مندوں کی فوج تو تیار ہو گئی۔ لیکن وہ خود طبل تہی بلند بانگ در باطن ہیچ کا مصداق ثابت ہوئی۔ نہ وہ اپنا کوئی مشن لے کر آئی نہ اس نے اپنی صلاحیتوں کا کوئی ثبوت بہم پہونچایا، نہ اس کے اندر قوت عمل کی کوئی رمق پائی گئی، نہ اس پر اخلاص و ایثار کی کوئی تہمت لگی۔ اس کے اندر نہ ظاہری اوصاف پیدا ہو سکے اور نہ باطنی اوصاف کی روشنی چمک سکی۔ اتفاقات نے عقیدت مندوں کا ایک گروہ پیدا کر دیا جس نے اپنے "رہنما" کے پر لگائے، مگر اسے اڑنے اور بلندی پر پہنچنے کے قابل نہ بنا سکے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ پیری مریدی کا بازار تو چلا اور عام رسوم میں ایک اور رسم کا اضافہ ہوا۔ مگر جس شخص کو اڑانے کی کوشش کی گئی تھی وہ اپنا کوئی قابل ذکر کارنامہ تاریخ کے حوالے نہ کر سکا۔ خلاصہ یہ کہ امامت اور اقتدار کا مسئلہ مہاجرین اور انصار سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ جس طرح مہاجرین کے لئے انصار کا وجود ضروری ہے۔ اسی طرح ایک قائد و رہنما کے لئے ان حامیین کی ضرورت ہے جو اس کے مشن کی صداقت پر اپنے عمل سے شہادت دیں اور اس کے پیغام کو لے کر آگے بڑھیں اور اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیں۔ اگر کسی قائد کا کوئی صحیح مخاطب نہیں تو اہم سے اہم شخصیت بھی وہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکتی، جو اسے انصاف کی رو سے حاصل ہونی چاہئے۔ جب ہم اس نقطۂ نظر سے حضرت مجاہد ملت کی شخصیت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے قوم کے اندر کبھی یتیمی کی زندگی نہیں گزاری اور قوم نے کبھی ان کو تنہا نہیں چھوڑا۔ ذرا ہندوستان کے طول و عرض کا جائزہ لیجئے اور انگلی رکھ کر بتایئے کہ کوئی مقام ایسا بھی ہے جہاں مرحوم کا فیض نہ پہنچا ہو یا وہ ان کی خدمات سے محروم رہ گیا ہو۔ کلکتہ سے مالا بار تک اور کشمیر سے راس کماری تک ملک کا چپہ چپہ مرحوم کی خدمات کے لئے زیر بار احسان ہے اور ملک کا ہر گوشہ ان کی قربانی اور ایثار پر مجسم شہادت ہے۔ اگر قدرت نے مجاہد ملت کو بے پناہ قوت عمل دی تھی، تو اسی قدرت نے خدمات کا دائرہ بھی اتنا وسیع کر دیا تھا کہ اس پر ان کی قیادت کا شامیانہ آسانی سے پھیل سکا اور وہ اپنی رہنمائی کا بھرپور مظاہرہ کر سکے۔

جہاں تک مجاہد ملت کی عوامی قیادت کا تعلق ہے اس میں کسی وقت بھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ لیکن جن لوگوں کو آپ سے کم و بیش تعلق خاطر رہا ہے اور جن کو ہم متوسلین اور عقیدت مندوں میں شامل کر سکتے ہیں انھیں ہم آسانی کے لئے تین خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلے خانہ میں وہ لوگ ہیں جنھوں نے مجاہد ملت کو بہت ہی قریب سے دیکھا ہے آپ کی معیت میں شب و روز گزارے ہیں۔ ان کے مزاج میں دخل حاصل کیا ہے یا مزاج شناسی میں مہارت حاصل کی ہے اور وہ اس حد تک قریب رہے ہیں کہ ان کی حرکات و سکنات کو دیکھ کر اندازہ لگا لیتے تھے کہ کچھ عرصہ کے بعد ان کا کردار کیا ہوگا اور وہ کن خطوط پر سوچ کر کون سے نتائج اخذ کریں گے یا جو اس حد تک مزاج شناس ہیں کہ ان کی برہمی اور خوش باشی سے پتہ لگا لیتے تھے کہ ان کا ذہن کن مسائل کے

گروہوں سے ہے اور وہ آئندہ کیا قدم اٹھانے والے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوگی۔ مگر یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے صحیح معنے میں ان کی خدمت و خدمات کے لئے ان کی تڑپ کا مشاہدہ کیا ہے اور جو بلا تکلف شرعی کہہ سکتے ہیں کہ سارے ملک میں مولانا کا وجود بے بدل ہے اور ان کی قیادت کو چیلنج کرنے والا ابھی تک پیدا نہیں ہوا ہے۔

دوسرے خانہ میں وہ لوگ نظر آتے ہیں جو توسل اور تعلق کے اعتبار سے بین بین ہیں۔ ایسے لوگ مجاہد ملت سے متعارف بھی ہیں، انھیں اپنا دوست اور بزرگ بھی سمجھتے ہیں۔ اگر موقع ملا تو خدمت میں حاضری بھی دے دی، راہ میں ملاقات ہوگئی تو سلام وکلام بھی کرلیا۔ ضرورت پڑی تو ان کے مشوروں سے بھی فائدہ اٹھایا۔ علالت میں عیادت کے لئے بھی آگئے۔ تشریف آوری پر ہوائی اڈہ اور اسٹیشن پر بھی چلے گئے، خطوط کے ذریعے بھی گاہے گاہے راہ و رسم کو زندہ رکھا۔

تیسرے خانہ کے وہ لوگ ہیں جنھوں نے مجاہد ملت کا صرف نام سنا، یا ان کی کوئی تقریر پڑھ لی، یا کوئی بیان مطالعہ میں آگیا۔ یا کبھی کسی جلسہ میں شرف نیاز حاصل کرلیا اور مصافحہ کی نوبت آگئی یا عمر میں ایک دو دفعہ کسی کام کی خاطر بات چیت کرنے کے لئے خدمت میں حاضر ہوگئے۔

اب یہ بات بالکل عیاں ہے کہ مجاہد ملت کے بارے میں ان میں سے ہر شخص کے تاثرات قدرے مختلف ہوں گے اور پھر ان کے نتائج اور فیصلوں میں بھی اختلاف ہوگا اور ان کے طرز عمل میں بھی تنوع پیدا ہوجائے گا۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود ان کا یہ احساس مشترک ہوگا کہ قوم و ملت کو ان کی سخت ضرورت ہے اور انھیں اس میدان میں ان کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ مرحوم جن علوم سے بہرہ ور تھے اور اس سلسلہ میں آپ نے جو کتابیں تصنیف کیں ان کی قدر و قیمت سے صرف اہل علم ہی واقف ہو سکتے ہیں لیکن قدرت نے آپ کو جو قوت عمل بخشی تھی اور خدمات کا جو جذبہ آپ کو حرکت میں لا رہا اُسے دیکھنے کے لیے صرف آنکھوں کی ضرورت تھی اور ہر آنکھ والے نے دیکھا کہ مولانا کا وجود سراپا جہاد تھا جو آپ کو حرکت و عمل کے لئے سیماب وار مضطرب رکھتا تھا۔ اور دن رات کے اٹھارہ گھنٹے اسی خدمت و عمل میں صرف ہوتے تھے۔ اگر دفتر میں ہیں تو نزدیک اور دور کے لوگ مشورے لے رہے ہیں۔ کوئی اپنی بپتا سنا رہا ہے۔ کسی جگہ سے کوئی وفد آیا ہوا ہے اور آپ گھنٹوں ان کے ساتھ مشوروں میں مشغول ہیں۔ کہیں تار روانہ کئے جارہے ہیں، کہیں حکام کو فون کیا جارہا ہے۔ کسی کو چٹھی لکھی جارہی ہے۔ کہیں سے فوری بلاوا آیا ہے اور آپ روانگی کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ کبھی پنڈت نہرو سے ملاقات کا وقت مقرر کیا جارہا ہے اور کبھی وزیر داخلہ سے بات چیت کے لئے چل کھڑے ہوئے ہیں۔ اگر کہیں مسلمانوں کے خلاف یورش ہوئی تو بے چینی کے آثار فوراً نمایاں ہوگئے اور چلنے کے لئے تیاری شروع کردی۔ نہ کھانے پینے کی سدھ اور نہ سونے اور آرام لینے کی فرصت۔ یہ وہ باتیں ہیں جن سے وہ لوگ بھی انکار نہیں کرسکتے جنھیں مولانا سے اختلاف تھا۔ اور جو مختلف وجوہ سے آپ کا ساتھ نہ دے سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجاہد ملت کی شب و روز کی سرگرمیاں نظروں کے سامنے تھیں اور جن کو ہر شخص آنکھوں سے چھو کر بھی دیکھ سکتا تھا۔ منطق سے استدلال میں شکوک پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ مگر مشاہدہ کی تکذیب نہیں کی جاسکتی۔

مجاہد ملت کی زندگی کے مخفی اور علمی نقوش آپ کو آنے والے اوراق میں نظر آئیں گے۔ ہم یہاں مرحوم کی ذہنی نفسیات سے متعلق صرف دو باتوں پر توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ یعنی آپ کی بے مثل ذکاوت اور ذہن ثاقب اور اس کے ساتھ ہی قوت فیصلہ اور استقامت رائے۔ مجاہد ملت کے سیلان ذہن کا یہ حال تھا کہ بات کی تہ کو فوراً پہنچ جاتے تھے۔ جہاں کسی نے کوئی بات چھیڑی آپ کا ذہن اس کی انتہا کو پہنچا۔ نہ صرف آپ کو ذہن کی رسائی میں ملکہ تھا بلکہ قوت فیصلہ میں بھی کمال حاصل تھا۔ بات چھیڑتے ہی اس کی تہ تک پہنچ جانا اور فوراً قوت فیصلہ سے کام لینا اور عموماً اس فیصلہ کا مصاب اور درست ہونا ایک ایسی خداداد نعمت تھی جو قدرت نے آپ کو نہایت فیاضی سے عطا کی تھی۔ اگر کسی نے کوئی واقعہ بیان کیا تو ختم ہونے سے پہلے ہی سمجھ لیا کہ واقعہ کی کڑی کہاں سے ٹوٹی ہے اور بیان کرنے والے نے کون سی بات چھپائی ہے اور کیوں چھپائی ہے۔ چنانچہ جرح کرنے کے بعد ان کے سیلان ذہن کی داد دینی پڑتی تھی۔ اور وہی ظاہر ہوتا تھا جیسے آپ ابتداہی میں محسوس کرچکے تھے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کوئی شخص آپ کو دھوکا دینے میں پورے طور پر کامیاب ہوگیا ہو۔ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے بہت دھوکے کھائے اور اکثر حالات میں ان کی سزا بھی بھگتی۔ مگر اب ایک مدت سے ہم نے دھوکہ سے بچنے کا گر معلوم کرلیا ہے اور ہمیں ابتدا ہی میں معلوم ہوجاتا ہے کہ کہنے والے کا مقصد کیا ہے اور وہ کن باتوں کو چھپا کر ہم سے غلط کام لینا چاہتا ہے۔ ایک بار راقم الحروف کی موجودگی میں ایک صاحب تشریف لائے اور انھوں نے مولانا کو واقعہ سنایا کہ میں فلاں مقام سے ایک بس میں سوار ہوا۔ جب وہ ایک خاص جگہ پہنچی تو کالج کے ہندو طلباء نے اس کا محاصرہ کرلیا اور مسلمان مسافروں کو اتار کر خوب پیٹا اور کسی ہندو مسافر کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ صاحب چاہتے تھے کہ مولانا اس

حادثہ کی اطلاع ضلع کلکٹر کو دے دیں اور اس سے واقعہ کی تحقیقات کا مطالبہ کریں۔ مولانا نے سنتے ہی دریافت کیا کہ جب مسلمان مسافروں کی پٹائی ہو رہی تھی تو آپ کہاں تھے؟ وہ بولے، میں بھی وہیں موجود تھا اور اپنا چشم دید واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ مولانا نے پھر پوچھا کہ آپ کو کہاں کہاں چوٹ آئی وہ بولے کہ خیریت گزری کیا اور مجھ پر کسی نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ مولانا فوراً سمجھ گئے کہ یہ معاملہ فرقہ وارانہ نہیں ہے۔ یہ رقابت اور آپس کی دشمنی کا معاملہ ہے چنانچہ آپ بار بار پوچھتے رہے کہ جب ہندو طلباء نے صرف مسلمانوں ہی کو پیٹا تو آپ بھی تو مسلمان ہیں پھر آپ کیسے بچ گئے؟ اس کے جواب میں وہ صاحب بہت گھبرائے۔ اور مولانا خاموش ہو گئے۔ لیکن تین چار روز کے بعد ایک صاحب کے ذریعہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے دو فریق میں مقدمہ بازی چل رہی تھی۔ ایک فریق نے اپنے تعلقات کی بنا پر کالج کے کچھ لڑکوں کو بتایا کہ دوسرے لوگ کچہری میں حاضر ہونے کے لئے فلاں بس سے فلاں روز چلیں گے، تم ایک خاص جگہ جمع ہو جانا اور ان لوگوں کی ذرا اچھی طرح مرمت کر دینا۔ چنانچہ طلباء نے ایسا ہی کیا لیکن مولانا کو بتایا گیا کہ یہ واقعہ فرقہ وارانہ نوعیت کا ہے۔ اس لئے آپ ضلع کلکٹر کو خبر کر دیں۔ اور ان سے تحقیقات کا مطالبہ کریں۔ لیکن جب اصل حقیقت کا پتہ چلا تو مجاہد ملت کی ذہنی رسائی کی داد دینی پڑی۔ اور خود مولانا نے فرمایا کہ یہ پہلا تجربہ نہیں۔ اس قسم کے تجربے آئے دن پیش آتے ہیں اور ہم بھی سمجھ لیتے ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

خاص طور پر ۴۷ء کے بعد سے حضرت مولانا مرحوم کی زندگی اس قدر عوامی اور مشغول ترین زندگی رہی کہ بیک وقت ملک و ملت کی بیسیوں ذمہ داریاں تنہا ان کے کاندھوں پر تھیں۔ کتنے ہی اجتماعی اور انفرادی مسائل سے ہر روز ان کو نمٹنا پڑتا تھا۔ ان کی درد مند طبیعت یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ اہم سے اہم ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ وہ کسی چھوٹے سے چھوٹے کام کو بھی بربنائے مصروفیت نظر انداز کر دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے آخری پندرہ سولہ برس انھوں نے جس تندہی اور دل سوزی کے ساتھ خدمت وعمل کی راہوں میں گزارے، انسانی کردار میں اس کی مثالیں بہت ہی کم مل سکیں گی۔

کاموں کے مسلسل ہجوم اور مشاغل کی گراں باری نے جس طرح ان کی تندرستی کو گھلایا اس کا ایک قدرتی نتیجہ یہ بھی تھا کہ زندگی کے اس حصہ میں آکر مزاج میں تیزی اور لب ولہجہ میں کچھ کرختگی پیدا ہو گئی تھی۔ بعض وقت ملنے والوں کو یہ انداز طبع کچھ اجنبی سا محسوس ہوتا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عوامی زندگی کے جھنجھٹ میں رہتے ہوئے شب و روز کے تجربوں نے مولانا مرحوم کو اس مقام تک پہنچا دیا تھا کہ رد و قدح کے بغیر وہ کسی شکایت و روایت کو قبول نہ کریں۔ مولانا مرحوم کی جرح و تشریح اکثر اصحاب معاملہ کو راست گفتاری پر مجبور کر دیا کرتی تھی۔ پھر جب معاملہ کی صحیح صورت حال ان کے علم میں آجاتی تھی تو پوری دل سوزی اور دردمندی کے ساتھ وہ صاحب معاملہ کی بھرپور مدد اور امکانی کوشش سے دریغ نہ فرماتے۔ اور جب تک اپنے مقدور بھر کوشش نہ کر لیتے چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔

اب آپ آئندہ اوراق میں حضرت مجاہد ملت نور اللہ مرقدہٗ کی کتاب زندگی ملاحظہ فرمائیے۔ جن اہل قلم اور علم دوست حضرات نے مرحوم کی زندگی کے کسی گوشہ پر قلم اٹھایا ہے اور اس کے ذریعہ معلومات کے موتی بکھیرے ہیں ان کی تابناکی مدتوں تک باقی رہے گی۔ اور پڑھنے والے ان سے برابر فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ ہم ان تمام ارباب قلم کے ممنون اور متشکر ہیں کہ انھوں نے ہمیں اپنے رشحات قلم کی اشاعت کا موقع دیا۔ اور ہم انھیں قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہو سکے۔ ہم ان کی نگارشات کے بارے میں اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

ناسپاسی اور افسوسناک فروگذاشت ہوگی اگر ہم یہاں جنرل منیجر اخبار الجمعیۃ جناب مولانا انیس الحسن صاحب بی، اے و فاضل عربی کو خلوص اور مسرت کے ساتھ خراج تحسین پیش نہ کریں۔ درحقیقت اس شاہکار کو ایڈٹ کرنے ترتیب دینے اور کتابت وطباعت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ فاضل محترم نے جس انہماک اور شب و روز کی ان تھک مساعی سے اس مجموعہ کو مرتب کیا اور اپنی نگرانی میں اول سے آخر تک جملہ مراحل طے کئے اس کے لئے ادارہ الجمعیۃ آپ کی خدمت میں ہدیہ تشکر و امتنان پیش کرتا ہے۔ اگر اس مجموعہ کی ترتیب و اشاعت میں آپ کی مخلصانہ مساعی کو دخل نہ ہوتا تو وہ اس شان کے ساتھ منظر عام پر کبھی نہ آسکتا۔ فاضل محترم کو حضرت مجاہد ملت کی بارگاہ میں خدمت اور معیت کا جو شرف حاصل رہا ہے اور سفر و حضر میں ساتھ رہنے سے جو مرتبہ اختصاص آپ کو حاصل ہے اس کا یہی تقاضہ تھا کہ یہ ہدیۂ خلوص ترتیب پاکر اور زینت طبع سے آراستہ ہو کر قارئین کرام کے ہاتھوں میں پہنچے اور مجاہد ملت کی یاد کو مدتوں تک دلوں میں تازہ رکھے اور ان کی ملی، قومی اور علمی خدمات کی یاد دلاتا رہے۔ دعا ہے کہ خالق ارض و سماوات اس مجموعہ کو بابرکت بنائے، اور اسے قبولیت عامہ کی سند بخشے! آمین۔

ایک حادثۂ فاجعہ کی

صدائے بازگشت

مجاہدِ ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کو

رہنمایانِ وطن　　اساطینِ اُمت　　اور عالم اسلام

کا

خراجِ عقیدت

عنوانِ تکمیلِ حیات

شاعرِ انقلاب علامہ انور صابری صاحب

اے ولی اللہ کے عنوانِ تکمیلِ حیات — حادثہ اس دور کا غمناک ہی تیری وفات

دین و ملت کے مجاہد، مردِ جانبازِ وطن — عشق و اخلاص و وفائے دل کی شمعِ انجمن

اے حسین احمد کے بازوئے جوانِ زندگی — تیرا مرنا درحقیقت ہے زیانِ زندگی

دیدۂ آزاد کی تنویرِ ایمانی تھا تو — سراپا اک پیکرِ ایثار و قربانی تھا تو

روحِ ایماں تھی ترے آئینۂ کردار میں — تیری جرأت کا تھا پرتو سینۂ احرار میں

نقرئی سکوں پہ تو نے قوم کو بیچا نہیں — غربت و افلاس سے باہر قدم رکھا نہیں

قرنِ اول کی ادائیں تھیں ترے انداز میں — تھا اضافہ توشۂ کونین کے اعجاز میں

جوش میں بھی ہوش کا احساس رہتا تھا تجھے — غیرتِ ناموسِ حق کا پاس رہتا تھا تجھے

عمر بھر حسنِ عمل تیرا بھلا سکتے نہیں
داغ تیری یاد کا دل سے مٹا سکتے نہیں

انور صابری

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب

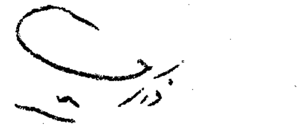
نائب صدر جمہوریۂ ہند

مولانا حفظ الرحمٰن (صاحبؒ) مرحوم کی وفات' پورے ہندوستان کے لئے ایک سخت سانحہ ہے بعض مرنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی جگہ پُر کرنا بڑا دشوار ہوتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کا شمار انھیں میں کرنا چاہیئے۔ انھوں نے اپنی مجاہدانہ زندگی کی ساری صلاحیتیں ہندوستانی قومی تعمیر کے لئے وقف کردی تھیں۔ ان کی حساس اور فرض شناس شخصیت نے مذہب و ملت کا فرق و امتیاز کبھی روا نہ رکھا۔ وہ ہر اس تحریک کے ساتھ تھے جو مظلوموں اور بیکسوں کی حمایت میں اُٹھائی گئی ہو جب کبھی اور جہاں کہیں انھیں مظلوم کی چیخ سُنائی دی تو وہ بیتاب ہوگئے' اور غم گساری کے لئے پہنچ گئے اور جو بھی بن پڑا کیا۔ کبھی حکام کو متوجہ کیا، کبھی مالی اور طبی امداد کیلئے سامان فراہم کیا اور کبھی بڑی جرأت اور بے باکی سے حق اور صداقت کو اپنے اہلِ وطن کے سامنے پیش کیا۔

مولانا مرحوم کی سیاسی زندگی ۱۹۱۹ء سے شروع ہوئی۔ انھوں نے خلافت اور سوراج کی تحریکوں میں حصہ لیا اور متحدہ قومیت اور حریت و آزادی کے پیغام کے ساتھ اپنی زندگی کو وابستہ کیا اور یہ وابستگی آخر دم تک برقرار رہی۔ ان کی زندگی صلہ و ستائش سے ہمیشہ بے نیاز رہی۔ جو کچھ کیا اسے فرض سمجھ کر کیا۔ قید و بند کے مصائب برداشت کئے تو فرض سمجھ کر۔ آزاد رہ کر جو سختیاں جھیلیں' وہ بھی فرض سمجھ کر۔ ان کی ذات ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان اتصالی کڑی کے مثل تھی۔ وہ قومی اتحاد اور یک جہتی کے زبردست علم بردار تھے۔ انھیں پورا یقین تھا کہ جب تک اہلِ ملک میں جذباتی ہم آہنگی' اور ہمدردی و موانست نہ پیدا ہو اس وقت تک آزادی کی برکتیں عام نہیں ہوسکتیں اور نہ وہ حریت و اخوت کے اصول جڑ پکڑ سکتے ہیں' جن پر ہندوستانی دستور کی شاندار عمارت تعمیر کی گئی ہے۔

افسوس' صد افسوس کہ وہ ہم سے رخصت ہوگئے۔ لیکن کیا وہ واقعی ہم میں نہیں ہیں؟

نہیں' وہ ہزاروں ساتھیوں کے سینوں میں محبت اور عقیدت کے روپ میں ہزاروں بے یاروں' بے مددگاروں، بے شمار یتیموں، بیواؤں کے دلوں میں ایک سہارے کی یاد کی شکل میں لاکھوں ہم قوموں کے ذہنوں میں خوف کے وقت جرأت' بے سرو سامانی میں ہمت اور ہر حال میں خلوص اور صداقت کے علم کی صورت میں' زندہ رہیں گے۔ ایسے لوگ مرتے نہیں۔ موت ان کے لئے حیاتِ جاوداں کا دروازہ ہوتی ہے۔ ان کی روح اپنے پیدا کرنیوالے کے حضور میں پہنچ گئی ہے۔ اس کی رحمتوں اور برکتوں کی بارش اس پر ہو۔



بجری تار سے

السیّد جمال عبد الناصر

صدر متحدہ عرب جمہوریہ

مولانا حفظ الرحمٰن جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند کی خبر وفات میں نے گہرے رنج و غم کے ساتھ سُنی۔ بلاشبہ ہم ایک جیّد عالم دین سے محروم ہوگئے۔ انھوں نے اسلام کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ خدائے پاک سے میری دعا ہے کہ انھیں اپنی رحمتوں سے نوازے، اور آپ کو جو سخت نقصان پہنچا ہے، اس کی تلافی کرے،

ڈاکٹر ریاض العطر

کلچرل اٹیچی

سفارت خانہ متحدہ عرب جمہوریہ

(اپنی اور علماء متحدہ عرب جمہوریہ کی جانب سے، ایک تحریری بیان میں)

حضرات السادة الافاضل ! انه ليعز علينا ان نجتمع اليوم لتأبين شخصيّة عَزيزة علىٰ نفوسنا بعد ان كانت الیٰ عهد قريب ملأ السمع والبصر۔ تشع بنور عرفانها وايمانها ووطنيتها على انحاء الهند خاصة والعالم الاسلامی عامة۔

كان الفقيد الكريم طوال حياته داعی سلام ومحبة وتعاون بين جميع الطوائف فی القارة الهندية فاستحق عن جدارة احترام كل من لازمهٗ او اتصل به او عمل معه۔

ولقد كان لی شرف اللقاء بالراحل الكبير فی مناسبات مختلفة فلمست منه صدق العزيمة والوفاء و الايمان بربه ووطنه۔ لم تتخل عنه هٰذه المثل مطلقًا بتغيير الظروف والاحوال بل ظل عاملا لارساء قواعد هذه المثل ونشر رسالتها بكل ما وسعهٗ الجهد حتیٰ آخر لحظة فی حياته۔

كان مولانا حفظ الرحمٰن عليه رحمة الله عالما دينيا واسع الافق عمل لدينه بقدر ما عمل لدنياه وخلف وراءهٗ سجلا حافلا بالصفحات البيضاء فی الجهاد والقيم الاخلاقية جديرة بان يحتذى بها وان يعمل لها زملاءهٗ ومحبوه واتباعه و عارفوا فضله حتى يحافظوا على غرسه وتراثه الذی تركه من بعده۔ ومع شعورنا بالالم لهول الفاجعة التی اصابت الشعب الهندی الصديق وجمعية علماء الهند بفقد هٰذه الشخصية الفذة العاملة فی ميدان المحبة والسلام والجهاد الوطنی فانه لا يسعنی الا ان اعرب بالنيابة عن علماء الجمهورية العربية المتحدة خاصة واخوانكم هناك عامة عن عظيم الاسف والالم لهذا الخسارة الفادحة۔ والله نسأل ان يسكن الفقيد الجليل واسع جناته وان يسبغ عليه رحمته وان يعوضنا فی فقده عوضا لصابرين وان ينزله منزلة الصديقين والشهداء والابرار كما اتوجه الی اسرة الفقيد الكريم بالعزاء وان يلهمهم الله الصبر والسلوان وسلام على الفقيد يوم لقی ربه ويوم ان يلتقی معه فی جنة الخلد۔ والسلام عليكم و رحمة الله وبركاته۔

Riyaz

ڈاکٹر راجندر پرشاد

سابق صدر جمہوریۂ ہند

کیمپ حیدر آباد۔
مورخہ ۳۱ راگست ۶۲ء

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم جمعیۃ علماء ہند کے ایک بلند پایہ رُکن تھے۔ ہماری قومیت کی ایک جیتی جاگتی مثال تھے اور میرے اُن عزیز دوستوں میں تھے جن کے ساتھ بارہا کام کرنے کا مجھے اتفاق ہوا تھا۔ مثل ہے کہ عوام کی یادداشت بہت کمزور ہوتی ہے اور اسے اپنے سچے خادموں کو بھی بھولتے دیر نہیں لگتی۔

الجمعیۃ کا خاص نمبر مولانا مرحوم کی یاد کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو، یہی میری تمنا ہے۔ فقط

راجندر پرساد

مسز ارونا آصف علی (ترجمہ انگریزی سے)

مجھے ۱۹۳۰ء سے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے واقفیت اور ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے کیونکہ جب آصف علی صاحب مرحوم اور مولانا آزادؔ یہاں پر جمع ہوا کرتے تھے، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔

ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر کے لئے جس میں جمہوری اور غیر مذہبی دستوری کے ساتھ ہر فرقہ اور ہر فرد ملت کو مساوی حقوق اور مواقع حاصل ہوں۔ مولانا نے جس طرح اپنی زندگی وقف کی، وہ ایک روشن حقیقت ہے۔

میں تو یہ دعا ہی کر سکتی ہوں کہ خدا کرے ان کی مثالی زندگی نئی نسلوں میں بھی ایسا ہی عزم اور حوصلہ پیدا کر سکے، اور ان کے لئے مشعلِ راہ ہو۔

"ارونا آصف علی"

مسز اندرا گاندھی (خاص مکتوب کے ذریعہ)

مولانا کی وفات سے ہم سب کو دلی صدمہ پہنچا۔ مولانا صاحب کی بیماری کا مجھے علم تو تھا، لیکن یہ گمان نہ تھا کہ اُن کا وقت اتنا قریب آگیا ہے۔ علاج کرانے کے بعد انھوں نے میرے والد (پنڈت جواہر لال نہرو) سے کہا تھا کہ اب میں اچھا ہوں۔

مولانا صاحب نے اپنی تمام زندگی ملک اور قوم کی خدمت میں گزاری۔ وہ بڑے حوصلے والے، روشن خیال اور بلند اخلاق انسان تھے۔ ان کی وفات سے ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔

شریکِ غم
اندرا گاندھی

شری جواہر لال نہرو وزیر اعظم ھند

مولانا کے انتقال سے مجھے بڑا دُکھ ہوا ہے۔ مولانا کو میں کب سے جانتا ہوں، کچھ کہہ نہیں سکتا تیس برس سے زیادہ سے جانتا ہوں، یا شاید پینتیس چالیس برس سے جانتا ہوں، بالکل یاد نہیں۔ ہم لوگ شروع میں دونوں یوپی کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ اکثر ملا کرتے تھے، چھوٹی کونسل کے ممبر بھی رہے، وہاں اُن سے ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ سب مسئلوں پر بات چیت ہوا کرتی تھی، جب انگریزی حکومت سے مقابلے ہوتے تھے تو ہمارا معمولی کام رُک جاتا تھا، صرف مقابلہ ہوتا رہتا تھا، جیل جانے اور آنے کا کام رہتا تھا، ہم پھر آکر ملتے تھے تو اس سلسلے کو شروع کر دیتے تھے۔ میں ان سے بہت ملتا تھا۔ اہم مواقع پر ملنے جلنے اور بات کرنے سے ایک دوسرے کو خوب سمجھنے لگے تھے۔ میرے دل میں ان کی بہت قدر تھی، بہت محبت تھی، وہ بہادر سپاہی تھے، بہادر نیتا تھے، جو کہتے تھے اس میں وزن ہوتا تھا، ان کی بات غور طلب ہوتی تھی، ایسے آدمی کا گزر جانا سخت رنج و غم کی بات ہے۔ ایک تو یہی کہ ایک دوست اور ساتھی گزر گیا۔ وہ ایسے آدمی تھے کہ پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں مدد کرتے تھے۔ ان کی وفات سے مجھے کافی دھکا لگا ہے۔ ہلکے ہلکے سارے بزرگ گزرتے جا رہے ہیں ان کے کاموں کا بوجھ نوجوانوں کے کندھوں پہ آپڑا ہے۔ دنیا کا اس طرح ہی دستور ہے۔ دستور کیسا بھی ہو، رنج تو ہوتا ہی ہے اور رنج ہونا بھی چاہیئے۔

ابھی وہ امریکہ سے واپس آئے تھے، تب میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے ملا تھا، مجھ سے بڑے اطمینان سے انھوں نے کہا تھا کہ ڈاکٹروں نے ان کو اچھا کر کے بھیجا ہے، ہاں کافی کمزور تھے۔ میں نے انھیں مبارکباد دی۔ شکر ہے کہ اچھے ہو گئے، سوچتا تھا کہ ہلکے ہلکے طاقت آجائیگی۔ ابھی کمزور ہیں۔ ایک روز میں نے سُنا کہ وہ گزر گئے۔ بڑا افسوس ہوا، اس بات کو برداشت کرنا ہی ہوتا ہے۔ مناسب ہے کہ جمع ہوں۔ رنج و غم کا اظہار کریں۔ لیکن کچھ غور کریں کہ کیسا آدمی تھا، اس کا کیا طریقہ تھا کیا کر گیا۔ **ہمیں چاہیئے کہ اس سے کچھ سیکھیں اسکے راستہ پر چلیں**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آہ مولانا حفظ الرحمٰن

از ڈاکٹر سید محمود صاحب، ایم، پی

مولانا حفظ الرحمٰن کے متعلق کچھ بھی لکھنے کے لئے میرا قلم نہیں چلتا۔ وہ رُکتا ہے۔ میرا دل قابو میں نہیں آتا، اور نہ دماغ میں سکون پیدا ہوتا ہے کہ میں مولانا حفظ الرحمٰن کے متعلق چند سطریں لکھ سکوں۔ آں محترم کے کئی تقاضوں سے مجبور ہو کر کئی بار کچھ لکھنے کے لئے بیٹھا، مگر قلم نہ چلا اور کچھ نہ لکھ سکا۔ ممکن ہے آنجناب نے نوٹس لیا ہو کہ میں نے نہ تو کوئی تعزیت نامہ بھیجا نہ اخباروں میں کوئی بیان شائع کرایا۔ البتہ جمعیۃ کے دفتر میں جو مرحوم کے ایثار و قربانیوں کا جولانگاہ تھا آنا چاہتا تھا۔ مگر میرے محترم محمد میاں صاحب اور حضرت مفتی صاحب نے اس کا بھی موقع نہ دیا جب ان کو معلوم ہوا کہ میں آنا چاہتا ہوں، وہ بزرگان خود ہی تشریف لائے۔ میں کیوں آنا چاہتا تھا تاکہ اس جگہ کو پھر دیکھوں جہاں حضرت مفتی کفایت اللہ۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی۔ حضرت مولانا احمد سعید کیسے کیسے کارنمایاں کر چکے تھے۔ اور اب اُس گروہ کا آخری شخص (عمر کے لحاظ سے نہیں، بلکہ کام کے لحاظ سے) کیا کچھ نہ کر کے مسلمان قوم کو بے یار و مددگار چھوڑ کر دنیا سے چل بسا اُس جگہ کو دیکھ کر مسلمانوں کی بےکسی و بےبسی پر چند قطرات آنسو کے بہاؤں، اور دریافت کروں کہ اے دفتر جمعیۃ تیرے سب کارکن یکے بعد دیگرے چل بسے، اَب تو بتلا حفظ الرحمٰن جیسا انہتک کام کرنے والا۔ ایسا بے لوث۔ ایسا مخلص۔ ایسا سچا۔ ایسا بے دھڑک کارکن۔ ایسا نڈر انسان جو اپنا دِل خدمتِ خلق و خدمتِ اسلام کے جوش میں نوکِ سناں پر رکھ دیتا تھا، تو اب کہاں سے لائے گا۔

حفظ الرحمٰن کو مجاہدِ ملت کا خطاب قوم نے عطا کیا تھا لیکن یہ بات لوگوں کو نہیں معلوم کہ اس خاندان میں کتنے ہی مجاہد تھے۔ انکے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری پیدائشی مجاہد تھے۔ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور اوائل میں ولایت سے واپسی کے چند برس بعد بھوپال میں قضا کر گئے۔ علی گڈھ میں طالب العلمی کے زمانہ میں انھوں نے اور ان کے دوست و ساتھی تصدق احمد خاں شیروانی نے بڑے بڑے کارنمایاں انجام دیئے۔

مولانا کے دو بڑے بھائی بھی اُس زمانہ میں علیگڈھ میں پڑھتے تھے۔ فخرالدین اور بدرالدین بدرالدین بھی عبدالرحمٰن اور تصدق احمد خاں شیروانی کے گروہ میں شامل تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن اُس وقت بہت کم سن رہے ہوں گے لیکن میں اُن کے نام سے اُسی وقت سے واقف تھا۔ اور اُن کے تیزی و ذہانت کے قصے بدرالدین سے سُنے تھے۔ طلباء کے اس چھوٹے سے گروہ نے عبدالرحمٰن کی سرکردگی میں سیاسی حیثیت سے علی گڈھ کالج میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ ایک خفیہ سوسائٹی بنائی تھی اور انگریزوں کو ہندوستان سے کیونکر نکالا جائے۔ اس پر ہفتہ وار بحث ہوا کرتی تھی ۱۹۰۷ء کی مشہور اسٹرائک کا سرکردہ یہی گروہ تھا۔ عبدالرحمٰن بہت اچھے مقرر تھے۔ اس اسٹرائک نے جو پانچ ماہ تک قائم رہی مسلمانوں کو سیاست کی طرف متوجہ کیا۔ تمام طلبا نے یونین کلب کی ایک ڈبیٹ میں ہندوستان کے تقریباً جملہ مسلمان لیڈران کی موجودگی میں اعلان کیا کہ اب ہم نوجوان اپنے لیڈروں کی انگریز نواز پالیسی سے بغاوت کرتے ہیں۔ اب ہم انگریزوں کی غلامی برداشت نہیں کر سکتے۔ اس ڈبیٹ میں ڈاکٹر سید حسین (مشہور مقرر و صحافی) جو اس وقت علیگڈھ کے طالب العلم تھے، کی تقریر معرکۃ الآرا تھی۔ ایک بار ہم لوگوں نے عبدالرحمٰن کی سرکردگی میں سر سید کی قبر پر جا کر حلف اُٹھایا تھا اور قسم کھائی تھی کہ ہم انگریزوں کو ملک سے نکالے بغیر چین نہ لیں گے۔ آپ نے دیکھا کہ حفظ الرحمٰن کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جس کا ہر فرد طالب العلمی ہی سے زیادہ مجاہد تھا۔ اور اس خاندان کے ایک فرد عبدالرحمٰن نے ہندوستان کے لئے اپنے زمانہ طالب العلمی میں کیا کیا کارنمایاں کئے تھے۔

جس خاندان کی یہ زریں *Tradition* رہی ہو مولانا حفظ الرحمٰن کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔ مجھے اُن کے طالب العلمی کے حالات معلوم نہیں ہیں لیکن اپنے زمانۂ طالب العلمی میں بھی انھوں نے کارنمایاں ضرور کئے ہوں گے۔

یہ لکھنے سے میرا یہی مطلب تھا کہ مولانا حفظ الرحمٰن سے میرا گہرا اور ذاتی تعلق تھا۔ وہ ایک بڑی سوجھ بوجھ کے انسان تھے۔ بلکہ اُن کو سیاسی زبان میں ایک مدبر کہا جا سکتا ہے۔ وہ بہت ذہین و طبّاع تھے اور بات کی تہ کو جلد اور آسانی سے پہنچ جاتے تھے۔

مسلم کنونشن کے وقت مجھے ان کو بہت نزدیک سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جس دانشمندی اور ہوشیاری سے انھوں نے اس کی کارروائی کو چلایا اور کامیاب بنایا وہ ان کی مدبرانہ تدبیروں کی دلیل ہے۔ کنونشن سے ملک کو بڑے بڑے فوائد پہونچ سکتے تھے اور پہونچے، لیکن افسوس ہے کہ ہمارے پریس نے اتنا غیر معمولی شور مچایا کہ مسلمانوں نے اپنا دردِ دل سُنا کر وہ سب کچھ مان لیا تھا جو ۱۹۳۷ء سے انھوں نے اس وقت تک تسلیم نہیں کیا تھا۔

(۱) سکولرزم کو مسلمانوں نے کبھی مانا ہی نہ تھا۔ مسلم کنونشن میں انھوں نے نہ صرف اسے تسلیم کیا بلکہ کام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

(۲) دو نیشن تھیوری مسٹر جناح نے ان کے دلوں میں راسخ کر دی تھی لیکن کنونشن میں انھوں نے اکثریت سے مل کر کام کرنا ضروری بتلایا اور اس نظریہ سے ۳۷ء کے بعد مسلمانوں کے ایک بڑے اجتماع نے انکار کیا۔

(۳) مسٹر جناح یہاں سے یہ فرما کر تشریف لے گئے تھے کہ یہاں کے مسلمانوں کو وہ Write off کر کے جاتے ہیں۔

اس کے مطلب یہ ہوئے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندو زندہ رہنے نہیں دیں گے اور ہم ان کو گویا دریا برد کر کے یا سمجھ کے جاتے ہیں۔ دس برس بعد جب مسلمان پہلی بار جماعتی حیثیت سے مل کر بیٹھے اور تقریریں اور اپنے مسائل پر غور و خوض کیا تو معلوم ہوا کہ بجائے دریا برد ہونے کے ان کی آوازوں میں قوت ہے۔ ان کے دماغ صحیح طور پر سمجھنے اور کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کیا دنیا پر اس سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ ہندوؤں پر مسٹر جناح نے غلط الزام لگایا تھا اور ہندوؤں نے مسلمانوں کو بجائے دریا برد کرنے کے ان کو کافی طور پر طاقت ور رہنے دیا۔ کاش ہمارا ملکی پریس اس نکتہ کو سمجھنا کہ اکثریت کو اس کنونشن نے کتنا فائدہ پہونچایا۔ لیکن فرقہ پرستی نے اس ملک سے اس کی مدبرانہ عقل و فلسفہ و منطق کا ورثہ کم از کم عارضی طور پر تو ضرور ختم کر دیا ہے۔

(۴) اگر کنونشن میں کچھ گرم تقریریں ہوئیں وہ تو ایک برادرانہ شکایات تھیں۔ لیکن اس سے بھی ملک کو باہر کے ملکوں میں بڑا فائدہ پہونچا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ گرم تقریریں نہ پاکستان، نہ مصر اور نہ کوئی دوسرا ملک برداشت کر سکتا تھا۔ وزیر اعظم نہرو نے اس کو برداشت کر کے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستان واقعتاً ایک سکولر ملک ہے، اور صحیح معنوں میں ڈیموکریٹک ملک ہے۔

اور بہت سے فوائد ملک کو حاصل ہوئے لیکن سب کو گنانا طویل ہوگا۔ کیا یہ فوائد جو ملک کو حاصل ہوئے وہ کم ہیں؟ پریس کی غیر معمولی شورش کا نقصان یہ ہوا کہ مسلمان جو آگے کاموں کے لئے بالکل مستعد و تیار ہو گئے تھے اور کنونشن میں ولولوں کے ساتھ کام کرنے کے ریزولیوشن پاس کئے تھے، مایوس ہو کر اور مشتبہ ہو کر پھر بیٹھ رہے۔ اگر یہی منشا تھا کہ وہ ملک کا کام نہ کرنے پائیں تو اس میں ضرور کامیابی ہوئی۔ اس سلسلہ میں جو باتیں وزیر اعظم سے منسوب کی گئیں انھوں نے ہرگز وہ باتیں نہیں کہیں۔ اُن کے بعض جوابات کو چھوڑ دیا گیا، اور بعض کو بالکل مسخ کر کے چھاپا گیا۔

مولانا حفظ الرحمن کی بڑی خواہش تھی کہ ایک انگریزی اخبار ۲۵ لاکھ کے سرمایہ سے نکالا جائے۔ افسوس کہ یہ ضروری کام رہ گیا اور ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کو ان کی موت کا بڑا قلق و صدمہ ہے اور ہونا چاہیے کیا میں اُن کا ایک شریک کار ہونے کی حیثیت سے یہ تجویز پیش کر سکتا ہوں کہ مرحوم کی یادگار میں مسلمان انگریزی کا ایک روزنامہ اخبار ۲۵ لاکھ کے سرمائے سے نکالنے کی سعی کریں۔ اگر اس کی خاطر خواہ تائید ہوئی اور تمام اخباروں نے اس میں دل کھول کر حصہ لیا تو میں ملک کے سربرآوردہ مسلمانوں سے مشورہ کر کے سب کی طرف سے ایک اپیل شائع کرنے کی کوشش کروں۔

تاریخ وفات حسرت آیات

علامۂ دوراں مولانا حفظ الرحمن

طاب ثراہ

چلے دنیا سے حضرت حفظِ رحماں
خدا کی رحمتیں ہوں اُن پہ نازاں
مثیل اُن کا کہاں عالم میں دیکھا!
تھے فخرِ جملہ اقران و اماثل
خطابت کا دیا وہ زور حق نے
کہ تھے ہمپایۂ سحبان وائل
اعزّا و احبّا اس الم سے
تپاں ہیں خاک پر جوں مرغ بسمل
ظفر کو سالِ رحلت کی ہوئی فکر
ندا آئی خطیب خلدِ منزل
۱۳ ھ ۸۲

(از ظفر الاسلام ابن مولانا ارشق شیرکوٹی)

هزایکسلنسی الشیخ یوسف الفوزان سفیر سعودی عرب

وزارة الخارجية
السفارة العربية السعودية
بالهند

حضرت الاخ الكريم الاستاذ انيس الحسن المحترم
السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

وبعد فقد تلقيت خطابكم المورخ ۲۲/۸/ ۱۹۶۲ء فيما يتعلق بوفاة الطيب الذكر المرحوم مولانا حفظ الرحمن، وعزم جريدتكم (الجمعية) على اصدار عدد ممتاز للافاضة في حياة المرحوم، باعماله ونشاطه الذى قام به في شتى الميادين، ومما لا يرتاب فيه ان حياة المرحوم متسعة في شتى المجالات الدينية منها والسياسية والخلقية، تتطلب درسا وتعمقا وتمحيصا كل شعبة منها مادة قائمة بذاتها، اذ بها عبر لمن يعتبر- هذا وليس في ارفاق الكلمة المطلوبة في الموضوع - وختاما تقبلوا تحياتي وتمنياتي ودمتم-

المخلص
(دستخط) يوسف الفوزان

حزن

(انه اسى وحزن على وفاة المرحوم مولانا حفظ الرحمن)

لا ريب بان وفاة المرحوم مولانا حفظ الرحمن كانت فادحة كبرى بالنسبة للهند عامة، ولمسلمى الهند بصورة خاصة-

اذ فقده مسلمو الهند وهم اشد ما يكونون حاجة لقيادة حكيمة ذات رزانة ومرونة يتصف صاحبها بالجرأة والثبات على المبدء-

فلقد عرف الفقيد رحمه الله بحماسته الوطنية وغيرته الدينية واتساع افق تفكيره ونضوج آرائه ولقد اتسم بالنزاهة والتجرد من الاطماع والاغراض والمآرب الذاتية- كما ان صلابته وصراحته كانت مثالاً من امثلة الرجولة الحقة - وبوفاته طويت صفحة بيضاء ناصعة في الجهاد الوطني والديني- كان رحمه الله وغفرله أثناء مرضه مثال المؤمن الصابر المحتسب- اذ ابدا جلدا وصبرا ينم عن عميق ايمانه، بالرغم مما عاناه من الاوجاع المبرحة وآلام الداء العضال الذى ادّى اخيرا بحياته-

اكرم الله مثواه وتغمده برحمته (وانا لله وانا اليه راجعون)

"يوسف الفوزان"

پروفیسر ہمایوں کبیر منسٹر گورنمنٹ آف انڈیا (ترجمہ از انگریزی)

مولانا حفظ الرحمٰن!

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات نے ہندوستان کو جنگ آزادی کے ایک جانباز مجاہد سے محروم کر دیا ہے۔ مولانا مرحوم نے نوعمری ہی سے خود کو آزادئ وطن کے عظیم مقصد کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اُن کی پرورش قدیم روایات اور ماحول میں ہوئی اور ضمیر کی آزادی۔ بنی نوع انسان سے ہمدردی اور مخالفین کے ساتھ تحمل و برداشت کا سلوک جو اسلامی تعلیمات کا جوہر پاکیزہ ہے اوّل دن ہی سے اُن کے قلب و نظر میں سما گیا تھا۔ اور دن بدن اُس کا رسوخ بڑھتا ہی گیا یہاں تک کہ اس جوہر مصفّی نے مولانا کو ایک بے مثل و ممتاز انسان بنا دیا۔

وطن دوستی کا جذبہ مولانا مرحوم کو براہِ راست مقدس مذہبی تعلیمات سے ملا تھا۔ اسلام واضح الفاظ میں ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسانیت کے رشتہ میں انسان برابر ہیں اور بندگی صرف خدا واحد ہی کے لئے ہے۔ بے شک حکومت اور ریاست کے ساتھ وفاداری کا بھی ایک مقام ہے۔ لیکن صرف اس حد تک کہ ریاست یا حکومت زندگی کی بنیادی قدروں کو سنبھالے رکھنے کا ایک وسیلہ ہے۔ اس ذہنی اور مذہبی پس منظر کے ساتھ یا اگر یہ تھا کہ مولانا مرحوم ایک بیرونی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے۔ وطن کی محبت اُن کے لئے ایک مذہبی عقیدہ بھی اس پر مزید حریت پسندی کا ولولہ —— ذہن و جذبات کی اس یگانگت نے انہیں غلامی اور مظلومیت کا ناقابل تسخیر مخالف بنا دیا

اپنی سیاسی زندگی میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ مولانا آزادؒ سے بہت متاثر ہوئے تھے اور مولانا آزادؒ کا قطعی خیال یہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی ملک کے تمام فرقوں کی متحدہ جد و جہد ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ مولانا آزادؒ سے پہلے بعض مسلم زعماء کا رجحان یہ تھا کہ مسلمانوں کا مفاد حکمراں طاقت سے مل کر چلنے اور اس کی دوستی ہی میں ہے۔ مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے اس خیال کی برملا تردید کی اور یہی تلقین کی کہ مُلک کی ملی جلی زندگی میں مسلمان اپنا صحیح موقف جب ہی حاصل کر سکیں گے کہ وہ بھی دوسروں کے ساتھ ساتھ اخلاص وطن کی تحریک میں حصّہ لیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے بھی اسی رائے کو اپنایا۔ دوسروں کو بھی یہی مشورہ دیا اور خود بھی برادران وطن کے دوش بدوش تحریک آزادی میں شریک رہے۔

مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی طرح مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ بھی ہندوستان کی آزادی کو نہ صرف مسلمانِ ہند کے لئے بلکہ پورے عالم اسلام کی آزادی اور خوشحالی کے لئے ضروری جانتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنی تقریروں بیانوں میں بار بار اس خیال کو دُہرایا کہ مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں بھی مسلمانوں کی پریشانی کا ایک بڑا سبب ہندوستان پر برطانوی اقتدار و حکمرانی ہے۔ ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد مغربی ایشیا کو بھی برطانیہ اپنے پنجۂ اقتدار میں نہ رکھ سکے گا، اور مغربی ایشیا کے ممالک اپنے استقلال اور آزادی سے ہمکنار ہو سکیں گے۔

اسی پیش بینی اور یقین کے ساتھ انہوں نے ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کو پورے عالم اسلام کی آزادی اور خوشحالی کا مطالبہ قرار دیا۔ اور اسی نظر سے دیکھا

کچھ لوگوں کا آج بھی یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کا قدیم تعلیمی سسٹم اُن کے اندر رجعت پسندی اور محدود دائرہ فکر و نظر پیدا کرتا ہے۔ لیکن مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی زندگی اس خیال کی ایک مستقل تردید تھی۔ اُن کی تمام تر تعلیم و تربیت اُن ہی پرانے مدرسوں میں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے وسعت قلبی اور صحتمند جدید افکار و نظریات کو اپنانے کی وہ لچک دکھلائی جو اپنی مثال آپ ہے۔

وہ آج کے مغربی افکار و رجحانات کو سمجھنے اور قبول کرنے میں جس حوصلہ مندی اور فراخدلی کا مظاہرہ کرتے تھے، مجھے خود اُن کی اس حیرت انگیز صلاحیت کا بارہا تجربہ ہوا۔ وہ اسلام کی بنیادی قدروں کو موجودہ فلسفہ اور سائنس کے مشاہدات کا ہم آہنگ دیکھنے کی جستجو میں رہتے تھے۔ اور ان دونوں میں رشتۂ اشتراک و امتزاج ڈھونڈ نکالنے کا ملکہ مولانا کو اپنے بہت سے معاصرین سے کہیں زیادہ حاصل تھا۔

ان تمام امتیازی اوصاف و کمالات کے ساتھ مولانا مرحوم کی جدائی ملت مسلمہ کے لئے ایک بہت ہی حسرتناک محرومی ہے جس نے اُن کے رفقا کا اور ساتھیوں پر ایک عظیم الشان مقصد کی تکمیل کا بڑا بوجھ ڈال دیا ہے۔ مولانا مرحوم کی شخصیت کا ایک بہت ہی قوی اور نمایاں عنصر اُن کی بے باک حق پرستی اور دلیری بھی تھی۔ زیر دستوں کی مدد کے لئے جب وہ کمربستہ ہوتے تو پھر اقتدار کے ساتھ تصادم ہی کیوں نہ ہو، وہ کسی شکوہ اور افسوس کے بغیر، بے محابا نتائج و عواقب کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی متحمل مزاج بھی اس درجہ کے تھے کہ اپنے مخالف نقطۂ نظر کو اگر وہ معقول ہو قبول کرتے انہیں دیر نہیں لگتی تھی۔ اُن کا بنیادی یقین یہ تھا کہ انسان کے کردار و عمل کی قیادت ہمیشہ فہم و بصیرت کے ہاتھوں میں رہنی چاہیئے نہ کہ جوش و جذبات کے ہاتھوں میں کسی فرد یا قوم کی بڑائی، حق پرستی۔ بے باکی اور تحمل ہی میں مضمر ہوتی ہے اور اس لحاظ سے مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی وفات نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ تمام ہی باشندگان وطن کے لئے نقصان عظیم ہے۔

شری لال بہادر شاستری (ہوم منسٹر)

(ٹاؤن دہلی کے تعزیتی جلسے میں تقریر)

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا کل انتقال ہو گیا۔ میرا اُن کا ۳۰، ۳۲ سال کا ساتھ تھا۔ یوپی میں میرا اُن کا ساتھ رہا، پھر دلی آنے کے بعد میرا ان کا ساتھ رہا، ہمارے ساتھی ایک ایک کر کے اُٹھتے جاتے ہیں۔ ابھی ٹنڈن جی اور مسٹر بی سی رائے کا انتقال ہوا تھا اب مولانا بھی چل دیئے۔ اسی طرح ہم بھی ایک دن چلے جائیں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ جو چلا جاتا ہے اُس کی جگہ لینے کے لئے کوئی دوسرا سامنے نہیں آتا۔

ابھی ابھی کچھ لوگوں نے کہا کہ مولانا گاندھی جی کے اصولوں پر چلتے تھے۔ گاندھی جی اس ملک میں آئے انھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی، ان کے ساتھ مل کر، ان کے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنا کر، ان پر چل کر بہت سے لوگ لیڈر بن گئے۔ چھوٹے چھوٹے آدمی لیڈر بن گئے۔ ان کا ڈھنگ اُن کا طریقہ ایسا ہی تھا۔

لیکن میں آپ سے ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ لیڈر دولت سے نہیں بنتا۔ بہت سا پڑھ لکھ جانے سے نہیں بنتا، حکومت کا وزیر بن جانے سے نہیں بنتا، لیڈر تو پیدا ہوتا ہے اور مولانا ایسے ہی لیڈر تھے۔ ابھی آپ نے سُنا کہ مولانا شروع ہی سے لوگوں کی خدمت کے کاموں میں حصّہ لیتے تھے تو ان میں وہ بات شروع ہی سے تھی جو ایک پیدائشی لیڈر میں ہوتی ہے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس ۳۲، ۳۳ سال کی مدت میں کبھی ایسا ہوا ہو کہ کوئی جلسہ ہو کوئی موقع ہو اور مولانا اس میں شامل ہوں، اور انھوں نے سب کی توجہ اپنی طرف نہ کھینچ لی ہو۔ ان کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی، جہاں وہ بیٹھے ہوں، تھوڑی ہی دیر میں وہ سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ میں نے ان کو کانگریس کے جلسوں میں دیکھا، یوپی اسمبلی میں دیکھا، پھر یہاں پارلیمنٹ میں اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے دیکھا، وہ اپنی بات سے اپنی سچّائی اور بردباری سے لوگوں کو متاثر کرتے تھے۔

مولانا ہمارے لئے بڑا سہارا تھے، ملک کے لئے مشکل مشکل مسئلوں میں ان کی رائے کا ایک وزن تھا، اس لئے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے تک تو ان کے سامنے ایک ہی سوال تھا۔ ملک کو آزاد کرانے کا، لیکن اس کے بعد سے ان کے سامنے ملک کی ترقی اور ملک کے اتحاد کا سوال سب سے زیادہ رہتا تھا۔

اس ملک میں کبھی کبھی ایسی باتیں ہو جاتی تھیں جن سے مولانا کو بہت دُکھ پہنچتا تھا۔ میں آپ کو بتاؤں وہ کیا باتیں تھیں جن سے مولانا بہت دکھی ہوتے تھے۔ یہی باتیں کہ کبھی ہم یہاں لڑ بیٹھے، کبھی وہاں دنگا فساد کر دیا۔ جب لاٹھی اور خنجر کا استعمال ہوتا ہے تو کون ہندوستانی ہے جس کے دل پر چوٹ نہ لگتی ہو۔

مولانا کو ایسی باتوں سے بہت دُکھ ہوتا تھا، وہ ناراض ہوتے تھے، غصّہ بھی ہوتے تھے مگر سنجیدگی اور بردباری کے ساتھ ان باتوں کو سوچتے تھے، ان کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے اندر ایسے واقعات سے کوئی تلخی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ وہ بے چین ہوتے تھے اور غلط باتوں کے خلاف پوری قوت سے آواز اُٹھاتے تھے مگر بردباری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

جبلپور میں ایسا ہی دنگا فساد ہوا، مولانا وہاں گئے۔ اپنی آنکھوں سے وہاں کی باتیں دیکھ کر آئے، وہ بہت دکھی تھے، انھوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے ملک کے لیڈروں کے سامنے، وہ باتیں بڑے دکھ کے ساتھ بیان کیں جو وہ دیکھ آئے تھے میں آپ کو بتاؤں کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اس جلسہ میں اُس صوبے کے چیف منسٹر صاحب بھی موجود تھے، لیکن مولانا نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا جو غصہ لئے ہوئے نفرت لئے ہوئے یا سخت ہو، ان میں یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ بڑی سے بڑی تکلیف میں بھی اپنی زبان سے سخت لفظ نہ نکالتے تھے۔

بہت سی باتیں جو انھوں نے بیان کیں، اُن کے بارے میں جب ان کو ایسی باتیں بتائی گئیں جو ان کے علم میں نہیں تھیں تو انھوں

نے اپنی بات پر اصرار نہیں کیا۔ اُنھوں نے فوراً کہا "یہ باتیں میں نوٹ کئے لیتا ہوں میں اُن کی تحقیق کروں گا، اور آپ کو بتاؤں گا کہ اصل بات کیا ہے، لیکن یہ جو میں اپنی آنکھ سے دیکھ کر آیا ہوں اس کے بارے میں میں نہیں مان سکتا" یہ ان کی سچائی کی بات تھی۔ اسی طرح وہ ہر معاملہ میں ہماری مدد کیا کرتے تھے وہ ہمارے لئے ایک بڑا سہارا تھے۔

باتیں تو بہت سی ہیں۔ لیکن وقت نہیں ہے۔ اگر کبھی وقت ملا تو میں تفصیل سے آپ کو بتاؤں گا کہ مولانا میں کیا خوبیاں تھیں ان کی باتیں کیسی ہوتی تھیں۔ یہاں میں ایک بات کا ذکر کرتا چلوں۔

انھوں نے دہلی میں انڈین مسلم کنونشن بلایا، میرا خیال یہ تھا کہ ابھی حالات ایسے نہیں ہیں کہ وہ اس طرح کا ایک کنونشن بلائیں۔ چنانچہ میری رائے ان کی رائے سے الگ تھی۔ اور اکثر ایسا ہوتا کہ ہماری رائے ان کی رائے کے مطابق نہ ہوتی لیکن مولانا کی رائے میں ایک وزن ہوتا تھا ہمیں ان کی رائے ماننی پڑتی تھی، وہ اپنی بات کو بہت صفائی سے جرأت سے، اور دلیلوں کے ساتھ پیش کرنے کے عادی تھے۔ چنانچہ ایک دن رات کو ۱۱ بجے وہ مجھ سے ملنے آئے۔ ایک گھنٹہ تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے اور انھوں نے اپنے دلائل سے مجھے رائے بدلنے پر مجبور کر دیا میں ان کی بات سے متفق ہو گیا چنانچہ میں صبح سویرے ہی اُٹھ کر سب سے پہلے آپ کے ملک کے وزیر اعظم صاحب کے پاس گیا، اور میں نے ان کو بتایا کہ رات ایک گھنٹہ تک مولانا سے میری بات چیت ہوئی ہے۔ میں نے پنڈت جی کو وہ باتیں سنائیں اور میں نے کہا کہ اب میں اس حق میں ہوں کہ مسلم کنونشن ہونی چاہیئے۔ چنانچہ پنڈت جی نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا اور وہ کنونشن ہوا۔

مولانا ایک زبردست مقرر تھے۔ میں یہاں کسی کی شان میں گستاخی کرنا نہیں چاہتا اور میری رائے اگر غلط ہے تو میں معافی چاہتا ہوں لیکن میں کہوں گا کہ اس ملک میں ایک تو مولانا ابوالکلام آزاد تھے جو بہت اچھی تقریر کرتے تھے ان کا نام ہی ابوالکلام تھا، لیکن ان کے بعد میں نے گزشتہ ۳۰۔ ۴۰ برس میں مولانا حفظ الرحمٰن سے زیادہ اچھی اور سُلجھی ہوئی تقریر کرنے والا نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ مجھے ان کے ساتھ فرخ آباد کے ایک جلسہ میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ کوئی ۲½، ۳ لاکھ انسانوں کا مجمع تھا۔ مولانا تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ ان کی آواز کے اُوپر اُٹھنے کے ساتھ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سارا مجمع اُوپر اُٹھ رہا ہے، ان کی آواز کے اُتار کے ساتھ یوں لگتا تھا جیسے سارا مجمع نیچے گر رہا ہے مجھے تھوڑی دیر بعد یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ شخص اس ۳ لاکھ کے مجمع سے جو چاہے کرا سکتا ہے۔ اسی طرح جب وہ پارلیمنٹ میں بولتے تھے تو پورے ہاؤس میں سکون اور خاموشی سے ان کی تقریر سُنی جاتی تھی۔ اس کا خاص اثر ہوتا تھا۔ جنوبی ہند کے ممبران بھی جو ان کی زبان نہ سمجھ سکتے تھے۔ سکون اور خاموشی سے ان کی تقریر سنتے تھے اور اُن کے لب و لہجہ اور آواز کے اُتار چڑھاؤ سے ہی متاثر ہوتے تھے۔

اس ملک میں بڑے بڑے لیڈر آج بھی موجود ہیں، لیکن بات جو مولانا میں تھی وہ میں کسی میں نہیں پاتا، ایک طرف تو مولانا ملک کے بڑے بڑے مسائل میں اپنی رائے دیتے تھے۔ اور اونچی سے اونچی سطح پر کام کرتے تھے۔ دوسری طرف مولانا ایسی سادگی کے ساتھ زندگی گزارتے تھے کہ غریب سے غریب اور کمزور آدمی مولانا تک آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ وہ سب کی بات سنتے تھے۔ اور فوراً اس کی مدد کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ وہ روزانہ ہی مجھ کو یا تو کسی معاملے سے متعلق خط لکھتے تھے۔ پارلیمنٹ میں مجھ سے آکر ملتے تھے۔ وہ کسی ایک ہی فرقے کے لوگوں کے کام لے کر میرے پاس نہ آتے تھے۔ بلکہ جس فرقہ کا بھی آدمی ان کے پاس پہنچ جاتا تھا، اور اپنی مصیبت کا حال ان کو سناتا تھا اس کا ساتھ دینے کے لئے وہ تیار ہو جاتے تھے، وہ صحیح معنوں میں غریبوں، کمزوروں، بیکسوں اور مظلوموں کا سہارا تھے۔ ان کے ہمدرد تھے ان کے کام آتے تھے۔ یہ لوگ ان تک آسانی کے ساتھ پہنچ سکتے تھے۔

کسی کام کے کرنے کے سلسلے میں ہماری بھی اپنی دقتیں ہوتی ہیں۔ وہ جب کسی کام کے لئے کہتے تو میں ان کے سامنے اپنی دقتیں بیان کرتا، ان کو بھی وہ غور سے سنتے۔ اور پھر جلد ہی ایک نتیجہ پر پہنچ جاتے وہ کہتے "اچھا یہ تو آپ کے ایڈمنسٹریشن کی مجبوریاں ہیں، میں انھیں مانتا ہوں، لیکن فلاں بات کا کوئی تعلق آپ کے ایڈمنسٹریشن سے نہیں ہے اسے تو ٹھیک ہو جانا چاہیئے" اور ہمیں ان کی بات ماننی ہی پڑتی، ان کی بات میں اتنا وزن ہوتا تھا۔

اب میں سوچتا ہوں کہ ایسے لیڈر کہاں ہیں۔ آج ہمیں مولانا حفظ الرحمٰن جیسے لیڈروں کی ضرورت ہے۔ ایسے لیڈروں کی ضرورت ہے جو ان کی طرح سوچ سکیں۔ ان کی طرح اپنی بات منوا سکیں، غریبوں مظلوموں، بیکسوں کے بلا تفریق مذہب و ملت کام آ سکیں۔ برائیوں پر ان کے دل دکھی ہوں۔ لیکن ان کے اندر تلخی نہ پیدا ہو، میں نہیں جانتا کہ اب مولانا جیسی سنجیدگی ذہانت، تدبّر، اور بردباری رکھنے والے لوگ پیدا ہوں گے یا نہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ آج ہمیں ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے، میں نوجوانوں سے کہوں گا کہ وہ مولانا کی طرح بننے کی کوشش کریں۔ در حقیقت مولانا کا انتقال نہیں ہوا ہے، بلکہ مظلوموں اور بے کسوں کا سہارا اُٹھ گیا ہے۔

ایک بے لاگ و بے داغ زندگی!

(مسٹر صادق علی ایم پی جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی)

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اپنی عظیم شخصیت رکھتے تھے۔ مختلف پیچیدہ اور اہم مسائل جو ملک کے سامنے آتے رہتے تھے ان پر مولانا اپنی قطعی اور واضح رائے رکھتے تھے۔ اپنی رائے وہ ہمیشہ پوری صفائی اور بے خوفی کے ساتھ ظاہر کرتے تھے۔ کبھی کسی اجتماع یا میٹنگ میں کسی اظہار خیال کے وقت انہیں ہرگز یہ فکر نہیں ہوتا تھا کہ گرد و پیش کے لوگ میری اس رائے سے کہاں تک اتفاق کر سکیں گے۔ جرأتمندی کوئی ایسا وصف نہیں ہے جو آسانی سے پیدا ہو سکے بلکہ اس کے لئے بے لاگ اور بے داغ زندگی کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک سلجھے ہوئے طریق فکر کی۔ جہاں تک مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی زندگی کا تعلق ہے اس کے بے داغ اور بے لاگ ہونے میں تو دو رائے ہو ہی نہیں سکیں۔ رہا طریق فکر، وہ ان کو براہِ راست اسلامی تعلیمات نے بخشا تھا۔ اسلام، اُسکے بنیادی اصولوں اور عقیدوں سے مولانا کو گہری واقفیت ہی نہ تھی بلکہ وہ اپنی عملی زندگی کو اس کے مطابق ڈھال چکے تھے۔ جو انسان اپنے مذہب کا تنگ اور محدود نظریہ رکھتا ہو اور پھر اس پر عمل پیرا ہونا چاہے تو وہ اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی مصیبت بنتا ہے۔ لیکن مولانا اپنے مذہب کا بہت ہی روشن اور تابناک تصور رکھتے تھے اور اس کی شہادتیں ان کی نجی اور عوامی زندگی میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔

مولانا صاحب آزادی وطن کی گھمسان جنگ میں مدتوں رہے اور اس کے لئے انہوں نے بڑی بے جگری کے ساتھ کام کیا۔ ان کا جوش عمل اور کمال خطابت دسیوں نہیں ہزاروں کو اس میدان تک کھینچ لایا۔ وہ یقیناً ایک عملی انسان اور مجاہد تھے اور اپنی اس خصوصیت سے وہ دوسروں کے لئے بھی نمونۂ عمل تھے۔ وہ جو کچھ سوچتے اور محسوس کرتے تھے وہ اسلامی روایات کا عین تقاضہ ہوتا تھا اور صحیح نقطۂ نظر کا ایک صحیح نشان۔

جماعات اور میٹنگوں میں مولانا مرحوم کو دیکھنے کا مجھے بارہا موقعہ ملا۔ وہ جب بھی بولتے تھے پوری قوت اور جوش کے ساتھ بولتے تھے لیکن ان کے خیالات و افکار میں کوئی ایسا جھول نظر نہیں آتا تھا جس پر قوم پرورانہ نقطۂ نظر سے یا عقلی طور پر کوئی معقول اعتراض کیا جا سکے۔ ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں میں بھی ان کے احباب اور قدر دان کچھ کم نہیں تھے اور وہ سب ان کی جرأت حق گوئی کا پورا احترام کرتے تھے

یقیناً انہیں یہ فخر حاصل تھا کہ وہ دوسرے بہت سے دعویداروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اپنے ملک کی واقفیت رکھتے تھے۔ وہ بے پناہ سفر کرتے تھے اور شاید ہی اس ملک کا کوئی گوشہ ایسا بچا ہو جہاں وہ نہ گئے ہوں یا جہاں ان کے احباب اور قدر دانوں کا حلقہ نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا مرحوم مسلمانوں کی مجبوریوں اور مشکلات پر اپنی قوت فکر و عمل کا بڑا حصہ صرف کرتے تھے

لیکن اس کا محرک کچھ تاریخی اسباب و عوامل تھے اور یہ جذبہ بھی کہ وہ ہندوستان میں سچی جمہوریت کی بنیادیں استوار کرنا چاہتے تھے۔ اپنے   اور مسلک میں وہ کسی دائمی اور مستقل اقلیت کے قائل تھے نہ اکثریت کے۔ وہ تو ایک ایسے ماحول کے آرزومند تھے جہاں ذات پات یا نسل و علاقہ کی حدبندیوں کے بغیر انسان — مرد عورت — آزادی کی فضا میں سانس لے سکے۔ آبرومندی سے رہ سکے اور مختلف صلاحیتوں کو نشوونما کے مواقع فراہم ہوں۔ اپنے متعلق کسی بڑائی کا احساس انہیں کبھی نہیں ہوا۔ اپنے احباب کے حلقہ میں وہ ہمیشہ ایک شریف، متواضع، ملنسار اور سچا دوست ہوتے تھے اور دکھ درد میں ہمیشہ دوسروں کے کام آتے۔ ایک ایسا انسان جب کبھی اس دنیا کے منظر سے اٹھ جاتا ہے، اس کے پیچھے ایک بڑا خلا اور بہت سے دلوں میں درد پیدا ہوا کرتا ہے جو تا دیر قائم رہتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ آج مولانا کے بعد جو خلا پیدا ہوا ہے وہ بھی کبھی پر ہو سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن دلوں کا درد تو دلوں کے ساتھ ہی جائے گا۔

(ترجمہ از انگریزی)

مسٹر عظیم حسین ۔ سفیر ہند مقیم قاہرہ

ترجمہ انگریزی سے

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ایک ایسے قوم پرور مسلمان لیڈر کی حیثیت سے جس نے ملک کے لئے بیش بہا خدمات انجام دیں، میں مدت سے جانتا تھا، لیکن اُن سے پہلے پہل ملاقات کا موقعہ مجھے آزادیٔ ہند سے کچھ ہی پہلے ملا تھا۔

آزادیٔ ہند سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی وہ پاکیزہ شعور جو ہندوستان میں بلا امتیاز مذہب و ملت ایک ترقی پذیر اور مستحکم قومیت کو بروئے کار لانے کے لئے کوشاں رہا ہے، مولانا کی ذات اُسی پاکیزہ شعور کا سرچشمہ تھی۔ ایک مخلص قوم پرور رہنما کی حیثیت سے انھوں نے ہمیشہ اپنے فرقہ کو برادرانِ وطن کے دوش بدوش جنگ آزادی میں حصہ لینے کی تلقین کی اور اس عظیم مقصد کے لئے خود بلا خوف ملامت اُنھوں نے ایثار و فدائیت کا اعلیٰ کردار پیش کیا۔ آزادیٔ ہند کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند کے عواقب مسلمانوں اور غیر مسلموں سب ہی کے لئے اپنی بھیانک شکل میں سامنے آئے۔

اس موقعہ پر بھی فادر آف دی نیشن مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے بنیادی اصولوں پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے، انتہائی بہادری اور جانفشانی کے ساتھ مولانا نے مسلسل جد و جہد کی کہ اُن مصائب و آفات کو کم سے کم کیا جا سکے، جن کا سامنا پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کو بھی تھا اور خود اُن مسلمانوں کو بھی جنھوں نے اپنے وطن عزیز میں ہی رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ایسے نازک مرحلے میں بسا اوقات مولانا کو غلط سمجھا گیا۔ لیکن مولانا کی اصول پسندی اور اُس عقیدہ کی سچائی پر تب بھی کسی کو شک و شبہہ کی گنجائش نہ ہوئی جو دستور ہند کا بنیادی تخیل ہے اور ایک متحد۔ ترقی پذیر سیکولر ہندوستان کی تخلیق کا داعی۔

"ایم اے حسین"

شری بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش :- (ترجمہ انگریزی سے)

مجھے یہ معلوم کر کر خوشی ہوئی کہ الجمعیۃ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی یاد عزیز میں ایک خصوصی شمارہ پیش کر رہا ہے۔ یقیناً الجمعیۃ کی کوشش اس جانباز حامیٔ وطن کی خدمت میں تحسین و اعتراف کا ایک شایانِ شان ہدیہ ہے۔ جس نے اپنی پوری زندگی وطن کے مفاد و سربلندی کے لئے وقف کردی۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ہمارے ملک کی آزادی کی خاطر بڑی سرفروشی اور اولوالعزمی کے ساتھ جہاد حریت میں حصہ لیا۔ اور اس راہ میں عظیم الشان قربانیاں پیش کیں۔ پھر تقسیم ہند کے بعد دہشتناک ہنگاموں کے دور میں اُنکی جد و جہد اور کھری زندگی، ہندوؤں، مسلمانوں، سب ہی کیلئے ایک مشعل راہ بن کر سامنے آئی جس نے قوم کو سچائی کی صراط مستقیم دکھلائی اور اس نے قومی استحکام و یکجہتی کا ایک قابل قدر نمونہ ہمیں عطا کیا۔

مولانا موصوف عربی و فارسی کے ایک جلیل القدر عالم اور اسلام کے ایک بیباک ترجمان بھی تھے، وہ ایک بینظیر خطیب بھی تھے۔ ان کی تقریریں ہمیشہ اثر انگیز اور سبق آموز ہوتی تھیں۔ وہ غریبوں کے دوست اور مظلوموں کے ایسے ہمدرد تھے جو ہر وقت ان کی خدمت کے لئے مستعد رہتا۔

آنے والی نسلیں مولانا کے نام کو مادر وطن کے اس عظیم فرزند کے طور پر ہمیشہ یاد رکھینگی جنکی وطن دوستی اور ہمدردیٔ خلائق۔ چھوٹے چھوٹے جھگڑوں اور کشمکشوں سے ہمیشہ بے داغ اور وراء الورا رہی۔ یقیناً ان کی وفات نے عوامی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا کردیا ہے، جس کا پُر ہونا شاید ممکن نہیں۔ خدا کرے کہ اُنکی روح کو ابدی و سرمدی راحتیں نصیب ہوں۔

"بھیم سین سچر"

شری پرتاپ سنگھ کیرون (وزیراعظم پنجاب)

مُدیرِ محترم!

یہ امر موجبِ اطمینان ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کا ترجمان روزنامہ "الجمعیۃ" مولانا حفظ الرحمن صاحب ایم، پی مرحوم، جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک نمبر شائع کر رہا ہے۔ مولانا مرحوم کی ذاتِ ستودہ صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کا شمار ان چند برگزیدہ شخصیتوں میں ہوتا ہے جو عمر بھر اپنے عقیدے پر قائم رہے۔ شروع میں ہی مولانا مرحوم نے حبّ الوطنی، خدمتِ خلق، رواداری اور مساوات کی جو راہ اختیار کی وہ آخری دم تک اس پر پورے عزم اور استقلال سے گامزن رہے۔ سخت سے سخت ناموافق حالات میں بھی انکے پائے استحکام میں لغزش نہیں آئی۔ ان کی شخصیت فرقہ وارانہ تعصبات کے سخت اندھیرے میں روشنی کے ایک تابندہ مینارہ کا کام دیتی تھی۔ گو دنیوی طور پر وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہوگئے ہیں، مگر ان کے کردار کی صفات ہمیشہ ہماری رہبری اور آنیوالی نسلوں کو نیک اصولوں کی پیروی کی تلقین کرتی رہیں گی۔

میں ان کی یاد میں شائع ہونے والے اس خاص نمبر کی کامیابی کا دل سے خواہاں ہوں۔

دستخط:۔ پرتاپ سنگھ (کیرون)

بیرسٹر نورالدین احمد (میئر دلی کارپوریشن)

حضرت مولانا حفظ الرحمن رحمۃ اللہ علیہ سے میری واقفیت کم و بیش بیس سال سے تھی اور ۱۹۵۲ء سے تو میں نے انھیں بہت قریب سے دیکھا اور ان کے ساتھ مختلف اداروں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ مولانا مرحوم جو کام بھی ہاتھ میں لیتے تھے، نہایت خلوص اور ایمانداری کے ساتھ اسے پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تقسیم ہندوستان کے بعد، ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا کہ اس ملک کے لوگوں میں یگانگت، محبت اور رواداری پیدا کریں اور اس سلسلے میں جو محنت انھوں نے کی وہ محتاجِ بیان نہیں، مولانا سچے معنوں میں ایک محب وطن اور محب قوم انسان تھے۔ چونکہ مسلمانوں کو تقسیم کے بعد متعدد دشواریوں و مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، اس لئے مولانا مرحوم نے مسلمانوں کی مدد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اگر ہندوؤں پر یہ مصیبتیں پڑتیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ انکی بھی مدد میں کوئی دریغ نہ کرتے۔ مولانا کی یہی خصوصیت تھی جس نے مجھے ان کا دلدادہ کیا۔ مولانا کی نصف پسندی، صاف گوئی اور جرأت تو مشہور رہی ہیں۔ ان کی زندگی اور موت دونوں شاہد ہیں کہ انھوں نے خدمتِ خلق کو ذاتی آرام اور آسایش پر ہمیشہ ترجیح دی۔ اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں کبھی فروگزاشت نہ کی۔ مولانا کی بے وقت وفات نے ملک و قوم کو عظیم نقصان پہنچایا ہے اور فی الحال مولانا کی جگہ پُر ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، لیکن رب العالمین مسبب الاسباب ہے آج کوئی مرجھائی ہوئی کھیتی کسی کی ہے تو کل اللہ تعالیٰ اسی خشک اور مُردہ زمین کو پھر زندہ کر دیتا ہے۔ ہماری یہی دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ ہمیں مولانا کا نعم البدل عطا فرمائے اور مولانا کی روحِ مبارک کو اپنے آغوشِ رحمت میں لے لے۔

نورالدین

کچھ تعزیتی اور پیغام

"مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات حسرت آیات ہماری تاریخ کا زبردست حادثہ اور ایک عالمگیر سانحہ تھا۔ جس کے اثر و اضطراب نے بیک لمحہ ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں دلوں کو زخمی کیا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان کی وسعتوں بلکہ دور دراز ممالک تک میں کتنے مسلم و غیر مسلم انسانوں کے دل اس بے مثل شخصیت کی دائمی جدائی سے مجروح اور آنکھیں اشک بار ہوئی ہوں گی۔

جوں ہی ریڈیو اور اخبارات کے ذریعہ خبر وفات نشر ہوئی حضرت مولانا مرحوم و مغفور کے احباب، متوسلین، قدردانوں اور عقیدت مندوں کے تعزیتی پیغامات، بیانوں، تاروں اور مراسلوں کا ایک سیلاب امڈ آیا جس کا سلسلہ کئی ماہ تک برابر جاری رہا۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ، شہر شہر، قصبہ قصبہ اور بستی بستی کے مسلم عوام و خواص، جمعیۃ علماء کی ہزاروں شاخوں اور رفقاء جماعت ہی کے تعزیتی خطوط اور تاروں کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ خیال تھا کہ مجاہد ملت نمبر میں یہ تمام پیغامات نہ سہی کم از کم ان کے بھیجنے والوں کی فہرست ضرور شریک اشاعت کر دی جائے کہ اس طرح حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولیت و ہر دلعزیزی کا ایک لازوال نقش باقی رہ سکے۔ اس خیال کے ساتھ جب فہرست مرتب کی گئی تو اندازہ ہوا کہ "مجاہد ملت نمبر" کے محدود صفحات میں سما سکنے کی بجائے وہ خود ایک ضخیم اور مستقل کتاب کا سر و سامان ہے، مجبوراً اس خیال کو ترک کرنا پڑا۔ اب پیش نظر صفحات میں صرف چند خطوط اور تار شریک اشاعت کئے جا رہے ہیں جو اس اندوہناک حادثۂ فاجعہ کی صدائے بازگشت کہے جا سکتے ہیں

"انیس الحسن"

بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعظم کشمیر (بذریعہ تار)

"مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات نے انتہائی دلی صدمہ پہنچایا۔ وہ ایک باشعور، قوم پرور رہنما اور سیکولرزم کے فداکار وکیل تھے۔ ان کی جدائی بلاشبہ قوم و وطن کے لئے ایک بے اندازہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے میری دلی تعزیت ان کے اہل و عیال کو ضرور پہنچا دیجئے"

شری آچاریہ کرپلانی (بذریعہ تار)

"دل کے گہرے غم کے ساتھ مولانا کی وفات کی خبر سنی وہ ایک مثالی شخصیت تھے۔ آج ہم ایک جانباز مجاہد اور فدائے وطن ہستی سے محروم ہو گئے۔ خدا کرے کہ اس عظیم قومی نقصان کی کسی طرح تلافی ہو سکے"

ہز ہائی نس والئی بھوپال (بذریعہ تار)

"مولانا کی اچانک وفات سے دلی صدمہ پہنچا۔ یہ غم ہم سب ہی کے لئے ہے۔ اس محرومی میں دلی تعزیت اور ہمدردیاں قبول کیجئے"

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد بدر عالم۔ مدینہ منورہ

(حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے نام اپنے مکتوب کے ذریعہ)

مَنْ شاء بعدك فليمتْ فعليكَ كنتُ احاذر

میرے علم میں اس وقت تمام ہند میں مسلمانوں کے سب سے بڑے خیرخواہ اور ہمدرد، مجاہد عالم، رفیق محترم مولانا حفظ الرحمٰن صاحب غفر اللہ لہ و اعلیٰ درجاتہ فی علیین تھے۔ اپنے غم کا کیا اظہار کروں۔ بستر علالت پر پڑا ہوا اس الم سے کروٹیں بدل رہا ہوں، موجودہ دور میں مولانا جیسی ہستی کا نقدان ایک ناقابل تلافی نقصان ہے

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

ہز ہائی نس ملا طاہر سیف الدین بمبئی (بذریعہ تار)

"مولانا حفظ الرحمن صاحب کی خبرِ وصال دلی رنج و غم کے ساتھ سنی ان کی عظیم الشان خدمات کے تذکرے تا دیر باقی رہیں گے اور آئندہ نسلوں کو خدمت و عمل کا سبق دیں گے۔ ان کی فیملی تک دلی ہمدردیاں پہنچا کر ممنون فرمائیے"۔

شیخ الازہر الشیخ محمود شلتوت جامع ازہر قاہرہ (مصر)

(بذریعہ تار)

"مولانا حفظ الرحمن کی وفات پوری ازہر یونیورسٹی کے لئے باعثِ قلق و ملال ہے۔ حق تعالےٰ ان کو ان کی خدمات کا اجرِ جزیل بخشے جو انھوں نے اسلام کی سربلندی کے لئے انجام دیں اور ان کے تمام پس ماندگان، متوسلین و رفقاء کار کو صبرِ جمیل سے نوازے"

موتمر اسلامی۔ مکہ مکرمہ، الشیخ محمد صالح القزاز (بذریعہ تار)

مولانا حفظ الرحمن کا حادثۂ وصال دلی رنج و غم کا باعث ہے۔ آج مسلمانانِ ہند کے جذباتِ غم کا ہمیں پورا احساس ہے کہ ایک مخلص رہنما جس نے مسلمانانِ ہند کی ان تھک خدمت کی۔ آج دنیا سے رخصت ہو گیا۔

مفتی اعظم کشمیر (مولانا بشیر الدین صاحب) بذریعہ تار

"حضرت مولانا کی وفات سے دل ٹوٹ کر رہ گیا۔ اللہ تعالےٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ہم سب تہی دستانِ قسمت کو ان کا نعم البدل بخشے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی وفات نے امتِ مسلمہ کو ایک جوہرِ نایاب سے محروم کر دیا ہے"

فرنگی محل لکھنؤ (مولانا ناصر میاں لکھنوی) — بذریعہ تار —

"مولانا حفظ الرحمن کی وفات ایک بے اندازہ قومی و ملی نقصان ہے اور ان کا صدمہ عالم گیر ہے"

خان بہادر محمد جان صاحب۔ کلکتہ۔ (بذریعہ تار)

"مولانا مرحوم کے انتقال سے دل کو ناقابلِ برداشت صدمہ پہنچا ہے"

مسٹر محمد صادق وزیر تعلیم کشمیر (بذریعہ تار)

"مولانا کی جدائی سے انتہائی صدمہ پہنچا ہے

میری جانب سے تعزیت قبول کیجئے"

شری جگموہن داس وزیر مدھیہ پردیش (بذریعہ تار)

"مولانا کی وفات سے دل انتہائی بے چین ہے۔ آج ملک اپنے ایک بے مثال فدائی سے محروم ہو گیا۔ میں بھی اس غم میں شریک ہوں"

شورش کاشمیری ایڈیٹر چٹان لاہور (بذریعہ تار)

"مولانا حفظ الرحمن صاحب کے وصال سے دل پر جو بجلی گری ہے ناقابلِ بیان ہے۔ ان کی وفات ایک بے مثل عالمِ دین، عظیم رہنما، مجاہد حق اور مسلمانانِ ہند کی آخری امید کی موت ہے"

مولانا اسماعیل گارڈی جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ) (بذریعہ تار)

"مولانا حفظ الرحمن صاحب کی خبرِ وفات ایک جانکاہ صدمہ ہے۔ اُن کی جدائی نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ عالمِ اسلام کا زبردست نقصان ہے۔ اللہ تعالےٰ ان کو اپنی بے اندازہ رحمتوں سے نوازے"

جمعیۃ علماء ٹرانسوال (جنوبی افریقہ) (بذریعہ تار)

"ریڈیو پر مجاہدِ ملت کے وصال کی دلخراش خبر سنی۔ آہ ہم سب ایک عظیم سرپرست سے محروم ہو گئے۔ دعاءِ مغفرت کرتے ہوئے اللہ سے آپ کے لئے صبر و سکون کے طلب گار ہیں"

جمعیۃ علماء برما (رنگون سے تار کے ذریعہ)

"مولانا حفظ الرحمن صاحب کی وفات سے برما کے مسلمان اور جمعیۃ علماء برما کو دلی صدمہ پہنچا۔ اس غم میں ہم آپ کے ساتھ ہیں"

پورٹ ٹرسٹ کمیٹی بمبئی (بذریعہ تار)

"پورٹ ٹرسٹ کمیٹی کے ارکان، چیرمین اور اسٹاف اس عظیم حادثہ میں مسلمانانِ ہند کے شریکِ غم ہیں۔ مولانا کی وفات سے ہندوستان اور مسلمانانِ ہند کو بے اندازہ نقصان پہنچا ہے۔ ان کی یاد ہمارے دلوں سے کبھی محو نہ ہو سکے گی۔

پرنس ملا یوسف نجم الدین صاحب (بمبئی)

ایک عرصہ سے مولانا حفظ الرحمن صاحب

ساتھ مجھے بہت قریبی تعلق رہا۔ دل اور دماغ کی دوسری اعلیٰ صفات کے ساتھ ساتھ جو انھوں نے ایک اعلیٰ ترین مقصد زندگی کے لئے صرف کیں۔ ان کی سب سے نمایاں اور ممتاز صفت جو میں نے محسوس کی وہ سخت سے سخت خطرات میں بھی حیرت انگیز قوت عمل اور جرأت مندی تھی۔ نہایت انہماک، بے باکی اور استقلال کے ساتھ انھوں نے عمر بھر خدمت گزاری کا سلسلہ قائم رکھا اور کبھی اپنے آرام و راحت بلکہ صحت تک کی پروا نہ کی۔ یہ ان کی اتنی بڑی قربانی ہے جو ہمیشہ یاد رہے گی۔ جماعت کے ساتھ ان کے دوستانہ روابط ہمارے ذہنوں پر ہمیشہ نقش رہیں گے۔

یوسف نجم الدین

ہز ہائی نس نواب صاحب آف محمد گڑھ

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی خبر اچانک سن کر جو قلبی صدمہ ہوا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ آج پوری امت کے لئے ماتم کا دن ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کے ساتھ ہمدردی کی جائے اور کس کے پاس تعزیت کے لئے جایا جائے جب کہ خود ہی مستحق ہمدردی ہیں اور پوری امت کو تعزیت کا حق پہنچتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا جو ہر بُرے وقت پر ہمارے لئے سینہ سپر ہو جایا کرتا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ملی عمارت جن ستونوں پر قائم ہے افسوس کہ ان میں سے آج ایک سب سے مضبوط اور زبردست ستون گر گیا۔ الٰہی ہمارے شہید مجاہد کو اپنی آغوش رحمت میں لیلے۔ اس کی مغفرت فرما کے تو اس سے راضی ہو جا۔ اور اپنی بے شمار نعمتوں، رحمتوں اور محبتوں سے اس کو راضی کر دے، مگر بار الٰہا ہم کو بھی برداشت کی قوت عطا فرما کہ ہمارے سردار کے بچھڑنے پر ہمارے قدم ڈگمگا نہ جائیں اور ہم صحیح راستہ سے پرے نہ ہٹ جائیں۔ آمین (محمد کامل)

شیخ طریقت افغانستان

حضرت الحاج مولانا شاہ

عبدالسلام صاحب مجددی

کابل

مرگ صاحبدل جہانی را دلیل کلفت است شمع چوں خاموش گردد داغ محفل میشود

عندلیب گلشن علم و عرفان و مجاہد با عزم و وجدان حضرت مولانا حفظ الرحمن علیہ الرحمۃ والغفران، صاحب چناں شخصیت بلند و مقام ارجمندی بود کہ تاریخ ہندوستان نام نامی و کارنامہ ہائے گرامی او را بخط زریں ثبت خواہد نمود۔ مولانا آں عالم باہوش و ذکار چناں مقام بحیثیت علمی و اجتماعی را حائز بود کہ نظیر آں امروز در عالم اسلام کمتر بنظر میرسد۔ مولانا در پرتو افکار عالی و خیالات بلند اجتماعی خود آنقدر بکار در مانده مسلمین ہمت گماشت کہ اخیراً گوہر گرانبہائے حیات و نقد گرامی عمر خود را در ہیں راہ صرف و ایثار نمود۔

مولانا فروغ دیدۂ اہل نظر و آئینہ حسن ارباب فضل و ہنر بود۔ مولانا از غم مسلمانان در دل سوزی و در سر شوری داشت۔ مولانا در تمام امور بقوت و جدیت تمام در پرتو ایمان قوی و عزم راسخ وارد صحنۂ عمل گردیده و مخصوصاً در ساحت ہائے اجتماعی و تہذیبی و اخلاقی چناں کامیابیہائے شایانی بدست آورده بودند کہ تا دیری آں خاطرہ ہا از خاطرہا محو نخواہد گردید۔

نفیر مجددی چہار سال قبل وقتی کہ بعرس مبارک حضرت قبلۂ روحانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ بہند آمده بودم در دہلی با مولانا ملاقات نموده از صحبت پُرقیمت شان محظوظ گردیده بودم شخصیت مولانا را آنقدر بر ازندہ روحیہ عالی شان ما باندازۂ بلند یافتہ بودم ہیچ قوۃ مانع طرز عمل و اجرائے نظریات شان شده نمی توانست

مولانا از کمال عشق و محبتی کہ با عتلاء اسلام داشت حیات جاودانی را اکتساب نموده و اخیراً در آں مقبرۂ آسوده آں را رشک روضۂ بہشت بریں تعبیر خواند یعنی در جوار آں بزرگان عظام و محدثین کرام مثل حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب و حضرت شاہ ولی اللہ صاحب و حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب جا گزید کہ امیدست ببرکت ایں علمای دین و اکابر مسلمین احوال اخروی او سعادت قرین باشد۔ اللّٰھم اغفر لھم وارحمھم

چوں جناب الحاج مولانا سید انیس الحسن صاحب جنرل منیجر اخبار الجمعیۃ در ضمن دعوت نامہ تحریرے نظریات فقیر را راجع بحضرت مولانا مطالبہ فرموده بودند اینک با امتثال امر شان مختصراً چند سطری نوشتم با تقدیم احترامات

عبدالسلام المجددی اثیم کابل۔ افغانستان دارالامان وات۔

آہ مولانا حفظ الرحمٰن

(حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند)

مجاہد ملّت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات کا یہ عظیم ترین المیہ کسی ایک فرد یا خاندان یا ایک شہر یا ایک ملک کا نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا صدمہ ہے مولانا حفظ الرحمٰن کی ذات گرامی اپنی قابلیت ومقبولیت کے لحاظ سے بلا امتیاز مذہب وملت ہندوستان گیر شخصیت تھی دارالعلوم دیوبند کی اس چار دیواری میں ان کی علمی استعداد اور فکری نشو ونما کا آغاز ہوا۔ فراغت کے بعد اکابر نے مولانا موصوف کی قابلیت کی رفعت مندانہ کیفیات کو دیکھ کر آپ کو دارالعلوم میں معین المدرسی کی خدمات سپرد فرمائیں۔ نتیجہ توقع کے مطابق ثابت ہوا کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے دارالعلوم کی ممتاز تدریس میں بہت جلد اکابر کی نظروں میں اعتماد قابلیت اور طلبہ کی نظروں میں محبوبیت ومقبولیت پیدا کر کے بلند تر مقام پیدا کر لیا اور اس کے بعد دارالعلوم میں آپ کا پورا زمانہ قیام اسی مقبولیت اور امتیاز کے ساتھ بسر ہوا۔ برنام بٹ مدراس کی دینی درسگاہ سے جب امتیازی اوصاف تدریس رکھنے والے، بلند فکر عالم کیلئے خصوصی طلب آئی تو قدرتاً اکابر کی نگاہ انتخاب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب پر پڑی۔ طبعی اطاعت شعاری کی بنا پر آپ نام بٹ مدراس تشریف لے گئے اور جس انہماک وقابلیت سے آپ نے وہاں تدریسی اور تعلیمی خدمات انجام دیں ان پر دائمی نقوش اعتراف واقرار آج بھی ثبت ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اپنے محبوب اساتذہ کرام کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں خدمت تدریس انجام دینے کی نوبت آئی۔ ڈابھیل کے طویل قیام اور ہر علم وفن کی کتب پڑھانے کے بعد ان کی علمی اور تدریسی قابلیت علماء میں مسلم ہو گئی۔ یہاں تک کہ دارالعلوم دیوبند کے ایک موقر اور ذی رائے فرزند کی حیثیت سے مولانا موصوف کو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا رکن بنایا گیا اور اصابت رائے اور معاملہ فہمی کی ان عظیم صلاحیتوں سے دارالعلوم تقریباً ۲۲ سال منتفع رہا۔

علمی اور تدریسی ذوق کیساتھ دور آغاز سے مولانا مرحوم سیاسی دماغ بھی رکھتے تھے جو جذبۂ عمل اور فعالیت سے بھرپور تھا آپ کی سیاسی خدمات کا آغاز جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے ہوا یہاں آپ نے بڑی تیزی کیساتھ اپنے فکر رسا۔ معاملہ فہمی۔ وقت شناسی۔ اور استقلال و ثبات قدمی کا لوہا منوالیا جسکے نتیجہ میں آپ ورکنگ کمیٹی میں لے لئے گئے اور پھر آپ کی پر تاثیر فعال شخصیت نے اپنا واجبی خراج اعتراف اس طرح وصول کر لیا کہ جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس لاہور میں آپ کو باتفاق رائے "ناظم اعلیٰ" بنادیا گیا اس ذمہ دارانہ منصب پر آنے کے بعد آپ کی ذمہ دارانہ خدمات کا آغاز بھی تھا اور ساتھ ہی ایک غیر معمولی امتحان بھی لیکن زیادہ وقت گزرنے نہیں پایا تھا کہ آپ کی مدبرانہ روش اور زعیمانہ صلاحیتیں بروئے عمل آگئیں اور سیاسی رہنمائی میں ملک گیر انداز پر آپ صف اول کے لیڈروں میں پہنچ گئے نتیجۃً برطانوی عہد میں آپ کو اپنی رہبرانہ صلاحیتوں کی قیمت قید وبند کی صورت میں ادا کرنی پڑی اور بالآخر اپنے ہمعصر صف اول کے زعماء کے دوش بدوش جنگ آزادی لڑ کر وطن کو آزاد کرایا۔ لیکن بخت وقت کو یہ منظور نہیں تھا کہ آپ کا فکر وعمل اور جہاد ختم ہو۔ ۱۹۴۷ء میں آفتاب آزادی طلوع ضرور ہوا لیکن اس کا افق خونی شفق سے رنگین تھا اور ایک شہر سے دوسرے میں نہیں بلکہ قاسم جان اسٹریٹ سے لال قلعہ تک جانے کے لئے بھی خاک وخون میں تڑپتی ہوئی لاشوں کو عبور کرنا ناگزیر تھا۔ یہ مجاہد ملّت کا ہی حوصلہ مردانہ تھا کہ اس قتل وغارتگری کے پر آشوب دور میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر قیام امن کی مساعی میں سرفروشانہ حصہ لیا اور اپنی بے مثال سعی کے نتیجہ میں لاکھوں کی جانوں مالوں اور آبروؤں کے محافظ بنے اور خطرناک منزل پر بھی اپنی جان کی کوئی قیمت نہیں سمجھی۔

ع خدا رحمت کرے اس صادق پاکیزہ طینت پر

غرضیکہ مجاہد ملّت کی زندگی ہر ہر حیثیت سے ناقابل فراموش ہے آج دارالعلوم اور اس کی جماعت اپنے اس جلیل القدر فرزند کی دائمی جدائی پر سوگوار ہے۔ آج مظلوم اپنے پشت پناہ کے اٹھ جانے پر غم آگیں ہیں۔ آج ملک کے اہل علم ایک بالبصیرت وبالغ نظر عالم کے رخصت ہو جانے پر غم نصیب ہیں آج ارباب سیاست ایک صاحب فراست کے اپنے درمیان نہ رہنے پر اشک فشاں ہیں۔ آج تحریر وخطابت کی محفلیں سونی ہیں آج تصنیف وتالیف کی مجلس پر سکوت طاری ہے لیکن اب یہ سوگواری نہ ہمارے حق میں کارآمد ہے نہ ان کے حق میں آج وہ اس کے ضرورتمند ہیں کہ آپ ان عظیم خدمات کے صلہ میں اپنے اوپر ان کے حق کو پہچانیں اور اس کو ادا کریں اور وہ یہی ہے کہ ایصال ثواب کی کثرت کی جائے اور ہر ہر موقع پر ایصال ثواب پر آپ مولانا مرحوم کو یاد رکھیں آخر میں میں انہی کلمات کے ساتھ مولانا مرحوم کے متعلقین اور اعزا کی خدمت میں اپنی شرکت غم کیساتھ تعزیت مسنونہ وتلقین صبر کی عرضداشت واجر جزیل کی دعا پیش کرتا ہوں۔

مولانا داؤد غزنوی۔ لاہور (پاکستان)

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے سانحۂ ارتحال کی خبر مجھے ایک سفر سے واپس آنے کے بعد ہوئی۔ اس خبر سے بےحد صدمہ ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا اپنے علم و فضل کے لحاظ سے ملک کے ممتاز ترین علما میں سے تھے، اسلامی غیرت و حمیت اور اس کے لئے جاں نثاری میں قابل رشک مقام رکھتے تھے۔ ان کی خدمات علما کی تنظیم اور ان کے مقام کو بلند کرنے میں بیش بہا تھیں تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد وہ اسلام کے نڈر بہادر سپاہی بھی تھے اور کمانڈر بھی تھے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ تقسیم کے بعد وہ مسلمانوں کا تنہا سہارا تھے۔ انھوں نے اسمبلی کے اندر اور اسمبلی کے باہر جس جرأت اور بے باکی سے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے آواز بلند کی آج اس کا کوئی بدل نظر نہیں آتا۔ وہ حسن اخلاق۔ مروت۔ ہمدردی، ایثار نفسی اور تحمل و بردباری کے مجسمہ تھے

ان کے فراق پر آنکھیں اشکبار ہیں، دل حزین و غمگسار ہے۔ لیکن رضا با لقضاء کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم اپنے رفیق قدیم کی جدائی پر انا للہ و انا الیہ راجعون کہیں اور ان کے حق میں دعا کریں۔

اللھم اغفر لہ و ارحمہ و عافہ و اعف عنہ واکرم منزلہ و وسع مدخلہ واغسلہ بالماء والثلج ...... ونقہ من الخطایا کما نقیت الثوب الابیض من الدنس وبدلہ دارا خیرا من دارہ و اھلا خیرا من اھلہ و زوجا خیرا من زوجہ وادخلہ الجنۃ واعذہ من عذاب القبر ومن عذاب النار۔

اللہ تعالیٰ ان کے بچوں اور تمام پسماندگان کا محافظ و ناصر اور مربی ہو۔

مولانا عبدالحامد بدایونی صدر جمعیۃ علماء پاکستان

سیوہارہ ضلع بجنور کی سرزمین قابل فخر ہے جس نے مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جیسا عالم پیدا کیا۔ جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب فراغت و تکمیل علوم عربیہ کے بعد ہی قومیات، مذہبیات کی تحریکات میں پورے جوش کے ساتھ شریک ہو گئے۔ تحریک خلافت، آزادی جزیرۃ العرب میں انھوں نے انتہائی سرگرمی کے ساتھ خدمات انجام دیں اس تحریک میں جو لوگ شریک ہوئے ان کے اندر مودت و محبت کے رجحانات و میلانات نمایاں طور پر پیدا ہو گئے۔ چنانچہ ہمیں یاد ہے کہ جب ہماری اور مولانا کی پہلی ملاقات سیوہارہ خلافت کے ایک جلسۂ خصوصی میں ہوئی۔ اس دن سے تا قیام پاکستان وہ جب ملے انتہائی اخلاص و محبت سے ملے۔ سیاسیات میں اگرچہ ان کی ہماری دو جداگانہ رائیں اور منزلیں تھیں، مگر مولانا نے کسی وقت بھی تعلقات میں فرق نہ آنے دیا۔

مولانا حفظ الرحمٰن بہترین خطیب و مقرر تھے، انکی تقاریر میں جوش و ولولہ، خطابت، علمی مواد ہوتا، ہر ذوق کا سامان ہوتا۔ سیاسی تقاریر کے علاوہ میں نے چند تقاریر سیرت نبویہ پر بھی سنیں بلا شبہہ یہ تقاریر یادگار حیثیت رکھتی تھیں۔ کاش اس زمانے میں ٹیپ ریکارڈ ہوتے تو یہ ریکارڈ کی جاتیں۔

مولانا اگرچہ شروع سے لیکر آخر تک کانگریسی رہے، لیکن انکے اندر مذہبی تڑپ ملت اسلامیہ کی ضرورتوں کا احساس مسلمانوں کی تباہی بربادی کے تاثرات زیادہ سے زیادہ موجود تھے، وہ یہاں اسمبلی کے اندر مسلمانوں کے معاملات پر آزادی کے ساتھ بولتے وہیں حکومت کی بنچوں میں بیٹھ کر کلمہ حق بلند فرماتے۔ پورے ہندوستان میں جہاں کہیں بھی مسلمانوں پر کوئی آفت آئی، مولانا حفظ الرحمٰن مضطربانہ انداز میں موقعہ واردات پر پہنچکر مصیبت زدوں کی امداد و اعانت فرماتے۔ مولانا کی یہ خدمات جلیلہ تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ اسلامیان ہند کی طرح پاکستان کے علماء بھی مولانا مرحوم کو فراموش نہیں کر سکتے۔

اللہ تعالیٰ انکو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

روزنامہ الجمعیۃ دہلی

مجاہد ملت نے جس ہمت، جرأت اور دانائی سے فرقہ پرستی کا مقابلہ کیا اس کی نظیر نہیں ملتی

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین دہلی کا اظہار غم!

تعمیر کے ہر مرحلہ پر ان کی یاد ستائے گی

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے مجاہد ملت کی وفات پر ایک بیان میں فرمایا کہ مولانا کی جدائی ملکی اور ملی سانحہ کے علاوہ میرے لئے ایک ہولناک شخصی حادثہ ہے۔ مرحوم سے تقریباً بیالیس سال سے ہمارے تعلقات اتنے گہرے وسیع اور پرخلوص تھے کہ ان کا بیان الفاظ کے قالب میں سما نہیں سکتا۔ ایسے روابط کی مثالیں بے شبہ کمیاب ہیں ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء تحریک ترک موالات اور آزادی کی جدوجہد کے ہنگامہ خیز سال تھے۔ ہم دونوں ایک ہی وقت میں استخلاص وطن کی اس تحریک میں شامل ہوئے اور اس مقدس تحریک کی تقریب سے ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہوگئے کہ یہ تعلقات بہت جلد اخوت و مودت کے نہایت عمیق رابطہ میں ڈھل گئے۔ ایک ساتھ پڑھے، ایک ساتھ پڑھایا، زندگی کی ہر منزل میں ایک دوسرے سے کچھ اس طرح رفاقت رہی کہ فرق من و تو ہی باقی نہ رہا۔ اس وقت بیالیس سال کی اس لطیف و نفیس رفاقت کا نقشہ آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔ اور بے شمار نقوش صفحات حافظہ کی لوح پر ابھر رہے ہیں۔ مرحوم عظیم سیاست داں، زبردست عالم دین، اعلیٰ درجہ کے مصنف اور بے مثال خطیب تھے۔ عزم و ہمت اور بیباکانہ حق گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، بے لوث خدمت خلق ان کی زندگی کا طرۂ امتیاز بلکہ خاص مشن تھا اور رات دن اس کام میں لگے رہتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے فرقہ پرستی کا انھوں نے جس ہمت، جرأت اور حکمت و دانائی سے مقابلہ کیا اس میں ان کا کوئی سہیم و شریک نہیں تھا۔ ان کی بے پناہ خدمات اور غیر معمولی قابلیت کا ملک کے تمام حلقوں میں زبردست اثر تھا۔ وہ مظلوموں اور بے سہاروں کی پناہ تھے۔ جہاں تک جمعیۃ علماء ہند کا تعلق ہے اس کے یتیم ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ ایسی جامع کمالات شخصیت کا بدل اب مشکل ہی سے مل سکے گا اور قومی و ملی تعمیر کے ہر مرحلے پر ان کی یاد بری طرح ستائے گی۔ اللہ تعالیٰ اس ہمدم دیرینہ غمگسار کی دائمی جدائی کا غم سہنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم

مظاہر العلوم، سہارنپور

مکرم محترم، مد فیوضہم، بعد سلام مسنون۔

کل کے تار کی رسید تو مولانا محمد میاں صاحب کے کارڈ پر اسی وقت لکھ چکا تھا۔ اس حادثہ پر قلق اور رنج جتنا بھی ہو، قرین قیاس ہے، بالخصوص اس وجہ سے کہ جرأت اور بیباکی سے حکام کے سامنے مسلمانوں پر مظالم کو پیش کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی مولانا مرحوم کو ان سب مساعی جمیلہ کا، جو انھوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود بالخصوص ۱۹۴۷ء کے حوادث میں کیں کہ یہ ناکارہ خود بھی اس وقت دہلی ہی میں موجود تھا اور خود دیکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کی شایان شان بہترین جزائے خیر عطا فرمائے۔ غالباً آپ کے علم میں تو یہ بات ضرور ہوگی۔ کہ اس ناکارہ کے یہاں تعزیتی ریزولیوشن وغیرہ کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ میرے نزدیک جانیوالے کے لئے اور پسماندہ دوستوں کے لئے کام آنیوالی چیز دعاء مغفرت اور ایصال ثواب ہے

کل سے جب حادثہ کی اطلاع سنی، مدرسہ کے علاوہ خصوصی احباب سے بھی یہی فرمائش کر رہا ہوں کہ ہر حافظ کم از کم قرآن پاک اور ناظرہ خواں تین مرتبہ سورہ یٰسین اور جو ان پڑھ ہوں وہ کم سے کم تین مرتبہ قل ھو اللہ پڑھ کر ضرور بخشیں، بندہ کے نزدیک مولانا کے احسانات علی المسلمین کا اگر کوئی بدلہ ہے تو یہی ہے۔

محمد زکریا۔ یکم ربیع، جمعہ ۸۲ھ

مولانا حفظ الرحمٰن ہندوستان کی تاریخ کا ایک روشن باب تھے

علیگڈھ یونیورسٹی کا حضرت مجاہد ملت کو خراج عقیدت

(تعزیتی قرارداد)

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کے انتقال پُرملال پر اپنے رنج وغم کا اظہار کرنے کے لئے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے طلباء، اساتذہ، ممبرانِ کورٹ اور عملہ کارکنان کا ایک جلسہ یونین ہال میں منعقد ہوا۔ اسی روز یونیورسٹی میں تعطیل کردی گئی تھی۔ جلسہ کی صدارت پرو چانسلر نواب صاحب چھتاری نے فرمائی۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے نواب چھتاری، جناب عبدالمجید خواجہ۔ اور مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے سکریٹری بصیرت احمد صاحب نے حضرت مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا۔ بعد میں وائس چانسلر کرنل بشیر حسین صاحب زیدی نے مندرجہ ذیل قرارداد پیش کی جو متفقہ طور پر جلسے نے کھڑے ہوکر پاس کی۔

"مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے طلباء، اساتذہ، ممبران کورٹ اور عملہ کارکنوں کا یہ جلسہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات پر انتہائی رنج والم اور ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ مولانا جنگ آزادی کے عظیم مجاہد، روشن خیال عالم اور بلند پایہ خطیب تھے۔ انھوں نے جنگ آزادی کے راستہ میں قید وبند کی ہر تکلیف کو بے نیازی کے ساتھ برداشت ہی نہیں کیا بلکہ انھیں جرأت اور پامردی کے ساتھ دعوت بھی دی۔ وہ بجنور کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو علم وفضل میں ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ خلافت اور کانگریس کی تحریک کے سلسلہ میں مولانا کی قربانیاں اور اُترپردیش اور ہندوستان کی تاریخ میں یادگار ہیں۔ وہ ہندوستانی قومیت کے زبردست حامی تھے۔ ملک کی تقسیم کے بعد جس طرح انھوں نے ہندوستانی قومیت اور جمہوریت کے تصور کو اس ملک میں قائم کرنے کی جدوجہد کی وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک نہایت روشن باب ہے۔ ۱۹۴۷ء سے لیکر اپنے آخری لمحوں تک مولانا نے ان مقاصد کیلئے صحیح معنوں میں جہاد جاری رکھا۔ مولانا کی علمی خدمات نہایت گرانقدر ہیں۔ علمی اداروں کی خدمت اور اساتذہ کی بہبودی کے لئے انھوں نے اپنی ذات سے جو کچھ کیا وہ انجمنیں اور جماعتیں نہ کرسکیں۔ وہ ایک بڑے روشن خیال بزرگ تھے۔ جس کا ایک بڑا روشن ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے دیوبند کے تصور کو علیگڈھ کے تصور پر اور علی گڈھ کے تصور کو دیوبند پر کبھی مسلط نہیں کیا وہ جہاں پُرانے علوم کا احترام کرتے تھے وہاں مغربی علوم کی ضرورت اور اہمیت کے معترف اور انکے ماہرین کے سچے قدردان بھی تھے انکی رواداری اور وسیع المشربی میں چھوٹے بڑے کا سوال نہیں تھا۔ وہ امیر غریب، عالم اور جاہل سب کے غمخوار تھے۔ البتہ وہ ہر قسم کی غلامی اور ہر قسم کے استبداد کے سخت دشمن تھے اور انکے خلاف جہاد کرنے میں اپنی جان و مال کی کبھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

مولانا مسلم یونیورسٹی کے ساتھ کئی حیثیتوں سے وابستہ تھے، وہ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر اور ایگزیکٹیو کونسل کے رکن تھے۔ انھوں نے اس ادارہ کی زبردست خدمات انجام دیں۔ مولانا کی وفات ہندوستان کیلئے، ہندوستانی مسلمانوں کیلئے اور علمی، ادبی اور سیاسی جماعتوں کیلئے ایک عظیم سانحہ ہے۔ خدائے عزّوجل سے دعا ہے کہ وہ حضرت مولانا کی مغفرت فرمائے اور ان کے پسماندگان اور اقربا کو صبر جمیل عطا فرمائے۔"

ایک عظیم قومی اور ملّی سانحہ

تحریر: مولانا عبد الوہاب
... صدر آل انڈیا
... جمعیت کانفرنس

حضرت مولانا محمد حفظ الرحمان صاحبؒ کا وصال ایک عظیم ملّی سانحہ ہے۔ مولانا ... عظیم المرتبت اور بلند پایہ مفکر اور جہادِ حرّیت کی صف اوّل کے سپاہی تھے ... کے خلاف انیسویں صدی کے اوائل میں جہادِ حریت کا جو پرچم شہیدین ... صاحب بریلویؒ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب دہلوی نے بلند کیا اور ... کی بازی لگائی۔ اس مقدس تحریک کو اُن کے بعد بھی علماء ربانیین نے جاری ... کے تغیّر و تبدل کے ساتھ اپنے اپنے طور پر کام کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ... عظیم آبادیؒ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، شیخ الہند حضرت مولانا ... دیوبندیؒ، حضرت مولانا عبد العزیز صاحب رحیم آبادیؒ حضرت مولانا محمد ... حضرت مولانا ابو الکلام آزادؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحبؒ ... عبید اللہ صاحب سندھیؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ ... خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ مجاہدِ ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحبؒ بھی اسی متبرک جماعت سے تھا۔

... میں اجتماعی طور پر وطنی تحریک ایک نئے دور میں داخل ہوئی، اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ بھی پوری قوت کے ساتھ اس میں شامل ہوگئے اور اس سلسلے میں قید و ... صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ اس کے نتیجہ میں ملک آزاد ہوا مگر ساتھ ہی ملک تقسیم بھی ہوگیا۔ اور اس کے نتیجہ میں ملک کے دونوں حصوں ... میں ہوش ربا فسادات (قتل و غارت گری) کا بازار گرم ہوا خصوصاً دار السلطنت ... خوب ... کی جوارزانی ہوئی۔ اُس نے ملک کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر گاندھی جی ... کردیا۔ مسلمان بحد خوف زدہ اور ہراساں تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا ... سے بالکل خالی ہوجائے گی۔ اور سیکولر حکومت کا ڈھانچہ پارہ پارہ ہو ... ایسے وقت میں ملک و ملّت کا جو بطل جلیل مسلمانوں کی پاسبانی اور سیکولرازم کی ... کے لئے میدان میں آیا وہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ تھے، اس ... مولانا کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ مسلم رہنماؤں میں ایک طبقہ تو وہ تھا جس کے ... اجتماعی مفاد رہا اور اسی کی تکمیل میں وہ مصروف تھا۔ دوسرا گروہ وہ تھا جس کی ... مسلم مفاد تک محدود رہی لیکن مجاہد ملت کا شمار ان معدودے چند رہنماؤں ... سے جنہوں نے بیک وقت ملکی اور ملّی دونوں مفادوں کے لئے کام کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہر ہر قدم پر کامیابی عطا فرمائی۔ مولانا فرماتے تھے کہ ملک میں جمہوری نظام اسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب ملک کی اقلیتیں مطمئن ہوں۔

مولانا آزادؒ کے بعد ملّت کا آخری سہارا مجاہدِ ملّت کی ذات تھی۔ جبلپور، ساگر کے خونی واقعات ہوں یا بھوپال، مبارک پور، علیگڈھ، میرٹھ کے بھیانک فسادات، سب جگہوں کے مظلوم اور ستم زدہ مسلمان مولانا کے پاس پہونچتے تھے۔ اور مولانا خود فساد زدہ علاقوں میں پہونچ کر ایک طرف تو مسلمانوں کی ہر طرح کی امداد کرتے اور دوسری طرف مقامی اور مرکزی حکومتوں کو دادرسی کے لئے مجبور کرتے تھے۔

آخر میں مجاہدِ ملت کا ایک بہت بڑا کارنامہ "انڈین مسلم کنونشن" ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد ہندی مسلمانوں کا اپنی نوعیت کا یہ پہلا اجتماع تھا جس میں ہر طبقہ اور ہر مکتب خیال کے مسلمانوں نے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر اپنے جائز اور مناسب مطالبات کو حکومت کے سامنے پیش کیا حکومت کے بعض مقتدر افراد جن کو اس وقت تک "سیکولرازم" کے صحیح مفہوم پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا، اس اجتماع پر چونکے اور بعض مسلم رہنماؤں نے بھی نکتہ چینی کی مگر مجاہدِ ملت نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ وہ بار بار فرمایا کرتے تھے کہ "جب ہم نے آزادی سے قبل مسلم فرقہ پرستی سے جنگ کی ہے تو آزادی کے بعد ہندو فرقہ پرستی سے لڑنا بھی ہمارا ہی کام ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے مجاہدِ ملت کو علم و فضل، استقامت و عزیمت، جرأت و بصیرت اور اخلاص و ایثار کی نعمتوں سے نوازا تھا۔ اور انھوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو ملک و ملت کی از سرِ نو تعمیر کے لئے وقف کردیا تھا خصوصاً ملّتِ ہندیہ کو اُن کی رہنمائی کی سخت ضرورت تھی مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر شخص کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔ وہ علیم و بصیر ہے۔ اپنی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے۔ مولانا کے انتقال سے نہ صرف جمعیۃ علماء ہند یتیم ہوگئی بلکہ پوری ملت ان کے لئے سوگوار ہے۔ اور مولاناؒ کا انتقال ملک و ملّت کے لئے ایک بڑا سانحہ ہے۔

یہ چیز ہمارے لئے یقیناً باعث طمانیت ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کے قائم مقام ناظم اعلیٰ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے ایک طویل عرصہ تک مجاہدِ ملت کی معیت و رفاقت میں کام کیا ہے۔ یقین ہے کہ یہ حضرات مجاہدِ ملتؒ کے نقش قدم پر چلیں گے۔ اور ان کی قیادت میں جمعیۃ علماء قوم و ملت کے تقاضوں کو پورا کرتی رہے گی۔

مجاہد ملت رحؒ سے میری آخری ملاقات امریکہ جانے سے قبل حافظ محمد ابراہیم صاحب کی کوٹھی پر ہوئی۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحبان کی ہدایت ہے کہ مولانا کے پاس زیادہ دیر بیٹھ کر گفتگو نہیں کی جائے۔ میرے ساتھ حافظ عبد السلام صاحب (سکندر آباد ضلع بلند شہر) اور جناب حاجی محمد صالح صاحب (کوٹھی حاجی علی جان) بھی تھے۔ تقریباً دس منٹ کے بعد جب ہم لوگوں نے اجازت چاہی تو مولانا نے آبدیدہ ہوکر فرمایا کہ اتنی جلدی کیا ہے، ابھی کچھ دیر اور بیٹھئے مجھے سکون مل رہا ہے۔ پانچ منٹ کے بعد پھر اجازت چاہی تو فرمایا، کہ جب تک دہلی میں قیام رہے کبھی کبھی آجایئے۔ اس کے بعد دو تین مرتبہ ملاقات کے لئے گیا چار پانچ دن کے بعد مولانا بغرض علاج امریکہ تشریف لے گئے۔ مرض کی نوعیت معلوم کرکے تشویش تو ضرور پیدا ہوگئی تھی مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ مولانا عنقریب ہم لوگوں سے جدا ہوجائیں گے۔ امریکہ سے واپسی کے بعد متعدد دفعہ ارادہ ہوا کہ مولانا کی عیادت کے لئے دہلی چلوں۔ مگر اپنی علالت کسی طویل سفر کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ انتظار تھا کہ صحت اور کچھ قوت ہوجائے تو مولانا سے ملاقات کروں۔ یکایک دلی ریڈیو سے یہ ہوش ربا خبر ملی کہ مجاہد ملتؒ ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہوگئے۔ انا للہ الخ دعا ہے کہ مولائے کریم مجاہد ملتؒ کی روح کو اپنے آغوش رحمت میں جگہ دے اور ان کی وفات سے ملت کو جو نقصان عظیم پہونچا ہے اپنے فضل و کرم سے اس کی تلافی فرمائے۔ آمین ثم آمین

ھو الغفور الرحیم القدیر

۲ ۶ ۴ ۹ ۱

قطعۂ سال وصال مقبول وطن مجاہد ملت علیہ الرحمۃ

۲ ۶ ۴ ۹ ۱

زعیم قوم و وطن آنکہ حفظ رحمٰن بود ‏— ملیکِ علم و کمال و سیاستِ علیا
بجان نثاریٔ ملّت مجاہد ملّت ‏— بسر فروشیٔ قوم و وطن دُرِ یکتا
قویم جادۂ حق و صداقت و انصاف ‏— انیس بے کس و مظلوم با خلوص و صفا
ستونِ حریتِ ملک شیرِ ہندوستان ‏— زہے مدبرِ اعظم مفکرِ اعلا
حیات او ہمہ بے لوث بے غرض بیباک ‏— فتادتش بخروش و بجوشِ ہوش ادا
حیاتِ او ہمہ سرگرم کار یک جہتی ‏— گذاشت نقش قدم رہبرانِ قومی را
زہے خطیب و خوش واعظِ لطیف و فصیح ‏— بر امتناعِ نظیرش شہادتِ عقلا
بعزم و ہمتِ راسخ بجوشِ ایمانی ‏— کسے ندید چنان شیر ملتّے بیضا
بدرد مندیٔ امّت فدا نمود حیات ‏— بجان سپاریٔ ملت نمونۂ شہدا
از ارتحال جگر سوز حسرت و افسوس ‏— یتیم و بے کس و حیران بماند خلق خدا
بغیر ساقیٔ ملّت چہ لطفِ مے خانہ ‏— بماند ہیچ مے و جام و ساغر و مینا

بسالِ سانحہ جان گداز راغب گفت
غروب شد مہ علم و فنون از دنیا

---

۲ ۶ ۴ ۹ ۱

(حکیم نور العین حسین راغب، لیکچرار طبیہ کالج علیگڈھ)

ایک عظیم رہنما اور مجاہد کی سبق آموز زندگی

جس نے —o

اپنی پوری متاعِ زندگی ہمدردیٔ عوام اور خدمتِ خلق کی راہوں میں لٹائی۔

جس کے —o

ایثار و کردار، ریاضتوں اور قربانیوں نے مُلک و مِلّت کو سربلندی بخشی۔

جس کے —o

عزم و ہمت نے ۱۹۴۷ء کے طوفانِ حوادث کا رُخ پھیر دیا۔

جس نے —o

مُلک کے گوشہ گوشہ کی خاک چھان کر آزاد ہندوستان میں ملتِ اسلامیہ کو نئی اور باعزت زندگی سے روشناس کرایا اور عزتِ نفس، خودداری اور وطن پروری کی شاہراہ دکھائی۔

جمعیۃ علماء ہند کا خراج عقیدت

تعزیتی قرارداد

"مورخہ ۲۸ اکتوبر ۶۲ء" جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس اپنے عزیز ترین رفیق و رہنما مجاہد ملت حضرت مولینا محمد حفظ الرحمٰن صاحبؒ ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماءِ ہند کی وفات حسرت آیات پر قلب پُر درد اور جگر پُر سوز کے ساتھ اظہارِ قلق کرتا ہے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کو جس طرح قدرت نے علم و فضل کی دولت سے نوازا تھا علمی بصیرت، فکرِ رسا، تعمقِ نظر، ادبی ذوق اور تحقیق و تفتیش کا وہ شوق عطا فرمایا تھا جس نے آپ کو بہترین مصنّف بنایا، فصاحت و بلاغت اور خطابت کی وہ بے نظیر قدرت عطا فرمائی تھی کہ آپ ملک کے بے مثال خطیب تھے۔ آپ کو وہ فراست عطا فرمائی تھی جو مومن کامل کی شان ہے۔ آپ کو وہ سوجھ بوجھ اور سیاسی تدبر عطا ہوا تھا جس نے آپ کو ملک کا ممتاز رہنما اور ملک کی اعلیٰ سیاست کا ایک رُکن بنا دیا تھا، آپ کو وہ حوصلہ وہ ہمّت اور وہ جرأت نصیب ہوئی تھی کہ حق و باطل کے ہر ایک معرکے میں آپ کا قدم آگے رہتا تھا۔ معاملہ فہمی اور رسائی فکر کا وہ جوہر آپ کو میسّر تھا جو ہر پیچیدہ معاملہ کی گتھی کو آسانی سے سلجھا دیتا تھا صاف گوئی اور راست بازی نے آپ کا وزن اتنا بڑھا دیا تھا کہ ہر مخالف اور موافق کی گردن آپ کے احترام کے سامنے خم تھی اور نہ صرف دوست بلکہ دشمن بھی آپ کے اعلیٰ کردار کے مدّاح تھے، ان تمام اوصاف اور کمالات سے بڑھ کر قدرت کے دستِ کرم نے آپ کو ملک و ملّت کا وہ درد عطا فرمایا تھا کہ آپ کا ہر نفس سوز و گداز تھا اور آپ کی حیاتِ طیّبہ کا ہر لمحہ سراپا سر جہاد بن گیا تھا اسی بنا پر آپ کو صحیح معنی میں مجاہد ملّت کہا گیا اور اتنا کہا گیا کہ یہ خطاب آپ کے اسم مبارک کا جزو بن گیا۔ آپ کی زندگی کا ایک معتدبہ حصّہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں صرف ہوا۔ آپ نے حیاتِ باشعور کے میدان میں قدم رکھا تو سیاسی ذوق آپ کا ہم نفس تھا، جس نے آپ کو جنگِ آزادی کا جانباز کمانڈر بنا دیا۔ جس کا اقدام تحریک آزادی کے ہر موڑ پر فاتحانہ رہا اور جب ہندوستان آزاد ہوگیا تو اسی جذبہ اور احساس نے آپ کی تمام صلاحیتوں کو ملک و ملّت کی تعمیر میں منہمک کر دیا اسی جذبہ اور قوتِ عمل کے ساتھ آپ انڈین نیشنل کانگریس کے ممتاز ممبر و ہند پارلیمنٹ کے ایک باوقار رکن رہے لیکن ذوق و احساس کی ان تمام رنگینیوں میں جو جماعت آپ کو سب سے زیادہ محبوب تھی وہ جمعیۃ علماء ہند تھی۔ جس کے لئے جد و جہد کی تمام سرگرمیاں اس وقت سے وقف تھیں جب سے نظام جمعیۃ علماء ہند کا وجود ظہور پذیر ہوا، اور جب سے آپ نے سن شعور کی پہلی منزل میں قدم رکھا تھا۔ اس چالیس سالہ دور میں حفظ الرحمٰن جمعیۃ علماء ہند کے تھے اور جمعیۃ علماء ہند حفظ الرحمٰن کی۔

تقریباً ۱۸ سال تک آپ کی سربراہی نظامت علیا جمعیۃ علماء ہند کی قباپوش رہی۔ اس عرصہ میں آپ کا قابل قدر تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی افادیت کو آپ نے پورے ہندوستان کے لئے عام اور نو آزاد ملک کی پُر آشوب سیاست میں اس کا موقف سب سے بُلند کر دیا۔

آپ کے یہی اعلیٰ کمالات ہیں کہ آج ہند و بیرون ہند کے تمام سیاسی سماجی اور مذہبی حلقے آپ کی وفات پر صفِ ماتم بچھائے ہوئے ہیں۔ اور ہر شاہ و گدا رنج و الم میں شریک ہے۔

جمعیۃ علماء ہند اپنی عظمت و وقار کے اس علَم بردار اعلیٰ کی وفات پر جتنا بھی افسوس اور ماتم کرے کم ہے۔

بیشک جمعیۃ علماء ہند آج سوگوار ہے اور حضرت مجاہد ملت مرحوم کے پسماندگان کے سوگ میں شریک ہے۔ مگر اس کا احساس کا یہ ہے کہ حضرت مرحوم کی صحیح یاد اور آپ کے ساتھ سچی ہمدردی یہ ہے کہ اس مشن کی تکمیل کی جائے، جس کے لئے حضرت نے اپنی زندگی وقف کی، انتہا یہ کہ ان ہی سرگرمیوں میں حیات عزیز کو قربان کر دیا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ مجاہد ملت کو عباد مقربین کے زمرہ میں شامل فرما کر اپنی بے شمار نعمتوں سے نوازے۔ آپ کے تمام پسماندگان کو دین اور دنیا کی برکتیں عطا فرمائے۔

مجاہدِ ملّت کے چند کارنامے

تحریکِ آزادی اور تعمیر و ترقی کے ہر ایک موڑ پر قائدانہ اقدام

از حضرت مولانا سیّد محمّد میاں صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند

تقریباً سات ماہ گذر گئے جب مجاہد ملّت رخصت ہوئے تھے۔ بڑے سے بڑا زخم اس عرصہ میں مندمل ہوجاتا ہے مگر جو زخم مجاہد ملّت کی مفارقت سے پڑگئے ہیں وہ مندمل تو کیا ہوتے، اُن کی ٹیس میں بھی فرق نہیں آیا ہے۔ جیسے ہی مجاہد ملّت کا خیال آتا ہے۔ دل قابو میں نہیں رہتا، تو قلم کس طرح قابو میں رہ سکتا ہے۔ لہٰذا اس طویل بیان میں جہاں جہاں انتشار محسوس ہو آپ اسے نظر انداز فرمائیں مضطرب کا اضطراب قابل معافی ہوتا ہے۔ البتہ اس منتشر مضمون میں بہت کچھ تاریخی مواد مل جائیگا۔ اگر آپکو تاریخ سے دلچسپی ہے تو آپ اس کی قدر کریں گے

محمّد میاں

سبحان الذی یقضی فی عبادہ بما یشاء کیف یشاء والصلوٰۃ والسّلام علی رسولہ خاتم الانبیاء الذی علّمنا الرضاءَ بالقضاء۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہم بھی "صاحب قلم" ہیں۔ مگر ہمارا قلم کیا ہے؟ ایک بے حقیقت کھلونا۔ اوپر سے نیچے گرجائے تو ریزہ ریزہ ہوجائے ذرا سی نمی سے حرفوں کی نمود ختم۔ کہیں بے احتیاطی سے رکھا جائے تو کیڑے چاٹ جائیں۔

ایک قلم وہ ہے جسے قلم تقدیر کہتے ہیں۔ سارا جہان ادھر سے اُدھر ہوجائے مگر کیا مجال کہ نوشتہ تقدیر کا ایک حرف بھی بدل سکے

یہ ناکارہ سمجھ رہا تھا کہ جب تک وہ زندہ ہے مجاہد ملّت کو دامت برکاتہٗ اور مدظلہٗ العالی ہی لکھتا رہے گا اور جب یہ نفتر حقیر پیوند خاک ہوچکے گا تو ایک عرصہ کے بعد وہ وقت آئے گا کہ مجاہد ملّت کے لئے محد اور تابوت کی ضرورت ہوگی۔ اور اُن کے واسطے رحمۃ اللہ، غفر اللہ لہٗ قدس اللہ سرّہٗ اور نور اللہ مرقدہٗ جیسے الفاظ استعمال کئے جائیں گے۔

میری عمر اگرچہ تقریباً تین سال کم تھی مگر اپنی اور مولانا کی صحت اور جسمانی قوتی کا موازنہ کرتا تھا تو یہ اندازہ صحیح ہی معلوم ہوتا تھا۔ مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ قلم تقدیر کچھ اور لکھ چکا ہے۔ اور حد امکان کی آخری سے آخری کوشش بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتی۔

ہاں قلم تقدیر کا ہم پلّہ ایک اور قلم ہے۔ وہ ہمارے ہاتھ میں تو نہیں رہتا۔ البتّہ ہمارے ساتھیوں کے ساتھ ہر وقت اس کو جنبش دینے میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ ہمارے ساتھی وہ واجب الاحترام فرشتے ہیں جنھیں عرف میں "کراماً کاتبین" کہا جاتا ہے جو ہمارے ہر ایک قول اور فعل کو لکھتے رہتے ہیں۔

ما یلفظ من قول الّا لدیہ رقیب عتید

بیشک مشیت ایزدی اور رحمتِ خداوندی کی بوندیں بسا اوقات اس تحریر کے خراب یا کمزور حصّوں کو مٹا بھی دیتی ہیں۔ یمحو اللہ ما یشاء ویثبت مگر جو حرف باقی رہیں گے وہ ایسے اَمٹ اور ایسے پائیدار ہوں گے کہ صورِ اسرافیل بھی ان کو نہ مٹا سکے گا۔

یہ وہ نوشتہ ہوگا جو قیامت کے روز اصحاب یمین کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اور حضرت مجاہد ملت جیسے خوش نصیب اُس کو دیکھتے ہی

خوشی سے پکاریں گے۔

هَاؤُمُ اقْرَءُوا كِتَابِيَه

آئیے آئیے پڑھئے یہ میری دستاویز

اور اگر ہم دنیا کے اصطلاحی الفاظ استعمال کریں تو شاید بامحاورہ ترجمہ یہ ہو۔ آئیے۔ ملاحظہ کیجئے۔ یہ سپاسنامہ جو مجھے دیا گیا ہے۔

یہ حقیر فانی جو یہ سطریں لکھ رہا ہے اُمید ہے کہ یہ بھی باقی رہیں گی کیونکہ ان میں اُس تحریر کا مواد ہے جو قیامت کے روز مجاہد ملت کو پیش کی جائے گی جو انشاء اللہ قابل فخر سپاسنامہ کی شان رکھے گی۔

خود مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کو اس تحریر کا بہت خیال رہا کرتا تھا چنانچہ غالباً ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے۔ جب دو قومی نظریہ کا آتش فشاں پھوٹا ہوا تھا اور ہر طرف خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ میں نے ایک بیان دینا چاہا۔ بیان اپنی جگہ صحیح تھا مگر اُس کا نتیجہ یہ ہو سکتا تھا کہ اشتعال میں اضافہ ہو اور کچھ اور خون خرابہ ہو جائے۔

حضرت مجاہد ملت سے میں نے تذکرہ کیا۔ فرمایا۔ ہرگز نہیں۔ خون کے دھبوں سے خدا نے ہمارا دامن پاک رکھا ہے۔ آپ یہ دھبہ کیوں لگاتے ہیں۔

چند کارنامے

احادیث مقدسہ میں "اغاثۃ ملہوف" کے بہت فضائل بیان فرمائے گئے ہیں۔ یعنی مظلوم اور مصیبت زدہ کی فریاد رسی اور امداد۔ اس میں وہی پیش پیش ہوگا جس کا دل پُردرد اور جگر پُرسوز ہو۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامی دور میں اور اُس کے بعد جو واقعات پیش آتے رہے انھوں نے مجاہد ملت کے اس وصف کو اتنا نمایاں کر دیا ہے کہ آپ کی ذات۔ ہمدردی اور فریاد رسی کی زندہ جاوید مثال بن گئی ہے۔

ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات

یہ خاص وصف جو بلا مبالغہ لاکھوں مظلوموں کے زخموں کا مرہم ثابت ہوا۔ جس نے بیشمار مصیبت زدوں کی جانیں بچائیں دیکھنے والوں نے اس کے "چکنے چکنے پات" اسی وقت دیکھ لئے تھے جب تقریباً ۴۵ سال پہلے ریلوے اسٹیشن کانٹھ کے قریب ایکسپریس کے ہولناک تصادم کا حادثہ پیش آیا تھا۔ اس حادثہ میں کئی بوگیاں چکنا چور ہو گئی تھیں۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ اس ایکسپریس کا گارڈ جس کو مولانا ذاتی طور پر بھی جانتے تھے اس طرح چور چور ہو گیا تھا کہ اس کو فقط سیٹی کے نشان سے شناخت کیا جا سکا تھا۔

اس حادثہ میں ختم ہونے والوں کی لاشیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں انھیں کے بیچ میں وہ نیم جان زخمی بھی تھے جن کی کراہ سے دل لرزتے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ لاشوں تک پہونچنا۔ اُن کو اٹھانا۔ زخمیوں کی مدد کرنا بڑے دل گردہ کا کام تھا پکّی عمر کے آدمی بھی اس کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ قصبہ کانٹھ جس کے اسٹیشن کے قریب یہ حادثہ پیش آیا حضرت مجاہد ملت کے وطن عزیز "سیوہارہ" سے تقریباً سات میل کے فاصلہ پر ہے۔

وہ کیا جذبہ تھا جس نے اٹھارہ یا اُنیس سالہ حفظ الرحمٰن کو جو قانوناً بالغ بھی نہیں تھا اس پر آمادہ کیا کہ اپنے قصبہ سے سات میل چل کر جائے حادثہ پر پہونچے اور بڑے آدمیوں کے زمرہ میں شامل ہو کر وہ کام کرے جو بڑوں کے لئے بھی سبق آموز ہوں، مزدوروں کی طرح لاشیں اُٹھائے اور تڑپنے والے زخمیوں کی تیمارداری کرے اور جب تک اس کام سے پوری طرح فراغت نہ ہو جائے۔ اپنے مکان واپس نہ آئے۔

کچھ لاشوں کو جلایا گیا۔ کچھ کو دفنایا گیا۔ یہ سب کچھ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔

یہ جذبہ جس نے اس بچپن میں اس نوخیز بہادر کو اس والہانہ خدمت پر آمادہ کیا۔ نشان تھا اُس سوز اور اس درد کا جو فطرت مجاہد کو عطا ہوا تھا۔ وہ بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھا کہ تمام ستم رسیدہ مظلوموں اور کمزوروں کا درد قلب مجاہد کا درد بن گیا۔ بقول شاعر

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

تحریکات کا دور جدید۔ اور مجاہد ملت کی مجاہدانہ زندگی کا آغاز

آزادیٔ ہند کی تحریک اگرچہ بہت پہلے سے شروع ہو چکی تھی اور اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ جیسے ہی یورپ کے بنیوں نے دوکانداری کو حکمرانی کی شکل دی، آزادی کی تحریک شروع ہو گئی تھی، تو واقعات اس دعوے کا بھی ناقابل تردید ثبوت پیش کر دیں گے۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پچھلی جنگ عظیم (۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۷ء) کے بعد تحریک آزادی نے ایک ایسی صورت اختیار کی جو پہلے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں

تھی۔ جب دیش باپو گاندھی جی نے "ستیہ آگرہ" کا راستہ اختیار کیا اور عدم تشدد (آہنسا) یا مقاومۃ بالصبر کی طاقت کو جنگ آزادی کا حربہ قرار دیا۔ جب وہ تجویزیں جو خفیہ انجمنوں میں منظور کی جاتی تھیں برملا اسٹیجوں پر پیش کی جانے لگیں اور مقابلہ کے وقت میدان جنگ کو نوجوانوں سے پاٹ دینے کے بجائے رضاکاروں سے جیل خانوں کو بھرا جانے لگا

یہ پروگرام جنگ آزادی کے پہلے طریقوں سے اتنا مختلف تھا کہ عام طور پر اسی کو تحریک آزادی کا آغاز قرار دیا گیا۔

بیسویں صدی عیسوی کا بیسواں سال (۱۹۱۹ء) ہمیشہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں "صبح صادق" تسلیم کیا جائے گا۔ کیونکہ اسی ۱۹۱۹ء کے مارچ میں ستیہ گرہ کی تجویز منظور کی گئی۔ اسی سال جمعیۃ علماء ہند کے نظام جدید کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اور اسی سال جلیانوالہ باغ کا وہ مشہور حادثہ پیش آیا جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار ہندوستانیوں نے جنگ آزادی کی مردہ تحریک میں اپنے مظلوم و معصوم خون کے انجکشن سے جان ڈالی اور ایک کامیاب تحریک کی آبیاری کی۔

سیوہارہ کے قریب ٹرین کا حادثہ اسی سال یا اس سے ایک سال پہلے پیش آیا تھا۔

جو نوخیز نوجوان ایکسپریس کے حادثہ میں ہمدردانہ ایثار و فدائیت کے جوہر دکھا کر ہر ایک صاحب بصیرت کو حیرت زدہ کر چکا تھا، ناممکن تھا کہ جلیانوالہ باغ کا حادثہ سن کر اس کی رگ حمیت میں جوش نہ آتا اور عواقب و نتائج سے بے پرواہ ہو کر خدمت خلق اور آزادی ملک کے میدان میں مردانہ وار قدم نہ بڑھاتا۔

چنانچہ یہ خود ساختہ والنٹیر جس نے ایکسپریس کے حادثہ میں اپنے مونڈھوں پر لاشیں اٹھائی تھیں، جب جنگ آزادی کا بگل بجا تو وہ خدمت خلق اور ہمدردیٔ ملت کے میدان میں سب سے آگے تھا۔

مولوی مقبول احمد صاحب سیوہاروی اس دور کے چشم دید شاہد اور مجاہد ملت کے رفیق ہیں اُن کا مضمون اسی نمبر میں شائع ہو رہا ہے اس میں ان ابتدائی سالوں کی تفصیل موجود ہے۔ ہم بنظر اختصار اس حصہ کو حذف کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ابھی تک مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جو درجات عربی کے طالب علم تھے پوری طرح تحصیل نہیں کر سکے تھے کہ جنگ آزادی نے دلوں میں تڑپ پیدا کی۔ جن جانبازوں اور سرفروشوں نے آگے بڑھ کر ہتھکڑیوں

ایک رہنما کی حیثیت سے سب سے پہلا کارنامہ

جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کو جنگ آزادی میں شرکت کی دعوت

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور اُن کے رفقاء اور احباب کے حالات سے واقفیت رکھنے والے اگر یہ خیال کریں کہ آپ کی وہ مخصوص سوسائٹی جس کی رہنمائی حافظ محمد ابراہیم صاحب موجودہ وزیر حکومت ہند اور مولینا بشیر احمد صاحب (بھٹہ) مرحوم کیا کرتے تھے وہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی ساخت اور پرداخت، اور اُن کے فطری جوہر کو نکھارنے میں مددگار ثابت ہوئی تو یہ خیال بڑی حد تک صحیح ثابت ہوگا۔ مگر ۱۹۲۵ء میں پہلے گاندھی جی کے ساتھ ڈانڈی کے مارچ میں شریک ہونا، وہاں پہونچکر نمک بنانا اور پھر جمعیۃ علماء ہند کے ہونے والے اجلاس میں شرکت۔ کانگریس کی تجویز پیش کرنا، یہ اقدامات اس سوسائٹی کی رہنمائی اور اس کے اثر سے نہیں تھے بلکہ خود آپ کی ذاتی فراست و بصیرت اور آپ کی جرأت مندانہ فطرت کے مدبرانہ تقاضے تھے کیونکہ آپ اس زمانہ میں سیوہارہ، نگینہ اور دہلی سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ڈابھیل ضلع سورت کے جامعہ اسلامیہ میں مدرس عربی کی حیثیت سے مقیم تھے

جہاں تک ہمیں معلوم ہے ڈابھیل کے اس ..... ماحول میں آپ کے خیالات سے متاثر ہونے والے یا آپ کی ہمنوائی کرنے والے صرف ایک رفیق تھے یعنی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی (ناظم اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی) لہٰذا اس موقعہ پر جو کچھ مجاہد ملت نے سوچا وہ خود انھیں کا فکر تھا اور جو اقدام کیا وہ خود مجاہد ملت کا فیصلہ تھا۔

جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس ۱۹۲۵ء میں قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد میں ہو رہا تھا۔ احقر اس زمانہ میں مرادآباد کی مشہور درسگاہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں درس و تدریس کی خدمات انجام دے رہا تھا مرادآباد ضلع کا صدر مقام ہے اور قصبہ امروہہ مرادآباد سے تقریباً اٹھارہ میل کے فاصلہ پر ہے اس لئے مرادآباد کے حضرات بھی اس اجلاس کے داعی اور ذمہ داروں میں شامل تھے۔ مگر احقر اس وقت تک صرف ایک مدرس تھا، جس کو اس کے اکابر، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) اور حضرت الاستاذ مولانا اعزاز علی صاحب (سابق شیخ الفقہ والادب دارالعلوم دیوبند) نے چند ماہ پہلے مدرسہ حنفیہ آرہ، شاہ آباد (صوبہ بہار) سے منتقل کر کے یہاں بھیجا تھا۔

البتہ جذبۂ صادق نے اس احقر کو حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب مدظلہ العالی اور حضرت مولانا قاری عبداللہ صاحب مرحوم کی پارٹی کا ایک رکن یا ایک رضا کار بنا دیا تھا اور اس بنا پر اس اجلاس سے احقر کا تعلق صرف وزیٹر یا تماشائی کا نہیں تھا۔ بلکہ یہ حیثیت ہوگئی تھی کہ ایک مبصر کی طرح قریب سے قریب ہو کر حالات کا جائزہ لے سکے ابھی اجلاس میں تقریباً دو ہفتے باقی تھے کہ اخبارات نے اپنے لاکھوں ناظرین کو آگاہ کر دیا کہ

"جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس امروہہ میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب تحریک آزادی میں شرکت سے متعلق تجویز پیش کریں گے۔

(جہاں تک یاد پڑتا ہے تجویز کے الفاظ بھی اخبارات میں شائع کر دیئے گئے تھے)

گردش لیل ونہار کے نتائج بھی عجیب وغریب ہوا کرتے ہیں۔ تحریک آزادی میں شرکت کی تجویز جو اس وقت آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی باعزت زندگی کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے ۱۹۲۹ء کے ماحول میں انوکھی، اجنبی، بھیانک اور بعض حلقوں میں نفرت انگیز اور وحشت آفریں تھی، کیونکہ آٹھ نو سال کے واقعات نے ہندوستان کی فضا کچھ ایسی بنا دی تھی کہ آزادی غیر متوقع ہی نہیں رہی تھی بلکہ ایک بڑا طبقہ وہ تھا جو تحریک آزادی کو خودکشی کے مرادف سمجھنے لگا تھا۔

وہ کثیر تعداد جو تحریک خلافت ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۲ء میں سرگرم رہ چکی تھی۔ وہ آزادی کی حامی تھی مگر اس کے سامنے بھی ایسی معقول وجوہات تھیں جن کی بنا پر وہ اب تحریک آزادی میں شرکت کے لئے کچھ شرائط ضروری سمجھتی تھی۔

مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۲ء میں جب کہ تحریک شباب پر تھی اور بہت بڑی اکثریت کامیابی کو یقینی سمجھتی تھی "چوری چورہ" کے واقعہ سے متاثر ہو کر تحریک کو ختم کر دیا تھا۔

مہاتما گاندھی کے اس فعل سے جو شکوک پیدا ہوئے تھے تقریباً چالیس سال گذر گئے ان کا ازالہ نہیں ہو سکا۔

اعتراض کرنے والے تو گاندھی جی کی نیت پر بھی شک ظاہر کیا کرتے تھے کہ مسلمانوں کی پیش قدمی گاندھی جی کو پسند نہیں تھی۔ لیکن خود گاندھی جی نے جو وجہ بیان کی وہ بھی سی۔ آر۔ داس جیسے لیڈروں کو مطمئن نہیں کر سکی۔

گاندھی جی نے تحریک کی بنیاد "اہنسا" اور عدم تشدد پر رکھی تھی گاندھی جی کا عذر یہ تھا کہ "چوری چورہ" میں چھ کانسٹبلوں کو قتل کر کے عوام نے ظاہر کر دیا ہے کہ "اہنسا" کی تحریک چلانے کی صلاحیت ابھی ان میں پیدا نہیں ہوئی ہے۔

اب مولانا آزاد کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں

"گاندھی جی کے علاوہ اور سب لیڈر (خود مولانا موصوف بھی) جیل میں تھے۔ گاندھی جی نے چورہ چوری کے حادثہ کی وجہ سے تحریک کو معطل کر دیا۔ سیاسی حلقوں میں اس کا شدید رد عمل ہوا اور سارے ملک میں شکست کی فضا پیدا ہوگئی...... مسٹر سی آر داس کو یقین تھا کہ تحریک بند کرنے میں گاندھی جی نے ایسی غلطی کی ہے جس سے شدید نقصان ہوگا۔ اس نے سیاسی کام کرنے والوں کی ہمتیں پست کر دی ہیں کہ اب پبلک میں جوش برسوں تک پیدا نہ کیا جا سکے گا"

مختصر یہ کہ ایک طبقہ وہ تھا جو اگرچہ تحریک آزادی کا حامی تھا مگر اس کو گاندھی جی کی قیادت پر اعتماد نہیں تھا اسے خطرہ تھا کہ یہ مہاتما اپنے مخصوص عقیدے کی وجہ سے کسی بھی مرحلہ پر بلا استصواب و بلا مشورہ تحریک بند کرنے کی پرانی غلطی دوبارہ لوٹا سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ظاہری اور قدرتی حقیقت تھی کہ انگریزی حکومت چونکہ اس تحریک کا ہدف تھی تو لازمی بات تھی کہ انگریزی حکومت اور انگریز اپنے جملہ ذرائع عوام کو تحریک آزادی سے برگشتہ کرنے میں صرف کرتے چنانچہ ان کا یہ عمل پوری قوت سے جاری تھا۔

مختصر یہ کہ ۱۹۲۹ء میں چند طبقے وہ تھے جو تحریک کے مخالف تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ اگر ممکن ہو تو وہ زبانیں کھینچ لی جائیں اور وہ حلقوم ذبح کر دیئے جائیں جن سے نعرۂ آزادی بلند ہو۔

(۱) انگریز۔
(۲) انگریزوں اور ان کی حکومت کے بہی خواہ
(۳) وہ طبقہ جو تحریک خلافت کی ناکامی سے اتنا مایوس ہو گیا تھا کہ اب اس جدوجہد کو عبث اور بیکار محض سمجھتا تھا۔
(۴) وہ طبقہ جو اگرچہ محب وطن اور حریت پسند تھا، تحریک آزادی کے

لئے قربانیاں بھی پیش کر سکتا تھا لیکن شرکت تحریک سے پہلے چند شرطیں تسلیم کرا لینی ضروری سمجھتا تھا

ان سب کے برخلاف صرف ایک جماعت وہ تھی جو آزاد ہندوستان میں ہر ایک فرقہ اور ملت کی باوقار زندگی کیلئے ایک فارمولے کی ضرورت تو ضرور محسوس کرتی تھی لیکن اب جبکہ جنگِ آزادی شروع ہو رہی ہے اور انگریز اور اُس کے تمام ہوا خواہ اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں اور یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ اس پُر آشوب فضا میں کوئی فارمولا متفقہ طور پر طے ہو جائے اور یہ بات قطعاً ممکن ہے بلکہ یقینی ہے کہ مسٹر جناح نے اگر ۱۴ نکات پیش کئے ہیں تو جیسے ہی ان ۱۴ نکات کی منظوری کا وقت آئے اسی شد و مد سے ۲۸ نکات کا کوئی دوسرا فارمولا اُبھر کر سامنے آجائے اور جب یہ چکر چل رہا ہو تو انگریز کی موجودگی میں آزادی کی جنگ کبھی شروع نہیں ہو سکے گی اور اگر شروع ہوگی تو مسلمان اُس میں شرکت نہیں کر سکیں گے جو نتیجہ کے لحاظ سے مسلمانوں کی سیاسی موت ہوگی۔

اس جماعت میں وہ رہنما شریک تھے جن کو نیشنلسٹ اور قوم پرور کہا جاتا تھا اور ان میں بھاری اکثریت علماء کرام کی تھی۔ ان حضرات کے گہرے غور و فکر نے ایک اور سوال بھی ان کے سامنے رکھا تھا۔

سوال یہ تھا کہ گذشتہ چند سال کے واقعات نے اگرچہ مسلمانوں کو تحریک آزادی سے الگ کر دیا ہے اور مہاتما گاندھی کی شخصیت بھی اُن میں اس درجہ مقبول نہیں رہی ہے مگر یہی تحریک ہندوؤں کے بڑے حلقہ میں جڑ پکڑ چکی ہے اور گاندھی جی نے اس حلقہ میں یہ مقبولیت حاصل کر لی ہے کہ وہ صرف اونچے درجہ کے رہنما یا لیڈر نہیں رہے بلکہ اُن کا شمار ہندوستان کے رشیوں میں ہونے لگا ہے یہاں تک کہ نام سے زیادہ ”مہاتما“ کا خطاب مقبول اور زبان زد ہو چکا ہے۔

مہاتما گاندھی اپنی اس مقبولیت کی طاقت کے ساتھ تحریک شروع کر چکے ہیں اور ہندوستان کا ہر ایک شہر اور ہر ایک حلقہ اس سے متاثر ہو چکا ہے۔ تو کیا مسلمانوں کے مستقبل کے لئے یہ درست ہوگا کہ وہ محض تماشائی رہیں یا انگریز کے دست و بازو بن جائیں۔

جمعیۃ علماء ہند کا یہی اجلاس جس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے، اسی اجلاس کی سبجیکٹ کمیٹی میں مولانا سید سلیمان صاحب جیسے مدبر اور مفکر نے تقریر فرماتے ہوئے کہا تھا۔

انقلاب کی تحریک جب شروع ہو جاتی ہے تو تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ وہ بے نتیجہ ختم نہیں ہوتی۔ بے شک اس کو مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ نیست و نابود معلوم ہونے لگتی ہے لیکن اس کی خاک میں چھپی ہوئی چنگاریاں پھر دہکتی ہیں اور شعلہ بن کر مختلف طاقتوں کو نذرِ آتش کر دیتی ہیں، اب کیا مسلمان یہ پسند کریں گے کہ مخالفِ انقلاب طاقتوں کا ضمیمہ بن کر وہ بھی نذرِ آتش ہو جائیں یا ساحل پر کھڑے ہوئے طوفان کا تماشہ دیکھتے رہیں اور جب طوفان ختم ہو تو وہ اپنی سیاسی حیثیت بھی ختم کر چکے ہوں اور اُن کا شمار بھی اُنہیں پسماندہ قوموں میں ہو جن کے لئے ہندوستان میں نفرت و حقارت کی پالیسی ہمیشہ کے لئے طے ہو چکی ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تقریر میں فقہی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی اور اُن چند علماء کی تردید کی جو انگریزوں کو ”اولی الامر“ کی حیثیت دیکر اُن کے خلاف ”سول نافرمانی“ کی تحریک کو ناجائز قرار دے رہے تھے جن کی پشت پر ایک نواب صاحب اور چند سر صاحبان تھے جو علماء دیوبند سے اپنے پُرانے تعلقات کا واسطہ دیتے ہوئے اسی لئے شریک اجلاس ہوئے تھے کہ معاذ اللہ گمراہ مولویوں کو راہ راست پر لائیں۔

بہاؤ تاؤ اور لین دین کے نظریہ سے آپ قوم پرور مسلمانوں اور علماء کرام کے حق میں جو چاہیں فیصلہ کریں مگر حریت پسندی، عزت نفس، خودداری اور باوقار مستقبل کے جذبات کا تقاضا یہی تھا جس کی دعوت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے دی تھی۔ یہی سبب ہے کہ جو ”حوصلہ مند“ عمل کے وقت لیت و لعل کے عادی نہیں تھے اُن کا تعلق خواہ کسی بھی مذہبی فرقہ اور مکتبۂ خیال سے تھا وہ جمعیۃ علماء کے ساتھ ہو گئے تھے۔

اب یہ کہنا تو قطعاً غلط ہوگا کہ ابوالقاسم مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کی تجویز نے حضرات علماء کو جنگِ آزادی میں شرکت کی طرف متوجہ کیا کیونکہ اگر مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب تحریک نہ کرتے تب بھی جمعیۃ علماء ہند کا فیصلہ یہی ہوتا۔ البتہ یہ درست ہے کہ مولانا مرحوم کے اس اقدام نے حضرت علامہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب۔ حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری۔ حضرت علامہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم

دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا ابو الکلام آزاد، ابو المحاسن مولانا محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت صوبہ بہار حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب رحمہم اللہ جیسے اکابر اور مشاہیر کی موجودگی میں نوجوان مولانا حفظ الرحمٰن کو قائدانہ حیثیت دیدی اور غالباً اسی وقت سے آپ کو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا رکن بنا لیا گیا

اس موقع پر یہ عرض کر دینا بھی ایک تاریخی انکشاف ہے کہ جلسہ عام میں جس نے اس تحریک کی تائید کی وہ ہندوستان کے مشہور خطیب حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ تھے جن کی شعلہ بار تقریر نے جس کا سلسلہ تقریباً تین گھنٹہ تک جاری رہا تھا بہت سے دلوں کی دنیا بدل دی۔ جن میں سے ایک خود یہ راقم الحروف بھی ہے کہ پہلے صرف ایک گوشہ نشین مدرس تھا اور اب جنگ آزادی کا سپاہی بن گیا جس کو قید و بند اور دار و رسن کے خواب آنے لگے۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے تعلق اور علیحدگی

مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب نے تمام تعلیم خود اپنے وطن قصبہ سیوہارہ میں اور کچھ عرصہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں حاصل کی۔ فراغت کے بعد آپ حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ درس حدیث میں داخل ہونے کے لئے دیوبند تشریف لے گئے جہاں آپ نے دورۂ حدیث مکمل کیا۔ اسی ایک سال کے مختصر قیام میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کی بصیرت و فراست نے آپ کو دار العلوم دیوبند کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ چنانچہ فراغت کے بعد ہی آپ کو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے پہلے مدراس بھیجا جہاں کسی مدرسہ میں درس کے ساتھ تبلیغ اور مناظرہ کی خدمت بھی آپ کے سپرد کی گئی اور جب آپ کی قابلیت کے جوہر میدان میں کھل کر سامنے آ گئے ...... تو اگلے سال آپ کو دار العلوم دیوبند میں معین المدرسین کی حیثیت سے خدمت تدریس سپرد کر دی۔ مگر جب کچھ دنوں بعد دار العلوم دیوبند میں تحریک اصلاح نے قوت اختیار کی تو آپ بھی حضرت علامہ کشمیری، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب وغیرہ اساتذہ دار العلوم کے ناراض گروہ کے ساتھ ڈابھیل تشریف لے گئے۔ تقریباً تین سال وہاں جامعہ اسلامیہ میں قیام رہا اور جب ۱۹۲۹ء میں جنگ آزادی کا بگل بجا تو جیسے ہی آپ نے جنگ آزادی میں شرکت کی تحریک پیش کی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے علیحدگی کا بھی تہیہ کر لیا۔ چنانچہ اس اجلاس سے چند ماہ بعد آپ گرفتار ہوئے اور میرٹھ سنٹرل جیل میں محبوس کر دیئے گئے

اس موقع پر آپ کو حضرت مولانا ابو الکلام آزاد سے تعلقات بڑھانے اور فیض صحبت حاصل کرنے کا موقع ملا کیونکہ وہ بھی اسی جیل خانہ اور اسی احاطہ میں تھے مگر وہ بیرک میں نہیں رہتے تھے بلکہ ایک چھولداری میں ان کا اسپیشل انتظام تھا "رکھ رکھاؤ" اور عزلت پسندی جو مولانا آزاد کے مزاج پر غالب تھی وہ یہاں بھی کارفرما تھی۔ اس لئے خاص اوقات ہی میں مولانا سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اگرچہ علمی مذاکرہ اور سیاسی بحث و نظر کے باعث وہ خاص خاص ملاقاتیں بھی کیمیا کا اثر رکھتی تھیں۔

میرٹھ کے مشہور وکیل پیارے لال شرما جو اپنے اخلاق و کردار، تہذیب و شرافت میں اپنی مثال آپ تھے جو ۱۹۳۷ء میں جب کانگریس نے پہلی مرتبہ منسٹری سنبھالی تو یوپی میں وزیر تعلیم بھی بنائے گئے تھے وہ بھی اسی جیل میں تھے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے رات دن کے رفیق۔ ہم نفس اور ہمدم مولانا بشیر احمد صاحب بھٹہ تھے جن کو قدرت نے اسی جیل خانہ اور اسی بیرک میں اس لئے رکھا تھا کہ رات دن ہنستے رہیں اور دوسروں کو ہنساتے رہیں — افسوس اب یہ سب وفات پا چکے۔ آن قدح بشکست و آن ساقی نماند

اب کوئی ایسا بھی نہیں رہا جس سے کچھ مزید حالات معلوم کئے جا سکیں۔

۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۲ء تک
جنگ آزادی کے مختلف دور

۱۹۲۷ء میں گاندھی جی کے ڈانڈی مارچ۔ اور نمک سازی کی تحریک سے جنگ آزادی کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ گاندھی ارون پیکٹ کے بعد مارچ ۱۹۳۱ء میں عارضی طور پر ملتوی کیا گیا۔ اس پیکٹ کے نتیجہ میں جتنے سیاسی قیدی جیلوں میں تھے سب رہا کر دیئے گئے۔ حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب موجودہ صدر جمعیۃ علماء ہند و شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند اور ان کا خادم یہ راقم حروف اور ہمارے بہت سے ساتھی جو اکتوبر ۱۹۲۹ء میں گرفتار کئے گئے تھے اس عام رہائی سے بہرہ اندوز ہوئے کیونکہ ہماری سزا ایک ایک سال کی تھی اور ابھی تقریباً نصف مدت ہی ختم ہوئی تھی مگر مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اس سے بہرہ یاب نہیں ہوئے کیونکہ وہ ہم

سے چند ماہ پہلے گرفتار ہوئے تھے اور ان کی مدت سزا چھ ماہ تھی جو غالباً ۱۹۲۹ء کے آخر میں ختم ہو چکی تھی۔

مگر یہ رہائی پائیدار نہیں ثابت ہوئی۔ گول میز کی تجویز جو خداوندانِ برطانیہ کے پیش نظر تھی اور مقصود یہ تھا کہ گاندھی جی کو اس میں شریک کیا جائے جب تک یہ مقصود پورا نہیں ہوا۔ یہ صلح قائم رہی اور جب یہ کانفرنس ناکام رہی تو ابھی گاندھی جی ہندوستان لوٹنے بھی نہیں پائے تھے کہ نئے وائسرائے لارڈ ولنگڈن کی حکومت نے داروگیر کی تیاریاں شروع کر دیں اور گاندھی جی کی واپسی کے بعد ابھی تین ماہ بھی نہیں گذرے تھے کہ حکومت نے گرفتاریاں شروع کر دیں اور اس طرح تحریک دوبارہ زندہ ہو گئی۔

اس مستقبل کا اندازہ قوم پرور طبقہ اور جنگ آزادی کے رہنماؤں کو پہلے سے تھا چنانچہ وہ بھی اس عرصہ میں خاموش نہیں رہے بلکہ تیاریاں کرتے رہے۔

جمعیۃ علماء ہند کا ادارۂ حربیہ

"تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس موقع پر یہ بات خاص طور سے نوٹ کر لینی چاہیئے کہ جمعیۃ علماء ہند نے جب ۱۹۲۹ء میں جنگ آزادی میں شرکت طے کی تھی تو ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اس کا پلیٹ فارم علیحدہ ہوگا۔ اس کے رضاکاروں کا نظام بھی علیحدہ رہے گا۔ گرفتاریوں کا پروگرام بھی جمعیۃ علماء ہند اپنے ارکان اور کارکنوں کے لئے علیحدہ بنائیگی اور اگر مقدمات وغیرہ کے سلسلہ میں مصارف کی ضرورت ہوگی تو اُن کا انتظام بھی جمعیۃ علماء اپنے طور پر کریگی۔ کانگریس پالیسی اور پارٹی کی طرف نظر نہیں اُٹھائے گی۔ اب ۱۹۳۲ء میں جب تحریک میں دوبارہ جان پڑی تو اس کو زندہ رکھنے کے لئے غذا کی ضرورت تھی۔ پروگرام کے مطابق سول نافرمانی کرتے ہوئے گرفتار ہو جانا تحریک کی غذا تھی۔

مگر اس مرتبہ اس غذا کا فراہم کرنا کانگریس اور "جمعیۃ علماء" دونوں کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ کیونکہ اوّل تو مسلسل تین سال گزر جانے کے بعد کارکنوں کے جوش عمل میں اضمحلال پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر تھا اس کے علاوہ ولنگڈن گورنمنٹ نے اس مرتبہ تحریک شروع ہونے سے پہلے ہی صفِ اوّل کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر لیا تھا۔ مزید برآں ضبطی جائداد اور گرفتاریوں کے سلسلہ میں بھی حکومت کی پالیسی پہلے سے بہت زیادہ سخت ہو گئی تھی۔ ان تمام حالات کی بنا پر اگرچہ کام بہت مشکل ہو گیا تھا مگر ان حالات کا تقاضا یہ بھی تھا کہ تحریک کی رگوں اور پٹھوں میں تقویت کے انجکشن اس پردہ داری کے ساتھ لگائے جائیں کہ سی آئی ڈی کی نظر تفتیش اُن ڈاکٹروں تک نہ پہونچ سکے جو انجکشن کی سوئیاں ہاتھ میں لئے ہوں۔

عام طور پر پروگرام یہ ہوا کرتا تھا کہ ہفتہ میں ایک یا دو مرتبہ رضاکاروں کے جتھے بھیجے جاتے تھے جو برسر عام قانون کی خلاف ورزی کرتے تھے اور گرفتار کر لئے جاتے تھے۔ عام طور پر دفعہ ۱۴۴ نافذ رہتی تھی۔ رضاکاروں کے جتھے خلاف قانون نعرے لگاتے تھے۔ جو جماعتیں خلاف قانون قرار دیدی جاتی تھیں اُن کا پرچم لہراتے یا اُن کا لٹریچر تقسیم کرتے تھے اور جب وہ جلوس بنا کر چلتے تھے تو دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی بھی ہو جاتی تھی پولیس کی کوشش یہ رہتی تھی کہ وہ یہ معلوم کرے کہ رضاکاروں کا جتھا کہاں سے روانہ ہوگا تاکہ روانگی سے پہلے ہی ان کو گرفتار کر لے اور یہ نہ ہو سکے تو جیسے ہی جتھہ روانہ ہو فوراً گرفتار کر لے تاکہ شہر میں خلاف قانون اقدام کا مظاہرہ نہ ہو سکے۔

پورے ملک میں سول نافرمانی اور خلاف ورزی قانون کے اس نظام کو زندہ رکھنے کے لئے ایک مستقل نظام کی ضرورت تھی چنانچہ کانگریس نے جنگی کونسل قائم کر دی تھی اور جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اس نظام کے لئے عربی کا لفظ "ادارہ حربیہ" منتخب کیا تھا۔

وہ زمانہ بھی عجیب تھا۔

جمعیۃ علماء ہند کے صدر مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب اور ناظم اعلیٰ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب تھے مگر وہ ڈاکٹر جس کو بہت سے انجکشن دیئے گئے تھے۔ ابو المحاسن مولانا سجاد صاحب (نائب امیر شریعت صوبہ بہار) تھے۔ رحمہم اللہ۔ "ادارۂ حربیہ" کے کلید بردار یہی حضرت تھے۔

جمعیۃ علماء ہند کے دفتر سے علیحدہ محلہ بلی ماران کی ایک تاریک گلی میں ایک مکان لے لیا گیا تھا۔ حضرت مولانا سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام اسی مکان میں رہتا تھا جس کا علم دفتر کے لوگوں میں سے بھی غالباً صرف قاضی اکرام الحق صاحب کو تھا جماعت کے جو حضرات اسی ادارہ کی ضرورت سے حضرت موصوف سے ملاقات کرنا چاہتے تھے تو قاضی اکرام الحق صاحب ہی اُن کے رہبر بنتے تھے۔

ہمیں یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ حضرت مولانا سجاد صاحب کے دست راست

اور "نفس ناطقہ" یہی رفیق محترم مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کو نظام رضا کاران کا ناظم اعلیٰ یا کمانڈر بنایا گیا تھا اور ان کا کام یہ تھا کہ ملک میں گھوم پھر کر تحریک کا جائزہ لیں اور اس نظام کو کامیاب بنائیں۔

وہ وقت یاد آتا ہے۔ احقر مدرسہ شاہی میں ملازم تھا۔ اور فاضل وقت اور بسا اوقات رخصت لیکر مدرسہ کا بھی وقت اسی تماشے میں صرف کیا کرتا تھا۔

مرادآباد میں خفیہ طریقہ سے مجاہد ملت رح کی تشریف آوری کا پروگرام پہونچا۔ چند ساتھیوں کے ساتھ احقر استقبال کے لئے اسٹیشن پر حاضر ہوا۔

آجکل دہلی جنکشن سے ایک پاسنجر دس بجکر دس منٹ پر مرادآباد جاتا ہے۔ یہی پاسنجر اس زمانہ میں بھی تقریباً اسی وقت دہلی سے روانہ ہوتا تھا اور تقریباً ساڑھے تین بجے مرادآباد پہونچا کرتا تھا۔ مجاہد ملت اسی ٹرین سے مرادآباد پہونچنے والے تھے۔ چنانچہ ٹھیک وقت پر پہونچے۔ مگر حسب معمول سادہ لباس میں ملبوس۔ کھدر کی شیروانی بھی کسی قدر بوسیدہ تھی۔ کچھ ظرافت پسند دوستوں نے عرض بھی کیا کہ کمانڈر صاحب کو تو فوجی لباس میں ملبوس ہونا چاہیئے۔ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کا خاموش تبسم اس کا جواب تھا۔ مگر اس زمانہ میں ایسے عہدوں کی عمر بہت کم ہوتی تھی۔ "اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند" چنانچہ چند روز بعد ہی مجاہد ملت گرفتار کر لئے گئے۔ مقدمہ چلا۔ لیکن مقدمہ کامیاب نہیں ہوا۔ یعنی حضرت مجاہد ملت پر جرم ثابت نہ ہو سکا۔ اس مرتبہ مجاہد ملت رہا ہوگئے۔ البتہ اس اثناء میں احقر گرفتار ہوگیا۔

حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں خصوصاً اس موقع پر اپنا تذکرہ مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ مجاہد ملت رح کی حیثیت اس وقت آل انڈیا ہوچکی تھی۔ وہ کانگریس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے اور نظام جمعیۃ علماء ہند میں وہ آل انڈیا جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے ممبر اور آل انڈیا جمعیۃ علماء ہند کے ادارۂ حربیہ کے افسر انچارج یا کمانڈر تھے اور احقر کی حیثیت صرف یہ تھی کہ مدرسہ شاہی مرادآباد کا مدرس اور جمعیۃ علماء شہر مرادآباد کا ناظم تھا۔ اس موقع پر لفظ لیڈر استعمال کرنا درست ہو تو مختصر تعبیر یہ ہے کہ احقر مقامی لیڈر تھا اور مجاہد ملت آل انڈیا لیڈر تھے۔ مگر خوش قسمتی سے ایک مرتبہ جیل کاٹ چکا تھا اس بنا پر ایک خاص امتیاز حاصل ہوگیا تھا۔

دوسرا امتیاز یہ تھا کہ احقر کو جمعیۃ علماء ہند کا نواں ڈکٹیٹر نامزد کیا جاچکا تھا۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ اس زمانہ میں کانگریس خلاف قانون جماعت قرار دی جاچکی تھی۔ اور جمعیۃ علماء ہند کو اگرچہ انگریزی ڈپلومیسی نے خلاف قانون جماعت قرار نہیں دیا تھا (تاکہ خود انگریزی حکومت کے عمل سے اس کے اس دعوے کی تردید نہ ہو جائے کہ مسلمان تحریک آزادی میں شریک نہیں ہیں) مگر عمل جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ ایسا ہی تھا جیسا کسی خلاف قانون جماعت کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ اس کے دفتر پر پولیس کے چھاپے پڑتے رہتے تھے۔ نمایاں کارکنوں کو گرفتار کر لیا جاتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند دونوں نے اس زمانہ میں مجلس عاملہ اور صدر سکریٹری وغیرہ کے عہدے ختم کر کے "ڈکٹیٹرشپ" قائم کردی تھی۔ ڈکٹیٹر ہی نظام چلاتا تھا اور جب وہ گرفتار ہوجاتا تھا تو اپنی گرفتاری کے وقت اپنے جانشین ڈکٹیٹر کا اعلان کردیتا تھا۔

ایسے حضرات کی فہرست خفیہ طور پر پہلے سے تیار کرلی گئی تھی جو ڈکٹیٹر بنائے جائیں اور اُن کی ترتیب بھی مقرر کردی گئی تھی۔ جہاں تک یاد آتا ہے حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند پہلے ڈکٹیٹر تھے۔ پھر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی (رحمہما اللہ) سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب غالباً تیسرے ڈکٹیٹر تھے اور یہ بھی خیال آتا ہے کہ وہ پہلے گرفتار ہوچکے تھے اس لئے اُن کا نام ڈکٹیٹروں کی فہرست میں نہیں آسکا تھا بہرحال احقر کو اپنے متعلق یہ بات یاد ہے کہ وہ جمعیۃ علماء ہند کا نواں ڈکٹیٹر تھا۔ (اس زمانہ کا تمام ریکارڈ پولیس کے چھاپوں اور باقی ماندہ دیمک کی نذر ہوچکا لہذا پختہ بات عرض کرنی مشکل ہے) علاوہ ازیں ایسی باتیں ریکارڈ میں رکھی بھی نہیں جاتی تھیں ان کو یا تو ذہن میں محفوظ رکھا جاتا تھا یا انفرادی یادداشتوں میں۔ اور یہ شرف غالباً احقر کے لئے ہی مخصوص تھا کہ ساتھ ساتھ اترپردیش کانگریس کمیٹی (جو اس زمانہ میں کانگریس کمیٹی صوبجات متحدہ تھی) اس کا بھی ڈکٹیٹر احقر ہی تھا۔

بہرحال حضرت مجاہد ملت رح کے تذکرہ میں اپنا تذکرہ مناسب نہیں تھا مگر یہ ایک تاریخی حقیقت سپرد قلم کرنی تھی کہ اس زمانہ میں کانگریس اور جمعیۃ علماء دونوں کی طرف سے گرفتاری کے لئے "ڈکٹیٹرشپ" کا نظام قائم کیا گیا تھا۔ اس تاریخی انکشافات کے علاوہ ایک خاص لطیفہ بھی یہاں دلچسپی پیدا کرے گا۔ لطیفہ ملاحظہ فرمائیے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے اس نظام کی کلید حضرت ابوالمحاسن

مولانا سجاد صاحب رحمۃ اللہ کے دست مبارک میں تھی موصوف کی ہدایت اس احقر کے لئے یہ تھی کہ ہر ہفتہ جمعہ کی صبح کو مرادآباد سے چل کر دہلی پہونچا کرے اور نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد میں تقریر کرکے واپس ہوجایا کرے۔

چند جمعے اس طرح گذرے۔ مرادآباد سے تقریباً ۵ بجے صبح کو گاڑی چلتی تھی (جیسا کہ آجکل بھی چلتی ہے) احقر اس ٹرین سے تقریباً ساڑھے دس بجے دہلی پہونچتا تھا۔ اسٹیشن پر ہی کوئی صاحب موجود رہتے جو احقر کو احتیاط سے طے کردہ مقام پر پہونچا دیتے تھے۔ پھر اسی احتیاط سے رقیبوں کی نظروں سے بچاتے ہوئے جامع مسجد پہونچاتے اور تقریر کے فوراً بعد اسی احتیاط سے کسی صاحب کی رہنمائی میں صوبہ دہلی کی حدود سے باہر پہونچا دیتے تھے۔ پولیس جب تلاش کرتی تو اس کو اپنی ناکامی پر کافی جھنجلاہٹ ہوا کرتی تھی۔

جمعہ کا دن تھا۔ احقر حسب ہدایت مرادآباد سے دہلی پہونچا۔ اس روز پولیس پوری طرح چوکنی تھی اور احقر کی گرفتاری کا سامان اس نے مکمل کر رکھا تھا۔ حضرت مولانا سجاد صاحب کو اس کا علم تھا۔ مولانا موصوف نے نماز جمعہ کے لئے احقر کو خفیہ راستوں سے روانہ فرمایا تو احقر کے رہبر قاضی اکرام الحق صاحب کو تاکید کردی کہ نماز کے بعد جنوبی دروازہ سے احقر کو نہ نکالیں۔ اس طرف پولیس چوکی ہے اور آج چوکی کے علاوہ بھی پولیس کا انتظام ہے بلکہ شمالی دروازہ کے سامنے تانگہ تیار رکھیں اور اسی راستہ سے نکال کر لائیں۔ اس طرف پولیس نہیں ہوگی۔

قاضی اکرام الحق صاحب سہو ونسیان کے پرانے مریض ہیں یہاں بھی وہ اس ہدایت سے ایسے غافل ہوگئے کہ خاص طور پر ممنوعہ راستہ ہی پر تانگہ کا انتظام کیا۔ یعنی جنوبی پھاٹک سے ہی احقر کو لیکر گئے جہاں پولیس کی چوکی ہے پھر راستہ بھی چاوڑی بازار کے علاوہ چاندنی چوک کی طرف کا اختیار کیا۔ چنانچہ جیسے ہی کوتوالی کے سامنے تانگہ پہونچا۔ سی آئی ڈی کے سب انسپکٹر نے جو جامع مسجد سے ہی تانگہ کے پیچھے لگ لیا تھا اور اطمینان سے اپنی سائیکل پر ہمارے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔ اس سب انسپکٹر نے تانگہ رکوالیا اور احقر کو پورے اعزاز کے ساتھ تانگہ سے اتار کر حوالات میں پہونچا دیا۔

اس حوالات میں مولانا منت اللہ صاحب موجودہ امیر شریعت صوبہ بہار صبح سے قیام پذیر ہوچکے تھے اور چند ساتھی اور بھی تھے جو اسی روز یا اگلے روز آئے۔

غالباً اگست کا مہینہ تھا۔ شدید گرمی۔ حوالات سب طرف سے بند۔ کہیں نہ روشن دان نہ کھڑکی۔ صرف ایک جانب میں دروازہ کے دو طرف جنگلے تھے۔ مگر سامنے چوڑا برآمدہ تھا جس کی وجہ سے یہ جنگلے بھی ہوا سے ناآشنا رہتے تھے۔

پیشاب پاخانہ کے لئے صبح کو ۸ بجے ایک گھنٹہ کے لئے کھولا جاتا تھا باقی ۲۳ گھنٹہ اسی کمرہ میں بند رہتے تھے۔ یہیں وضو بھی کیا جاتا تھا۔ پانی نکلنے کی کوئی نالی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وضو کا پانی کمرہ ہی میں بھرتا رہا حسن اتفاق یہ تھا کہ کمرہ میں ڈھال کافی تھا پانی اسی ڈھال میں رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ صورت یہ ہوگئی کہ کمرہ کے نصف حصہ میں پانی بھر گیا اور نصف حصے میں ہمارے چھ یا سات ساتھیوں کے بستر تھے اور پُرلطف بات یہ تھی کہ اسی تھانہ "کوتوالی" کے سب انسپکٹروں میں ایک بزرگ سید اصغر حسین صاحب بھی تھے جو احقر کے چچازاد برادر محترم تھے۔ اُن کو صدمہ تھا کہ میرا بھائی (محمد میاں) کانگریس کے چکر میں آکر گمراہ ہوگیا۔

افسوس اب ان کی بھی وفات ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

ایک ہفتہ کے بعد ہمیں حوالات سے نجات ملی اور ۶ ماہ کے لئے دہلی میں داخلہ ممنوع قرار دیدیا گیا۔

اگست کے مہینہ میں اس حبس بے جا کا اثر یہ ہوا کہ تمام ساتھیوں کو کچھ عوارض لاحق ہوگئے۔ احقر کو پیچش ہوگئی۔

احقر دہلی سے رہا ہوکر دیوبند پہونچا جہاں والدہ صاحبہ اور احقر کے متعلقین تھے۔ پھر فوراً ہی مرادآباد چلا گیا۔ جہاں صوبہ یوپی کانگریس کمیٹی کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے گرفتاری کا پروگرام طے تھا۔ سی آئی ڈی احقر کی تفتیش میں رہی ہوگی اور ممکن ہے اس کو حیرت ہوئی ہو جب احقر دفعتاً مرادآباد کے چوک بازار میں اس حالت میں نمودار ہوگیا کہ ایک ہاتھ میں کانگریس کا جھنڈا تھا دوسرے میں جمعیۃ علماء ہند کا۔

ایک عزیز دوست پنجابی سوداگر حافظ محمد شفیع صاحب نے آگے بڑھ کر سنہری ہار گلے میں ڈالا جس کو احقر نے منظور کیا۔ کیونکہ ہار پہننے اور پہنانے کے لئے اس سے بہتر وقت کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ چند منٹ بھی نہیں گذرے تھے کہ حاضرین کے اجتماع نے جلوس کی شکل اختیار کرلی اور اب یہ جلوس جس کی قیادت محمد میاں کر رہا تھا (جس کے دونوں ہاتھ اس طرح گھرے ہوئے تھے کہ ایک میں ایک جھنڈا تھا اور دوسرے میں دوسرا

اور گلے میں قرآن شریف) امر دہمہ گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی تقریباً ایک فرلانگ چلا تھا کہ پولیس کے دستے نے آکر محاصرہ کرلیا۔ احقر کو گرفتاری کا حکم سنا کر اپنی تحویل میں لے لیا اور مجمع کو منتشر کرنے کے لئے لاٹھی چارج شروع کردیا۔

احقر حوالات میں پہونچا تو تھوڑی دیر بعد حافظ شفیع الدین صاحب بھی در آمد ہوئے۔ جرم یہ تھا کہ کانگریس اور جمعیۃ کے ڈکٹیٹر کو ہار کیوں پہنایا تھا۔ پھر ابھی انگریزی حساب سے یہ تاریخ ختم نہیں ہوئی تھی یعنی رات کے بارہ نہیں بجے تھے کہ مراد آباد کانگریس کے تمام سربراہ جن کی تعداد سترہ تھی گرفتار کرکے احقر کے ساتھی بنا دیئے گئے۔

چند روز مقدمہ ہوا۔ چھ ماہ کی سزا بامشقت کلاس "سی" اور مشقت میں احقر اور موجودہ کین ڈویلپمنٹ منسٹر یوپی (داؤدیال کھنہ) کو چکی دی گئی۔ لیکن حکیم انتظار احمد صاحب وغیرہ نے (جو گرفتاری سے محفوظ تھے) فوراً دوڑ دھوپ شروع کردی۔ یوپی کے گورنر صاحب رخصت لے کر یورپ گئے ہوئے تھے اور ان کی جگہ نواب احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری۔ فرائض گورنری انجام دے رہے تھے۔ منسٹر وغیرہ اس زمانہ میں برائے نام ہوتے تھے۔ جملہ اختیارات گورنر ہی کو ہوا کرتے تھے۔ بہر حال نواب صاحب کو جیسے ہی توجہ دلائی گئی احقر اور داؤدیال کھنہ اور چند ساتھیوں کا درجہ سی کے بجائے "بی" کردیا۔ تیسرے ہی دن اس کے آرڈر آگئے اور ہمیں جس طرح (سی کلاس) سے نجات ملی۔ چکی کی مشقت سے بھی نجات مل گئی۔

گھنٹہ گھر برخلاف قانون کانگریس کا جلسہ اور مجاہد ملت کی شرکت

۱۹۳۲ء میں تحریک کی حالت بر گفتگو ہو رہی تھی احقر نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور حضرت مولانا کے تذکرہ میں اپنے تذکرہ کا بھی پیوند لگا دیا۔ ناظرین محترم اس جرأت کو معاف فرمائیں اس کا کفارہ یہ ہے کہ حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی حیات طیبہ کا ایک نہایت عجیب واقعہ پیش کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین کرام محظوظ ہوں گے۔

انڈین نیشنل کانگریس کمیٹی اور اس کی تمام شاخیں خلاف قانون تھیں کہیں کوئی اجلاس نہیں ہوسکتا تھا۔ مگر اس کے باوجود کانگریس نے طے کیا کہ اس کا سالانہ اجلاس حسب معمول ہوگا۔ صدر کا انتخاب کیا گیا۔ تاریخ مقرر کی گئی۔ وقت بھی مقرر کردیا گیا اور نہایت دلچسپ بات یہ ہے کہ اجلاس کا مقام دہلی کا گھنٹہ گھر تجویز کیا گیا جو چاندنی چوک جیسے صدر مقام پر تھا جو اس زمانہ میں دہلی کا سب سے زیادہ پُر رونق بازار تھا جہاں سے چند قدم کے فاصلہ پر دہلی کا سب سے بڑا تھانہ کوتوالی ہے۔

انڈین نیشنل کانگریس کمیٹی کا یہ اجلاس حکومت اور کانگریس دونوں کے لئے وقار اور عزت کا سوال بن گیا تھا۔ حکومت کی طے کردہ پالیسی یہ تھی کہ یہ اجلاس نہیں ہوگا۔ اس نے اپنی پالیسی کو کامیاب بنانے کے لئے پورے ہندوستان کی سی۔آئی۔ڈی کو سرگرم بنا دیا تھا۔ ریلوے اسٹیشنوں پر سی آئی۔ڈی۔ ویٹنگ روم میں سی۔آئی۔ڈی۔ ٹرین کے ڈبوں میں سی آئی ڈی کہ اے آئی سی سی کے ممبر سفر نہ کرسکیں۔ دہلی کے گلی کوچوں میں سی آئی ڈی کے جتھے موجود۔ دہلی کے چپہ چپہ پر سی آئی ڈی کی نظر۔

اجلاس کے مقررہ وقت میں چند منٹ باقی رہ گئے تھے۔ گھنٹہ گھر کے آس پاس نہ میز کرسیاں تھیں نہ فرش فروش۔ نہ رضاکار اور والنٹیر نہ کوئی ممبر۔ سی آئی۔ڈی مطمئن ہوگئی کہ پالا مار لیا اور کانگریس کو شکست فاش دے دی۔

لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اسی پولیس اور سی آئی ڈی کی آنکھوں کے سامنے آس پاس کی گلیوں کوچوں سے اے آئی سی سی کے ممبروں کی آمد شروع ہوئی اور ایک جھپکے میں ان کی اتنی تعداد اکٹھی ہوگئی کہ باوردی اور بے وردی پولیس جو وہاں موجود تھی اپنی تعداد کو ناکافی سمجھنے لگی۔ مزید پولیس بلانے کے لئے کوتوالی کی طرف آدمی دوڑائے۔

آل انڈیا کانگریس کے ممبران جو دفعتہً یہاں برآمد ہوگئے تھے انھوں نے ٹھیک گھنٹہ گھر کے نیچے اپنا اجلاس شروع کردیا۔ انقلاب زندہ باد — ہندوستان آزاد۔ مہاتما گاندھی کی جے ہو۔ کانگریس زندہ باد۔ یہ سب نعرے خلاف قانون تھے۔ یہاں پہلے یہ نعرے اتنی زور سے لگائے گئے کہ آسمان گونج گیا۔

پھر صدر نے حلف نامہ آزادی پڑھا۔ تجویز آزادی پیش کی جو بالاتفاق منظور ہوئی۔ پھر جلسہ بخیر و خوبی ختم کردیا گیا۔ ابھی پولیس پہونچنے نہیں پائی تھی کہ یاران شاطر اور ممبران چست و چالاک اپنا کام پورا کرکے منتشر بھی ہوچکے تھے۔

پولیس پہونچی تو میدان خالی تھا۔ لاکھوں روپیہ جو اس اجلاس

کے روکنے کی تدبیروں پر صرف ہوا تھا بیکار ہو گیا اور سی آئی ڈی کا کام ختم ہونے کے بجائے پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔ رسوائی، بدنامی اور ناکامی انعام میں ملی۔

اس قصہ کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یارانِ تیز گام اور ممبران شاطر جنھوں نے اپنی بہترین ہوش مندی، حاضر حواسی، چستی اور پھرتی سے اس اجلاس کو کامیاب بنایا۔ ان میں ہمارے محترم مجاہد ملت بھی تھے۔ رحمہ اللہ۔

مجاہد ملت دہلی کس طرح پہونچے

اس زمانہ میں مجاہد ملت کا دہلی قیام نہیں تھا۔ غالباً آپ اپنے وطن عزیز سیوہارہ سے تشریف لائے تھے۔ سیوہارہ میں پولیس کو یہی یقین رہا کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ممبر اے آئی سی سی۔ یہیں قیام فرما ہیں۔ مگر آپ نے کھدر کے لباس کو گٹھری میں باندھا۔ لٹھے کا پاجامہ، ولایتی کپڑے کی شیروانی زیب تن کی۔ جے پوری صافہ جے پوری انداز میں سر پر باندھا عمدہ چھڑی ہاتھ میں۔ بقول قاضی اکرام الحق صاحب۔ ایک نواب کی شان سے دہلی کے اسٹیشن پر اترے۔ قاضی اکرام الحق صاحب اسٹیشن پر موجود تھے یہ مولانا کو دیکھ کر ان کی طرف بڑھنے لگے تو فوراً اشارہ سے روک دیا۔ گیٹ پر سی۔ آئی۔ ڈی موجود تھی۔ مگر اس کو سیوہارہ سے روانگی کی اطلاع نہیں ملی تھی اور اس وقت جو ایک داڑھی والا مولوی نما نوجوان نوابی شان سے اس کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ اس کے متعلق یہ وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ وہی حفظ الرحمٰن ہوگا جو ہمیشہ کھدر میں ملبوس رہتا ہے۔

تحریک کی انتہا

تحریک کا جو سلسلہ ۱۹۲۸ء کے اواخر میں شروع ہوا تھا ۱۹۳۵ء میں اس کا خاتمہ تو نہیں ہوا البتہ اس کا رُخ بدل گیا۔

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں بہت کچھ اختیارات مرکزی اسمبلی اور صوبائی کونسلوں کو دیدیئے گئے تھے۔ مگر مکمل آزادی کا مطالبہ ابھی بہت کچھ تشنہ تھا۔ کانگریس نے اپنی پرانی تاریخ دہرائی۔ ۳۷ء والا یہ سوال پھر سامنے آیا کہ ایکٹ کو اپنا کر اس کے بموجب وزارتیں بنائی جائیں یا نہیں۔ ایکٹ پر عمل درآمد کے لئے انتخابات کی ضرورت تھی کیونکہ انتخابات کے بعد ہی کونسلیں اور مرکزی اسمبلی قائم ہو سکتی تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مسلم لیگ جمعیۃ علماء ہند سے بغل گیر ہوئی اور اس نے کانگریس کے سامنے بھی نیازمندی کا اظہار کیا۔ کیونکہ اس عرصہ میں اگرچہ حریت پسند مسلمانوں پر اعتراضات کئے جاتے رہے تھے مگر مسلم لیگ کے قائد خصوصاً مسلم لیگ کے قائد اعظم جناح صاحب یہ دیکھ رہے تھے کہ تحریک نے صرف ہندوؤں ہی کو نہیں بلکہ مسلمانوں کو بھی بہت زیادہ متاثر کر دیا ہے اور انتخابات اگرچہ جداگانہ ہیں مسلمان نمائندوں کا انتخاب صرف مسلمان ہی کریں گے لیکن پھر بھی وہ سمجھتے تھے کہ قوم پرور مسلمانوں نے اگر اپنا محاذ الگ بنا لیا تو مسلم لیگ کے لئے مقابلہ مشکل ہوگا۔

چنانچہ مسٹر جناح جمعیۃ علماء ہند کی طرف اس قدر لپکے کہ بلا کسی دعوت کے خود جمعیۃ علماء ہند صوبہ دہلی کے اجلاس عام میں جو دہلی میں ہو رہا تھا تشریف لانے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ بدخلقی علماء کرام میں نہیں تھی کہ اجلاس عام کا دروازہ ایک جماعت کے سربراہ پر بند کر دیتے۔ چنانچہ پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔

مسٹر جناح کے اس اقدام کا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے مسلمانوں کے قوم پرور طبقہ کو لیگ کی طرف کھینچ لیا اور ان کو اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ الیکشن کے لئے علیحدہ محاذ قائم کریں۔ اور جب قوم پرور مسلمانوں سے رابطہ قائم ہوا تو کانگریس سے بھی عملی طور پر تعاون کا رشتہ قائم ہو گیا۔ اس وقت مسٹر رفیع احمد قدوائی مرحوم کانگریس کی طرف سے یو۔ پی میں الیکشن کے انچارج تھے اور چودھری خلیق الزماں صاحب جو قوم پرور مسلمانوں میں شمار ہوتے تھے لیگ کی طرف سے انچارج تھے۔ ان دونوں میں شخصی اور اور ذاتی طور پر گہرا رابطہ تھا اور جماعتی حیثیت میں نجی طور پر یہ طے تھا کہ جہاں مسلم حلقوں میں کانگریس کسی مسلمان کو کھڑا کرے گی وہاں مسلم لیگ نہیں کھڑا کریگی گویا آپس میں عملی طور پر مقابلہ نہ کرنے کا معاہدہ ہو گیا تھا

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسٹر جناح مرحوم کی یہ تدبیر کامیاب رہی اور جب انتخابات ختم ہوئے تو قوم پرور مسلمانوں کا کوئی پلیٹ فارم نہیں تھا ——— اب پلیٹ فارم صرف دو رہ گئے تھے: کانگریس اور مسلم لیگ۔

ان جماعتوں اور پارٹیوں کا اتحاد یا عملی تعاون کیوں ختم ہوا۔ یہ ایک طویل داستان ہے اور موضوع کلام سے غیر متعلق ہے۔

حضرت مجاہد ملتؒ سے تعلق رکھنے والی بات تو یہ ہے کہ اس دور میں مجاہد ملتؒ جماعت کے ایک نمایاں اور ممتاز فرد کی طرح کام کرنے

رہے لیکن جماعت میں آپ کی حیثیت رہنما کی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اس سلسلہ میں پیش پیش محترم مولانا بشیر احمد صاحب (بھٹہ) رحمۃ اللہ تھے۔ البتہ اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ وہ نقطۂ نظر جو مجاہد ملت رحمۃ اللہ کی ساعی جمیلہ کا محور و مرکز بن گیا۔ اس کا آغاز اسی دور میں ہوا تھا یعنی دو قومی نظریہ کا آغاز اسی دور میں ہوا جس کو برطانوی سامراج کی حمایت اور تائید حاصل تھی اور جبکہ تقریباً چالیس سال پہلے سے یعنی جب سے ہندوستانیوں کو لوکل باڈیز میں کچھ اختیارات سپرد کئے گئے تھے تو انگریز بہادر نے جداگانہ انتخاب کا دستور قائم کرکے ذہنوں میں علیحدگی پسندی اور تفریق کے جراثیم پیدا کردیئے تھے۔ یہ مسموم ذہن دو قومی نظریہ کی تائید کے لئے پہلے سے آمادہ تھے۔ چنانچہ جیسے ہی ایک قوم یا دو قوم کی بحث شروع ہوئی بہت تیزی کے ساتھ تمام ہندوستانی دو پارٹیوں میں تقسیم ہوگئے۔

یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ صرف مسلمانوں ہی نے اس کو قبول کیا بلکہ ہندوؤں کی اکثریت بھی اگرچہ زبان سے نہیں کہتی تھی مگر دل سے اس کی حامی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو پریس نے مطالبہ تقسیم کو جو ۱۹۴۲ء تک ایک لغو خیال تصور کیا جاتا تھا اتنی اہمیت دی کہ وہ نہ صرف ایک معقول مطالبہ سمجھا جانے لگا۔ بلکہ غیر معمولی جذبات کی پشت پناہی اس کو حاصل ہوگئی۔

یہ اکثریت کانگریس سے باہر ہندو مہاسبھا راشٹریہ سیوک سنگھ اور جن سنگھ کی صورت میں نمودار ہوئی اور کانگریس کے اندر اس کا ظہور اس وقت ہوا جب کانگریس ہائی کمانڈ کو بھی اس کی رضاجوئی کے لئے مطالبہ تقسیم کے سامنے جھکنا پڑا۔ بیشک روپ جدا جدا تھے مگر ذہنیت ایک ہی تھی۔ کانگریس میں انگریزی سامراج سے جلد ہی چھٹکارا پانے کو بہانہ بنایا گیا کہ اگر اس وقت مطالبہ تقسیم منظور نہ کیا جاتا تو آزادی پندرہ سال پیچھے پڑجائیگی۔ ہندو مہاسبھا اور جن سنگھ وغیرہ نے ہندو اسٹیٹ کو نصب العین قرار دیکر اس ذہنی یکسانیت کا ثبوت دیا۔

اس موقعہ پر اس بے موسم اظہار حقیقت کا مقصد صرف یہ ہے کہ نظریہ دو قوم جیسے ہی سامنے آیا فوراً ایک ایسا محاذ قائم ہوگیا جو جنگ آزادی کے محاذ سے کہیں زیادہ سخت تھا۔

جنگ آزادی انگریزوں سے تھی۔ جن کی حمایت کا دائرہ انگریزوں تک محدود تھا یا ان گنے چنے افراد تک جو جذبۂ حریت سے بیگانہ تھے اور صرف اپنی زندگی بنانا ان کا نصب العین تھا اس کے برعکس دو قومی نظریہ کا محاذ وہ تھا جہاں خود اپنوں سے مقابلہ تھا۔ یہاں تک کہ بہن بھائی جیسے عزیز ذاتا و بیت تو عموماً اس نظریہ کی بنا پر ایک دوسرے کے حریف ہوگئے تھے اور ایسی نظیریں بھی بے شمار تھیں کہ ماں باپ اور اولاد بھی دو محاذوں پر تقسیم ہوکر ایک دوسرے کے مقابل آگئے تھے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کا یہ مشہور ارشاد جس نے عام محاورہ کی حیثیت حاصل کرلی اسی موقع پر صادر ہوا تھا۔

دہلی کے ایک جلسہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ غالب خیال یہ ہے کہ برطانیہ کا ڈپلومیٹک حلقہ پشت پر تھا اور اسی کے ایما پر یہ سوال حضرت شیخ الاسلامؒ سے کیا گیا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی حضرت موصوف کی زبان مبارک سے یہ جملہ صادر ہوا اگلے ہی دن سے اس کی تردید اس قوت سے شروع کردی گئی کہ جیسے کوئی گولے بارود کا میگزین آگ کی ایک چنگاری کا منتظر تھا۔

بہرحال شیخ الاسلامؒ کے اس جملہ کو مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً اپنی زبان سے کبھی نہیں دہرایا۔ لیکن ایک قومی نظریہ کی حمایت اسی شدومد سے شروع کردی جو ایک مجاہد کی شان ہوسکتی ہے۔

دو قومی نظریہ کا ثمرۂ تلخ۔ تقسیم ہندوستان اور مطالبہ پاکستان تھا چنانچہ جیسے جیسے دو قومی نظریہ کی حمایت بڑھتی رہی تقسیم ہند کا مطالبہ مضبوط ہوتا رہا۔

حدیث شریف میں "فراست مومن" کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے یہ نور حق کا پرتو ہوتی ہے۔ مومن نور خداوندی کی روشنی میں مستقبل کو دیکھ لیتا ہے۔

سنہ ۴۰ء سے لیکر ۴۷ء تک کے پُرآشوب ہنگامی دور میں جس بے جگری، والہانہ سرگرمی اور بے انتہا جرأت و ہمت کے ساتھ جان کی بازی لگا کر حضرت مجاہد ملت قدس اللہ سرہٗ العزیز نے تقسیم ہند اور پاکستان کی مخالفت کی وہ آپ کے کمال ایمان اور مکمل نور فراست کی دلیل ہے۔

قوم پرور مفکرین کی نظر ان غیر معمولی خطرات پر تھی جو تقسیم ہند کے نتیجہ میں ہندوؤں سے کہیں زیادہ مسلمانوں کو پیش آنے والے تھے۔ چنانچہ وہ بیشمار کتابچے اور پمفلٹ جو اس زمانے تقسیم ہند کی مخالفت میں شائع کئے گئے تھے، اس کی دلیل ہیں۔ لیکن ان متوقع خطرات نے ان کی قوت عمل

[illegible] اتنی ہی حرکت پیدا کی تھی جیسی کسی موہوم خدشہ کی صورت [illegible] ہے۔

[illegible] یہ دو بزرگ جن میں سے ایک شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی تھے اور دوسرے ہمارے یہی مجاہد ملت [illegible] میں یہ نمبر شائع کیا جا رہا ہے۔

معلوم ہوتا تھا کہ وہ قتل عام اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کی تباہی و بربادی جو تقسیم کے وقت پیش آئی دن کی روشنی میں ان کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ گویا تقریباً آٹھ سال پہلے سے یہ حضرات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ دہلی کے گلی کوچوں میں گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ مسلم کشتگان کے پشتے جگہ جگہ لگے ہوئے ہیں۔ مشرقی پنجاب۔ راجستھان اور یو۔ پی کے اُن علاقوں سے جو مشرقی پنجاب کی سرحدوں سے ملے ہوئے ہیں مسلمانوں کا اخراج ہو رہا ہے۔ اخراج کو کامیاب بنانے کے لئے خونِ مسلم سے ہولی کھیلی جا رہی ہے جائدادیں تباہ کی جا رہی ہیں، مال و اسباب لوٹا جا رہا ہے۔ با عفت و عصمت خواتین کی لرزہ خیز بے حرمتی کی جا رہی ہے۔ دینی ادارے منہدم اور مسجدیں قیام گاہ بلکہ خرگاہ اور اصطبل بنائی جا رہی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور دوسری طرف پاکستانی علاقوں میں ہندو اور سکھوں کے ساتھ یہی سب کچھ کیا جا رہا ہے۔

صرف اتنی بات ہی نہیں تھی کہ ان دونوں بزرگوں نے جلسوں میں تقریریں کر دیں۔ اور تقسیم ہند کی تردید و مذمت میں۔ پاکستان پر ایک نظر۔ پاکستان کیا ہے۔ جیسے کتابچے لکھ کر شائع کرا دیئے بلکہ ایک اضطرابی کیفیت تھی جو ان دونوں بزرگوں پر طاری تھی جس نے رات کی نیند اور دن کا چین و آرام حرام کر دیا تھا۔

۱۹۳۹ء سے لیکر ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء تک آٹھ سالہ دور اسی اضطراب میں گذرا بیشک اس عرصہ میں تحریک آزادی کے بھی یہ دونوں حضرات علمبردار رہے اور اس سلسلہ میں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۴ء کے نصف تک قید فرنگ میں اسیر و نظربند بھی رہے۔ مگر یہ اضطراب ہر ایک حالت میں بدستور رہا۔

اور حد سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہی مخالف تھے وہی جانی دشمن اور درپے آزار تھے جن کے لئے یہ سب کچھ اضطراب، پریشانی سرگردانی اور بے چینی تھی۔

۱۹۴۲ء ۔ کوئٹ آف انڈیا کی تجویز

۱۹۴۲ء کا آغاز انتہائی خطرناک حالات میں ہوا تھا۔ ہٹلر کی فوجیں اسٹالن گراڈ تک دندنا رہی تھیں۔ اس کے نئے حلیف "جاپان" کی آبدوز کشتیوں نے سنگاپور کے قریب برطانوی بحری بیڑے کے سب سے بڑے جنگی جہاز کو (غالباً پرنس آف ویلز نام تھا) غرق کر دیا تھا۔ اس کے ہوائی جہاز کلکتہ تک تاخت کرنے لگے تھے۔ ادھر اندرونِ ہند کانگریس کی تحریک آزادی کی چنگاریاں سلگ سلگ کر شعلہ بن رہی تھیں۔ انہیں حالات میں بمبئی میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس طے کیا گیا۔

اب کانگریس کی طرف سے اجلاس کو کامیاب بنانے اور حکومت کی طرف سے ناکام بنانے کی کوششیں شد و مد سے جاری ہو گئیں۔ کمزور آدمیوں کے پتّے ان تیاریوں کی خبر سے ہی پانی ہوتے تھے جو حکومت کی طرف سے اجلاس کو ناکام بنانے کے لئے کی جا رہی تھیں۔

مسلح پولیس اور فوج تیار۔ مشین گنیں اور ٹینک تیار۔ ممکن ہے جلیانوالہ باغ کی تاریخ دہرا دی جائے۔ یا قصہ خوانی بازار کی طرح اجلاس کانگریس کو مشین گنوں اور ٹینکوں کا نشانہ بنا دیا جائے۔ ان خبروں کو سننے کے بعد اس اجلاس میں شرکت کی ہمت وہی کر سکتا تھا جو سربکف اور کفن بردوش ہو۔ پھر چپّہ چپّہ پر سی۔ آئی۔ ڈی مسلط تھی۔ اس کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے سیوہارہ سے روانہ ہو کر بمبئی پہونچنا آسان نہ تھا۔ مگر جس کو پوری قوم مجاہد ملت کا خطاب دینے والی تھی اس کے لئے کوئی مشکل نہیں تھی۔ وہ انہیں حالات میں سیوہارہ سے روانہ ہو کر بمبئی پہونچا۔

غالباً اس مرتبہ علی بہادر خاں صاحب کے یہاں قیام فرمایا۔

کانگریس اگرچہ ۱۹۳۲ء میں خلاف قانون قرار دی جا چکی تھی مگر اس مرتبہ ابھی تک خلاف قانون جماعت Unlawful assembly نہیں قرار دی گئی تھی۔ مگر جس تجویز کو منظور کرنے کے لئے یہ اجلاس کیا جا رہا تھا اس کا علم حکومت کو بھی تھا۔ حکومت جانتی تھی کہ تجویز میں ۔ ہندوستان خالی کرو Quit India کا مطالبہ کیا جائے گا اس تجویز کے منظور ہونے کے بعد کانگریس کو اگر کسی مصلحت کے خلاف قانون نہ بھی قرار دیا جائے لیکن ہمہ گیر اور عالمگیر جنگ کے اس خطرناک دور میں "ہندوستان خالی کرو" کا مطالبہ سراسر بغاوت ہے اور اس کو پاس

کرنے والے باغی ۔

چنانچہ حکومت کو اس میں تامل نہیں تھا کہ جو ممبر بھی اس اجلاس میں شریک ہوگا وہ باغیانہ سرگرمی کا مرتکب ہوگا اور اس کو گرفتار کر لینا ضروری ہوگا ۔ سوال صرف یہ تھا کہ گرفتار کرنے کی ذمہ داری کون لے بمبئی کی حکومت اس کے لئے تیار نہیں تھی کہ بمبئی جیسے شہر میں سیکڑوں ممبروں کو گرفتار کرکے طوفان برپا کرے ۔ پھر جیل خانوں میں ان کی نازبرداری کا فرض غیر محدود مدت تک انجام دیتی رہے ۔

لہذا سرکاری پالیسی یہ قرار پائی کہ گرفتار کرنے کا تلخ فرض دوسرے صوبوں کی حکومتیں انجام دیں یعنی جو ممبر جس صوبہ کا ہو اسی صوبہ کی حکومت اس کو گرفتار کرے ۔

اس پالیسی کے طے ہونے کے بعد مجاہد ملت رح کے لئے بھوپال یا بھرت پور تک تو پہونچنا آسان تھا لیکن جیسے ہی ٹرین حدود یوپی میں داخل ہو گرفتاری لازمی تھی ۔ لیکن آپ کو اس ذمہ داری کا بھی شدید احساس تھا جو مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کے رکن رکین اور روح رواں کی حیثیت سے آپ پر عائد ہوتی تھی ۔

صدر جمعیۃ علماء ہند شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ چند ماہ پیشتر سے ایک تقریر کے سلسلہ میں گرفتار ہو چکے تھے جو آپ نے بچھراؤں میں جمعیۃ علماء ضلع مرادآباد کی کانفرنس میں کی تھی ۔

حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب نقاہت اور ضعف دماغ کے مرض میں مبتلا تھے اور سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب پر دل کے دورے پڑ رہے تھے جن کی وجہ سے بہت نحیف اور کمزور ہو گئے تھے ۔ ضابطہ کے لحاظ سے منصب نظامت مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی کے حوالہ تھا ۔ مگر مولانا صدیقی کو کسی بیدار مغز مشیر کی ضرورت تھی جو اس موقع کے مناسب غیر معمولی جرأت سے کام لیکر جمعیۃ علماء ہند کو اس کے فرض کی طرف متوجہ کر سکے ۔

مجاہد ملت سے بڑھ کر بیدار مغز کون ہو سکتا تھا ۔ جس کی بیدار مغزی کا ثبوت یہ ہے کہ اس کو عائد ہونے والے فرض کا احساس اُن سے بہت زیادہ تھا جو آئینی طور پر جماعت کی طرف سے ذمہ دار تھے ۔

مجاہد ملت کے لئے قید و بند باعث تشویش نہیں تھی ۔ البتہ ان کو تشویش یہ تھی کہ کہیں یہ گرفتاری اُن کے پروگرام میں رخنہ انداز نہ ہو جائے اس لئے آپ نے بمبئی سے روانگی کا پروگرام خفیہ رکھا اور غالباً وضع بھی ایسی اختیار کی کہ راستہ میں شناخت نہ ہو سکیں ۔

۸ اگست ۱۹۴۲ء کو انڈین نیشنل کانگریس نے "کوئٹ انڈیا" کی تجویز پاس کی اسی روز شب کو حضرت مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگرس پنڈت جواہر لال نہرو اور ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبر گرفتار کر لئے گئے ۔ اسی افراتفری میں مجاہد ملت بھی بمبئی سے روانہ ہوگئے اور موقعہ بموقعہ راستہ میں قیام کرتے ہوئے سیوہارہ پہونچے ۔ سیوہارہ اسٹیشن پر اترنا احتیاط کے خلاف تھا لہذا کسی اور اسٹیشن پر آپ اُتر گئے اور خفیہ طور سے سیوہارہ میں پہونچے سیوہارہ یوپی میں ہے ۔ صوبائی حکومت کو آپ کی تلاش تھی اس لئے آپ کو بہت احتیاط کرنی پڑی ۔

اگست کے مہینہ میں بارشیں ہوا کرتی ہیں اس وقت بارش کا سلسلہ جاری تھا ۔ جو چشم رقیب کے لئے گھونگٹ بنا رہا ۔ آپ نے دو تین روز سیوہارہ میں قیام کیا ۔ پھر دہلی پہونچنے کا ارادہ کر لیا تاکہ اس کام کی تکمیل کر سکیں جس کے لئے گرفتاری سے بچنے کی صورت اختیار کی جا رہی تھی ۔ سیوہارہ اسٹیشن سے سوار ہونا بھی مخدوش تھا ۔ اس لئے آپ نے دیہاتی وضع اختیار کی ۔ آپ تنہا روانہ ہونے والے تھے مگر آپ کے ایک نوجوان عزیز حاجی محمد ایوب صاحب بی اے ۔ اصرار کرکے آپ کے ساتھ ہو لئے اور شاید "کانٹھ" کے اسٹیشن سے آپ ٹرین میں سوار ہو کر دہلی پہنچے (چند سال بعد انہیں حاجی محمد ایوب صاحب سے مجاہد ملت کی صاحبزادی منسوب ہوئیں ۔ بیماری میں خصوصًا امریکہ سے واپسی کے بعد حاجی صاحب کے بڑے صاحبزادے اقبال سلمہٗ ایسے باسلیقہ خدمت گذار رہے کہ مجاہد ملت ان سے بہت خوش تھے)

دہلی چند روز کے واسطے آپ کے لئے پناہ گاہ بن سکتی تھی ۔ کیونکہ آپ کا وارنٹ گرفتاری یوپی گورنمنٹ نے جاری کیا تھا ۔ جب تک وہ یوپی سے منتقل ہو کر دہلی پہونچے آپ دہلی میں گرفتاری سے محفوظ تھے اس فرصت سے آپ نے فائدہ اٹھایا اور دہلی پہونچتے ہی مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کی ہنگامی میٹنگ طلب کرائی ۔ ۲۷، ۲۸ اگست ۱۹۴۲ء ۳، ۴ شعبان ۱۳۶۱ھ کو دہلی میں مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا ۔ صدر جمعیۃ علماء ہند یعنی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اس سے تقریبًا دو ماہ پہلے ۲۵ جون ۱۹۴۲ء کو گرفتار ہو چکے تھے ۔ آپ کی غیر موجودگی کے باعث اس اجلاس کی صدارت سحبان الہند حضرت مولانا احمد صاحب (نائب صدر جمعیۃ علماء ہند) نے فرمائی ۔

مجلس عاملہ نے انڈین نیشنل کانگریس کے اقدام کی حمایت کرتے ہوئے ایک تجویز منظور کی۔ اور طے یہ کیا گیا کہ اس کو کثیر تعداد میں طبع کراکر ملک کے گوشہ گوشہ میں پہونچایا جائے۔

خلاف قانون تجویز کا طبع کرانا خود ایک خطرناک مرحلہ تھا اور اس کو پورے ملک میں تقسیم کرنا اور چپہ چپہ پر پہونچانا اس سے کہیں زیادہ سخت مرحلہ تھا۔ یہ خدمت مولانا عبدالماجد صاحب دہلوی مرحوم اور احقر کے سپرد ہوئی۔ دہلی سے مشرقی ہندوستان کے آخری کنارہ تک تقسیم کرنا اور پہونچانا احقر کے ذمہ کیا گیا۔ اور پنجاب اور فرنٹیر میں اس کو پھیلانا مولانا عبدالماجد صاحبؒ کے سپرد کیا گیا۔ جنوبی ہند کے لئے بھی دفتر نے کوئی انتظام کیا ہوگا احقر کو اس کا علم نہیں ہو سکا۔

اس زمانہ میں احقر کا تعلق مدرسہ شاہی مرادآباد سے تھا۔ مستقل سکونت مرادآباد ہی میں رہا کرتی تھی۔ مگر "بجرم عشق حریت" ۸ راگست کو رفقاء محترم حافظ محمد ابراہیم صاحب (موجودہ وزیر مرکزی حکومت) مولانا قاری عبداللہ صاحب مرحوم۔ مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی ایم۔ایل۔اے کو مرادآباد سے گرفتار کیا گیا۔ تو احقر نے فوراً ہی روپوش ہو جانا ضروری سمجھا۔

چنانچہ پولیس گرفتاریوں میں مصروف تھی اور احقر تاریک اور غیر معروف گلیوں کوچوں میں ہوتا ہوا مرادآباد سے نکل رہا تھا۔ میرے نسبتی بھائی حافظ سادات حسن صاحب ازراہ ہمدردی احقر کے ساتھ ہو لئے۔ ہم دونوں نے ۸ میل پا پیادہ طے کرکے قصبہ حکیم پور پہنچے جب چند گھنٹہ بعد دہلی جانے والا پسنجر حکیم پور پہونچا تو احقر اس سے روانہ ہوا۔ لیکن ٹرین میں زیادہ دیر تک بیٹھنا بھی مناسب نہیں تھا۔ لہذا سمبھاولی اسٹیشن پر اتر گیا اور موضع دیٹھ میں جو اسٹیشن سمبھاؤلی سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے اپنے ماموں زاد بھائی مولانا سید محمد اعلیٰ صاحب صدر مدرس مدرسہ اعزازیہ قصبہ "دیٹھ" کے یہاں دو تین روز قیام کیا۔ پھر کچھ پا پیادہ اور کچھ بس سے سفر کرتے ہوئے دہلی پہونچنا چاہتا تھا کہ جمنا کے پل پر راستہ روک دیا گیا کہ شہر میں کانگریسیوں نے فساد برپا کر رکھا ہے۔

فساد کا تماشہ میں خود بھی جمنا پار سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ بیلی کوٹھی کو جس میں ریلوے کا ریکارڈ تھا آگ لگادی گئی تھی اور اس کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے یہ شعلے جمنا پار بلکہ شاہدرہ سے نظر آرہے تھے۔

اس وقت جمنا برج سے واپس ہوکر غازی آباد پہونچا۔ پھر غازی آباد سے دہلی پہونچنے کی داستان طویل ہے۔ مختصر یہ کہ مجاہد ملتؒ جیسے ہی دہلی پہونچے احقر بھی کسی صورت سے دہلی پہونچ گیا۔

مجاہد ملتؒ "ندوۃ المصنفین" کے رفیق تھے۔ ندوۃ المصنفین قرول باغ کی ایک کوٹھی میں تھا۔ مجاہد ملت یہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔ آپ اس وقت بھی وہیں فروکش ہوگئے۔ مگر احقر کا قیام دفتر ہی میں رہا۔ اور ۱۷ ر ۱۸ ر اگست کو مدعو خصوصی کی حیثیت سے مجلس عاملہ کے اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد حسب ہدایت اراکین مجلس عاملہ، مجلس عاملہ کی تجویز اور اعلان کے بنڈل لیکر کلکتہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

جگہ جگہ ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ پولیس اور فوج کی گولیاں موت کی بارش برسا رہی تھیں۔ ریل کی پٹریاں اکھاڑی جا رہی تھیں۔ ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کے تار کاٹ کر نظام حکومت خصوصاً ریلوے کے نظام کو معطل کیا جا رہا تھا۔ اور بارش کی مسلسل جھڑیوں نے جس طرح پولیس اور سی آئی ڈی کے کام کو دشوار کر دیا تھا مسافروں کے لئے بھی صعوبتیں پیدا کر دی تھیں بہرحال ان حالات کو انگیز کرتے ہوئے دہلی سے روانہ ہوکر مغلسرائے تک تو رسائی ہوگئی لیکن مغلسرائے کے بعد سفر کی تمام صورتیں ناممکن ہوگئیں کیونکہ ریلوے کی پٹریاں تو تحریک کی نذر ہوگئی تھیں اور عام راستوں اور سڑکوں کو سیلاب نے ناقابل عبور بنا دیا تھا۔ مجبوراً احقر جونپور واپس ہوا اور محترم حاجی ولی محمد صاحب مرحوم کے ایک مکان میں گوشہ نشین ہوکر اس لٹریچر کو مختلف صورتوں سے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہونچانے کا انتظام کیا۔

مجاہد ملت کا وارنٹ گرفتاری یوپی سے منتقل ہوکر دہلی پہونچا اور مجاہد ملت کو ندوۃ المصنفین قرول باغ دہلی سے گرفتار کر لیا گیا۔ جہاں آپ روزانہ اس کے منتظر رہا کرتے تھے۔

حسن اتفاق! آپ ضلع مرادآباد کی طرف سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ لہذا آپ کا وارنٹ بھی مرادآباد سے آیا اور گرفتار کرکے آپ کو مرادآباد پہونچا دیا گیا۔ جہاں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی۔ عالیجناب حافظ محمد ابراہیم صاحب، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب، مولانا قاری عبداللہ صاحب مرحوم اور دوسرے چند خصوصی رفقاء پہلے سے موجود تھے۔ چند روز بعد رمضان شریف آگیا تو جیل خانہ کی بارگ تراویح گاہ

بن گئی۔ شیخ الاسلام تراویح پڑھاتے تھے اور مولانا حافظ قاری عبداللہ صاحب سماعت کیا کرتے تھے۔ (رحمہما اللہ)

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو علماء حق جلد دوم)

اس مرتبہ تحریک کے پروگرام میں یہ بات بھی داخل تھی کہ جہاں تک ممکن ہو گرفتاری سے بچکر باہر کام کیا جائے۔ احقر اس سفر سے واپس ہو کر مراد آباد پہونچا۔ اور بظاہر اپنے آپ کو کامیاب سمجھتا تھا کہ گرفتار نہیں ہوگا اگرچہ میرے بعض مخلص کانگریسی دوستوں کی خواہش یہی تھی کہ محمد میاں گرفتار ہو جائے اور خواہش کی بنیاد یہ تھی کہ دو سال پہلے احقر کی تصنیف "علماء ہند کا شاندار ماضی" جب ضبط ہوئی اور احقر ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت گرفتار ہوا۔ پھر مقدمہ چلا تو میں نے کورٹ میں ایک بیان دیا تھا جس کو میں خود تو اخلاقی جرأت سمجھتا تھا۔ مگر بعض دوستوں نے اس کو معافی سے تعبیر کیا۔ کیونکہ اس بیان کے بعد بھی اگرچہ سزا ہوئی مگر صرف تابرخاست عدالت۔ اور عدالت بھی فیصلہ سنانے کے بعد فوراً ہی برخاست ہو گئی تو گویا سزا نہیں ہوئی بلکہ سزا کا نام ہوا

احقر کے اس بیان کی حقیقت یہ تھی کہ میں نے ان الفاظ سے معذرت کی تھی جو فی الواقع سنجیدگی کے معیار سے گرے ہوئے تھے۔ مثلاً انگریزوں کو "سفید فام درندہ" کہا تھا۔ قابل اعتراض صرف یہ الفاظ نہیں تھے۔ بلکہ کتاب میں ایسے مضامین بہت سے تھے جن کو باغیانہ کہا جاسکتا تھا۔ پولیس نے کتاب کے تقریباً نصف حصہ پر نشانات لگا رکھے تھے۔ ان کے جوابات کا مجموعہ بھی اچھی خاصی کتاب بن گیا تھا جو بعد میں دیمک کی نذر ہو گیا۔ مگر اس زمانہ میں مجسٹریٹوں کی ہمدردیاں بھی عموماً گرفتار ہونے والوں کے ساتھ ہوتی تھیں۔ مجسٹریٹ نے اس معذرت کی بنیاد پر سزا میں تخفیف کردی۔ بہرحال ان کانگریسی دوستوں کا خیال یہ تھا کہ احقر گرفتار ہو جائے تو یہ دھبہ دھل جائے گا۔ بالآخر دوستوں کی خواہش پوری ہو گئی۔ اور عجیب وغریب صورت سے یہ خواہش پوری ہوئی۔

واقعہ یہ ہے کہ احقر اس زمانہ میں گرفتار شدہ احباب اور بزرگوں کی جانب سے موقع بموقع سرکلر جاری کرتا رہتا تھا۔ ایک سرکلر جو سراسر باغیانہ تھا۔ اس کو پشاور میں کالج کے طلبہ نے پشتو میں ترجمہ کرکے شائع کیا اور اس پر احقر کا نام بھی لکھ دیا۔ فرنٹیئر کی پولیس نے وہ سرکلر یوپی بھیجا۔ تو اب بقول انسپکٹر پولیس، یوپی کی پولیس کے لئے چشم پوشی ناممکن ہو گئی۔

بہرحال اکتوبر میں احقر بھی گرفتار ہوا۔ احقر خوش تھا کہ رات دن کی دوڑ دھوپ سے نجات ملی جیل خانہ میں کچھ آرام کا موقعہ ملے گا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ حضرت شیخ الاسلام جیسے مرشد مربی اور حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ جیسے رفیق مخلص کی معیت میسر آئے گی۔

جیل خانہ میں پہونچا تو ہندو اور مسلمان سب دوستوں نے بڑی مسرت سے احقر کا استقبال کیا۔ مگر مجاہد ملت کی یہ ادا کبھی فراموش نہیں ہو سکتی کہ آپ نے نہایت خفگی کے ساتھ احقر کا استقبال کیا۔

"یہاں پہونچے بغیر چین نہیں آئی" کیا خرابی تھی اگر باہر ہی رہتے۔ یہ حرکتیں نہ کرتے۔ اب باہر کا تمام کام ٹھپ ہو جائے گا"

عتاب آمیز لہجہ میں اس قسم کے جملے ادا کرتے ہوئے مجاہد ملت نے احقر کا استقبال کیا۔ مگر یہ عتاب بھی کس قدر شفقت آمیز تھا۔ نہ صرف احقر کے حق میں شفقت۔ بلکہ جماعت اور جماعتی کاموں کے حق میں شفقت پھر یہ ادا کہ جس سے زیادہ تعلق اسی پر زیادہ عتاب۔ ان سب چیزوں نے اس عتاب میں وہ لذت پیدا کردی کہ جو دوسروں کی پر تکلف مسرت میں نہیں تھی۔

یہ غضبناک ادا چند سکنڈ کی تھی۔ پھر ایسا اتفاق ہوا کہ سب ساتھی بچھڑ گئے۔ صرف یہ خادم ہی ساتھ رہا جس کی آمد پر ناراضگی ظاہر کی تھی۔

حضرت شیخ الاسلام کی یہ معیت ایک کیمیا تھی۔ ایک پارس کی پتھری تھی۔ جو پیتل کو طلاء خالص بنا سکتی تھی ہم نے کوشش کی کہ طلاء خالص نہ بن سکیں تو کم از کم کھوٹا سونا ہی بن جائیں۔ کسی صورت سے سونے کا رنگ روپ تو نصیب ہو جائے۔ چنانچہ درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ مگر یہ درس صرف ایک ہفتہ ہونے پایا تھا کہ حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز کو مراد آباد سے نینی جیل منتقل کر دیا گیا۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی اس مفارقت کو "برق خرمن سوز" سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ "برق" تو آن کی آن میں قلب وجگر سب ہی کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ نہ جگر رہتا ہے نہ سوز جگر۔ نہ دل رہتا ہے نہ دل کا درد نہ اضطراب۔ مگر اس مفارقت سے قلب وجگر اس طرح مجروح ہوئے کہ ان کی ٹیس عرصہ تک مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپاتی رہی۔

حضرت شیخ الاسلام رخصت ہوئے تو کم وبیش ہر ایک رفیق کی حالت یہ تھی کہ ضبط مشکل ہو رہا تھا۔ سب کے سامنے رونا بھی وقار کے خلاف تھا تو کونوں میں چھپ کر دل کی بھڑاس نکالتے تھے اور اس طرح روتے تھے

شاید بیوہ عورتوں کو بھی اس کی نقل اتارنی مشکل ہو۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ باقی رفقاء کچھ پہلے چھوٹ چکے تھے۔ کچھ بعد میں۔ پھر صرف مجاہد ملت رہ گئے اور آپ کے ساتھ یہ خادم۔ لیکن ہمارا قیام بھی مرادآباد میں زیادہ دیر نہیں رہا۔ غالباً جنوری ۱۹۴۳ء میں احقر اور مجاہد ملتؒ اور ہمارے رفیق داؤ دیال کھنہ (موجودہ وزیر حکومت اترپردیش) کو بریلی سنٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔

مجاہد ملت کا غیر معمولی ثبات واستقلال

اس زمانہ میں حکومت نے سیاسی قیدیوں کے لئے پیرول کی صورت منظور کی تھی۔ یعنی "کچھ مدت کے لئے عارضی رہائی" بعنوانِ دیگر "جیل خانہ کی زندگی سے رخصت"

احقر کے والد ماجد اس زمانہ میں بیمار تھے۔ حضرت مجاہد ملت نے اصرار کر کے رخصت (پیرول) کی درخواست دلوائی۔ اگرچہ وہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے تقریباً تین ہفتہ بعد منظور ہوئی۔

پھر دوسری مرتبہ اسی طرح کچھ خانگی ضرورتوں کی بنا پر اصرار کر کے رخصت دلوائی۔ اگرچہ وہ چند روز بعد ہی منسوخ ہو گئی۔ کیونکہ مہاتما گاندھی نے ۲۲ روز کا برت رکھ لیا تھا اور حالت ایسی نازک ہو گئی تھی کہ حکومت کو خطرہ ہو گیا تھا کہ جاں بر نہ ہو سکیں گے۔ جیسے ہی یہ خطرہ پیدا ہوا پولیس کے پاس تاروں کے ذریعہ یہ احکام پہنچے اور پیرول والوں کی رخصت فوراً منسوخ کر دی گئی۔

بہرحال حضرت مجاہد ملت نے دو مرتبہ اصرار کر کے احقر کو رخصت دلوائی۔ اور یہ احقر کی کمزوری تھی کہ حضرت موصوف کے اصرار کو قبول کر لیا۔ مگر اس کے برعکس خود حضرت مجاہد ملت کی حالت یہ تھی کہ پیرول کے لئے کسی کے بھی اصرار کو قبول نہیں کیا۔ حالانکہ مجاہد ملت کو احقر سے کہیں زیادہ یہ حق پہنچتا تھا۔ کیونکہ اول تو خود مجاہد ملت کی صحت بہت خراب تھی۔ آپ کو دردِ سر کا دورہ ہوتا تھا۔ دورہ اتنا سخت ہوتا تھا کہ کئی کئی گھنٹے تڑپتے ہوئے گذر جاتے تھے پھر استفراغ ہوتا تھا۔ اس کے بعد سکون ہوا کرتا تھا۔ رمضان شریف میں کئی دفعہ دورہ پڑا اور عید کی تو پوری رات تڑپتے ہوئے گذر گئی۔ اس عارضہ کی بنا پر بآسانی پیرول مل سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ قوی عذر یہ تھا کہ آپ کی بڑی صاحبزادی علیل تھیں جو بعد میں تپ دق میں مبتلا ہو کر وفات پا گئیں۔ جیل میں مرض کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ خود مولانا فرمایا کرتے تھے کہ ان کو صاحبزادہ سے زیادہ صاحبزادیوں سے انس ہے۔ باہر کے دوستوں نے بھی اور جیل کے ساتھیوں نے بھی بے انتہا اصرار کیا۔ خود احقر نے استدعا اور التجا کی تمام صورتیں ختم کر دیں مگر "مجاہد ملت" کا خطاب غالباً بامعنی نہ ہوتا اگر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا پارۂ استقلال اتنا مضبوط نہ ہوتا کہ آپ نے کسی طرح بھی گوارا نہیں کیا کہ خود اپنی زبان سے یا اپنے قلم سے باہر آنے کی استدعا کریں۔

یہ رہائی عارضی ہی ہوتی۔ مگر لفظ رہائی تو درخواست میں لکھا جاتا جو مجاہد ملت کو کسی طرح گوارا نہیں تھا۔

مجاہد ملت کا یہ استقلال سبق آموز تھا اور بجا ہوگا اگر احقر کو ملامت کی جائے کہ اتنے قریب اور شب و روز کا ساتھی رہتے ہوئے بھی یہ سبق نہ یاد کر سکا۔

واقعات بہت ہیں۔ مگر نہ وقت میں گنجائش ہے نہ نمبر کے صفحات میں اتنی وسعت ہے کہ مزید واقعات لکھے جائیں۔ لہٰذا اب موضوع بدلتے ہیں

اجلاس سہارنپور اور مجاہد ملت باضابطہ ناظم اعلیٰ

۱۹۴۲ء میں اجلاس لاہور کے وقت بھی حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کو جمعیۃ علماء ہند کا ناظم اعلیٰ بنانے کی تجویز منظور ہوئی تھی اور اس ناکارہ سے بھی اس وقت وعدہ لے لیا تھا کہ رفیق کار رہے گا۔ اسی طرح کا وعدہ حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز نے بھی احقر سے اس وقت لیا تھا جب جماعت کی اکثریت حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے اصرار کر رہی تھی کہ جمعیۃ علماء ہند کی صدارت منظور فرمائیں۔ لیکن مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کے ناظم اعلیٰ ہونے کی یہ تجویز اس وقت بروئے کار نہیں آ سکی۔ کیونکہ کچھ دنوں بعد سیاسی حالات نے تمام توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ یہاں تک کہ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

دو سال بعد ۱۹۴۴ء کے روز و شب گذر رہے ہیں۔ جرمنی کی جنگ جو پانچ سال پہلے شروع ہوئی تھی دم توڑ رہی ہے۔ ہٹلر کی خودکشی اور ہیروشیما (جاپان) پر ایٹم بم داغے جانے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ کامیابی کی روشن توقعات نے برطانوی دماغ کی گرہیں بھی کھول دی ہیں۔ اب وہ مابعد جنگ کی مشکلات کو آسان کرنے کے لئے ہندوستان کے معاملہ میں

کوئی فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔ لہذا گرفتاران بلا کی رہائیوں کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ اپریل میں سب سے حقیر و صغیر فرد۔ محمد میاں کو رہا کیا گیا مئی میں مجاہد ملت رہا کئے گئے اور ۲۶ راگست ۱۹۴۴ء ۶ ر رمضان ۱۳۶۳ھ کو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب کو فوری آرڈر دیدیا گیا کہ وہ نینی جیل سے باہر تشریف لے جائیں۔

یہ حضرات باہر تشریف لائے تو ضرورت محسوس کی گئی کہ جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس عام منعقد کیا جائے۔ دو سال سے زیادہ گذر چکے تھے حالات میں بھی غیر معمولی تبدیلی ہوگئی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ زمانہ کچھ اس طرح کروٹیں لے رہا تھا کہ بالکل نئے قسم کے مستقبل کی روشنی نظر آرہی تھی۔

بہرحال سہارنپور کی درخواست منظور کی گئی اور ۱ار جمادی الاولیٰ ۱۳۶۴ھ - ۴ر مئی تا ۷ر مئی ۱۹۴۵ء کو بڑی شان کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس سہارنپور میں ہوا۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر اور مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ منتخب کئے گئے۔

احقر کا نام زبانوں پر آیا تو احقر نے اسٹیج پر کھڑے ہوکر معذرت کرنی چاہی۔ مگر سیدی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اسٹیج پر تشریف فرما تھے خلاف معمول احقر کا دامن جھٹک کر کھینچا اور احقر کو نیچے بٹھا دیا۔ اب بجز تسلیم و رضا چارہ ہی کیا تھا "قہر درویش برجان درویش"۔

سہارنپور میں جلوس اور مجاہد ملت شہسوار

مجلس استقبالیہ جس کے رکن رکین مولانا محمد منظور النبی صاحب تھے جناب صدر کے جلوس کی تیاری کرچکی تھی لیکن جناب صدر (حضرت شیخ الاسلام) کسی طرح تیار نہیں ہوئے تو مجاہد ملتؒ نے دلداری کے لئے شرکت منظور کرلی۔ اب مجلس استقبالیہ کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ناظم اعلیٰ کی سواری کے لئے گھوڑا تجویز کیا تھا۔ نہایت عمدہ شوخ چشم گھوڑا سواری کے لئے پیش کیا گیا۔

اچھا ہوا محمد میاں کو قابل التفات نہیں سمجھا گیا ورنہ محمد میاں کو گھوڑے کی سواری سے معذرت ہی کرنی پڑتی۔ اور مولوی کی پول کھل جاتی مگر مجاہد ملت کی شان دوسری تھی۔ آپ نے معذرت نہیں کی۔ آپ سوار ہوئے اور ایسی آن بان سے سوار ہوئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ پرانے شہسوار ہیں۔

مشق مجاہد ملت کو نہیں تھی۔ مگر خدا نے غیر معمولی جرأت بخشی تھی مشہور مقولہ ہے۔ ہمت مرداں مدد خدا۔

ہمیں بھی اس موقعہ پر حضرت شاہ شرف الدین بوعلی قلندر رحمۃ اللہ علیہ (پانی پتی) کا شعر یاد آگیا جو انھوں نے حضرت خواجہ مخدوم جلال الدین کبیرالاولیاء (رحمۃ اللہ علیہ) کو دیکھ کر موزوں فرمایا تھا۔ جب مخدوم صاحبؒ جوانی کے زمانہ میں گھوڑے پر سوار حضرت قلندر صاحب کے سامنے سے گذرے تھے تو حضرت قلندر صاحب نے فرمایا تھا۔

گلگوں لباس کرد و سوار سمند شد
یاراں حذر کنید کہ آتش بلند شد

۴۵ء اور ۴۶ء کے عام انتخابات

اجلاس سہارنپور سے کچھ دنوں بعد اُس الیکشن کا وقت آگیا جو نہ صرف وزارتوں اور منسٹریوں کے حق میں فیصلہ کن تھا بلکہ قوم و ملت کے حق میں برہان و فرقان سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ کچھ من چلے جوانوں نے دیواروں پر جلی حروف سے لکھ دیا تھا

جس طرح معرکہ پانی پت فیصلہ کن تھا
یہ الیکشن بھی فیصلہ کن ہوگا۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جس طرح شیر برطانیہ کے مقابلہ میں شیر ببر تھے وہ اپنوں کے مقابلہ میں گربہ مسکین بننا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ دیوبندی۔ بریلوی۔ اہل حدیث جیسے اختلافات میں پڑنا کبھی پسند نہیں کیا۔ مگر یہاں صورت کچھ ایسی تھی کہ اپنوں کے مقابلہ میں بھی مجاہد ملت کو شیر بننا پڑا۔ یعنی جس طرح انگریزی سامراج کے مقابلہ کے لئے آپ جاں باز و سر بکف تھے ایسی ہی اس فرقہ واریت کے مقابلہ میں بھی (جسکو آج مسلم فرقہ واریت کہا جاتا ہے) آپ کو سرفروشانہ جدوجہد کرنی پڑی۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان بہت بلند و بالا ہے اپنے زمانہ کی کسی چیز کو صحابہ کرام کے کسی معاملہ سے تشبیہ دینا بے ادبی ہے مگر سمجھنے اور سمجھانے کے لئے یہ عرض کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ دو نظریات کے حامیوں میں جس قوت اور شدت سے اس زمانہ میں مقابلہ ہوا اس سے مشاجرات صحابہ کی ایک گھٹیا سی مثال سامنے آگئی۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے مستند حوالوں سے اپنے رسالہ "پاکستان کیا ہے؟" میں ثابت کیا تھا کہ ہندوستان کی تقسیم انگریز کا طے کردہ منصوبہ ہے۔ آج جبکہ ۱۹۶۲ء ختم ہو رہا ہے اور ہماری آزادی کے پندرہ سال پورے ہو رہے ہیں ہندوستان اور پاکستان اپنے غیر معمولی ذرائع کے باوجود پسماندہ۔ مفلوج اور برطانیہ اور امریکہ کے دست نگر ہیں۔ جبکہ اسی عرصہ میں ہمارا پڑوسی ملک "چین" دنیا کی زبردست طاقت بن چکا ہے۔

اگر ہم ہندوستان و پاکستان کی اس پسماندگی کی علت معلوم کرنا چاہیں تو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ الزام قطعاً ثابت ہو جاتا ہے کہ تقسیم کا مطالبہ ہمارے اپنے احساس و فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ انگریزی ڈپلومیسی کا شاہکار تھا جس نے اپنے مطلب کی بات ہماری زبان سے کہلوائی۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنی ہی جماعت اور اپنی ہی ملت کے بہت سے بزرگ جن کی حق پسندی، صاف گوئی اور دیانت پر شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا وہ اس کو صحیح معنیٰ میں اسلامی حکومت کا سنگ بنیاد سمجھتے تھے جس پر خلافت راشدہ کے نمونہ کی سیاسی عمارت قائم کی جاتی تھی۔ اس جماعت کے نزدیک پاکستان ایک پُر تقدس تصور تھا۔ جس کو کامیاب کرنے کی سرگرمیوں میں سب کچھ قربان کر دینا اسلامی حمیت و غیرت کا تقاضا اور ہر ایک غیور و خود دار مسلمان کا فرض تھا۔

غور فرمایئے۔ کس قدر فرق تھا ان دونوں نظریوں میں۔ ایک تقسیم ہند کو انگریز کی پُرفریب سیاست کا شاہکار سمجھتا تھا۔ مسلمانوں کے لئے تباہ کن ہندوستانی قومیت کے لئے مرض لازوال، اور دوسرے کے خیال اور عقیدہ میں پاکستان ایک پُرتقدس تصور تھا جسکو الہام سبحانی اور القاء ربانی کہنے میں بھی اس کو تامل نہیں ہوتا تھا۔

ہر ایک فریق پوری صداقت اور دیانتداری کے ساتھ اپنے اپنے نظریہ پر جما ہوا تھا۔ اس کی حمایت میں جان قربان کر دینے کو شہادت اور مخالفت کرنے والوں کی پوری پوری مخالفت کو اپنا فرض سمجھتا تھا۔

ارباب علم کا فتویٰ اس صورت میں یہی ہوگا کہ جو صاحبان سچائی اور دیانتداری کے ساتھ جس نظریہ کے بھی حامی تھے ان میں سے کسی ایک کو خطاء اجتہادی میں مبتلا تو قرار دیا جا سکتا ہے۔ گنہگار کسی کو نہیں کہا جا سکتا۔

مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب ان صاحب بصیرت علماء میں سے تھے جن کی دوررس نظر انگریز کی ڈپلومیسی پر تھی۔ وہ اس فریب نظر سے آگاہ تھے جو ایک تباہ کن تصور کو پُر تقدس ظاہر کر رہا تھا وہ اس سے بھی واقف تھے کہ فرقہ واریت کا مہلک مرض خود مسلمانوں کے لئے وبال جان بن جائے گا۔

وہ ایسی سیاست کے حامی تھے جو کمزور کو قوی اور ضرورتمند کو بے نیاز کر دے۔ وہ پاکستانی نظریہ کے فلسفہ کو ملتِ اسلامیہ کے حق میں بہت بڑی خیانت قرار دیتے تھے کیونکہ اس کا مفاد صرف یہ تھا کہ دولت مند کی دولت میں اضافہ ہو جائے۔ رہے وہ ضرورتمند جو امداد کے محتاج تھے جن کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اقلیت اور اکثریت کا یہ تمام ہنگامہ برپا تھا۔ یعنی وہ مسلمان جو اقلیت میں تھے اُن کی دشواریوں اور پریشانیوں کا کوئی حل اور کوئی علاج پاکستان کے حامیوں کے پاس نہیں تھا۔

اس کے علاوہ مجاہد ملت کی نظر اُن نتائج پر بھی تھی جو اس وقت رونما ہو سکتے تھے۔ جب تقسیم ہند کا نظریہ بروئے کار آتا (جیسا کہ وہ پیش آئے بلکہ تصور سے زیادہ ہیبت ناک صورت میں پیش آئے)۔

ان وجوہات کی بنا پر مجاہد ملت نے اپنے دونوں مقتدار (شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمہما اللہ) کا دست راست اور اپنے دوسرے بزرگوں اور رفقار کا پُر اثر ترجمان بن کر وہ کردار پیش کیا جو صاحب العزیمت۔ عالی حوصلہ، شجیع اور بہادر مجاہد پیش کر سکتا ہے جس کو نہ لومۃ لائم کا خوف ہو۔ نہ دار و رسن کی دہشت اس کے دل میں ہو۔

ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں آپ پہونچے اور اس وارفتہ مخلوق کو جو جذبات کے خونیں سیلاب میں بہہ رہی تھی اس کی وارفتگی کے نتائج سے آگاہ کیا۔

اسی زمانہ کا وہ واقعہ ہے کہ شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کے ساتھ آپ ملتان سے واپس ہو رہے تھے۔ لاہور سے پنجاب میل کے فسٹ کلاس میں آپ حضرت شیخ کے ساتھ سوار ہوئے۔

لاہور ریلوے کے لیگی عناصر نے ریلوے کے ٹیلیفون کو نہایت غلط اور افسوسناک مقصد کے لئے استعمال کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امرتسر جالندھر اور لدھیانہ وغیرہ یعنی پنجاب کے جن جن اسٹیشنوں پر میل

ٹھیرنے والا تھا وہاں آبرو باختہ لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا اور انھوں نے شرمناک نعروں سے آگے بڑھ کر آپ کے ڈبہ پر اینٹ پتھر برسائے۔ اللہ تعالےٰ ان کا محافظ تھا کہ ان دونوں بزرگوں کا بال بیکا نہیں ہوا۔ مجاہد ملت کے صرف ایک ہاتھ پر معمولی سا خراش آیا۔ البتہ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہوگئے۔ اور جب لکڑی اور جالیوں والی کھڑکیاں چڑھادی گئیں تو وہ بھی جگہ جگہ سے ٹوٹ گئیں۔

اسی زمانہ میں مسلم پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا گیا جو جمعیۃ علماء ہند خدائی خدمتگار، مجلس احرار اسلام وغیرہ جماعتوں پر مشتمل اور لیگ کے مقابلہ میں ان جماعتوں کا متحدہ محاذ تھا۔ جس کے تحت پر جگہ جگہ امیدوار کھڑے کیئے گئے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو علماء حق جلد دوم)

یہ سرفروشانہ جدّوجہد پاسہ تو نہیں پلٹ سکی۔ مسلم حلقوں میں عموماً کامیابی مسلم لیگ ہی کو ہوئی۔ پھر بھی تقریباً تیس سٹیں یو۔ پی بہار وغیرہ میں بورڈ کے امیدواران کو حاصل ہوئیں اور جب دونوں کے اعداد و شمار حاصل کیئے گئے تو مسلمانوں کے ۳۵ فیصدی ووٹ پاکستان کے خلاف قوم پرور (نیشنلسٹ) مسلمانوں کو ملے تھے۔

یہ تھی سیاست کے اس موڑ پر مجاہد ملت کی قائدانہ جدّوجہد

جُرم کیا تھا؟

میرے احباب اور بزرگ یہ تلخ نوائی معاف فرمائیں کہ اس دور میں ایک بڑا ظلم جمعیۃ علماء ہند پر کیا جاتا رہا۔

برطانوی مشنری جمعیۃ علماء ہند کے خلاف کام کر رہی تھی اور اس کو ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا کیونکہ جمعیۃ علماء ہند اس کی حریف تھی اور ہندستان سے اُس کا نام ونشان مٹانا چاہتی تھی۔

یہ مشنری پروپیگنڈے کی تمام طاقت دو باتوں پر صرف کر رہی تھی اول یہ کہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے اور آزادی کا مطالبہ ہندوؤں کا ہے مسلمان اس کے حامی نہیں ہیں۔

دوسرے یہ کہ جمعیۃ علماء ہند اور قوم پرور مسلمان فریب خوردہ ہیں۔ یہ کوئی مثبت پالیسی نہیں رکھتے۔ صرف کانگریس کی ہمنوائی ان کا نصب العین ہے۔

جمعیۃ علماء ہند اور قوم پرور مسلمانوں کی اتنی طاقت نہیں تھی کہ برطانوی پروپیگنڈے کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر سکتے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ مسلمانوں کی اکثریت کو اس پروپیگنڈے نے نہ صرف متاثر بلکہ مسحور بنا دیا تھا، لامحالہ جمعیۃ علماء ہند کی آواز "نقارخانہ میں طوطی کی صدا" بنکر ناکام ہوتی رہی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ جمعیۃ علماء ہند پاکستان کا بہترین بدل تلاش کر چکی تھی اور ایک ایسا فارمولا منظور کر چکی تھی کہ وہ کامیاب ہو جاتا تو ملک کی طاقت میں یہ رخنہ نہ پڑتا کہ ایک ہی ملک کے دو حصے جن کے متعلق اب یہ کہا جا رہا ہے کہ کسی بھی حصہ کا کامیاب دفاع اور تحفظ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان دونوں کی فوجی کمان ایک نہ ہو۔ یہ دو حصے ایک دوسرے کے مقابلہ میں تیر و ترکش سنبھالے ہوئے ہیں اور مالیہ کا بڑا حصہ جو تعمیر و ترقی یا کسی بیرونی طاقت کے مقابلہ پر دفاعی طاقت کے مضبوط بنانے میں صرف ہوتا، اپنے ہی ہاتھ پاؤں کے بجائے پر صرف ہو رہا ہے۔ اور یہ صورت کہ بھارت کی مسلم اقلیت غضبناک اکثریت کے شکنجہ میں کسی ہوئی بے یار و مددگار واویلا کر رہی ہے، یہ افسوسناک صورت بھی پیش نہ آتی۔ غور فرمایئے جمعیۃ علماء ہند کے فارمولے کے اہم اجزاء یہ تھے۔

۱- صوبے خود مختار ہوں

۲- مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کر دیں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

۳- ان مشترک اختیارات کے علاوہ جن کی تصریح مرکز کے لئے کر دی گئی ہو، باقی تمام تصریح کردہ اور غیر مصرّحہ اختیارات صوبوں کے حوالے ہوں۔

۴- مرکز کی تشکیل ایسے تناسب سے ہو کہ اکثریت اقلیت پر زیادتی نہ کر سکے۔ مثلاً پارلیمنٹ کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو۔

ہندو ۴۵ مسلمان ۴۵ - دوسری اقلیتیں ۱۰

۵- جس مسئلہ کے متعلق مسلم ممبران کی اکثریت فیصلہ کر دے کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے، وہ پارلیمنٹ میں پیش نہ ہو سکے۔

اس فارمولے کا مفاد یہ ہوتا۔

(الف) اہم پورٹ فولیو (قلمدان وزارت) کی تقسیم مساوی طور پر ہوتی

(ب) صوبہ سرحد، صوبہ سندھ، صوبہ بلوچستان اور اگر کشمیر کو ایک صوبہ کی حیثیت دی جاتی تو صوبہ کشمیر، مذہبی معاشی، تہذیبی اور تمدنی

امور میں قطعاً خود مختار ہوتے۔

(ج) پورا صوبہ پنجاب۔ راولپنڈی سے لیکر ضلع سہارنپور کی سرحد تک۔

(د) پورا صوبہ بنگال جس کا دارالحکومت کلکتہ کا عظیم شہر ہوتا۔ مسلم اکثریت کے زیر اقتدار رہتا۔

(ﮦ) صوبہ دہلی اور صوبہ آسام کی سیاست اور حکومت میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً مساوی ہوتا۔ کیونکہ ان دونوں صوبوں میں مسلمان ۴۴ - ۴۵ فی صدی تھے۔

(و) ہندوستان کے باقی صوبوں میں مسلمان لاوارث یتیم کی طرح نہ ہوتے۔ کیونکہ:۔

۱۔ ملازمتوں اور اسمبلیوں میں ان کا حصہ حسب سابق ۳۰ یا ۳۳ فی صدی ہوتا۔

۲۔ وزارتوں میں ان کی موثر شمولیت ہوتی۔

۳۔ مذہبی اور تمام فرقہ وارانہ امور میں ان کو حق استرداد حاصل ہوتا۔

۴۔ وہ ایسے مرکز کے ماتحت ہوتے جس میں ان کی تعداد مساوی ورنہ کم از کم ۳۳ فیصدی ہوتی۔ اور تمام فرقہ وارانہ امور کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہوتی۔ کیونکہ اسمبلی، پارلیمنٹ یا کیبنٹ۔ مسلم ممبران کی موافقت کے بغیر کوئی فیصلہ صادر نہ کر سکتی۔

اس فارمولے کو اس پُر آشوب دور میں مسلمانوں کی اکثریت نے یا تو سُنا ہی نہیں اور اگر سنا تو جذبات میں اس درجہ وارفتہ تھے کہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ بہرحال "مضیٰ مامضیٰ" اب اس داستان پارینہ سے کیا فائدہ، مگر مجاہد ملت رحمۃ اللہ کے حالات کے تذکرہ میں اس کا تذکرہ ضروری ہے۔ تاکہ کل نہیں تو آج اندازہ ہوسکے کہ مخالفت کرنے والے کہاں تک حق پر تھے اور مجاہد ملت کی سرفروشانہ جانفشانی کس مقصد کے لئے تھی۔

جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا ایک مثبت فارمولا تھا اور جمعیۃ علماء ہند کے ارکان کو اس پر اتنا وثوق اور یقین تھا کہ وہ ہر ایک کے سامنے اس کو پیش کر سکتے تھے۔ چنانچہ وزارتی مشن آیا تو جمعیۃ علماء ہند کے نمائندہ حضرات نے اس کو نہ صرف یہ کہ پیش کیا بلکہ اس پر مشن کی پسندیدگی بھی حاصل کی۔

مولانا آزاد مرحوم نے اپنی مشہور کتاب (انڈیا ونس فریڈم) میں واضح کر دیا ہے کہ ان کا پیش کردہ فارمولا "وزارتی مشن" نے منظور کر لیا تھا یہی وہ فارمولا ہے جس کو مولانا آزاد نے پیش فرمایا تھا۔ مزید تفصیل چند سطروں کے بعد ملاحظہ فرمائیں۔

وزارتی مشن کی آمد اور جمعیۃ علماء ہند کی نمائندگی

ابھی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات تمام ہندوستان میں مکمل نہیں ہوئے تھے کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن کراچی پہونچ گیا۔ لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند، سر اسٹیفورڈ کرپس اور جنرل الیگزینڈر وفد کے ارکان تھے۔ ایک ہفتہ آرام کرنے کے بعد یا تازہ حالات کے پورے مطالعہ کے بعد یکم اپریل سے مشن نے ہندوستانی لیڈروں سے ملاقات شروع کی

کل ہند مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے صدر کی حیثیت سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دی گئی تھی۔ اور چونکہ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے ساتھ دوسری جماعتیں بھی اشتراک عمل کئے ہوئے تھیں لہذا جناب صدر کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ مزید تین افراد کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ چنانچہ عبدالمجید صاحب خواجہ مرحوم (صدر آل انڈیا مسلم مجلس) شیخ حسام الدین صاحب، صدر آل انڈیا مجلس احرار اسلام شیخ ظہیر الدین صاحب صدر آل انڈیا مومن کانفرنس۔ ان تینوں جماعتوں کے سربراہوں کی حیثیت سے اور جناب حافظ محمد ابراہیم صاحب (مرکزی وزیر برقیات) ترجمان کی حیثیت سے حضرت شیخ الاسلام کے ساتھ تشریف لے گئے۔

اس نمائندہ جماعت کو ایک ایسے صاحب بصیرت سیاسی کھلاڑی کی بھی ضرورت تھی جو نمائندگان پریس کی شوخیوں کا جواب بھی دے سکے۔ اس کی حاضر جوابی دوسری پارٹیوں کے نکتہ چینیوں کو خاموش کر سکے۔ پُر مغز و مدلل خطابت ہر ایک دل کو مٹھی میں لے سکے۔ ایسی شخصیت جوان اوصاف کی حامل ہو، مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کی شخصیت تھی۔ لہذا آپ کو بھی اس نمائندہ وفد میں شریک کیا گیا۔

۱۶ اپریل ۱۹۴۶ء کو ۴ بجے شام سے سوا پانچ بجے تک مشن سے ملاقات ہوئی۔ جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا وزارتی مشن کے سامنے پیش کیا گیا وزارتی مشن نے اس فارمولے سے یہاں تک دلچسپی لی کہ مقررہ وقت یعنی (نصف گھنٹہ) سے زائد ۴۵ منٹ فارمولے کے مضمرات اور اس کے مفادات کو سمجھنے سمجھانے پر صرف کر دیئے۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب (انڈیا ونس فریڈم) میں ایک فارمولے کا تذکرہ کیا ہے جس کو وزارتی مشن

خاص طور پر پسند کیا تھا اور اسی کی بنیادوں پر اپنا اعلان مرتب کیا تھا مولانا آزاد نے اس کتاب میں اس فارمولے کو اگر منسوب کیا ہے تو صرف اپنی جانب لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا تھا جو جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس لاہور (مارچ ۱۹۴۲ء) میں مرتب کیا گیا ۔ اور اجلاس سہارنپور (مئی ۱۹۴۵ء) میں اس کی مزید توثیق اور تشریح کی گئی تھی ۔

سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے اخبار بین طبقہ کو تقریباً سولہ سال پہلی یہ بات فراموش نہیں ہوئی ہوگی کہ مذکورہ بالا ملاقات سے ایک ماہ بعد ۱۶؍مئی ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن نے جو سفارشات پیش کیں وہ انہیں لائنوں اور انہیں خطوط پر تھیں جن کی طرف جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا اشارہ کر رہا تھا ۔

وزارتی مشن نے پاکستان کی تردید کرتے ہوئے نظریۂ پاکستان کو ہندوستان کے لئے مضرت رساں قرار دیا تھا ۔

ان سفارشات کی بنیاد پر ۲؍ستمبر ۱۹۴۶ء کو عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو کیبنٹ کے ۱۴ ممبروں میں پانچ مسلمان تھے یعنی $\frac{1}{3}$ سے کچھ زیادہ اور مالیات کا اہم ترین محکمہ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے سپرد کیا گیا تھا ۔

مگر بخت واژگون نے پھر پلٹا کھایا ۔ لیگ کی طرف سے ردعمل تو لازمی تھا ۔ لیکن برطانوی ایجنٹوں کی دورخی پالیسی نے اس کی نوعیت میں خون ریزی بھی شامل کردی ۔ انتہا یہ کہ تقسیم کا سوال پھر شدت سے سامنے آیا اور اس مرتبہ کانگریس کی غیر معمولی اکثریت بھی تقسیم کی حامی بن گئی ۔

سیاست کا یہ دور بھی نہایت پُرپیچ تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے متوقع نتائج کسی ایک فیصلہ پر متحد کرنے کے بجائے ہر ایک فریق کے لئے متضاد دلائل مہیا کر رہے تھے ۔

مثلاً یہ بات مشہور ہے کہ سردار پٹیل جو اس عارضی حکومت میں وزیر داخلہ بنائے گئے تھے ان کو اس سے سخت تکلیف ہوئی کہ وہ اپنے اختیارات سے ایک چپراسی کا تقرر بھی نہیں کر سکتے ۔ چپراسی کے لئے بھی وزیر مال نواب زادہ لیاقت علی خاں کی منظوری کے محتاج ہیں ۔ (جنہوں نے پارلیمنٹ سے ایک ایسا میزانیہ منظور کرالیا تھا جس نے ہندوستان کے سرمایہ داروں کو سراسیمہ کر دیا تھا ۔)

اس ایک واقعہ سے قوم پرور مسلمانوں کی یہ دلیل مضبوط ہو رہی تھی کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمان ایک فیصلہ کن پوزیشن اختیار کر سکتے ہیں بلکہ ایسی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں کہ اکثریت ان کی دست نگر بن جائے ۔

اور اسی ایک واقعہ نے سردار پٹیل جیسے ہندوازم کے حامیوں کو یہ سبق دیدیا تھا کہ تقسیم ضروری ہے ۔ کیونکہ سیاسی اقتدار میں اگر مسلمانوں کی شرکت رہی تو ان کو ہندوازم کے چمکانے اور من مانی کارروائی کرنے کی کھلی چھٹی نہیں مل سکے گی ۔

فرقہ پرستی کہاں تھی

کہا جاتا ہے کہ مسٹر جناح اور ان کے ساتھی مسلم رہنماؤں کی ذہنیت فرقہ پرست تھی ۔ مگر سردار پٹیل جیسے قوم پرست نے جس ذہنیت کا ثبوت پیش کیا اس کے لئے بھی فرقہ پرستی کے علاوہ کوئی اور عنوان نہیں ہو سکتا ۔ الفاظ میں اگر تبدیلی کی جائے تو سردار پٹیل کی ذہنیت کے لئے " زہریلی سامپردایکتا " کا لفظ استعمال کیا جائیگا ۔

بہرحال سیاست کا یہ وہ نازک موڑ تھا جس کی نظیر شاید ہندوستان کی پوری تاریخ میں نہ مل سکے ۔

انڈین نیشنل کانگریس کو عام طور پر کامیاب تصور کیا جاتا ہے بیشک وہ اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ انگریز کو ہندوستان بدر کر کے سیاسی اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ لیکن اگر کسی با اصول جماعت کی کامیابی کا مدار اصول کی کامیابی پر رکھا جائے تو صحیح بات یہ ہے کہ کانگریس ناکام رہی ۔ کیونکہ اس کے دونوں اصول یعنی پورے ہندوستان کا اتحاد ۔ اور بلا تفریق مذہب و ملت تمام ہندوستانیوں کی قومیت کا اتحاد ۔ یہ دونوں اصول پاش پاش ہو گئے ۔

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں کانگریس کا عذر یہ تھا ۔

> " حالات نے ہر ایک دماغ کو مجبور کر دیا ہے کہ جو حل بھی موجود الجھاؤ کو ختم کر سکتا ہو اس کو تسلیم کر لے ۔ کانگریس کے سامنے یہ سوال نہیں تھا کہ کونسا منصوبہ منظور کیا جائے بلکہ سوال یہ تھا کہ گومگو اور غیر اطمینانی کی موجودہ تباہ کن حالت باقی رہے یا سب سے پہلی فرصت میں اس کو ختم کر دیا جائے ۔

کانگریس متحدہ ہندوستان کے نظریہ سے جُدا نہیں ہوئی لیکن وہ حق خود ارادیت کو بھی تسلیم کر چکی تھی کہ جو علاقے یونین میں شامل نہ ہونا چاہیں، انھیں مجبور کرنے کے وہ خلاف ہے۔"

یہ دماغوں کی مجبوری کیا تھی۔ یہ وہی فرقہ واریت تھی جو دونوں پلیٹ فارموں پر رقص کر رہی تھی۔ جس کا افسوسناک اثر یہ تھا کہ ۳ رجون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کی اسکیم کا اعلان ہوا۔ اور ۱۴ رجون تک کانگریس اور مسلم لیگ (ہندوستان کی دونوں بڑی جماعتوں نے) اس کے حق میں منظوری صادر کردی۔

جمعیۃ علماء ہند اور مسئلہ تقسیم

لیکن تاریخی نوشتوں میں یہ صداقت اور اصول پسندی سنہری حرفوں سے درخشاں رہنی چاہیئے کہ اس بدترین بحرانی دور میں جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد جیسا سنجیدہ اور دانشمند مدبر بھی ہر ایک دماغ کو مجبور پا رہا تھا، جو پلیٹ فارم اس مجبوری سے مستثنیٰ رہا وہ جمعیۃ علماء ہند کا پلیٹ فارم تھا۔ اور ممبران کانگریس میں جو رہنما اس مجبوری سے محفوظ رہا، وہ مجاہد ملت حفظ الرحمٰن تھا۔

ابھی تقسیم ہند کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ صرف ارباب بصیرت اراکین جمعیۃ علماء ہند نے اس کے آثار سیاسی فضا میں محسوس کئے تھے کہ اسی احساس کی جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اجلاس لکھنؤ مورخہ ۱۰ رمئی ۱۹۴۷ء میں تقسیم کی مضرتیں ظاہر کرتے ہوئے اس سے بیزاری کا اظہار کیا اور جب ۳ رجون کو تقسیم ہند کا باضابطہ اعلان کردیا گیا تو ۱۴ رجون ۱۹۴۷ء کو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ نے دوبارہ بیزاری کا اظہار کیا اور سختی سے تقسیم ہند کی مخالفت کی۔

مجاہد ملتؒ کی استقامت اور جرأت

۱۴ رجون ۱۹۴۷ء کو کانسٹی ٹیوشن ہاؤس دہلی میں کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں تقسیم ہند کی تجویز پیش کی گئی۔ تجویز پیش کرنے والے پنڈت دلبھ پنت وزیر اعظم یوپی تھے اور تائید کرنے والے ہندوستان کے بہترین مدبّر اور خطیب امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ کانگریس ہائی کمانڈ جو ہندوستان کی سب سے اونچی شخصیتوں کا مجموعہ تھا تجویز کا حامی تھا۔

اجلاس میں شریک ہونے والے ممبروں میں سے ممکن ہے بہت سے ممبر اس تجویز کے حامی نہ ہوں۔ مگر اول تو ہائی کمانڈ کی مخالفت کسی بھی موقع پر آسان کام نہیں خصوصاً ایسی صورت میں کہ پوری فضا ایک رنگ میں رنگی ہوئی ہو اس کی مخالفت میں صرف وہی شخص آواز اٹھا سکتا ہے جو "لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم" کا پیکر اور اس کا صحیح مصداق ہو اور جس کی صداقت پسندی ہر ایک مرعوبیت سے آزاد ہو۔

مجاہد ملت جب تقسیم ہند کو ملک اور ملت دونوں کے لئے جرم عظیم سمجھتے تھے تو آپ نے قطعاً گوارا نہیں کیا کہ کسی بھی نوع سے اس جرم عظیم کی حمایت کریں۔

مجاہد ملت اپنا رشتہ اپنے مالک حقیقی سے جوڑے ہوئے تھے اُن کو یقین تھا کہ انہیں اس کی بارگاہ میں جواب دہی کرنی ہے۔ وہ سمجھتے تھے اور صحیح سمجھتے تھے کہ کلمۂ حق کے اعلان اور اظہار کے موقع پر سکوت بھی جرم ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے ممتاز ارکان میں سے صرف مجاہد ملت آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ آپ نے وہ فرض جو جمعیۃ علماء ہند کے ناظم عمومی ہونے کی حیثیت سے آپ پر عائد تھا۔ اور جس کو نہ صرف جماعتی بلکہ ملی اور قومی تقاضا اور حق و صداقت کا مطالبہ تصوّر کرتے تھے اس کو پوری جرأت اور استدلال و خطابت کے بہترین سلیقہ کے ساتھ ادا کیا۔

عجیب اتفاق ہے کہ اے۔آئی۔سی۔سی کے تقریباً چھ سو ارکان میں سے اس تجویز کی مخالفت کی توفیق صرف ایسے دو ممبروں کو ہوئی جو آپس میں بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مگر اس مسئلہ میں متحد ہو گئے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے علاوہ دوسرے ممبر جنھوں نے تقسیم کی اس تجویز کی مخالفت کی تھی ہندو تہذیب کے مشہور علمبردار" پرشوتم داس ٹنڈن" تھے۔

بیشک جمعیۃ علماء ہند کی تجویز۔ اظہار بیزاری اور اظہار برأت پھر اجلاس کانگریس میں کانگریس کی تجویز کی مخالفت کامیاب نہیں ہو سکی لیکن مجاہد ملت اور اُن کے علاوہ جمعیۃ علماء ہند کے معزز ارکان کو اس بات کا اطمینان ہے کہ وہ اس تباہ کن اور خونریز تقسیم کی ذمہ داری سے محفوظ رہے اور خون بے گناہ کا کوئی دھبّہ اُن کے دامن پر نہیں لگ سکا۔

* * * * * * *

۱۹۴۷ء اور مجاہد ملّت رحمۃ اللہ

۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں لاکھوں مسلمان ترک وطن کر کے چلے گئے پھر بھی ساڑھے تین کروڑ مسلمان (جو اَب خدا کے فضل سے ۶ کروڑ اور ایک قول کے مطابق آٹھ کروڑ ہوگئے ہیں) باقی رہ گئے۔ اس طرح اگر مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ بھی ہندوستان میں رہ گئے اور پاکستان نہیں گئے تو کوئی قابل تذکرہ بات نہیں ہے۔ قابل تذکرہ وہ انقلاب ہے جو مجاہد ملتؒ نے ان رہنے والے مسلمانوں کے ذہنوں، اُن کے حوصلوں اور ارادوں میں برپا کیا۔ قابل تذکرہ وہ تعمیر ہے مجاہد ملتؒ جس کے معمارِ اوّل بنے۔

۱۹۴۷ء کے وہ لرزہ خیز ہنگامے جن سے صرف انسانوں کے دل ہی نہیں لرزتے بلکہ انسانیت کی نگاہیں نیچی اور شرافت کی گردن جھک جاتی ہے۔ ان کا فراموش ہوجانا ہی بہتر ہے۔ ان کی یاد تازہ کرنا نہ ملک کے لئے مفید ہے نہ قوم و ملّت کے لئے۔ لیکن کسی "مجاہد" کی حیات عزیز کے خدوخال نمایاں کرنے کے لئے اگر ان کی طرف کچھ اشارے کرنے پڑیں تو وہ تاریخ کی ایک ضرورت ہوگی۔ جس سے نظر پھیر لینا بھی درست نہیں بلکہ درحقیقت تاریخ کے حق میں ناقابل معافی خیانت اور جرم ہے بیشک ہم اس تاریخ سے سبق بھی لے سکتے ہیں اور تاریخ کا اصل منشا یہی ہے کہ ماضی کی خرابیوں سے سبق لیکر مستقبل کو بہتر بنائیں۔

۱۹۴۷ء کا سب سے بڑا المیہ مشرقی اور مغربی پنجاب کی تبادلہ آبادی کا فیصلہ تھا جو چند چوٹی کے لیڈروں اور برطانوی ایجنٹوں نے اس طرح کیا کہ ان کروڑوں انسانوں کو اس کی خبر تک نہیں تھی جو اس خونیں فیصلہ سے تباہ و برباد ہونے والے تھے۔

سرکاری فیصلوں کا نفاذ اخلاق اور رحم و کرم کی شعاعوں سے نہیں ہوا کرتا۔ رائفلوں، مشین گنوں اور ٹینکوں کی گرج اور توپوں کے دھماکے اس کے نفاذ کی خبر دیا کرتے ہیں جو ساتھ ساتھ انسانی خون کی ارزانی کا بھی اعلان کردیتے ہیں۔

تبادلۂ آبادی کے نتیجہ میں ہند اور پاکستان کی اقلیتوں کی واسطہ ایسی بھیڑ سے پڑا جن سے نہ دید شنید تھی نہ جان پہچان۔ ان کی زبان جدا۔ ان کی معاشرت علیحدہ۔

جو اپنے اپنے وطن میں تباہ و برباد ہوکر اور زیادہ تر وہ تھے جو اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی تڑپتی ہوئی لاشوں کو چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔ بہت سوں کی بہنیں اور بیٹیاں جدا ہوگئی تھیں۔ کتنے ہی وہ تھے جو اپنی رفیقہ حیات کی بے عزتی سے مضطرب اور بے چین تھے۔ اُن کے دماغ جوش انتقام سے کھول رہے تھے۔ آنکھیں سُرخ۔ چہروں پر درندگی کی وحشت برس رہی تھی۔

فوجوں کی تقسیم نے اس وحشت انگیز اور بربریت نواز بھیڑ کو جس کی تعداد لاکھوں تھی جگہ جگہ مسلح بھی کردیا اور حکومت کو اگر وہ امن قائم کرنا چاہے تو بے دست و پا بنا دیا تھا۔ یہی حالت پولیس کی بھی ہوئی۔ وہ خود بخود تقسیم ہوگئی۔ دہلی کی پولیس میں مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔ اس نے سب سے پہلے اپنی جان کی فکر کی۔ اور بے پناہوں کی پناہ بننے کے بجائے پناہ گزینوں کے کیمپ میں جاکر پناہ گزیں بن گئی۔

پاکستانی اقلیتوں نے ہندوستان پہونچکر مسلمانوں کو الٹی میٹم دیا۔ "پاکستان بنانے کے ذمہ دار تم ہو۔ اب تمہارے لئے یہاں پناہ نہیں ہے۔ ہندوستان کے فرقہ پرستوں نے ان کی تائید کی۔ بہت سی ریاستیں جو کانگریس گورنمنٹ کی بحالی اور مضبوطی کو اپنے لئے پیغام فنا سمجھتی تھیں فرقہ پرستوں کی ہمنوا بن گئیں۔ اب ان کے پاس نہ سرمایہ کی کمی تھی نہ اسلحہ کی۔

ان قیامت خیز اور طوفان انشاں حالات نے پورے صوبہ دہلی اور مغربی یوپی کے تقریباً ایک درجن اضلاع اور راجستھان کے ان تمام علاقوں کو جو پاکستانی سرحد سے ملتے تھے جن میں الور اور بھرت پور کو خاص شہرت حاصل ہوئی، تباہی اور بربادی کے اس سیلاب کی نظر کردیا۔ جو مغربی پنجاب۔ سندھ اور فرنٹیر وغیرہ سے اُمنڈ اُمنڈ کر آرہا تھا۔

خود مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ وہ سب لیڈر اور رہنما جن کے بل بوتے پر پاکستان کے حامیوں نے گذشتہ دس سال تک آسمان سر پہ اُٹھائے رکھا تھا، ایک ایک کرکے رخصت ہو چکے تھے۔

پاکستان کا ہر ایک حامی نہ صرف مصیبت زدہ اور مایوس تھا بلکہ اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہا تھا۔

غداری کا ایک عام الزام، پاکستانی شرنارتھیوں اور ہندوستانی فرقہ پرستوں کی گرجتی ہوئی کرخت آوازوں کے ساتھ اُن کے سر تھوپا جارہا تھا۔

ان حالات میں تمام قوم پرور مسلم رہنماؤں کے سامنے خود اپنے متعلق

ایک سوال تھا :-

> وہ ہندوستان میں رہیں تو کس حیثیت سے ۔ خود ان کی پوزیشن کیا ہو ۔ اور عام مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہو بالخصوص ان مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہو ۔ جو پاکستان کے حامی تھے ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ۔ حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ۔ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب اور اُن سے وابستہ حضرات نے سب ہی نے ان سوالات کو عزم وہمت اور بلند حوصلہ کے ساتھ حل کیا ۔ مگر جہاں تک دہلی کا تعلق ہے جو دار السلطنت ہونے کی وجہ سے اور اس بنا پر کہ اصل تعداد سے کئی گنا زیادہ تعداد جوش انتقام سے بھرے ہوئے پناہ گزینوں کی یہاں ہوگئی تھی ان ہنگاموں کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا) دہلی کے متعلق بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ عوامی لیڈر کی حیثیت سے سب سے زیادہ جرأت اور ہمت کے ساتھ جس نے ان سوالات کو حل کیا ۔ اور نہ صرف حل کیا بلکہ جس نے حل کردہ منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لئے جان کی بازی لگا کر شب وروز کے ہر ایک لمحہ کو اپنی جدّوجہد سے زندہ جاوید بنا دیا ۔ وہ یہی مردِ مجاہد تھا جس کو اس کی قوم نے بجا طور پر مجاہدِ ملت کا خطاب دیا ۔ رحمۃ اللہ ۔

"ہندوستان ہمارا وطن ہے ۔ یہ ہماری روایات کا مخزن اور ہماری تہذیب وثقافت کا گہوارہ ہے ۔ اس کی در ودیوار پر ہماری ہزار سالہ تاریخ کے نشانات کندہ ہیں ۔ اگر پنڈت جواہر لال نہرو کو یہاں رہنے کا حق ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انہیں جیسا ہمارا حق بھی اس سرزمین میں نہ ہو ۔

وطن عزیز پر بہت سے حوادث آتے ہیں ۔ ایک حادثہ وہ تھا کہ برطانوی سامراج یہاں مسلّط تھا ۔ ایک حادثہ وہ تھا کہ مسلمانوں میں فرقہ واریت کا بھوت ناچ رہا تھا ۔ ایک حادثہ یہ ہے کہ ہند و فرقہ واریت کا دیو حملہ آور ہو رہا ہے ۔

اگر ہم نے اپنی تمام مجبوریوں اور لاچاریوں کے ساتھ برطانوی سامراج کے مظالم کا مقابلہ کیا ۔ اگر ہم مسلم فرقہ واریت کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوگئے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ہندو فرقہ پرستی کے مقابلہ میں مرد بہادر نہ بنیں اور مرعوب ہو کر وطن عزیز کو خیرباد کہدیں ۔

ہمیں یہیں رہنا ہے اور باعزت طور پر اُن تمام حقوق کے ساتھ رہنا ہے جو ایک باعزت شہری کو حاصل ہو سکتے ہیں ۔

بیشک ہم مظلوم ہو سکتے ہیں مگر غلام نہیں بن سکتے ۔ اگر ہم نے برطانیہ کی غلامی برداشت نہیں کی تو ہم اکثریت کی غلامی بھی برداشت نہیں کر سکتے ۔ ہم آزاد شہری کی حیثیت سے یہاں رہیں گے اور نہ صرف حفظ الرحمٰن ۔ ابوالکلام نہ صرف قوم پرور مسلمان ۔ بلکہ وہ کروڑوں مسلمان جو ہندیونین میں ہیں سب باعزت شہری کی حیثیت سے رہیں گے ۔

پاکستان بن چکا ۔ اس کی حمایت اور مخالفت کا سوال بھی ختم ہو گیا اب ہندیونین کے تمام مسلمان ایک کشتی میں سوار ہیں ۔ ایک کی تکلیف سب کی تکلیف ۔ ایک کی ذلت سب کی ذلت ۔"

یہ تھے وہ تصوّرات اور جذبات جن کو مجاہد ملت نے اپنایا اور جن کے لئے اپنی تمام کوششیں اور صلاحیتیں وقف کر دیں ۔

مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ خود فرمایا کرتے تھے کہ ۴ ستمبر ۴۷ء کو مسجد فتحپوری میں گولا پھینکا گیا وہ دہلی میں قیامت خیز طوفان کا آغاز تھا ۔ اسی وقت اپنے اور اپنے خدا کے درمیان یہ عہد کر لیا تھا کہ مخالفت وموافقت کے تمام قصّے ختم ہو گئے ۔ اب ہر مظلوم ۔ ہر پریشان حال ۔ ہر مصیبت زدہ کی امداد فرض ہے ۔ خواہ وہ کوئی ہو ۔ اور اس کا سابق کردار کچھ رہا ہو ۔

ٹاؤن ہال ۔ امن کمیٹی کا سنٹر تھا ۔ امن کی کوششیں کرنے والے ہندو مسلمان یہاں جمع ہوتے تھے ۔

ایک روز جب خونریزی کا دور شباب پر تھا ۔ ٹاؤن ہال کے چاروں طرف مسلمانوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں ۔ بلوائیوں کے ہجوم کے سامنے پولیس اور فوج بھی گویا ہتھیار ڈالے ہوئے تھی ۔ ہندو دوستوں نے بڑے اصرار سے کہا :-

> مولانا آپ اور آپ کے ساتھی ہمیشہ قوم پرور رہے ہیں ہماری ندامت کی کوئی انتہا نہیں رہے گی اگر آپ صاحبان پر آنچ آئی ۔ یہ جنونی ہجوم کسی کے بس کا نہیں ہے یہاں ہمارے تمام حفاظتی انتظامات ناکام ہو چکے ہیں ۔ اوکھلے میں ایک کیمپ بنایا گیا ہے ۔ وہاں یہ ہجوم نہیں پہونچ سکتا ۔ وہاں فوجی دستے لگا دیئے

گئے ہیں۔ آپ اور آپ کے ساتھی وہاں تشریف لے چلیں۔ آپ حضرات کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

غور فرمائیے۔ اس نازک وقت میں جب موت سامنے کھڑی تھی ہندو دوستوں کی یہ اپیل کس قدر موثر ہوسکتی تھی۔ آپ خود اپنے دل سے پوچھئے کیا آپ اس وقت اس اپیل پر لبیک نہ کہتے۔؟

اس وقت مجاہد ملت کے ساتھ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب اور دوسرے رفقاء بھی تھے۔ مگر سب سے پہلے جس نے ترخ کر جواب دیا وہ مجاہد ملت کا حوصلہ عالی تھا۔ آپ نے فرمایا۔

"ہمارے لئے اس سے زیادہ شرم اور بزدلی کی بات کوئی نہیں ہوسکتی کہ خود اپنے وطن میں ہم پناہ گزیں بن کر رہیں۔ بیشک یہ سخت آزمائش ہے مگر ہمیں ڈٹ کر اس بحران کا سامنا کرنا ہے

یا تن رسد بجاناں یا جان ز تن برآید

مجاہد ملت نے اپنے اس عزم کو عملی جامہ کس طرح پہنایا' وہ محتاج بیان نہیں۔ ہندوستان کا بچہ بچہ اس کا شاہد ہے۔

اس موقعہ پر امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے جس تدبر سے فریضۂ قیادت انجام دیا اس سے انکار نہیں ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے تحفظ کے لئے بار بار ان کو اپنے دولتکدہ سے نکل کر دہلی کی گلیوں اور کوچوں میں گھومنا پڑا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سیلاب اور طوفان کے منجدھار میں چٹان بن کر جس نے اپنے عمل اور کردار سے دوسروں کو استقلال و استقامت کا سبق دیا'

جس کی ثابت قدمی نے دہلی میں اس وقت تقریباً ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کو باقی رکھا۔ اور نہ صرف دہلی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے استقلال کا اثر ہند یونین کے گوشہ گوشہ تک پہونچا۔ کیونکہ اگر دہلی اور مغربی یوپی اور راجستھان کے سرحدی اضلاع مسلمانوں سے خالی ہوجاتے تو پھر یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ سیلاب جو ان سرحدوں سے ٹکرا کر ختم ہوگیا کہاں تک پہونچتا۔

اس زمانہ میں یو۔پی کے مغربی اضلاع (سہارنپور، مظفرنگر وغیرہ) تک پہونچنا مجاہد ملت کے لئے ناممکن تھا۔ آپ ایک لمحہ کے لئے بھی دہلی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ان اضلاع میں جس نے درس استقلال و استقامت دیا وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند و صدر جمعیتہ علماء ہند) کا ظل ہمایوں تھا۔ قدس اللہ سرہما العزیز۔

مجاہد ملت کا حسن تدبر اور گاندھی جی

آگ کی بھٹی سونے کا کھرا کھوٹا نکھارتی ہے اور مصائب کی بھٹی انسان کے جوہر ابھار دیتی ہے۔

مجاہد ملت کو اللہ تعالے نے تین جوہر ایسے عطا فرمائے تھے جنھوں نے صرف مجاہد ملت ہی کو نہیں ابھارا۔ بلکہ پوری ملت کو ابھار دیا اور اس کا سر اونچا کردیا۔

تدبر۔ یعنی تقاضا وقت کو برمحل اور عین وقت پر پہچاننا۔ اس کی تہہ تک پہنچ جانا۔ پھر دفع مضرت کے لئے بروقت تدبیر سوچنا۔

جراءت:۔ یعنی بلا جھجک تقاضا وقت کے بموجب عملی اقدام

خطابت:۔ یعنی اپنے خیال اور اپنے منصوبہ کو استدلال کی پوری طاقت کے ساتھ اس طرح پیش کرنا کہ مخاطب لامحالہ متاثر ہوجائے۔ ورنہ کم از کم جواب دینے کی طاقت مفلوج اور مرعوب ہوجائے۔

مجاہد ملت اور ان کے رفقاء کرام کا تعارف گاندھی جی سے پہلے سے تھا۔ اور جیسے ہی اس ہنگامی دور میں ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو گاندھی جی نواکھالی اور کلکتہ سے واپس ہوکر دہلی پہونچے' مجاہد ملت کا حسن تدبر تھا کہ آپ نے پرانے تعلقات کو صرف تازہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کو پختہ کیا اور ایسا اعتماد حاصل کیا کہ حکومت کے سربراہوں کو بھی گاندھی جی کا اتنا اعتماد حاصل نہیں تھا۔

گاندھی جی فی الحقیقت امن چاہتے تھے اور ابھی تین ہفتہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بنگال کے فسادات کو جن کا سلسلہ چند ماہ سے چل رہا تھا اور ہزاروں معصوم جانیں اس کی نذر ہوچکی تھیں اس طرح ختم کردیا تھا کہ دنیا حیرت زدہ ہوگئی تھی۔

گاندھی جی ۹ ستمبر کو دہلی پہونچے۔ فرقہ پرستوں نے ان کی مخالفت اتنی شدت سے کی کہ پرارتھنا کی مجلسوں میں گاندھی جی کو ترمیم کرنی پڑی مجاہد ملت جو خود فرقہ پرستی کے مقابلہ میں نبرد آزما تھے' گاندھی جی کے دست راست بن گئے

مجاہد ملت کو سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب کی رفاقت

چمل تھی۔ بلکہ عجیب و غریب حقیقت یہ تھی کہ حضرت سحبان الہند جو چند سال سے قلب کے مرض میں مبتلا تھے نقل و حرکت سے معذور ہوکر تقریباً گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ مجاہد ملت نے ان کو کنج عزلت سے "نکالا"۔ بلا شبہ سحبان الہند کا خود اپنا جذبہ اور اُن کے قلب بیمار کی بھی "تڑپ" تھی کہ انھوں نے مجاہد ملت کی دعوت پر لبیک کہا اور ضعف و نقاہت کے باوجود مولانا کا ساتھ دینے کے لئے گوشہ عافیت سے نکل آئے۔

جمعیۃ علماء ہند کے دفتر کے پاس اس وقت تک کوئی گاڑی نہیں تھی۔ احاطہ کالے صاحب کے مشہور تاجر حافظ محمد نسیم صاحب نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی۔ روزانہ صبح کو اپنی کار لیکر جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں رونق افروز ہوجایا کرتے تھے اور مجاہد ملت حافظ صاحب موصوف کے ساتھ سحبان الہند کے یہاں پہونچکر اُن کو ساتھ لیتے۔ دہلی کے بہت پُرانے اخبار نویس۔ سیّد محمد صاحب جعفری، سابق ایڈیٹر روز نامہ ہمدرد و روزنامہ "ملت" بھی سحبان الہند کے یہاں موجود ہوتے اُن کو چوتھا رفیق بناتے۔ اس طرح ان چار رفقاء کا پہلا کام یہ ہوتا کہ مہاتما گاندھی کے یہاں پہونچکر صحیح صحیح حالات بلاکم و کاست روزانہ پیش کردیتے

گاندھی جی کے "تدبّر" نیک نفسی، صداقت پسندی اور دور اندیشی میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے۔ انھوں نے اپنے طور پر بھی ان حضرات کے بیانات کو پرکھا۔ اور جب ہر طرح صحیح اور درست پایا تو ان کو اتنا اعتماد ہوگیا کہ حکومت ہند کے ہوم منسٹر سردار پٹیل کی شخصیت بھی اس کو ختم نہ کرسکی۔

حکومت ہند نے کبھی اپنی زبان سے یہ بات نہیں کہی مگر کم از کم راجدھانی کا ہر ایک باخبر انسان جانتا تھا کہ ممبران کیبنٹ کے جذبات ایک دوسرے سے مختلف اور ایسے متضاد ہیں جن کے باعث نہ صرف یہ کہ امن و امان کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہوگیا ہے۔ بلکہ گاندھی جی کی امن پرورانہ کوششیں بھی ناکام ہو رہی ہیں۔

ایک دفعہ مجاہد ملت نے دہلی کے ڈپٹی کمشنر مسٹر رندھاوا سے (جنکو مسلمانوں کے حق میں ۱۹۴۷ء کا لارڈ کیننگ کہنا درست ہے) ہنگاموں اور فسادات کے متعلق شکایتیں کیں اور مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کا نظریہ اور ان کی منشاء سمجھانے کی کوشش کی تو مسٹر رندھاوا نے فوراً تیوری بدل کر جواب دیا:۔

"ہمارا تعلق سردار پٹیل سے ہے اور وہ ہمارے کاموں سے مطمئن ہیں"۔

تاہم گاندھی جی کا اثر و رسوخ بھی معمولی نہیں تھا۔ اس کا اثر یہ تھا کہ تمام لاچاریوں اور بے بسیوں کے باوجود جمعیۃ علماء کے کارکن اس طرح حاوی تھے کہ دہلی ایڈمنسٹریشن کے افسر "طنزاً" کہا کرتے تھے کہ دہلی میں حکومت جمعیۃ علماء کی ہے۔

میواتیوں کا مسئلہ

مجاہد ملت نے فرقہ واریت کے مقابلہ میں گاندھی جی کا دست راست بن کر صرف دہلی کی آتشیں فضاء کو سرد کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دہلی سے متصل راجستھان اور مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو بھی محفوظ رکھنے اور اُن کو مطمئن کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے۔

افسوس اس زمانہ میں جمعیۃ علماء سے تعلق رکھنے والا ہر ایک چھوٹا بڑا اس درجہ مصروف اور منہمک تھا کہ کسی کو بھی ڈائری لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ احقر نے چند بار یہ سلسلہ قائم کرنا چاہا۔ مگر ایک طرف واقعات کی کثرت اور دوسری جانب جماعتی فرائض کی انجام دہی کی کوشش۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈائری لکھنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ تاہم بہت سے واقعات علماء حق جلد دوم اور "مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علماء ہند" میں درج کرکے شائع کراچکا ہوں۔

بہرحال یہ بات کسی ڈائری کے اندراج یا کسی شخص کی تصدیق و شہادت کی محتاج نہیں ہے کہ الور اور بھرتپور کی ریاستوں کی کھلی ہوئی پالیسی یہ تھی کہ وہ اپنی ریاستوں سے مسلمانوں کا نام و نشان ختم کردیں۔ ان مسلمانوں میں زیادہ تعداد "میواتیوں" کی تھی۔ جن کی مردم شماری ان ریاستوں میں تقریباً چھ لاکھ تھی۔ ان ریاستوں کی سرحدیں مشرقی پنجاب کے ضلع گوڑگانوہ سے ملتی ہیں۔ اس ضلع میں بھی کئی لاکھ میواتی آباد تھے۔ جن کی کافی تعداد اب بھی موجود ہے (امید ہے کہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں ان کی تعداد دو لاکھ سے بھی بڑھ گئی ہوگی)

الور۔ بھرتپور اور ضلع گوڑگانوہ کے اس علاقہ میں جس کو "موات" کہا جاتا ہے۔ تقسیم سے پہلے کس طرح مسلمان میو اور ہندو جاٹ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے ہے اور پھر کس طرح اُن میں ایسی حیرت انگیز صلح ہوئی کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کا آتش فشاں بھی اس میں جنبش پیدا نہ کرسکا۔ اس کی دلچسپ تفصیل علماء حق جلد دوم اور "مختصر تذکرہ

خدمات جمعیۃ علمار ہند" حصہ دوم میں ملاحظہ فرمائی جائے۔

یہاں اس کا دہرانا ممکن نہیں ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ جب الور اور بھرتپور کی ریاستیں میواتیوں اور عام مسلمانوں کے جبراً اخراج کا فیصلہ کر چکی تھیں۔ ان علاقوں میں میواتیوں کو باقی رکھنا ...... وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

بیشک میواتیوں کی تقریباً نصف تعداد ترک وطن کر گئی تھی، مگر باقی ماندہ مواتی جو اس وقت تین لاکھ سے کم نہیں تھے اپنی ثابت قدمی اور مضبوطی کے باوجود کسی پشت پناہ اور دست گیر کے محتاج تھے بالخصوص ایسی حالت میں کہ الور اور بھرتپور کی ریاستوں کے علاوہ مشرقی پنجاب میں بھارگو گورنمنٹ اور مرکز میں سردار پٹیل ہوم منسٹر کا منصوبہ یہ تھا کہ "راجدھانی" (دہلی) سے ملے ہوئے علاقہ کو شدھ کر لیا جائے اس محفوظ علاقہ پر مسلمان کا سایہ بھی نہ پڑ سکے۔

جغرافیائی لحاظ سے اس علاقہ میں خشک پہاڑیاں موجود ہیں اور وہ بہت سے موقعوں پر میواتیوں کی پناہ گاہ بن جاتی ہیں مگر اس موقع پر وہ بھی پناہ نہیں دے سکیں۔ ان کو ان پہاڑیوں سے بھی زیادہ مضبوط کوہِ استقلال کی ضرورت تھی۔

بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مجاہد ملت کی عظیم الشان شخصیت ان لاکھوں مسلمانوں کے لئے وہ کوہِ استقلال ثابت ہوئی جس کی ان کو ضرورت تھی۔ مجاہد ملت نے کبھی خود ان علاقوں کا دورہ کر کے اور کبھی اپنے رفیقوں کو بھیج کر صرف اطمینان کا پیغام نہیں پہونچایا بلکہ آپ نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ان کی اہمیت مہاتما گاندھی کے ذہن نشین کرائی اور ان کو اس درجہ متاثر کیا کہ گاندھی جی نے میواتیوں کی حفاظت اور اجڑے ہوئے میواتیوں کو ان کی جگہ آباد کرانا، اپنی زندگی کا ایک نصب العین بنا لیا۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات کیا ہو سکتی ہے کہ مشرقی پنجاب کی حکومت الور اور بھرتپور کی ریاستیں اور سردار پٹیل کی منسٹری جن کے اخراج کا فیصلہ کر چکی تھی، اُن کے متعلق مہاتما گاندھی نے کانفرنس کے کھلے اجلاس میں فرمایا۔ میواتی بھارت کی ریڑھ کی ہڈی اور ہمارے ملک کا گاڑھا خون ہیں میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ وطن کا گاڑھا خون اس کے بدن سے نکال دیا جائے

مجاہد ملت نے ایک طرف ان میواتیوں کو کانفرنس میں جمع ہونے کا مشورہ دیا۔ گھاسیرہ مقام پر ان کی کانفرنس ہوئی جس میں پنجاب کے چیف منسٹر مسٹر بھارگو بھی شریک ہوئے اور مجاہد ملت، مہاتما گاندھی کو بھی اس کانفرنس میں لے گئے۔ اس موقع پر بھارگو کی تقریر میواتیوں کو کیا خود مہاتما گاندھی کو بھی مطمئن نہ کر سکی۔ لیکن گاندھی جی نے حکومت کے ذرائع سے علیحدہ ہو کر اپنے خاص ورکروں کو اس علاقہ میں لگایا۔ جو کئی سال تک یہاں کام کرتے رہے۔ گاندھی جی کے مشہور چیلے ونوبا بھاوے نے بھی گاندھی جی کے حکم سے اس علاقہ کا دورہ کیا۔ جو مسلمان دہشت اور رعب کی وجہ سے ہندو ہو گئے تھے ان کی چوٹیاں کٹوائیں۔

بہر حال یہ سب کچھ ہوا مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب کچھ نتیجہ تھا مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کی اس سعی بلیغ اور جد و جہد مشکور کا جس کا کچھ اشارہ ہم اوپر کر چکے ہیں۔

پانی پت

پانی پت میں آباد تقریباً ننتالیس ہزار مسلمان بھی اسی حالت میں تھے کہ وہاں کی حکومت (وہی بھارگو گورنمنٹ) ان کے اخراج کا فیصلہ کئے ہوئے تھی اور وہ خود اس فیصلہ کو منظور کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔

مجاہد ملت یہاں بھی غالباً دو مرتبہ گاندھی جی کو لیکر گئے اور اُن کے لئے فضا ہموار کرنے کی کوشش کی مگر کہنا پڑتا ہے کہ ان میں وہ استقلال نہیں تھا جس کا مظاہرہ میواتیوں نے کیا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میواتیوں کو اپنے پڑوس کی حمایت حاصل ہو گئی پانی پت کے مسلمان اس سے محروم رہے۔ اس بنا پر یہاں مجاہد ملت کی کوشش اور گاندھی جی کی نصیحتیں کامیاب نہیں ہو سکیں۔

اسپیشل ٹرینوں کا انتظام

دہلی کے علاوہ یوپی وغیرہ دوسرے صوبوں کے ہزاروں بلکہ تقریباً ایک لاکھ مسلمان جو نہ دہلی والوں سے زیادہ واقف تھے نہ یہاں کی چھوٹی گلیوں اور کوچوں کی ان کو خبر تھی۔ وہ اپنے آپ کو جب حوادث کی اس طوفانی بارش میں گھرا ہوا پاتے تو اپنی موت سے زیادہ غریب لوٹنے اور اپنے عزیزوں سے جدائی کا صدمہ اُن کے ہوش گم کر دیتا تھا۔ مجاہد ملت نے اصرار کر کے حکومت کی طرف سے اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کرایا۔ جب یہ لوگ اپنے اپنے مقامات پر پہونچے تو ان کو حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ یاد آ گیا کہ کس طرح اللہ تعالےٰ نے ان کو شکم ماہی سے صحیح سالم نکالا تھا۔

اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن میں سے ہر ایک واقعہ تاریخ کا ایک باب ہے۔ لیکن "علمار حق جلد دوم" اور "مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علمار ہند" جو اسی موضوع پر مستقل کتابیں ہیں، جب ان کتابوں کے دامن ان تمام واقعات کو نہیں سمیٹ سکے تو ان کالموں میں ان کی گنجائش کہاں نکل سکتی ہے۔ واقعات کی تفصیل کے بجائے ایک بنیادی نقطہ کو پیش کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جو مجاہد ملت کے حوصلہ وسیع اور نظر بلیغ کی اعلیٰ مثال اور بہترین شہادت ہے۔

جدوجہد کی مختلف صورتیں
اور بنیادی نقطۂ نظر

مضمون غیر معمولی طوالت اختیار کر چکا ہے۔ ناظرین کرام اور خود مجاہد ملت نمبر کے ترتیب دینے والے احباب کو اس کی طوالت کی شکایت ہوگی۔ مگر ہمیں اس طوالت پر بھی تنگیٔ دامن کی شکایت ہے۔

مجاہد ملت نے کارپردازان حکومت کے دروازوں پر دستک دے کر کس طرح ان کو آرام گاہوں سے نکالا۔ ان کی بے نیازی اور بے اعتنائی ختم کر کے کس طرح ان کو امداد و اعانت پر آمادہ کیا۔ بیشمار خاندان جو متفرق محلوں میں موت کے موہنہ میں پھنس گئے تھے ان کو انہیں بے نیاز ممبروں کے ذریعہ تباہی کے جہنم سے کس طرح نجات دلائی۔

بارہا ایسا ہوا کہ پولیس فورس فراہم نہ ہوسکی تو بنام خدا اس جہنم میں کود پڑے اور زندگی سے مایوس انسانوں کو یاس و ناامیدی کی ظلمت سے نکالا اور محفوظ مقامات پر پہونچایا۔

مجاہد ملت کا یہ عزم۔ رفقار اور ساتھیوں پر بھی اثر انداز ہوتا اور خطرات میں گھرے ہوئے مایوس انسانوں میں وہ حوصلہ پیدا کر دیتا تھا کہ وہ خود اپنے عزم وہمت سے اپنی حفاظت کرتے اور حملہ آوروں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے اس طوفان سے صحیح سالم ساحل اطمینان پر پہونچ جاتے تھے۔ خدا جانے کتنے ہزار انسان مجاہد ملت کی اس کرامت یا عزم کی برکت سے زندہ اور محفوظ رہنے میں کامیاب ہوگئے۔

یہ سب باتیں صحیح ہیں اور مجاہد ملت مرحوم کے کارناموں کے سنہرے ابواب ہیں۔ مگر ہم یہاں ان کی تفصیل پیش نہیں کر سکتے۔ ہمیں یہاں یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ مجاہد ملت کا منتہائے نظر صرف یہ نہیں تھا کہ مسلمانوں کی جانیں بچ جائیں اور اُن کے مال محفوظ رہ جائیں۔ بلکہ آپ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مسلمان اپنے وطن میں مساویانہ حیثیت سے باعزت شہری بن کر رہیں، یعنی جس طرح وہ اپنے جان ومال، عزت وآبرو کی طرف سے مطمئن ہوں اسی طرح ان کو اپنی تہذیب، اپنے مذہب اور اپنے مذہبی مراسم کی طرف سے بھی اطمینان ہو۔ کہ یہ سب محفوظ ہیں اور ان کو آزادی ہے کہ جس کام کو وہ مذہبی کام سمجھتے ہوں، اُس کو آزادی کے ساتھ کرتے رہیں جس طرح پہلے کیا کرتے تھے۔

مذہبی کاموں کے بارے میں مجاہد ملت رحمۃ نے اپنے عقیدہ اور مسلک کو معیار نہیں بنایا۔ بلکہ خود عمل کرنے والوں کے جذبات و خیالات کو معیار قرار دیا۔ کیونکہ یہاں سنت یا بدعت کا سوال نہیں تھا بلکہ سوال تھا۔ شہری حقوق کی بحالی کا جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جس کام کو اپنا شہری حق سمجھتے ہیں اس کی اُن کو آزادی ہو۔

یہ کام مصلحین اور مبلغین کا ہے کہ وہ غلط رسومات کا انسداد کریں حکومت اس بارہ میں مفتی اور مصلح کی حیثیت نہیں اختیار کر سکتی، ورنہ پھر مذہب کے صحیح کاموں میں بھی دخل اندازی کی نوبت آسکتی ہے

اس نقطۂ نظر کے نتیجہ میں یہ بات تو ظرافت ہی قرار دی جائے گی کہ "تازیہ بنانے والوں کو بھی "تازیہ بنانے کی نہ صرف آزادی حاصل ہوئی بلکہ حکومت نے اہتمام کیا کہ حسب سابق "تازیے بنائے جائیں اور باضابطہ جلوس نکلیں۔ بہرحال یہ حرکت ایک طرح کی ظرافت تھی البتہ یہ بات ایک بڑے طبقہ کے نزدیک قدر سے دیکھی جائے گی کہ جو عرس بند ہوگئے تھے یا اُس خطرناک دور میں جبکہ دہلی کے گلی کوچوں سے بھی امن اور اطمینان مفقود ہوگیا تھا جن عرسوں کا امکان ختم ہو رہا تھا حکومت نے خاص اہتمام وانتظام کر کے ان کو جاری کرنے کا موقع دیا

قطب صاحب، خواجہ غریب نواز اور حضرت محبوب صاحب کی درگاہیں۔

اس سلسلہ کی کڑی وہ عظیم الشان خدمت ہے جو ہندوستان کی مرکزی خانقاہوں اور درگاہوں کے متعلق اللہ تعالےٰ کے فضل وکرم سے انجام پذیر ہوئی۔

عرس کے متعلق علمار دیوبند کا مسلک کچھ بھی ہو، مگر اکابر اولیار اللہ

سے اُن کی عقیدت کسی سے کم نہیں ہے بلکہ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ صحیح عقیدت علماء دیوبند ہی کو ہے۔ بہرحال یہاں اس بحث کا موقع نہیں ہے یہاں تو یہ عرض کرنا ہے کہ یہ تین درگاہیں جو نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیائے اسلام کی نظر میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں، اس دورِ پُر آشوب کی تباہ کاریوں کی زد میں آچکی تھیں۔

وہی سرہند اور بسی جو حضرت مجدد صاحبؒ کے مرکز ارشاد رہے تھے جن کا تذکرہ محبت اور قلبی تعلق کی چاشنی لئے ہوئے مکتوبات میں بار بار آیا ہے، چونکہ ریاست پٹیالہ میں واقع تھے جس کا نمبر مشرقی پنجاب میں سب سے بڑھا ہوا تھا اس لئے یہ دونوں عظیم الشان قصبے ان بدترین حالات کو برداشت کر چکے تھے جو مشرقی پنجاب میں پیش آئے تھے۔

یہ درست ہے کہ شاہ افغانستان نے پنڈت نہرو کو حضرت مجدد صاحبؒ کی بارگاہ کے بارے میں تار دیا تھا۔ اسی طرح اجمیر شریف کی حفاظت کے متعلق بیرونی ممالک سے پنڈت جی کے نام تار موصول ہوئے تھے جن کی بنا پر حکومت ہند نے ان کی حفاظت کا خاص انتظام کیا جس سے یہ درگاہیں محفوظ رہ گئیں۔ پھر اگرچہ سرہند اور بسی سے کلی طور پر مسلمانوں کا تخلیہ ہوگیا اور اجمیر شریف کے تمام مسلمان حالات کی شدت سے مجبور ہو کر منتشر ہوگئے۔ البتہ وہاں خدام صاحبان نے فی الواقع بڑی ہمت و جرأت کا ثبوت دیا کہ حضرات کے بے پناہ ہجوم کے وقت بھی ان حضرات نے حضرت خواجہ غریب نواز کے آستانہ کو نہیں چھوڑا اور یہ بھی درست ہے کہ حضرت مولانا ابو الکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے اثر و رسوخ نے کافی دستگیری کی لیکن عوامی لیڈر کی حیثیت سے جس نے سجادہ نشین اور خدام صاحبان کی خبر گیری کی اور ہمتیں بندھائیں، وہ مجاھدِ ملت ہی تھے۔ رحمہ اللہ۔

سرہند شریف تو حضرت مجاہد ملت اس دور میں تشریف نہیں لے گئے، وہاں کی حاضری تو احقر سے متعلق فرمائی تھی۔ مگر اجمیر شریف بار بار خود تشریف لے گئے۔ پھر درگاہ بل وغیرہ میں حضرات خدام کی کافی ترجمانی کی۔ بلکہ ایک عرصہ تک ایسا رہا کہ نظم کے ذمہ دار گویا مجاہد ملتؒ ہی تھے۔ اجمیر کے حضرات، مجاہد ملت ہی سے مطمئن تھے۔ ہر موقع پر مجاہد ملت سے مشورہ لیتے۔ ہدایت حاصل کرتے۔ اور انہیں ہدایات پر عمل پیرا ہونے کو کامیابی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

ان تینوں درگاہوں میں قطب صاحب (یعنی درگاہ شریف حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی رحمۃ اللہ علیہ) کی بارگاہ معلّٰی کا معاملہ سب سے زیادہ پیچیدہ اور دشوار تھا۔ کیونکہ خاص اس دور میں کہ پناہ گزینوں کا ٹڈی دل دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا، اس کو محفوظ رکھنے کا انتظام نہیں کیا گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا قصبہ مہرولی جہاں یہ درگاہ ہے شرنارتھیوں کا شہر بن گیا تھا۔ کوئی ایک گھر بھی مسلمان کا نہیں رہا تھا۔ خانقاہ شریف کا کونہ کونہ شرنارتھیوں سے بھرا ہوا تھا۔ تقریباً ایک ہزار افراد خانقاہ میں رہتے تھے۔ درگاہ کو خالی کرانے کی کوشش گویا مہرولی میں بسنے والے ایک لاکھ شرنارتھیوں سے ٹکر لینی تھی۔

سردار پٹیل کی ڈیوڑھی پر بار بار حاضری دی گئی۔ چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر (رندھاوا) سے بار بار التجائیں کی گئیں۔ مگر سب بے سود رہیں۔

بالآخر مہاتما گاندھی ...... کا دامن پکڑا گیا۔ غیر مناسب نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ اُن کو شیشہ میں اتارنے کی کوشش کی گئی۔ اور احقر کو اس شہادت کے قلمبند کرنے میں بھی تامل نہیں ہے کہ اس موقع پر سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ کی شیریں کلامی نے بڑا کام کیا۔

یہ پہلے گذر چکا ہے کہ گاندھی جی کے یہاں روزانہ صبح کو جانا ان حضرات کا معمول تھا۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ اس حاضری کے وقت حضرت قطب صاحب کی کچھ باتیں ایسے انداز سے دلنشیں پیرایہ سے فرماتے تھے کہ مہاتما گاندھی کے دل میں اُتر جاتی تھیں۔ چنانچہ گاندھی جی اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ جب ۹ جنوری ۱۹۴۸ء سے گاندھی جی نے مرن برت رکھا تو برت کھولنے کی آٹھ شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ قطب صاحب رحمۃ اللہ کی خانقاہ مکمل طور پر خالی کرائی جائے۔ جب گاندھی جی کی شرط کامیاب ہوگئی اور خانقاہ خالی ہوگئی۔ تو اتفاق سے عرس میں چند روز باقی رہ گئے تھے۔ عرس میں شرکت کی خواہش گاندھی جی نے بھی کی اور ان حضرات نے بھی اس کو حالات کے لحاظ سے مناسب اور بہتر سمجھا (اس شرکت کی دلچسپ تفصیل مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علماء ہند کے حصہ دوم میں ملاحظہ فرمائیے۔)

* * * *

شیرازی بندی مسلم پراگندہ

نصب العین کی وضاحت۔ نظریاتی یکجہتی کی کوشش اور احساس کہتری کا مداوا

وطن دوستی، قوم پروری۔ اور حقوق شہریت میں مساویانہ حیثیت حاصل کرنے کے جس بلند نظریہ کے ساتھ دہلی میں کام کیا گیا اور جس طرح مسلمانان دہلی کے ذہنوں کو احساس کہتری سے محفوظ رکھا گیا۔ ضرورت تھی کہ انہیں جذبات اور نظریات پر ہندیونین کے مسلمانوں کو متحد کیا جائے اور قیامت خیز ہنگاموں نے جو خوف و ہراس عام مسلمانوں میں پیدا کر دیا ہے جس کے نتیجہ میں وہ احساس کہتری میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں اور عین ممکن ہے کہ وہ اپنے متعلق غلامی کا فیصلہ کرلیں۔ ضرورت تھی کہ اس پست احساس کی کائی ان کے ذہنوں سے صاف کی جائے۔

جو فرقہ وارانہ رجحانات برطانیہ کی اس بنیادی پالیسی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" سے پیدا ہوئے تھے جن کو پائیدار کرنے کے لئے پچاس سال پہلے سے جداگانہ انتخاب کا طریقہ، پھر تقسیم ہند کا مطالبہ ایجاد کیا گیا تھا۔ تقسیم کے بعد اگر ایک طرف وہ جن سنگھ، ہندو مہاسبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے وجود اور ترقی کا سبب بنتے ہوئے تھے تو دوسری جانب ان رجحانات نے ان مسلمانوں کو نہ صرف مایوسی میں مبتلا کر دیا تھا بلکہ ایک تاریک چوراہے پر کھڑا کر دیا تھا جو ان رجحانات کے حامی رہے تھے کیونکہ اب نہ صرف تصورات کی دنیا بدل گئی تھی بلکہ بدقسمتی یہ تھی کہ وہ ٹہنیاں ہی ٹوٹ کر اڑ گئی تھیں جن کی پھننگوں پر آشیانہ کے تنکے رکھے گئے تھے

ان مسلمانوں کے لئے ایسی روشنی کی ضرورت تھی جو گم گشتۂ راہ کی سراسیمگی ختم کر کے ایک معین راستہ کی نشان دہی کر سکے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندیونین کے تقریباً ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کی اس عمومی حالت کے احساس نے سب سے پہلے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو متحرک بنایا۔ چنانچہ آپ نے پورے ہندوستان کے ممتاز مسلم رہنماؤں کی ایک خصوصی کانفرنس ۱۳ر نومبر ۱۹۴۷ء کو دہلی میں طلب کی۔ جبکہ ۱۵ر نومبر ۱۹۴۷ء کو کانگریس کا اجلاس دہلی میں ہونے والا تھا جس میں فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ تنظیمات کے خلاف تجویز منظور ہونے والی تھی۔

اس کے بعد کل ہند پیمانہ پر ایک عام کانفرنس لکھنؤ میں طلب فرمائی جو آزاد کانفرنس کے نام سے اب تک مشہور و معروف ہے۔ مگر جہاں تک عملی جد و جہد اور انتظامات کا تعلق ہے چونکہ مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب نے دست راست بلکہ پیکر عمل بن کر کام کیا۔ اس لئے ان دونوں کانفرنسوں کی کامیابی کا سہرا بھی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی شخصیت ہی کو آراستہ کرتا ہے۔ نومبر ۱۹۴۷ء کو فسادات کا دور شباب تو نہیں کہا جا سکتا مگر دہلی میں خون مسلم کی کوئی قیمت اب تک بھی نہیں قائم ہوئی تھی خاص انتظام کے بغیر گلیوں اور کوچوں میں کوئی شخص اپنی جان پہ کھیل کر ہی گذر سکتا تھا۔

دہلی جنکشن اب بھی غیر محفوظ تھا۔ خود پلیٹ فارموں پر سخت سے سخت جانی اور مالی حادثے پیش آجاتے تھے دہلی کے پُرخطر حدود میں داخل ہونے سے پہلے آنے والے مدعوئین کا اس طرح استقبال کرنا کہ وہ حفاظت کے ساتھ اپنے تجویز کردہ قیام گاہ پر پہونچ سکیں یا قیامگاہ سے چل کر بحفاظت تمام کانفرنسوں میں شرکت کر سکیں۔ پھر اس پریشانی کے دور میں فرائض مدارات انجام دینا بہت ہی خطرناک اور پریشان کن خدمت تھی۔ جس کو نہایت بلند آہنگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ مجاہد ملت نے اپنے مخلص رفقار کی مدد سے انجام دیا

جمعیۃ علمار ہند کے کچھ رضاکاروں کو اسپشل پولیس کی حیثیت دیدی گئی تھی۔ ان کو بندوقیں بھی دیدی گئی تھیں۔ یہ مسلح دستہ حضرت مجاہد ملت کے زیرکمان ہر ایسے موقع پر فرائض حفاظت انجام دیتا تھا۔ انتہا یہ کہ قبرستان تک مسلمانوں کا پہونچنا مشکل ہوتا تھا تو یہی دستہ جنازہ کے ساتھ جاتا تھا۔ ہفتہ میں دو تین بار اس دستہ کو جنازہ پہونچانے کی ڈیوٹی لامحالہ انجام دینی پڑتی تھی۔

یہ رضاکار اور کچھ اور ساتھی غازی آباد بھیج دیئے گئے تھے۔ آنے والے مہمانوں کو غازی آباد اتار لیا جاتا تھا اور وہاں سے جیپ کار یا موٹروں کے ذریعہ محفوظ راستوں سے نکال کر قیام گاہوں پر پہونچایا جاتا تھا۔

لکھنؤ میں یہ کانفرنس (آزاد کانفرنس) ۲۷ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو ہونے والی تھی۔ دہلی کی اس وقت یہ حالت تھی کہ صرف ریلوے جنکشن پر ہزاروں شرنارتھی پورا پورا اثاث البیت لئے ہوئے قیام پذیر تھے۔ اثاث البیت کے انباروں نے تمام پلیٹ فارموں کو گودام بلکہ خطرناک گھاٹیاں بنا رکھا تھا

پلیٹ فارم پر گذرنا ہر ایک کے لئے مشکل تھا۔ مگر خاص طور پر مسلمانوں کے لئے حد درجہ مخدوش تھا۔ خنجر زنی کے واقعات رات دن ہوتے رہتے تھے لکھنؤ کانفرنس میں دہلی سے نمائندگان کی بڑی تعداد جانے والی تھی تو اس وقت مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی جدوجہد نتیجہ خیز ثابت ہوئی کہ ان کے لئے اسپیشل ٹرین کا انتظام کیا گیا۔ پولیس کا ایک دستہ ٹرین کے ساتھ کیا گیا۔ دہلی جنکشن کے جس پلیٹ فارم سے یہ اسپیشل روانہ ہونے والی تھی وہاں پولیس کا خاص انتظام کیا گیا۔ ان تمام انتظامات کو مولانا آزاد کے اثر و رسوخ نے آسان کیا مگر ضرورتوں کا نقشہ تیار کرنے والے پھر اس میں عمل اور کردار کا رنگ بھرنے والے مجاہد ملت تھے۔ (رحمۃ اللہ) دہلی کے علاوہ اور علاقوں میں یہ دشواریاں نہیں تھیں، چنانچہ ہندستان کے گوشہ گوشہ سے تقریباً ایک لاکھ مدعوئین اور ارکان و نمائندگان نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

حضرت مولانا آزاد کی تقریر صدارت یقیناً ایک تاریخی تقریر تھی۔ مگر جس نے مسلمانوں کے دلوں سے خوف و ہراس دور کرکے اعلیٰ نصب العین کی روشنی دکھائی اور ایک بلند ترین مقصد کا عزم ان کے ذہنوں میں برانگیختہ کیا وہ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر تھی اسی بنا پر کامیابی کا کریڈٹ آپ کو دیا گیا۔

آزاد کانفرنس لکھنؤ

بہرحال ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۴۷ء کو یہ کانفرنس لکھنؤ میں کی گئی، سہمے ہوئے مسلمانوں نے اس کانفرنس کو پیغام زندگی تصور کیا اور ملک کے تمام گوشوں سے سفر کرکے اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ مسلمانوں کا اس سے بڑا اجتماع نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا نہ اس کے بعد آج تک دیکھا گیا۔ یہ کانفرنس اصولی اور بنیادی طور پر اس بات کی ضمانت تھی کہ مسلمانوں کا دامن فرقہ واریت سے پاک ہے اور وہ ملک کی مشترک سیاست میں حصہ لے کر ترقی پذیر عنصر کی حیثیت سے ملک کی خدمت کے لئے آمادہ ہیں۔

اس کانفرنس میں فرقہ واریت کے خطرات سے ملک کو آگاہ کیا گیا صوبائی حکومتوں سے فرقہ واریت کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا گیا کہ وہ فرقہ پرور عناصر سے اپنے نظام کو پاک کرکے غیر فرقہ وارانہ جمہوریت کو کامیاب کرنے کی طرف تیزی اور مستعدی سے قدم بڑھائیں۔ اس کانفرنس کا عظیم الشان کارنامہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے دامن سے ان تمام دھبّوں کو دھو یا گیا جو فرقہ پرستوں کی طرف سے لگائے جا رہے تھے۔ اس کے بعد خوف و ہراس اور احساس کمتری کے باقی رہنے کے کوئی معنیٰ نہیں تھے۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر

کانفرنس کے آخری اجلاس میں جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے کانفرنس کی کارگزاری اور تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ جو ولولہ انگیز اور تاریخی تقریر فرمائی وہ الجمعیۃ کے اسی نمبر میں آپ کے ملاحظہ سے گذرے گی۔

مسلمانان ہند کے ایک لاکھ نمائندوں نے جب یہ تقریریں سنیں اور کانفرنس کی دو روزہ کارگزاری کا مشاہدہ کیا، اس کی تجاویز پر غور و خوض کیا تو پھر صرف وہی شخص خوف زدہ اور ہراساں رہ گیا جو بزدل تھا۔ یا جس کے دل میں کھوٹ تھی۔ جمعیۃ علماء ہند کے ارکان نے پورے ملک میں دورے کرکے کانفرنس کے حیات بخش فیصلوں کو ہر سننے والے کان تک پہونچایا اور ان کروڑوں مسلمانوں کو جو مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے اطمینان بخش روشنی سے آشنا کیا۔

مجاہد ملت معمار سیکولرزم

اگر جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک باشندہ ملک شہری حقوق میں مساوی درجہ کا مالک ہو ہر ایک فرد کو رائے اور فکر کی آزادی حاصل ہو۔ مذہبی آزادی کے ساتھ اس کو یہ بھی حق ہو کہ اپنے کلچر، اپنی تہذیب و تمدن اور اپنی روایات کو زندہ رکھ سکے، جہاں تک ممکن ہو ترقی دے سکے۔ تو ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مختلف مذہبوں کے ماننے والے مساویانہ شہری حقوق کے مستحق ہوں جمہوریت کا لازمی تقاضا یہ بھی ہوگا کہ نظام حکومت سب مذہبی ہو یا لا مذہبی اور لادینی ہو۔ جب کہ ایک ہی مذہب کے ماننے والوں میں بہت سے فرقے اور بہت سے مکتبہ خیال موجود ہوں تو "سب مذہبی نظام حکومت" ناممکن العمل بھی ہوگا اور اتحاد و یکجہتی پیدا کرنے کے بجائے تقسیم در تقسیم اور انتشار در انتشار پیدا کرے گا۔

وطنی اور ملکی امور میں یکجہتی صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ مذہبیات سے الگ حکومت اور سیاست کا تعلق صرف ملکی امور سے ہو مذہبی معاملات میں حکومت قطعاً غیر جانبدار ہے، نہ کسی مذہب کی پشت پناہ ہے، نہ کسی کی مخالف۔ لادینی حکومت کا یہی مطلب ہے جس کو سیکولر حکومت کہا جاتا ہے۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جو آزادی سے پہلے مسلم فرقہ واریت کے مقابلہ پر سینہ سپر رہے اور خاص ۱۹۴۷ء کے ہنگامی حالات میں ہندو فرقہ واریت کے مقابلہ میں سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ پھر جیسے جیسے فسادات کے آتش فشاں شعلہ بار ہوئے مجاہد ملت کی سرگرمیاں ان کے مقابلہ میں بڑھتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ شعلے سرد پڑے اور وہ سیلاب پایاب ہوا۔ ظاہر ہے وہ ہندیونین میں سیکولرزم ہی کے حامی ہو سکتے تھے۔ ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء میں جب ہندوستان کا دستور اساسی منظور کیا جا رہا تھا۔ فرقہ پرست طاقتوں کی پوری کوشش یہ تھی کہ جب اسلامی حکومت کے نام پر پاکستان بنایا گیا ہے تو لامحالہ ہندیونین میں ہندو حکومت ہو۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے باقاعدہ ممبر نہیں تھے[1]۔ صرف ایک سب کمیٹی کا ممبر آپ کو بنا لیا گیا تھا۔ مگر آپ کی تمام سرگرمیاں ان کو کمک پہونچانے میں صرف ہوتی رہیں جن کو بانی سیکولرزم کہا جا سکتا ہے یعنی دیش باپو۔ گاندھی جی۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم حکومت ہند۔

اس ماحول میں کہ فرقہ واریت شباب پر تھی اور ہر طرف فرقہ وارانہ جذبات کا دیو رقص کر رہا تھا۔ سیکولرزم کو دستور اساسی کی بنیاد قرار دینا ایک ایسی عجیب بات تھی جس کے لئے مذہب کی زبان میں کرامت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی ظاہری اسباب کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوازم کامیاب ہو مگر جو نتیجہ ظہور پذیر ہوا وہ اس کے خلاف اور قطعاً غیر متوقع تھا۔

سیکولرزم کا تصور کامیاب ہو سکا یا نہیں۔ یہ ایک مستقل مسئلہ ہے۔ اگر پندرہ سال گذر جانے کے بعد بھی ناکام ہے تو اس کے اسباب پر بحث کی جا سکتی ہے۔ مگر جہاں تک مجاہد ملتؒ کی مساعی کا تعلق ہے ان کی درخشاں پیشانی داغدار نہیں ہو سکتی۔ بلکہ حالات کی نامساعدت اس کو اور زیادہ آبدار بنا دیتی ہے۔

جب نظریات کا تصادم ہو تو اس کا اثر قومی کردار پر بھی پڑتا ہے چنانچہ ایک طرف سیکولرزم کے بانی اور معمار صاحبان کی کوششیں سیکولرزم کو کامیاب بنانے میں صرف ہوتی رہیں تو دوسری جانب فرقہ پرست جماعتوں نے جہاں موقع ملا مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔

مسلمانوں کی مظلومانہ تباہی اور بربادی کا صدمہ مجاہد ملت سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے۔ مگر ہر موقع پر ایک اور صدمہ بھی آپ کے دل و دماغ کو متاثر کرتا رہا۔ یعنی ہر ایک ہنگامہ اور فساد سیکولرزم کی تحریک کے خلاف ایک حملہ ہوتا تھا جس سے منزل دور ہو جاتی تھی۔ مجاہد ملت جیسے بااحساس مسافر کے لئے دوری منزل کا صدمہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ چند سال یقیناً ایسے گذرے کہ وہ جذبات جو ۱۹۴۷ء میں مشتعل ہو چکے تھے وہی ان ہنگاموں کا سبب ہوتے تھے لیکن ۱۹۵۲ء کے الیکشن میں جب ملک کے عوام نے ۹۵ بلکہ ۹۹ فیصدی ووٹ غیر فرقہ پرست سیاسی جماعتوں کو دیکر یہ ثابت کر دیا کہ ملک کے عام باشندے اپنا مذہب کچھ بھی رکھتے ہوں وہ فرقہ پرستی کے حامی نہیں ہیں تو اس کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کی ذمہ داری عوام پر نہیں ڈالی جا سکتی تھی۔ بلکہ معقولیت پسندی کا تقاضا یہی تھا کہ فرقہ وارانہ ہنگاموں کا ذمہ دار ان مٹھی بھر غلط کار لیڈروں اور ان کے ساتھیوں کو قرار دیا جائے جو بنیادی طور پر سیکولرزم کے مخالف ہیں اور اپنی غلط حرکتوں سے عوام کو گمراہ کر کے ہنگاموں کی آگ بھڑکاتے ہیں۔

چنانچہ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے حکومت کے سربراہوں کو بارہا اس طرف توجہ دلائی۔ بعض سربراہوں سے اس سلسلہ میں تلخ کلامی تک کی نوبت آئی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت یعنی ۱۹۵۳ء، ۱۹۵۴ء میں اگر صوبائی حکومتوں کے سربراہ معقولیت پسندی سے کام لیتے اور اگر مجاہد ملت کے درد دل کا ایک شمہ بھی ان کو میسر ہوا ہوتا تو وہ نتیجہ یقیناً سامنے نہ آتا جو ۱۹۵۹ء میں قوم کا سرطان بن کر سامنے آیا۔

ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ صوبائی حکومتوں کے بہت سے ذمہ داروں اور بعض مرتبہ مرکزی حکومت کے بھی بعض ذمہ داروں کی ذہنیت اسی رنگ میں رنگی رہی جو فرقہ پرست جماعت اور اس کے پریس کا خاص مشن تھا۔ انتہا یہ کہ ان خونیں ہنگاموں کو بھی جو ملک کے گوشہ گوشہ میں ہوتے رہے قوم پرستی ہی قرار دیا۔ بہت سے بہت لفظ "جارحانہ" کا اضافہ کر دیا (یعنی فرقہ پرستوں کی ہنگامہ آرائیاں قوم پرستی ہی کا تقاضا ہیں فرق صرف یہ ہے کہ یہ جارحانہ قوم پرستی ہی) جبکہ مظلوم مسلمان کی آہ و زاری کو بھی فرقہ واریت اور نہ صرف فرقہ واریت بلکہ پاکستانی ذہنیت کا شاخسانہ قرار دیا جاتا رہا۔

مجاہد ملت کا ظرف وسیع اور حوصلہ عالی یقیناً اپنی مثال آپ تھا کہ باوجودیکہ سربراہوں کی یہ مسموم ذہنیت مجاہد ملت کے لئے رات دن کی کڑھن تھی تب بھی سیکولرزم کی حمایت میں اٹھا ہوا قدم تیز سے تیز تر

[1] غالباً حضرت مولانا محمد میاں صاحب کو یہ سطریں تحریر فرماتے ہوئے سہو ہو گیا۔ مجاہد ملتؒ جو دستور ساز اسمبلی کے باقاعدہ ممبر مسٹر رضوان اللہ کی سیٹ پر جولائی ۱۹۴۹ء میں منتخب ہوئے تھے اور اسمبلی کے اختتام تک باقاعدہ ممبر رہے اس سے پہلے مئی ۱۹۴۶ء میں وہ یوپی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے لیکن دستور ساز اسمبلی میں آجانے کی وجہ سے ہی انھوں نے یوپی کی ممبری سے استعفا دیدیا تھا۔ انیس الحسن۔

ہو رہا تھا اور ناممکن تھا کہ کوئی لغزش اس قدم میں آتے۔

لیکن چند سال بعد ہی ذمہ داران حکومت کی اس چشم پوشی کا نتیجہ سامنے آگیا۔ جب ۵۹ء میں انھوں نے دیکھا کہ خود اُن کا ماحول اُن کے خلاف ہو چکا ہے اور کارپردازان حکومت کی اکثریت فرقہ واریت کی وبا میں مبتلا ہو چکی ہے۔

۱۹۴۷ء کے وقتی ہنگاموں کے بعد جو فسادات گذشتہ پندرہ سال میں ہوئے اُن کا شمار مشکل ہے۔ ہر فساد کے موقع پر جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے وفود بھیجے جاتے تھے اور ستم رسیدہ مسلمانوں کی امداد کی جاتی تھی مگر ان وفود میں خود مجاہد ملت شریک نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ اہم موقع پر احقر کو بھیجدیا کرتے تھے۔ ورنہ اور ساتھیوں کو مامور فرما دیتے تھے۔ مگر ۵۹ء میں رمضان شریف کے ایام میں مبارکپور اور بھوپال میں جو ہنگامے ہوئے اُن کا جائزہ لینے کے لئے خود مجاہد ملت نے سفر فرمائے۔ روزہ میں مجاہد ملت کی ریاحی تکلیفیں بڑھ جاتی تھیں۔ مگر ان سفروں کے لئے نہ روزہ عذر بن سکا نہ ریاحی تکلیف راستہ روک سکی احقر ان ایام میں کلکتہ گیا ہوا تھا۔

ابتدا میں احقر کا خیال یہی رہا کہ چونکہ احقر مرکز سے دور ایک ہزار میل کے فاصلہ پر جمعیۃ کے ضروری کام میں مصروف ہے اس لئے ان سفروں کی زحمتیں خود مجاہد ملت نے برداشت کی ہیں۔ مگر بعد میں احقر کو محسوس ہوا کہ احقر کی غیر حاضری نہیں بلکہ ان فسادات کی عجیب و غریب نوعیت نے حضرت مجاہد ملت کو مضطرب کر دیا ہے اور آپ نے خود بہ نفس نفیس مقابلہ کا عزم کر لیا۔

۵۰ء کے ہنگاموں میں مراد آباد وغیرہ میں بھی بعض موقعوں پر یہ ثابت ہوا تھا کہ مقامی حکام اور پولیس نے مظلوموں کے بجائے ظالموں کا دست و بازو بن کر کام کیا ہے مگر واقعات کچھ اس قسم کے تھے کہ حکام کی اس غلط کاری کا عذر قابل تسلیم ہو سکتا تھا۔ لیکن مبارکپور اور بھوپال کے ہنگاموں نے کھلے طور پر ظاہر کر دیا کہ فرقہ واریت کی وبا سرکاری حلقوں کو بھی یہاں تک متاثر کر چکی ہے کہ بدامنی کے زمانہ میں پولیس بھی وہ کرتی ہے جو فرقہ وارانہ جماعتوں کے والنٹیر اور رضاکار کر سکتے تھے۔

مجاہد ملت کانگریسی حلقوں میں بہت کافی مقبولیت رکھتے تھے۔ کانگریس ان کو الیکشن کے موقع پر ٹکٹ دیا کرتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ مقبولیت اور کانگریسی حلقوں میں محبوبیت اُمید واروں کی عملی طاقت کو کمزور اور ان کی قوت گویائی کو سلب کر دیتی ہے لیکن مجاہد ملت کی ہمت عالی اس کمزوری سے پاک تھی۔ آپ نے خاموشی کے بجائے بے پناہ خطابت سے کام لیا۔ مبارکپور اور بھوپال وغیرہ کے ہنگاموں پر وہ بیانات دیئے جنھوں نے ان ریاستوں کے چیف منسٹروں کو چراغ پا کر دیا۔ اُن کے جوابی بیانات نے مجاہد ملت اور چیف منسٹروں کے درمیان ایسا محاذ قائم کر دیا جس کو توڑنے کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کو بھی دخل دینا پڑا۔

ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں ایک طرف مجاہد ملت تھے اور دوسری جانب مدھیہ پردیش اور یوپی کے چیف منسٹر اور اُن کے حامی۔ مگر صداقت انصاف اور حقیقت پسندی نے حضرت مجاہد ملت کی قوت خطابت میں استدلال کی وہ بے پناہ طاقت پیدا کر دی تھی جس نے صرف ان چیف منسٹر صاحبان کو لاجواب ہی نہیں کیا بلکہ پوری ورکنگ کمیٹی کو مجاہد ملت کی حمایت پر مجبور کر دیا۔

یہ درست ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی جماعتی طاقت، اس کی مجلس عاملہ کی تجاویز، وہ متعدد میمورنڈم جو مرکزی حکومت کے ارکان اور کانگریس کے ہائی کمانڈ کو بار بار پیش کئے گئے تھے حضرت مجاہد ملت رح کی پشت پر تھے مگر یہ بھی درست ہے کہ مسلمانوں بالخصوص جمعیۃ علماء ہند کی خوش نصیبی تھی کہ مجاہد ملت کی پرشوکت خطابت اور ناقابل تسخیر قوت استدلال ان کو میسر آئی تھی۔ آج اس قوت و طاقت کے فقدان پر جس قدر ماتم کیا کیا جائے کم ہے۔

کنونشن کی تجویز

یہ صورت حال کہ سرکاری عملہ بھی فرقہ واریت کے زہر سے متاثر ہو چکا تھا، پورے ملک کے لئے باعث تشویش تھی۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کا احساس صرف مسلم اقلیت کو تھا جو فرقہ پرستی کی تباہ کاریوں سے آئے دن متاثر ہوتی رہتی تھی۔ اور یہ فرقہ پرستی صرف فسادات کی صورت میں ہی ظہور پذیر نہیں ہوتی تھی بلکہ ملازمت۔ لوکل باڈیز، اسمبلی اور پارلیمنٹ وغیرہ سرکاری اداروں میں نمائندگی۔ کاروباری سلسلہ میں لائسنس وغیرہ غرض سماجی، سیاسی اور کاروباری زندگی کا ہر ایک شعبہ اس سے متاثر ہو رہا تھا۔ چند ماہ تک جمعیۃ علماء ہند کے پیش نظر یہ رہا کہ مسلمانوں اور صاف دماغ سلجھی ہوئی ذہنیت رکھنے والے ہندو رہنماؤں کا کنونشن کیا جائے۔ پھر مشترک نمائندگی کے ذریعہ حکومت کو اس خطرناک صورت حال سے آگاہ کر کے اس کے علاج کا مطالبہ کیا جائے۔

لیکن ایک عبرت انگیز دشواری اس مشترک کنونشن کے راستہ میں سنگ گراں بنی رہی۔ دشواری یہ تھی کہ جن ہندو رہنماؤں کو صاف دماغ سمجھا جاتا ہے ان کو ان حالات کا علم تک نہیں جن میں مسلمانوں کا تن من گھل رہا ہے۔ کیونکہ ان کے معلومات کا ذریعہ اخبارات ہوتے ہیں اور انگریزی یا ہندی وغیرہ کے جو اخبارات ان کے سامنے آتے ہیں وہ گویا قسم کھا چکے ہیں کہ مسلمانوں کے مصائب کا تذکرہ نہیں کرینگے اردو کا وہ پریس جو مسلمانوں کا پریس کہلاتا ہے مسلمانوں کے حالات اور اُن کے مصائب کا شکوہ ضرور کرتا رہتا ہے مگر غیر مسلم تو کیا خود مسلمانوں کا اونچا طبقہ بھی اُردو کے اخبارات پڑھنا پسند نہیں کرتا دوسرا ذریعہ معلومات ریڈیو ہے تو وہ ہندی اور انگریزی پریس سے بھی زیادہ محتاط یا سنگدل۔ کیا مجال مسلمانوں کے شکوہ شکایت کا کوئی ایک حرف بھی اس کی زبان پر آجائے۔ ایسے غیر مسلم رہنماؤں کو کنونشن میں دعوت دینے سے پہلے ضروری تھا کہ فرداً فرداً ہر ایک سے ملکر یا انگریزی پمفلٹوں کے ذریعہ منتقل پروپیگنڈہ کرکے پہلے اُن کو آشنا رو دکیب جائے پھر کنونشن میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ بلا شبہ اس وقت ہی نہیں بلکہ ہمیشہ مسلمانوں کے ایک انگریزی روزنامہ کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی رہی۔ لیکن اپنی کم ہمتی اور بے بضاعتی کا شکوہ کیا جائے یا اہل ثروت مسلمانوں کی لاپرواہی کا (یہ خود ایک بحث طلب موضوع ہے) یہ شدید اور اہم ضرورت پوری نہیں ہوئی۔ بیشک بعض غیر مسلم رہنما مثلاً دہلی کے وہ غیر مسلم رفیق اور ساتھی جن سے رات دن کا واسطہ رہتا ہے وہ واقف بھی تھے ان کو دعوت دینا بھی سہل تھا اور اُن کی شرکت بھی یقینی تھی مگر بدقسمتی سے وہ پہلے ہی سے مسلم نوازی میں بدنام ہو چکے ہیں۔

یہ مسئلہ ابھی زیر بحث تھا کہ اُجین میں جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس عام کا وقت آگیا۔

مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے اس اجلاس عام سے ہی کنونشن کا مقصد پورا کرنا چاہا۔ چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کے اراکین کے علاوہ اور بھی بہت سے مسلم رہنماؤں کو شرکت کی دعوت دی۔ ایک حد تک یہ مقصد پورا بھی ہوا۔ چنانچہ اس اجلاس میں کھل کر موجودہ حالات پر بحث ہوئی جس کی بنا پر مدھیہ پردیش کے پریس نے (جہاں یہ اجلاس ہوا تھا) بہت کافی کیچڑ اُچھالی۔ فرقہ پرستی کا آخری حربہ جو اس پریس کے پاس تھا اُس کو پوری چالاکی اور ہوشیاری سے استعمال کیا اور جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس کو فرقہ پرستی کا نشان قرار دیا وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اس اجلاس کے چند روز بعد ہی جبل پور کا حادثہ مسلمانوں کے حق میں بھونچال بن کر رونما ہوا۔ مجاہد ملت رح نے پہلے ایک وفد جبل پور بھیجا پھر وہ خود تشریف لے گئے۔ حالات کا معائنہ کیا اور واپس آنے کے بعد پارلیمنٹ میں وہ تقریریں کیں جن سے نہ صرف ہندوستان کے ایوان سیاست میں ہلچل پڑگئی بلکہ پارلیمنٹ کی صدا پوری دنیا میں گونج گئی۔

ہندوستان کے مسلمان جو پہلے اخبارات کی زبان سے جبل پور ساگر وغیرہ کے ناتمام حالات سُن رہے تھے اور ہندوستان کے دوسرے فسادات کی طرح اس کو بھی ایک بڑے پیمانہ کا ہنگامہ تصور کر رہے تھے۔ جب انھوں نے مجاہد ملت کی پارلیمنٹ کی تقریریں پڑھیں تو گویا ان کی شکستہ پائی تیزگامی سے بدل گئی۔ تن نیم جان میں نئی زندگی کی روح مضطرب ہوگئی اور لاکھوں روپیہ سے مالی امداد کرکے اپنی بیداری کا ثبوت دیا۔ مگر یہ مسئلہ پھر بھی باقی رہ گیا کہ ارباب اقتدار کو اجتماعی طور پر اپنی شکایتوں سے کس طرح آگاہ کیا جائے۔ اس کا ذریعہ کنونشن ہو سکتا تھا۔ لہذا کنونشن کا مسئلہ پھر اُبھر کر سامنے آیا اور غیر مسلم رہنماؤں کی شرکت سے چونکہ مایوسی تھی۔ لہذا مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند نے یہی طے کیا کہ صرف مسلمانوں کا کنونشن کیا جائے۔

مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس مورخہ ۴ اپریل ۱۹۶۱ء نے کنونشن کی تجویز پاس کرتے ہوئے تمام مکاتب خیال کے مسلمانوں سے شرکت کی اپیل کی اور کنونشن کے انتظامات کی ذمہ داری مجاہد ملت کے سپرد کر دی (رحمۃ اللہ) (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تذکرہ خدمات جمعیۃ علماء ہند ۲)

مجلس عاملہ کی تجویز کے بعد جیسے ہی مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے اخبارات میں کنونشن کا اعلان کیا۔ تو جیسا کہ خطرہ تھا اس سے بھی زیادہ بھیانک صورت میں غیر مسلم پریس کی یورش شروع ہوگئی۔ حد سے زیادہ تکلیف دہ رویہ ان دوستوں کا تھا جو پہلے کنونشن کے لئے مصر تھے اور جیسے ہی یہ شورش شروع ہوئی وہ حملہ آوروں کے ساتھ ہو گئے۔ اور کنونشن کے خلاف بیانات دینا شروع کر دیئے۔

کچھ دوستوں نے پنڈت نہرو وزیر اعظم حکومت ہند کے پاس باقاعدہ ڈیپوٹیشن لیجا کر کنونشن کے نقصانات پنڈت جی کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی

سمپورنانند جی چیف منسٹر یوپی اور اجیت پرشاد جین جیسے کانگریسی لیڈروں کی دلیل یہ تھی کہ اس کنونیشن سے فرقہ پرستی کو شہ ملے گی۔ وہ بھی اس کا جواب دیں گے (یعنی آجتک فرقہ پرست طاقتیں خاموش اور قطعاً غیر متحرک تھیں اور اب ان میں حرکت پیدا ہوگئی)

ایک ایسا لیڈر جو آجتک مقبول اور واجب الاحترام ہی رہا ہو اس پر جب سب طرف سے اعتراضات کی بوچھار ہو تو بہت مشکل ہے کہ اس کا قدم لغزش سے محفوظ رہے مگر مجاہد ملت کی لیڈری مصنوعی نہیں تھی بلکہ آپ کی لیڈری لازمی ثمرہ تھی جذبات صادق اور اُن مخلصانہ کوششوں کا جو مجاہد ملت کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھیں۔ اللہ تعالےٰ نے اخلاص۔ صداقت پسندی اور بے پناہ قوتِ عمل کے ساتھ وہ جرأت اور وہ استقامت بھی عطا فرمائی تھی کہ گردوپیش کی زیادہ سے زیادہ مخالفت بھی آپ کو متاثر نہیں کر سکتی تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جس کی پوری زندگی "محاذ" پر گذری ہو۔ وہ کسی حملہ سے کیسے مرعوب ہو سکتا ہے

تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس موقعہ پر آنریبل حافظ محمد ابراہیم صاحب (وزیر برق و آب) نے بھی غیر معمولی جرأت و استقامت کا ثبوت پیش کیا۔ آپ جس طرح پہلے دن کنونیشن کے حامی تھے آپ کی حمایت میں اگر فرق آیا تو صرف یہ کہ "حمایت" صرف زبانی نہیں رہی بلکہ عملی ہوگئی آپ نے سرکاری حلقوں کی غلط فہمی کو دور کرکے اُن کے اندر بھی حمایت کا جذبہ پیدا کیا

مجاہد ملت کی وفات سے تیسرے روز کارپوریشن کی طرف سے جلسہ تعزیت کیا گیا تو لال بہادر شاستری وزیر داخلہ حکومت ہند نے اپنی تقریر میں مجاہد ملت کی قوتِ خطابت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کنونیشن کے متعلق ہماری رائے نہیں تھی۔ چنانچہ مجاہد ملت سے ایک شب کو تفصیلی گفتگو کی گئی اگرچہ ہم مطمئن نہیں ہو سکے مگر مجاہد ملت کو جواب بھی نہیں دے سکے۔

بہرحال مجاہد ملت نے صرف استقلال و استقامت سے ہی نہیں بلکہ حسنِ تدبیر سے ایک طرف پریس کو ہموار کیا۔ انگریزی زبان پر عبور نہ رکھنے کے باوجود انگریزی اخبارات کے نامہ نگاروں، بیرونی ممالک کے نمائندوں کو مطمئن کر دینا آسان بات نہیں ہے۔ مگر مجاہد ملت نے کنونیشن کے سلسلہ پر پریس کانفرنس کی تو پہلی تقریر نے ہی ہر ایک کو متاثر کر دیا۔ پھر سوالات کے برمحل اور معقول جوابات نے نامہ نگاروں کے اطمینان کو گرویدگی کا رنگ دیدیا۔ اسی طرح صدر کانگریس سنجیوا ریڈی سے گفتگو کرکے انہیں اس درجہ مطمئن کر دیا کہ مخالفت کرنے کے بجائے انہیں کہنا پڑا کہ مسلم کنونیشن سے جمہوریت اور قومی یکجہتی کے مقصد کو تقویت پہونچے گی۔

بہرحال مسلم کنونیشن ہوا۔ اور جس شان سے ہوا اُس کا علم صرف شرکائے کنونیشن کو نہیں بلکہ ہر اُس صاحب بصیرت انسان کو ہے جو اخباری دنیا سے واسطہ رکھتا ہے۔

جس طرح دینی تعلیم کے سلسلہ میں (بمبئی کنونیشن منعقدہ ۱۹۵۴ء) تاریخ کا ایک عجوبہ تھا کہ مختلف مکاتب خیال کے علماء اور نمائندگان نے اس میں شرکت کرکے دینی تعلیم کے سلسلہ میں اتحاد نظر اور وحدت خیال کی ایسی مثال قائم کی جس کی نظیر تاریخ میں نایاب ہے اسی طرح اس کنونیشن نے اُن سب کو جو سیکولرزم کے حامی تھے ایک مرکز پر متحد کرکے ثابت کر دیا کہ خوف زدہ مرعوب اور پست ہمت کرنے کی پندرہ سالہ کوششوں کے باوجود اس تن مجروح میں قوتِ مقابلہ باقی ہے اور بہترین قیادت کی یہ برکت ہے کہ اس حقیقت کے باوجود کہ "تن ہمہ داغ داغ شد" وہ اپنے زخموں سے بے پرواہ میدانِ زندگی میں آگے قدم بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

مسلم کنونیشن ایک پیغام

مسلم کنونیشن جس طرح مسلمانوں کے لئے ایک پیغام تھا کہ جبل پور اور ساگر جیسے مہلک اور جاں گسل حوادث کے باوجود بزدلی اور پست ہمتی حرام ہے۔ بیشک وہ مظلوم ہیں۔ وہ مظالم کا شکوہ اور مظلومیت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں مگر طوق غلامی کے لئے اپنی گردنوں کو خم نہیں کر سکتے۔

اسی طرح وہ پورے ہندیونین اور اس کے سکولر نظام حکومت کے لئے ایک پیغام تھا کہ جمہوریت اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے کہ اس کا ہر عضو زندہ ہو اور وہ حیاتِ نو کی اُمنگوں کے ساتھ متحرک بن سکے۔

وہ قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے نصب العین کے لئے بھی ایک نشان تھا کہ گلہائے رنگارنگ کو شاداب رکھ کر ہی گلدستہ کی شیرازہ بندی ہو سکتی ہے۔ مرجھائے ہوئے پھولوں کی گڈی کو گلدستہ نہیں کہا جا سکتا۔

بین الاقوامی دنیا کے گلدان میں اگر آپ اپنا گلدستہ سجانا چاہتے ہیں تو آپ کی پہلی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہر ایک پھول شگفتہ اور ہر کلی مسکراتی ہوئی ہو۔ مُرجھائے ہوئے پھولوں کا گلدستہ گلدان

میں سجایا نہیں جاتا بلکہ خس و خاشاک کی طرح اس کو کوڑے پر پھینک دیا جاتا ہے۔

ملک کا پریس اگر تعصب کی گندگی سے پاک ہوتا۔ اگر اس میں یہ حوصلہ ہوتا کہ وہ مجاہد ملتؒ کے منشا اور مسلم کنونشن کے صحیح مقصد کو سمجھ سکے تو کنونشن کے ان مقاصد کی اشاعت وہ خود کرتا۔ مگر جس پریس کی تنگ نظری وزیر اعظم حکومت ہند کی تقریروں میں بھی کتر بیونت کرتی رہتی ہو، اس کا یہ حوصلہ کہاں تھا کہ وہ کنونشن کے مقاصد کی اشاعت صحیح طور پر کرتا۔ پھر اس کو اجیت پرشاد جین اور سمپورنانند جیسے "بدنام کنندگان نکونامے چند" کے بیانات کا بہانہ مل گیا جنھوں نے مسلم کنونشن کو فرقہ واریت کا نشان بنا کر فرقہ پرستوں کو شہ دینی شروع کردی۔ فرقہ پرست رہنما خاموش تھے۔ وہ خود مسلم کنونشن کو اپنی ترقی کا سبب نہیں سمجھ رہے تھے مگر ملک اور قوم کے ان نیم طبیبوں نے بلاوجہ مسلم کنونشن پر تنقید کر کے بہانہ تلاش کرنے والوں کے لئے بہانہ مہیا کرنے کی خدمت اپنے ذمہ لے لی

کسی کام کو شروع کرنے کے بعد ناتمام چھوڑ دینا مجاہد ملت کی فطرت کے خلاف تھا۔ جب آپ نے محسوس کیا کہ تنگ نظر پریس اور اس کے تعصب پرست سرپرست کنونشن کو اس طرح مشتبہ بنا کر اس کی افادیت کو ختم کردیں گے تو پھر آپ نے خود بہ نفس نفیس یہ عزم کیا کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں پہونچکر کنونشن کا پیغام وہ خود پہونچائیں گے۔ چنانچہ پورے ہندوستان کے دورہ کا آپ نے پروگرام بنالیا۔ اسی اثنا میں رانچی میں ایک ہنگامہ ہوگیا۔ وہاں سے تاروں کا تانتا بندھ گیا کہ مجاہد ملت خود تشریف لائیں۔

مرض کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا اور جب خلاف معمول تقریباً ایک ماہ تک کھانسی اور حرارت کی شکایت رہی تو ایکسرے کرایا گیا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے ذوڈ کا ایکسرے دیکھ کر مجاہد ملت کے رفیق خاص مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے "کینسر" کا خطرہ بھی ظاہر کیا۔ مگر اتفاق سے چند روز بعد اطبار کی عام دواؤں سے افاقہ محسوس ہونے لگا۔ حتیٰ کہ مجاہد ملت چلنے پھرنے اور تقریریں کرنے کے قابل ہوگئے تو پھر آپ کے رفقار نے اس خطرہ کو اہمیت نہیں دی اور خود مجاہد ملت کی یہ طبیعت نہیں تھی کہ ایسے خطرات سے متاثر ہوکر اپنے پروگراموں کو موقوف کریں، چنانچہ آپ رانچی تشریف لے گئے۔

مسلم کنونشن کے بعد مقبولیت کا دامن اور بھی زیادہ وسیع ہوگیا تھا چنانچہ آپ کی تقریر سننے کے لئے پورے صوبہ بہار سے لوگ کھنچ کھنچ کر رانچی پہونچے۔ حکومت بہار کے منسٹر بھی تقریر سننے کے ایسے ہی مشتاق تھے چنانچہ مجاہد ملت کی تقریباً نوّے منٹ کی تقریر نے پورے مجمع پر جادو کا اثر کیا۔ بالخصوص منسٹر صاحبان بہت کافی متاثر ہوئے۔

رانچی سے واپسی کے بعد آپ بمبئی تشریف لے گئے اور واپسی اس وقت ہوئی جب ۱۹۶۲ء کے الیکشن کے لئے امیدواروں کی نامزدگیوں کا اکھاڑا دہلی میں جما ہوا تھا اور جمعیۃ علمار ہند کے دفتر میں ہر وقت جم غفیر جمع رہتا تھا۔ پھر جیسے ہی ٹکٹ تقسیم ہوچکے اور امیدواروں کی یورش ختم ہوئی مجاہد ملتؒ نے آندھرا کے دورہ کا قصد فرمالیا جس کا تقاضا بہت عرصہ سے تھا۔

اب مرض میں اضافہ ہوگیا تھا اور ایک معمولی سی تشویش یہ پیدا ہونے لگی تھی کہ خلاف معمول اس مرتبہ طبیعت بحال نہیں ہوتی۔ عارضی افاقہ کے بعد پھر اسی طرح مضمحل ہوجاتی ہے۔

آندھرا سے واپسی کے بعد گرتی ہوئی صحت کا تقاضا یہ تھا کہ مجاہد ملت آرام فرماتے۔ مجاہد ملت خود بھی آرام کرنے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ مگر آپ نے آرام کرنے کا پروگرام یہ بنایا تھا کہ حلقہ انتخاب کا ایک مرتبہ دورہ کر چکنے کے بعد آپ آرام فرمائیں گے اور آپ کے رفقار الیکشن کی خدمات انجام دیں گے۔

۲۳ رجنوری ۱۹۶۲ء کو بمبئی میں سنٹرل حج کمیٹی کی میٹنگ ہونے والی تھی۔ مجاہد ملت کا پروگرام یہ تھا کہ ۲۲ رجنوری کو اپنے حلقہ انتخاب کا دورہ پورا کرنے کے بعد دہلی پہونچیں گے پھر فوراً ہی رات کے ہوائی جہاز سے بمبئی روانہ ہوجائیں گے۔ چنانچہ اسی پروگرام کو کامیاب کرنے کے لئے آپ ۲۲ رکی شام کو دہلی جنکشن پر پہونچے۔ اس سفر میں متعدد بار دورے پڑ چکے تھے۔ ایک روز تو تقریر کے بعد ایسی بے ہوشی ہوئی کہ نبضیں چھوٹ گئیں۔ لیکن جیسے ہی ہوش آیا پروگرام کی تکمیل کے لئے کمربستہ ہوگئے۔

مختصر یہ کہ ۲۲ رکی شام کو مرادآباد سے واپس ہوئے اسٹیشن پر پہنچے تو کمزوری کا یہ عالم تھا کہ اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا۔ مگر اس کے باوجود آپ نے ہوائی جہاز کے اڈے پر پہونچنے کی کوشش شروع کردی تاکہ اگلے روز بمبئی میں حج کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کرسکیں جس کے آپ "چیرمین" تھے۔ اس ارادہ سے آپ مکان سے باہر آکر کار میں بیٹھ بھی گئے۔ مگر آپ کے احباب بالخصوص شیخ محمد احمد صاحب وکیل نے کمزوری کا یہ عالم دیکھا تو پورا اصرار کر کے سفر ملتوی کرادیا۔

اگلے روز مجاہد ملت جوشی ہسپتال میں تشریف لیگئے جہاں چار سال پہلے

ہرنیا کا آپریشن آپ نے کرایا تھا۔ اس کے بعد ہی ہسپتال آپ کے متعلقین کا گویا گھریلو ہسپتال بن گیا تھا۔ ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر "پانڈے" مجاہد ملتؒ سے اتنے متاثر تھے کہ مجاہد ملت کی خوشنودی اور اُن کی خدمت کو اپنی خوش نصیبی سمجھتے تھے۔

بہرحال ۲۳ر کو آپ ڈاکٹر جوشی کے ہسپتال میں تشریف لے گئے اور ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر پانڈے نے آپ کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ پھیپھڑوں میں پانی بہت بھرا ہوا ہے۔ فوراً مجاہد ملت کو ہسپتال کے اسپیشل کوارٹر میں قیام کرنے پر مجبور کیا اور پانی نکالنے کا انتظام شروع کردیا۔

احقر بھی اتفاق سے باہر تھا۔ ۲۲ کی شب کو ۸ بجے مجاہد ملت دہلی پہونچے اور ۲۳ر کی صبح کو ۷½ بجے احقر دہلی پہونچا۔ تقریباً ۹ بجے دفتر میں گیا تو معلوم ہوا کہ مجاہد ملت مکان پر ہیں اور آرام فرما رہے ہیں۔ احقر نے آرام میں خلل اندازی مناسب نہیں سمجھی۔ اپنے غریب کدہ پر جاکر کچھ کام میں مشغول ہوگیا۔ تقریباً ۱۲ بجے قاضی اکرام الحق صاحب نے مکان پر پہونچکر ہی احقر کو اطلاع دی کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جوشی ہسپتال میں تشریف لے گئے ڈاکٹر صاحب نے واپس نہیں آنے دیا اور وہیں قیام کا انتظام کردیا ہے۔

ظہر بعد احقر ہسپتال پہونچا تو معلوم ہوا کہ پھیپھڑوں سے ۵۰ اونس پانی نکالا جاچکا ہے۔ کئی روز بعد اس وقت مجاہد ملت سے ملاقات ہوئی تھی۔ عام انداز مجاہد ملت کا یہ تھا کہ ذراسی بات پر برافروختہ ہوجاتے تھے اس ظاہر برافروختگی سے معلوم ہوتا تھا کہ مزاج میں تحمل اور برداشت نہیں ہے لیکن خود احقر کو معلوم ہے کہ بہت سی باتیں جو انتہا درجہ ناگوار خاطر ہوتی تھیں ان کی برداشت اس طرح کرتے تھے کہ کسی کو ناگواری کا وہم وگمان بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لوگ ہمیں احمق بناتے ہیں اور ہم جان بوجھ کر احمق بنتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جماعت کے ذمہ دار کے لئے تحمل اور برداشت اور ایک لازمی چیز ہے۔ بہرحال یہ قوت برداشت مرض کی حالت میں خاص طور پر نمایاں ہوتی تھی۔

اس روز جب احقر حاضر ہوا تو ۵۰ اونس پانی نکل چکا تھا اس کا اثر طبیعت پر لامحالہ ہوگا۔ مگر ملاقات کے وقت کسی تاثر کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کروٹ لینے کے وقت غیر اختیاری طور پر کراہ نکل گئی۔ تو پھر خود ہی فرمایا کہ جہاں سے پانی نکالا گیا ہے وہاں ٹیس ہورہی ہے۔

مولانا وحید الدین صاحب قاسمی جو دفتر ہی سے ساتھ گئے تھے ان سے احقر نے علیحدگی میں دریافت کیا تو مولانا موصوف نے بتایا کہ پانی ابھی اور باقی ہے پرسوں کو نکالا جائے گا۔ البتہ پانی کے ساتھ کچھ خون بھی آیا ہے ڈاکٹر صاحب کو تشویش ہے کہ خون کیوں آیا۔

احقر کو اسی روز حضرت مولانا موصوف کے الیکشن کے سلسلہ میں امروہہ وغیرہ جانا تھا۔ چنانچہ احقر شب کو روانہ ہوگیا ۲۵ کو دوبارہ ۵۴ اونس پانی نکالا گیا۔ تو "کینسر" نمایاں ہوا۔ فوراً حافظ محمد ابراہیم صاحب' وزیر حکومت ہند جو حضرت مولانا کے خالہ زاد بھائی بھی ہیں' بہنوئی بھی اور سمدھی بھی' ان کو اطلاع دیکر "بمبئی" بذریعہ ہوائی جہاز پہونچانے کا انتظام کیا گیا۔

سفر بمبئی۔ پھر سفر امریکہ اور مرض الوفات کے حالات شاید کوئی اور صاحب تحریر فرمائیں احقر تو مجاہد ملت کی قوت برداشت کے سلسلہ میں ایک اور حیرت انگیز واقعہ لکھنے کے بعد اس طویل مضمون کو ختم کررہا ہے۔

مرض الوفات کے زمانہ میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں بزرگوں۔ دوستوں اور ارادتمندوں نے مجاہد ملت سے ملاقات کی ہے لیکن زندگی کے آخری دن تک کبھی کسی نے یہ محسوس نہیں کیا کہ حضرت مجاہد ملت کسی درجہ میں بھی اپنی زندگی سے مایوس ہیں۔

یکم اگست کی شام کو بعد عصر بار بار کچھ ایسی غنودگی سی طاری ہو رہی تھی کہ خود احقر کو ایک مرتبہ خطرہ ہوا۔ چنانچہ نبض پر ہاتھ رکھ کر احقر نے دیکھا نبض کی رفتار نہایت سست تھی۔ خاص اسی حالت میں بمبئی کے مشہور لیڈر رئیس نوری صاحب آگئے۔ احقر نے اُن کو اشارہ کیا کہ وہ توقف کریں مگر وہ سمجھ نہیں سکے۔ جیسے ہی مولانا کے کان میں آواز پڑی کہ رئیس صاحب کھڑے ہیں فوراً چونک کر آنکھ کھولی اور ایسی بشاشت اور خندہ پیشانی سے گفتگو کی کہ احقر خود حیران ہوگیا۔ آواز نہایت کمزور پست تھی' مگر انداز میں وہی شگفتگی تھی جو دوستوں سے ملاقات کے وقت ہوا کرتی تھی پھر نماز مغرب کے بعد جبکہ سفر آخرت میں چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے دیر تک اس پر گفتگو کرتے رہے کہ علاج تبدیل کردیا جائے پھر خود ہی فیصلہ کرکے فرمایا کہ مولوی وحید سے کہدو کہ وہ بریلی چلے جائیں اور حکیم صدیق صاحب کو لے آئیں۔ بہرحال زندگی کے آخری دن کے آخری لمحات تک گفتگو یا کسی بھی انداز سے مایوسی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ

جیسے ہی کینسر کی تشخیص ہوئی مولانا اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب ابتدا مرض میں ٹاٹا میموریل ہسپتال بمبئی میں زیر علاج تھے احقر کو ایک طویل خط تحریر کرایا۔ احقر ان ایام میں امروہہ مقیم تھا۔ احقر کے ہمنام اور مجاہد ملت کے چہیتے دوست سیّد محمد میاں صاحب رضوی کی معرفت وہ طویل گرامی نامہ احقر کو موصول ہوا۔ اس میں الیکشن کے متعلق تو ایک دو سطر میں ہی مضمون تھا کہ احقر محمد میاں کو جملہ معاملات سپرد ہیں اور سیّد محمد میاں صاحب رضوی مولانا (مرحوم) کی طرف سے جنرل ایجنٹ ہیں۔ باقی تمام خط میں علاج کی تفصیل تھی اور اسی مکتوب گرامی میں اشارۃً مایوسی کا اظہار بھی تھا۔

جب مجاہد ملت بمبئی سے واپس آچکے اور ڈاکٹروں نے یہ اطمینان دلا دیا کہ ایسا عمل کیا جا چکا ہے کہ چھ ماہ تک مرض نہیں بڑھیگا اس وقت کی بات ہے کہ احقر ایک روز تنہائی میں گفتگو کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ مایوسی دور کرے تو بگڑ کر احقر کی سخن گستری کی تردید کی اور اپنے مکتوب کا حوالہ دیا کہ میں آپ کو پہلے ہی خط میں اشارہ کر چکا ہوں آپ سمجھے نہیں۔

ایک طرف یہ مایوسی۔ اور خاتمہ زندگی کا یقین اور دوسری طرف یہ ضبط و تحمل کہ آخری دن کے آخری لمحات تک کسی بھی دیکھنے والے کو مایوسی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اس کو مجاہد ملت کی کرامت ہی کہا جا سکتا ہے۔ کرامت کے علاوہ اور کوئی لفظ نہیں ہے جس سے اس کیفیت کی تعبیر ہو سکے۔

اس پوری مدت میں صرف ایک روز ایسا ہوا کہ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔

یہ امریکہ جانے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ صبح کے وقت خواب دیکھا کہ حافظ صاحب کی کوٹھی کے اسی کمرہ میں جہاں مولانا قیام فرما تھے ایک کالا سانپ ہے اور دو نیولے ہیں ایک چھوٹا اور دوسرا بڑا۔ کالا سانپ کہہ رہا ہے کہ میں موت ہوں اور بڑا نیولا کہہ رہا ہے کہ میں ہندوستان والوں کی دعا ہوں اور چھوٹا نیولا کہہ رہا ہے کہ میں بیرون ہند کے مسلمانوں کی دعا ہوں۔ اور ہم اس لئے موجود ہیں کہ اس سانپ کو باہر نکالیں۔ مولانا نے فرمایا کہ تم کس طرح لے جاؤ گے۔ کمرے کے تمام دروازے بند ہیں تو نیولوں نے جواب دیا کہ جب ہم لیجانا چاہیں گے تو بند دروازے ہمارے راستہ میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتے۔ جب یہ الفاظ آپ فرماتے تھے تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ مگر پھر فوراً قضاءِ مبرم اور قضاءِ غیر مبرم کی بحث شروع ہوگئی اور مجاہد ملت نے اس بحث میں شد و مد سے حصہ لیا۔ بہرحال:

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا" رحمۃ اللہ

مجاہد ملت کی زندگی کے دوسرے رُخ

مضمون نے بڑھتے بڑھتے کتاب کی طوالت اختیار کرلی پھر بھی مجاہد ملت کے کارناموں کا صرف وہی حصہ ضبط تحریر میں آسکا جس کا تعلق انقلابی اور سیاسی مساعی سے تھا۔ درس تدریس۔ تصنیف و تالیف۔ تحریر و خطابت جیسے ممتاز کمالات کے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھا جا سکا۔ اس کمی کو امید ہے دوسرے حضرات پورا کریں گے۔

سیاسی اور انقلابی خدمات کے سلسلہ میں بعض ایسے کارنامے باقی رہ گئے جن کی تفصیلات کا احقر کو علم نہیں ہے مثلاً ڈانڈی مارچ۔ یا آغاز تحریک (۱۹۲۱ء) کے زمانہ کی گرفتاری وغیرہ کیونکہ اس دور میں احقر کو شرف رفاقت حاصل نہیں تھا۔ خاص یہ دور جس میں شب و روز رفاقت کی سعادت حاصل رہی اس دور کے بھی بہت سے نہایت اہم اور ضروری کارنامے باقی رہ گئے جن کی تفصیل کے لئے سیکڑوں صفحات کی ضرورت ہے۔ مثلاً:

(۱) مجاہد ملت کی زندگی کا اہم باب وہ خدمات ہیں جن کا تعلق ریلیف سے ہے یہ باب اتنا وسیع ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ صبح سے شام بلکہ رات کے گیارہ بجے تک مجاہد ملت کا دروازہ ہر ایک ضرورت مند کے لئے کھلا رہتا تھا اور پورے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے لوگ اپنی ضرورتیں لیکر آتے تھے جن کی ضرورت جمعیۃ علماء کے راستے سے پوری ہوسکتی اُن کے لئے جمعیۃ علماء کا لیٹر فارم اور اس کی مہر بکام میں لائی جاتیں۔ جن معاملات کا تعلق جمعیۃ علماء سے نہیں ہو سکتا تھا اُن کے لئے ممبر پارلیمنٹ کا لیٹر فارم اور اس کی مہر استعمال کی جاتی۔ جہاں زبانی گفتگو کی ضرورت ہوتی وہاں زبانی جہاں ٹیلیفون کام دیتا اس کے لئے ٹیلیفون۔ غرض صرف مجاہد ملت ہی نہیں بلکہ جمعیۃ علماء کا پورا دفتر مجاہد ملت کے احترام میں ہمہ وقت انہیں کاموں میں مشغول رہتا تھا۔ جن کا تعلق ریلیف سے تھا۔ غالباً [illegible] کا واقعہ ہے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ حضرت مجاہد ملت لو کے طمانچوں اور آفتاب کی تمازت سے بچکر دفتر کے تاریک کمرے میں آرام فرما تھے کہ دہلی کے ایک لکھ پتی سوداگر گھبرائے ہوئے آئے۔ کہ ۱۵ لاکھ انکم ٹیکس کے لازم کردیئے گئے

ہیں اور اگر ادائیگی نہیں کی گئی تو کارخانہ بند کر دیا جائے گا جس سے ساکھ خراب ہو جائے گی۔ اول تو اتنی بڑی رقم کمر توڑ رہی ہے پھر ساکھ بھی گر گئی تو سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ ضرورت ہے کہ فوراً پنڈت نہرو کے ذریعہ اسٹے آرڈر حاصل کیا جائے۔ مجاہد ملت کے کانوں میں جیسے ہی یہ فریاد پڑی اپنا آرام بھول گئے۔ پنڈت جی سے ٹیلیفون پر اجازت حاصل کی اور دہکتے ہوئے دوپہر کی لپٹوں میں چار میل طے کرکے پنڈت جی کی خدمت میں حاضر ہوئے

پنڈت جی عام طور پر انکم ٹیکس کے معاملہ میں کوئی سفارش نہیں سنتے۔ مگر اس واقعہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ فوراً ہی ان کو مہلت دلوادی اور جب ان صاحب نے نظر ثانی کی درخواست کی تو پندرہ لاکھ کے صرف ڈھائی لاکھ رہ گئے۔

۲ر دسمبر ۱۹۶۲ء کو میواتی صاحبان کی کانفرنس ضلع الور (راجستھان) کے مشہور قصبہ تجارہ میں ہوئی تھی۔ آنریبل حافظ محمد ابراہیم صاحب نے بھی اس کانفرنس میں شرکت فرمائی۔ نواب محمد امین خاں صاحب آف لوہارو مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ معزز مہمان کا استقبال کرتے ہوئے استقبالیہ کے ذمہ دار رکن ولی محمد خاں صاحب وکیل نے جمعیۃ علماء بالخصوص مجاہد ملتؒ کی خدمات کا ذکر کیا۔ پھر خود اپنے متعلق فرمایا کہ میری یہ آزادی مجاہد ملتؒ کا طفیل ہے۔ کچھ مخالفوں نے مجھے قتل کے مقدمہ میں جکڑ دیا تھا۔ مجاہد ملت نے شہادت دی کہ اس وقت میں دہلی میں ان کی خدمت میں حاضر تھا۔ یہی شہادت میری برارت کا ذریعہ بن گئی۔

اس قسم کے انفرادی معاملات، طرح طرح کے مقدمات، ملازمتوں برخاستگی۔ ترقی۔ تنزل، طلبہ کے اسکالرشپ یا مثلاً کسی یونیورسٹی یا کالج میں داخلہ۔ پاکستان جانے آنے والوں یا تلاشی کے وقت کسی قابل اعتراض چیز کی برآمدگی وغیرہ کے متعلق سیکڑوں بلکہ ہزاروں معاملات ہیں جو مجاہد ملت کی نظر توجہ سے کامیاب ہوئے

اگر دفتر میں کوئی رجسٹر ہوتا تو اس کے سیکڑوں صفحات پُر ہو جاتے مگر مجاہد ملت نے رجسٹر کے اندراج کے بجائے اپنے نامۂ اعمال میں ان کا اندراج کافی سمجھا اور اسی کی وہ کوشش کرتے رہے کہ ان کا صحیفۂ اعمال زیادہ سے زیادہ مزین اور آراستہ ہو۔ امید ہے کہ یہ کوشش کامیاب ہوئی ہوگی اور حضرت مجاہد ملت کا صحیفۂ اعمال صدیقین اور شہداء کے اعمال ناموں کے ہم پلہ ہوگا۔ (ان شاء اللہ)

بہت سے ایسے معاملات بھی تھے جن کی نوعیت انفرادی تھی مگر پھر ان کی حیثیت "نظیر" کی ہو گئی جس سے بیشمار خلق خدا کو فائدہ پہونچا۔

(۲) مثلاً حاجی محمد دین صاحب کا کیس انفرادی تھا۔ انھوں نے ۵۴ ہزار کی ایک جائداد کراچی میں ایک صاحب سے خریدی تھی۔ یہ صاحب جب پناہ گزیں بن کر ہندوستان پہونچے تو انھوں نے اپنے کلیم میں اس جائداد کا تذکرہ کر دیا۔ کسٹوڈین کو بہانہ مل گیا اور ان کی تقریباً ۶۰ لاکھ کی جائداد جو دہلی میں تھی ضبط کر لی۔ قانون کے الفاظ اسی طرح کے تھے کہ اگر کسی نے کوئی بھی فائدہ پاکستان میں حاصل کیا ہے تو اس کی جائداد ہندوستان میں نکاسی قرار دی جائے گی۔

اگر کسی شرنارتھی کی ضبط شدہ جائداد کا کوئی حصہ پاکستان میں کسی نے پاکستانی ہونے کی حیثیت سے حاصل کر لیا ہے تب تو ہندوستان میں اس کی جائداد ضبط کر لینا کسی درجہ پر معقول ہو سکتا تھا۔ مگر اس کیس میں حاجی محمد دین صاحب نے پاکستانی کی حیثیت سے کوئی جائداد نہیں حاصل کی تھی بلکہ ایک خریدار کی حیثیت سے خریدی تھی، اور قیمت بھی مناسب ادا کی تھی۔

بہرحال یہ کیس چلا۔ کسٹوڈین کا فیصلہ اول سے لیکر آخر تک ایک ہی رہا "سر اچھرو رام" جنرل کسٹوڈین نے نظر ثانی کے بعد فیصلہ بحال رکھا۔ بالآخر کیبنٹ نے حاجی صاحب کے حق میں فیصلہ صادر کیا جس پر اچھرو رام صاحب نے برافروختہ ہو کر استعفاء دیدیا۔ اس واقعہ نے ہندوستان میں خاص شہرت حاصل کر لی۔ پھر کیبنٹ کا فیصلہ ایک نظیر بن گیا جس سے خدا جانے کتنے مظلوموں کو فائدہ پہونچا۔

یہ درست ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کیس میں دلچسپی لی۔ مگر جس نے مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کو دلچسپی لینے پر مجبور کیا وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی (قدس اللہ سرہٗ العزیز) صدر جمعیۃ علماء ہند کی شخصیت تھی یا مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی جد وجہد۔ جو مسلسل جاری رہی۔

کسٹوڈین کے قانون میں جو ترمیمات ہوئیں ان کی تفصیل مشکل بھی ہے اور طویل بھی۔ صرف اتنی بات آسانی سے لکھی بھی جا سکتی ہے اور اس کا سمجھ لینا بھی آسان ہے کہ مجاہد ملت کی غیر معمولی جد وجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترمیمات کے بعد اس کالے قانون کا نقصان صرف ایک چوتھائی رہ گیا۔

شروع میں نکاسی جائدادوں کا قانون نافذ ہوا تو پورے ہندوستان میں کہرام مچ گیا کیونکہ اس کی نوعیت ایسی تھی کہ تمام ہی صاحب جائداد مسلمان

اس کی زد میں آسکتے تھے۔ چنانچہ اسی وسیع پیمانہ پر کسٹوڈین نے دست درازی شروع کردی۔

مجاہد ملت کے سامنے معاملات آئے تو آپ فی الواقع بے چین ہوگئے راحت وآرام سب ختم ہوگیا۔ دن رات وکلاء سے مشورے۔ بار بار ماہران قانون کا جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں اجتماع۔ ان سے بحث مباحثہ شیخ محمد احمد صاحب آجکل "ایڈوکیٹ" ہیں۔ اس وقت تک وکالت پاس نہیں کی تھی۔ مگر قانون پر نظر بہت گہری تھی۔ وہ حضرت مجاہد ملت کا دست راست تھے۔

مختصر یہ کہ یکے بعد دیگرے ترمیمات منظور کراکر اس قانون کے دامن کو اتنا تنگ کردیا کہ شاید ایک چوتھائی معاملات بھی اس کی زد میں نہیں آسکے۔ تین چوتھائی معاملات ان ترمیمات کی رو سے ختم ہوگئے۔

(۳) ملازمتوں کے سلسلہ میں جن لاکھوں مسلمانوں نے عارضی پاکستان لکھوادیا تھا جب وہ چھ ماہ بعد پاکستان کے بجائے ہندوستان میں ملازمت کے خواہاں ہوئے تو سخت دشواری پیش آئی۔ قانون بنانے والوں اور رول طے کرنے والوں کو قانون یا رول بنانے کے وقت اس کا وہم وگمان بھی نہ ہوگا۔

دشواری یہ پیش آئی کہ مسلمان تو ہزاروں کی تعداد میں پاکستان سے واپس آگئے مگر جو شرنارتھی پاکستان سے آکر ان کی جگہ پر تعینات ہوئے تھے ان میں سے ایک بھی پاکستان واپس نہیں ہوا۔ اب عارضی پاکستان والے محروم رہ گئے۔

ریلوے میں یہ ستم ظریفی بھی کی گئی تھی کہ محض مسلمان ہونے کی بنا پر پاکستانی قرار دیدیا۔ این۔ ڈبلیو۔ آر میں عموماً یہی کیا گیا تھا۔ جودھپور سے ایک لائن سندھ جاتی تھی۔ یہاں اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کیا گیا کہ سب مسلمانوں کو یک قلم برخاست کردیا گیا حالانکہ ان میں سے بہت سے وہ تھے کہ انھوں نے نہ عارضی پاکستان لکھوایا تھا نہ مستقل۔

ان ہزاروں بلکہ تقریباً ایک لاکھ ملازموں کے حق میں پالیسی تبدیل کرانا مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کا خاص کارنامہ تھا۔

جو جگہیں خالی تھیں وہاں مسلمان لے لئے گئے اور جن مسلمانوں کو اس وقت جگہ نہیں مل سکی ان کے متعلق یہ طے کردیا گیا کہ خالی جگہ پر پہلے ان کو لیا جائے گا۔

(۴) وہ منظر کبھی بھی فراموش نہیں ہوگا جب دوپہر کے وقت سکھ نما پنجابیوں کی ایک جماعت دفتر میں دفعتہً پہونچ گئی۔ یہ پندرہ سولہ آدمی تھے۔ اردو سے ناواقف۔ ان سے گفتگو شروع ہوئی تو کچھ دیر تک یہی رہا کہ "زبان یار من ترکی و من ترکی نمیدانم" مگر پوری توجہ سے کام لیا گیا تو ان کا مطلب سمجھ میں آگیا کہ

"وہ مسلمان ہیں، ضلع پٹیالہ کے دیہات کے باشندے محض جان بچانے کے لئے یہ وضع اختیار کر رکھی ہے۔ اب مطالبہ یہ ہے کہ اس طرح اپنے ضمیر کے خلاف دو سال زندگی گذار چکے ہیں آئندہ یہ صورت باقی نہیں رکھنا چاہتے۔ ان کے لئے انتظام کیا جائے کہ وہ مسلمان بن کر آزادی سے زندگی گذار سکیں اور یہ ممکن نہ ہو تو ان کو پاکستان پہونچا دیا جائے"

مجاہد ملتؒ کی جرأت اور پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم حکومت ہند کی شرافت اس کی مستحق ہے کہ مسلمانان مشرقی پنجاب کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف سے لکھی جائے کہ مجاہد ملت نے ایک لمحہ کی تاخیر بھی گوارا نہیں کی سب سے پہلی فرصت میں پنڈت جی سے ملاقات کرکے صورت حال پیش کی۔ پنڈت جی نے یہ تو گوارا نہیں کیا کہ وہ وفادار ہندوستانیوں کو پاکستان کے حوالہ کریں البتہ ایک سرکلر جاری کردیا کہ جو لوگ ۱۹۴۷ء سے پہلے مسلمان تھے وہ اب بھی مسلمان ہی ہیں۔ وہ آزادی سے اپنے اسلام کا اظہار کرسکتے ہیں ان پر کوئی قانونی پابندی نہیں اور نہ کوئی شخص یا جماعت ان کی مذہبی آزادی میں رکاوٹ ڈال سکتی ہے۔

یہ سرکلر دیہات کے پٹواریوں اور چوکیداروں تک پہونچایا گیا۔ کچھ دنوں بعد احقر مولانا لقاء اللہ صاحب وغیرہ کے ساتھ مشرقی پنجاب کے دیہات میں گیا تو دیہات کے مسلمانوں کو اس پس منظر کا تو علم نہیں تھا البتہ اس سرکلر کا ان کو علم تھا۔ جب ہم نے ان سے حالات دریافت کئے تو انھوں نے بتایا کہ ہم چھپ چھپ کر نمازیں پڑھتے رہے اپنے مذہبی مراسم انجام دیتے رہے اور جب مذہبی آزادی کا اعلان ہوا تو ہم نے بھی پردہ اٹھادیا۔

اللہ تعالیٰ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات قبول فرمائے اور امید ہے کہ ایسا کارنامہ جس کا متعدی اثر ہزاروں مسلمانوں تک پہونچا اور ان کی آنے والی نسلیں بھی اس کارنامہ کی رہین منت رہیں گی انشاءاللہ۔ یہ کارنامہ مجاہد ملت کے صحیفۂ اعمال کا روشن اور درخشاں باب ہوگا۔

تعمیری خدمات

ہنگامی حالات نے جس کی زندگی کے ہر ایک لمحہ کو ہنگامہ بنادیا ہو

اس کے لئے بہت ہی مشکل ہے کہ کوئی تعمیری خدمت انجام دے سکے، جس کے لئے سکون، اطمینان اور خاموشی ضروری ہے۔ مگر مجاہد ملت کی زندگی میں یہ تضاد موجود تھا کہ ہنگامی حالات کی انتہائی مصروفیت اور انہماک کے باوجود تعمیر ملت کے فرائض سے وہ غافل نہیں ہوتے تھے۔

ابھی ۴۷ء کا پرآشوب دور ختم نہیں ہوا تھا کہ لکھنؤ میں ۲۹، ۳۰ دسمبر کی تاریخیں آزاد کانفرنس کے لئے طے کردی گئیں۔ وسط دسمبر میں احقر چند ضرورتوں سے دہلی سے باہر گیا ہوا تھا۔ غالباً ۲۰ دسمبر کو سہارنپور میں مجاہد ملت کا تار پہونچا۔ اور احقر خطرناک راستے طے کرتا ہوا خدا کے فضل سے دہلی پہونچ گیا۔ یہاں مجاہد ملت روزنامہ الجمعیۃ کے جاری کرنے کا عزم فرما چکے تھے اور احقر کو اسی لئے طلب فرمایا تھا کہ بلا توقف روزنامہ جاری کردیا جائے۔ چنانچہ ۲۳ دسمبر ۴۷ء سے یہ روزنامہ پھر جاری ہوگیا جو ۹ سال پہلے برطانوی حکومت کے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کی نوازشوں کا شکار ہو چکا تھا۔ فرق یہ ہوا کہ پہلے سہ روزہ تھا اور اس مرتبہ مجاہد ملت کے حوصلہ عالی نے اس کو روزنامہ قرار دیا۔

روزنامہ الجمعیۃ کی اشاعت دہشت زدہ صامت و ساکت فضا میں پہلی آواز تھی جس نے پھر زندگی کی لہر دوڑائی اور ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لئے صبح صادق ثابت ہوئی۔

الجمعیۃ پریس بھی اسی طرح مجاہد ملت کے عزم راسخ کا طفیل ہے جیسے ہی روزنامہ الجمعیۃ جاری ہوا تھا مولانا موصوف کی فرمائش یہ بھی تھی کہ پریس بھی قائم کیا جائے۔ مگر احقر کو پریس کی مشکلات کا تجربہ تھا۔ مجلس عاملہ میں پریس کا تذکرہ آیا تھا تو حضرت مولانا ابو الکلام آزاد جو پریس کے پرانے زخم خوردہ تھے انھوں نے فرمایا کوئی انتظام کرنے والا ہو تو پریس کامیاب ہو سکتا ہے۔ پھر مجلس عاملہ نے کمیٹی بنادی کہ پریس کے امکانات پر غور کرکے فیصلہ کرے۔ اس کی رپورٹ بھی مخالف ہی رہی۔ جب یہ سب صورتیں مجاہد ملت کے منشاء کو پورا نہ کرسکیں تو آپ نے فرمایا کہ نفع نقصان تو بعد کی بات ہے۔ میرا منشاء تو یہ ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی ایک جائداد ہو جائے۔ مجاہد ملت کے اس جذبہ کی حمایت سب ساتھیوں نے کی اور الحمد للہ الجمعیۃ پریس وجود میں آگیا۔

اسی طرح انگریزی اخبار کے متعلق بھی مجاہد ملت کی آرزو ساتھیوں کے دلوں میں امنگ پیدا کرتی رہی اور ایک مرتبہ ہفتہ وار اخبار "میسیج" جاری کردیا گیا جس کے لئے مجاہد ملت اور ان کے رفقاء نے بمبئی سے تقریباً ستر ہزار روپیہ اور مالی گاؤں سے تقریباً بارہ ہزار روپیہ فراہم کئے تھے، مگر افسوس اس کی مشکلات پر قابو نہ پایا جاسکا۔ اور تقریباً پانچ سال جاری رکھ کر بند کرنا پڑا۔

دینی تعلیم کا مسئلہ

مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ جس طرح سیکولرزم کے بہت بڑے حامی اور اس کی کامیابی کے لئے سرگرم جد وجہد کو اپنا فرض سمجھتے تھے وہ پہلے دن سے اس کے تقاضے سے بھی غافل نہیں رہے کہ سیکولر حکومت اور لازمی تعلیم کے منصوبہ کے جھمیلے میں دین و ایمان کا باقی رہنا اس پر موقوف ہے کہ مسلمان دینی تعلیم کے فرض کو اپنی جماعتی زندگی کا نصب العین بنالیں اور انفرادی طور پر نہیں بلکہ جماعتی قوت کے ساتھ اپنی کوششیں اس مقصد عظیم کے لئے وقف کردیں۔

مجاہد ملت کی یہ تحریک اور اس سلسلہ میں جمعیۃ علماء ہند کی تجویزیں (جن کا سلسلہ انقلاب سے چند ماہ بعد یعنی ۳ فروری ۴۸ء سے شروع ہوگیا تھا) اس وقت "ملا گردی" کا ایک شاخسانہ سمجھی گئیں۔ مگر جب بار بار تقریروں، مضامین اور رسالوں کے ذریعہ اس طرف مسلمانوں کی توجہ منعطف کرائی جارہی تھی تو ایک احساس پیدا ہوا۔ اور اب یہ سوال سامنے آیا کہ دینی تعلیم کا انتظام خود مسلمان کریں یا حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ اس کی ذمہ داری اپنے سر لے۔

یہ سوال اتنا بڑھا کہ نہ صرف خصوصی اجتماعات، بلکہ عام مجلسوں کا موضوع بحث بن گیا۔ اب ضرورت محسوس کی گئی کہ مسلمانوں کا ایک کنونشن طلب کیا جائے اور اس کنونشن میں اس موضوع پر بحث کرکے کسی متفقہ فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش کیجائے۔

ایک طرف موجودہ حالات میں دینی تعلیم کی غیر معمولی اہمیت کے احساس کو عام کرنا اور دوسری جانب دینی تعلیم کی ذمہ داری کے سوال کو حل کرنا اس دینی تعلیمی کنونشن کا مقصد تھا جس کے لئے مجاہد ملت کی تجویز کے بموجب بمبئی کا مقام تجویز کیا گیا اور پھر مجاہد ملت ہی کی کوششوں نے اس کو اس درجہ کامیاب بنایا کہ اس کو بے نظیر کنونشن سمجھا گیا۔

تاریخ کوئی ایسی مثال آسانی سے نہیں پیش کرسکتی کہ سنی شیعہ۔ اور شیعوں کے مختلف گروہ۔ ان کے علاوہ اہل حدیث، مہدوی، آغا خانی وغیرہ سب فرقے ایک پلیٹ فارم پر سر جوڑ کے بیٹھے ہوں اور پورے اتفاق اور یکجہتی کے ساتھ ایک فیصلہ کیا ہو۔ یہ مجاہد ملت کے اخلاص اور آپ کے جذبہ صادق کی برکت تھی کہ دسمبر ۱۹۵۴ء کے کنونشن نے یہ مثال قائم کردی۔ جزاہ اللہ احسن ما یجازی بہ عبادہ الصالحین

عمر بگذشت و حدیث درد ما آخر نہ شد
شب آخر شد کنوں کوتہ کنم افسانہ را

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

محمد میاں ۲۲ رجب ۱۳۸۲ھ - ۲۰ دسمبر ۱۹۶۲ء

مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صدیقی سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ

اپنے افکار و اعمال کے آئینہ میں

قِفا نبکِ من ذکریٰ حبیبٍ و منزلٖ

(از: انیس الحسن)

۴۵ء، ۴۶ء کو گزرے ہوئے اٹھارہ انیس برس ہوگئے۔ وہ زمانہ ہندوستان میں سیاسی کشمکش کے انتہائی بحران کا زمانہ تھا۔ ایک طرف کانگریس کی تحریک آزادی اپنی آخری منزل میں قدم رکھ چکی تھی۔ دوسری طرف مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان اپنے عروج و شباب پر تھا۔ پورے ملک کی فضائیں سیاسی چرچوں سے گونج رہی تھیں۔ پھر دہلی کو تو ملکی زندگی کے ہر معاملہ میں ہی مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ سیاسی کشمکش کا جو تلاطم یہاں بپا تھا اس کا اندازہ دشوار نہیں۔ آئے دن ملک بھر کے صف اول کے رہنماؤں اور لیڈروں کی آمد و رفت، جلسے، جلوس، مخالف و موافق تقریریں، بیانات، ایک طوفان تھا جس نے فضا کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ مسلمانوں کے درمیان لیگی قائدین میں مرحوم نواب زادہ لیاقت علی خاں، مسٹر جناح اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور قوم پرور رہنماؤں میں امام الہند مولانا آزاد، مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ، شیخ الاسلام حضرت مدنی، سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید، بطل حریت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظہور الدین بہاری قدس اللہ اسرارہم اور بیرسٹر آصف علی صاحب مرحوم کی تقریریں، کانفرنسیں، جلسے، جلوس تمام سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے

اپنے اساتذہ کرام اور علماء دین کی احترام کے اثر سے عربی و دینی مدارس کی فضا ان دنوں عام طور پر کانگریس، جمعیۃ علماء اور مجلس احرار کی پُر جوش ہم نوا تھی۔ میں نے بھی ان ہی دنوں مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں درس نظامی اور مشرقی علوم کے مروجہ نصاب کی تکمیل کی تھی۔

قوم پرور رہنماؤں اور بزرگان جمعیۃ سے قلبی تعلق اور ان کے جلسوں، جلوسوں میں شرکت کا شوق اسی ماحول کی بخشش تھی۔ دوسرے بزرگوں کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی بھی کئی دلآویز تقریریں ان دنوں سننے کا موقع ملا۔ خاص طور پر "یوم فلسطین" کے موقع پر برطانی حکومت کے مسلم آزار رویہ پر تنقید کرتے ہوئے لب لہجہ کی پوری پوری قوت اور جوش کے ساتھ مولانا مرحوم کے یہ الفاظ گویا آج تک کانوں میں گونج رہے ہیں۔

"برٹش اقتدار کو یہ گھمنڈ ہے کہ اس کی حدود سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا ہے، لیکن میں آج فلسطین کانفرنس کے اس اسٹیج سے پکار کر برطانوی سامراج کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ اس گھمنڈ میں نہ رہے۔ یہ سورج، سورج نہیں ہے بلکہ دستِ قدرت کی وہ ٹارچ ہے جو بات و دن برٹش استبداد اور آمریت کا تعاقب کر رہی ہے کہ آج کہاں یہ نہتے انسانوں پر ستم ڈھا رہے ہیں اور آج کہاں اپنی غلامی کا وبال غریبوں کے سر تھوپ رہے ہیں"

ان ہی دنوں (۴۵ء میں) دہلی میں ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کی سبجیکٹ کمیٹی میں کسی تجویز کی تائید میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے تقریر کی، پر جوش انداز بیان کے ساتھ ساتھ اس وقت ان کے جس امتیاز پر میں سب سے زیادہ حیران ہوا، وہ زبان کی طلاقت اور روانی تھی۔ مولانا کی تقریر کیا تھی، الفاظ و کلمات کی ایک بوچھار تھی یا ایک موسلا دھار بارش ـــ صفِ اول کے مقرروں میں یہ وصف مولانا مرحوم کا امتیاز تھا۔ ان ہی دنوں کچھ دوستوں سے سنا کہ شارٹ ہینڈ کے مشاق رپورٹر بھی جس تقریر کو نوٹ کرنے سے عاجز آجاتے تھے وہ صرف مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی تقریر ہوتی تھی۔ ان کی طلاقتِ زبان اور تیز رفتاری کے سامنے شارٹ ہینڈ کی ٹیکنیک بھی مات کھاتی تھی۔ آزادیٔ ہند سے پہلے پہلے حضرت مولانا کی جتنی بھی تقریریں سنیں، ان میں یہ خصوصیت نمایاں نظر آئی۔ آزادی کے بعد اگرچہ جوش خطابت اور قوت بیان میں

فرق نہیں آیا لیکن زبان کی اس تیز یلغار اور رفتار میں ضرور کچھ فرق آگیا تھا اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ آزادی سے پہلے ایک بیرونی اقتدار کا مقابلہ تھا۔ طبیعت میں ایک سیلابی جوش تھا اور بے چین اُمنگ۔ آزادی کے بعد حالات و ماحول نے غیر متوقع طور پہ جو رنگ بدلا اس میں نہ جذبات کا وہ تلاطم باقی رہا نہ امنگوں کا وہ جوش و خروش

بہرحال مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کو شروع شروع دیکھ کر اور سن کر یہی تاثر تھا جو میرے دل و دماغ میں ان کی عقیدت و گرویدگی کا نقش بنا۔ اُس وقت یہ گمان بھی نہ تھا کہ عنقریب ہی ان کے ساتھ اتنا قریبی تعلق ہو جائے گا کہ ان کے جیتے جی سترہ برس مسلسل رات و دن، سفر میں اور حضر میں سایہ کی طرح ساتھ رہنے اور دست و بازو بن کر ان کی شفقت و رہنمائی میں کام کرنے کی سعادت میسر آئے گی۔

ادھر آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شریک تمام قوم پرور مسلم نمائندوں نے یہ طے کیا کہ آنے والے انتخابات میں ایک مشترکہ "مسلم پارلیمنٹری بورڈ" کی قیادت میں صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کی ہر ہر سیٹ پہ مسلم لیگ کے خلاف قوم پرور مسلم نمائندے الیکشن لڑیں، تاکہ دستوری لحاظ سے ان کی رائے کا وزن ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں اثر انداز ہوسکے۔ جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی دفتر میں مسلم پارلیمنٹری بورڈ کا دفتر قائم ہوگیا۔ مرحوم و مغفور مولانا بشیر احمد صاحب بھٹہ اس کے کنوینر تھے مولانا عبداللہ مصری کا قیام ان دنوں جمعیۃ کے دفتر ہی میں تھا اور مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے پبلسٹی سیکشن کی کچھ ذمہ داری ان کے سپرد تھی۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۴۵ء میں مولانا مصری ہی داعی ہوئے اور مجھے ان کے ساتھ بورڈ کے پبلسٹی ورک میں شریک ہو جانے کا موقع ملا۔ اسی زمانہ کے مطبوعہ رسائل و لٹریچر سے الجمعیۃ بک ڈپو کی بنیاد پڑی جس کے نگراں حضرت مولانا محمد میاں صاحب تھے۔ آہستہ آہستہ انتخابات کی وقتی مہم سمٹتی گئی۔ لیکن دوسری طرف مرکزی جمعیۃ کے کام کا پھیلاؤ بڑھنے لگا جمعیۃ اس وقت تمام قوم پرور مسلم جماعتوں کا محور و مرکز بن چکی تھی۔ ادھر تحریک آزادی ہند اور ملک کے مستقبل کے فیصلے تدبیروں اور گفتگوؤں کی آخری منزل میں تھے۔ گاندھی جناح اور لیگ کانگریس گفتگوئیں، لارنس مشن۔ کرپس مشن، لارڈ ویول مشن کے سین یکے بعد دیگرے تیزی سے گزر رہے تھے۔ ان تمام مراحل میں قوم پرور مسلمانوں کی نمائندگی جمعیۃ ہی کے ذریعہ انجام پا رہی تھی۔ تاریخ کا مصروف ترین اور فیصلہ کن دور تھا اور اس میں جمعیۃ کا سیاسی کردار ایک اہم پارٹ ادا کر رہا تھا۔ جمعیۃ کا مرکزی دفتر جس کے سرپرست اعلیٰ حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مدار المہام مولانا سید محمد میاں صاحب تھے شبانہ روز سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس سے پہلے دفتر کی سرگرمیاں مقابلتاً محدود تھیں۔ لیکن اب بڑھتے ہوئے کاموں کے ساتھ ساتھ مزید کارکنوں کی بھی ضرورت سامنے آئی۔ چنانچہ مولانا سید محمد میاں صاحب نے پارلیمنٹری بورڈ کا کام سمٹنے کے ساتھ ہی مجھے مرکزی جمعیۃ کا پبلسٹی سیکشن سپرد کر دیا اور اس طرح میرا تعلق براہ راست مرکزی دفتر سے ہوگیا۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا قیام ان دنوں قرول باغ میں تھا۔ دن ندوۃ المصنفین کے سلسلۂ تصنیف و تالیف میں گزار کر روزانہ عصر کے بعد دفتر جمعیۃ میں تشریف لایا کرتے تھے اور دیر گئے رات تک رہ کر دن بھر کی ڈاک دیکھتے اور اہم معاملات و مشاغل کی تکمیل فرمایا کرتے تھے۔ کاموں کا سلسلہ دن بدن تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا ایک عظیم سیاسی انقلاب ملک کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔ جمعیۃ علماء ہند کی نظامت عمومی جیسی اہم ذمہ داری کو سنبھالے ہوئے مجاہد ملتؒ کی شخصیت، ان حالات میں تیزی کے ساتھ ابھرتی جارہی تھی۔ خط و کتابت اور دوسرے مشاغل کا سلسلہ بھی تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا یہاں تک کہ بہت ہی جلد مولانا موصوف کو ایک معاون کار کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ اور بالآخر اگست ۱۹۴۶ء سے انھوں نے اپنی خط و کتابت اور دوسرے دفتری مشاغل میں ہاتھ بٹانے کے لئے میرا کچھ وقت حضرت مولانا محمد میاں صاحب سے کہہ کر اپنے لئے حاصل کر لیا۔ اس وقت سے دستور یہ رہا کہ دن بھر کی ڈاک روزانہ شام کو میں حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کرتا۔ اہم خطوط کے جواب وہ خود تحریر فرمایا کرتے یا مجھے املا کرادیا کرتے۔ باقی خطوط کے لئے زبانی ہدایات دیدیتے کہ یہ جواب لکھ دینا۔ پھر خود جوابات کو دیکھ کر دستخط فرمایا کرتے اور ڈاک روانہ کر دی جاتی۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً بیانات و پیغامات کی مسودہ ترتیب، اسفار اور پروگراموں کی تنظیم بھی میرے سپرد رہتی۔ چند ہی روز کے تجربہ کے بعد حضرت مولانا کو میری کارگزاری پہ اتنا اعتماد اور اطمینان ہوگیا کہ انھوں نے اپنی انتہائی عدیم الفرصتی اور آئے دن کے اسفار کے باعث اپنی ڈاک کی پوری ذمہ داری مجھے تفویض فرمادی۔ آنے والے برسوں میں مسلسل ان کی مصروفیتوں کا جو حال رہا اس میں بہت ہی کم اس کا موقع ملتا تھا کہ وہ کسی دن کی پوری ڈاک یہاں تک کہ گھریلو اور ذاتی خطوط بھی لفظ بلفظ خود پڑھ لیتے یا سن لیتے۔ ورنہ عام طور پہ صبح، دوپہر، شام کی کسی بھی فرصت میں وہ بیٹھ جاتے۔ خطوط کا ماحصل سن کر جواب نوٹ کرا دیتے۔ مجھے بھی شب و روز ساتھ رہنے اور مستقل طور پہ اس خدمت کو انجام دیتے ہوئے ان کے مزاج، ان کے انداز فکر اور انداز تحریر کا اتنا تجربہ ہوگیا تھا کہ ان کے چند اشارے تفصیل و تعبیر سے بے نیاز کر دیتے تھے۔ خود مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اتنا اطمینان تھا کہ پھر میرے لکھے ہوئے کسی جواب کو انھوں نے کبھی خود پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں خطوط لکھ کر سامنے رکھ دیتا اور وہ قلم برداشتہ دستخط کرتے چلے جاتے۔

مولاناؒ کے دوسرے اہم کاموں، مثلاً ان کے اسفار اور پروگراموں کی ترتیب متعلقہ مقامات کو ان کی اطلاع۔ ان کے مشاغل کی تعیین اوقات اور یادداشت دہلی میں رہتے ہوئے ان کے مختلف اپوائنٹ منٹس کا اہتمام وغیرہ وغیرہ ان تمام امور کے ساتھ ساتھ ان کی مراسلت کا سلسلہ مستقل طور پر میرے سپرد تھا اور بحمد اللہ میں نے ۴۶ء سے مسلسل یہ خدمت انجام دی۔ میری نو عمری اور ناتجربہ کاری یقیناً اس کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی کہ ایک ملک گیر حیثیت رکھنے والی ذمہ دار شخصیت، صفِ اول کے سیاسی رہنما، بلند پایہ عالم دین اور ساتھ ہی صاحب فکر و قلم فاضل ادیب و مصنف کی اہم سے اہم خط و کتابت، احتیاط اور ذمہ داری کی جو نزاکتیں اپنے ساتھ لئے ہوتی ہے، اس اہم ذمہ داری کو سنبھالتا اور نباہ سکتا۔ پھر بھی اگر میں نے اس خدمت کو سنبھالا اور بارہ تیرہ سال مسلسل اس طور پر انجام دیا کہ اس پورے عرصہ میں مولانا مرحوم کے اعتماد و اطمینان کو کبھی شکایت اور ناامیدی کا موقع نہیں مل سکا تو یہ بھی حقیقتاً خود حضرت مولانا کی ہی کرامت تھی۔

بہر حال ۴۶ء سے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو وابستگی مجھے حاصل ہوئی، مولاناؒ کی زندگی بھر نہ صرف قائم رہی بلکہ ان کے بے اندازہ اعتماد، محبت اور شفقت نے اس وابستگی کو دفتری اور رسمی حدود سے کہیں بڑھ کر ایک ایسے گہرے تعلق میں تبدیل کر دیا تھا جو کسی ایک گھر اور خاندان کے روابط اور قرابت داری میں بھی ہر جگہ نظر نہیں آتا۔ مجھے جب کبھی انھوں نے کہیں سے کوئی تحریر بھیجی تو "برادر عزیز" کے شفقت بھرے خطاب ہی سے شروع کی پھر برس ہا برس مسلسل شب و روز ان کے ساتھ گزارنے، ان کے کاموں میں شریک رہنے اور نہ صرف دہلی کے قیام میں بلکہ دہلی سے باہر ملک کے کونے کونے تک ان کے اسفار اور دوروں۔ بری، بحری اور ہوائی سفروں میں ساتھ رہنے کی جو سعادت میسر آئی، اس کی بدولت جہاں اور بہت کچھ دیکھنے، سیکھنے، سمجھنے کا موقع ملا وہاں سب سے زیادہ خود حضرت مولانا کی شخصیت، ان کے افکار و عزائم، ان کے اعمال جلیلہ اور مقاصد عالیہ کو دیکھنے اور سمجھنے کی بھی وہ سعادت حصہ میں آئی جو میرے لئے زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ اور سامانِ صد بصیرت و موعظت ہے۔

آج جب کہ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ رفیق اعلیٰ کے حضور میں پہنچ چکے ہیں اس پوری مدت میں ان کے ساتھ گذاری ہوئی زندگی نگاہوں میں سمائے ہوئے قلم برداشتہ قلب و ذہن کے کچھ نقوش "مجاہد ملت نمبر" کے سپرد کر رہا ہوں۔ اگرچہ یہ بھی ان کے احسان و کرم، شفقت و نوازش اور محبت بھرے سلوک کا بس ایک دھندلا سا نشان ہے یا ایک بے مایہ اعتراف اور بس۔

دل کا تقاضہ تو یہی تھا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی اور سوانح حیات پر از اول تا آخر اپنے علم و مشاہدہ کے مطابق ایک مفصل مضمون لکھوں۔ لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ کام شروع کرتا، کچھ دوسرے حضرات اور بالخصوص مخدوم حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کے ارادوں سے واقفیت ہوگئی۔ یقیناً یہ حق مجھ سے کہیں زیادہ مولاناؒ کے ان پرانے رفقاء کار کو پہنچتا ہے کہ ان کی زندگی اور کارہائے نمایاں پر، ان کے اوصاف و کمالات کے ہر ہر پہلو پر قلم اٹھائیں اور حضرت مولانا کا ایک مبسوط و یادگار تذکرہ آنے والی نسلوں کے لئے باقی چھوڑ جائیں۔

چنانچہ اسی نمبر میں حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کا جو جامع مقالہ آپ کے پیش نظر ہے اور ساتھ ہی مولانا مقبول سیوہاروی صاحب اور حضرت مجاہد ملتؒ کی تصنیفی زندگی اور اس کے ثمرات طیبہ پر مولانا قاضی زین العابدین صاحب کے مقالات حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات کے دور اول پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ لیکن حضرت مولانا کی زندگی کا دوسرا زرین دور جو تقریباً آزادئ ہند سے شروع ہوتا ہے اور جو شاید مشیت الٰہی میں بھی ان کی تخلیق کا اہم مقصد تھا اس پر بہت کچھ لکھا جانے کے باوجود یقیناً اس کا مستحق ہے کہ اس پر زیادہ سے زیادہ کام کیا جائے اور بکھرے ہوئے نقوش کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سمیٹا جائے

اسی خیال سے آنے والے صفحات میں حضرت مولاناؒ کی سوانح حیات اور شخصیت و کردار کا مختصر خاکہ پیش کیا جا رہا ہے اور اس کے بعد ان کے افکار و اعمال جلیلہ خاص طور پر ۴۷ء میں اور اس کے بعد ان کی عظیم الشان خدمات پر اختصار و احتیاط کے ساتھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شخصیت اور کردار

شکل و شباہت

ایک سیدھے سادے انسان کا تصور کیجئے۔ گندمی رنگ۔ اوسط درجہ کا بدن نکلتا ہوا قد، کتابی چہرہ جس پر سادگی بھی برستی ہو۔ اور علم و فضل کا وقار بھی، فکر و تدبر سے معمور کشادہ پیشانی۔ آنکھوں میں ایک حسین چمک، بھاری بھاری فلسفیانہ بھویں (جنھیں دیکھ کر ایک دوست جارج برنارڈ شاکی بھوؤں سے تشبیہ دیا کرتے تھے) چہرہ پر گھنی داڑھی۔ آواز میں گرج اور گفتار میں بے ساختگی بس یہی حلیہ تھا مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا

وضع قطع

وضع قطع میں سادگی بھی تھی اور استقامت بھی۔ لباس ہمیشہ سادہ سفید کھدر کا کرتہ۔ اسی کا کسی قدر تنگ مہری کا پاجامہ۔ کھدر کی ہی شیروانی سردیوں میں عموماً کسی عمدہ کھال کی اور گرمیوں میں سادہ سفید کھدر کی اونچی باڑ کی ٹوپی جس کا تراش ان کا خود ایجاد مخصوص تراش تھا۔ جوتا ہمیشہ عمدہ پہننے کے شوقین تھے۔ کبھی کھلا ہوا (نیوکٹ) پمپ اور کبھی جے پوری۔

افتادِ طبع

خوراک بہت معمولی اور سادہ ہوتی تھی۔ اور مقدار میں بھی بہت کم۔ سادہ تنوری روٹی ہو اور معمولی دال، سبزی یا گوشت کی ترکاری، یہی ان کی پسندیدہ غذا تھی۔ وقت پر جو کچھ بھی میسر آجائے چند منٹ میں دس پانچ نقمے لئے اور بس فارغ ہو گئے کھانے پینے کے ذوق اور لذتوں کے اہتمام سے وہ تقریباً ناآشنا ہی رہے۔ احباب و مخلصین بڑے ارمانوں سے دعوت کرتے۔ مگر ان کی دعوت کرنے والے ہمیشہ مایوس ہی رہتے۔ دسترخوان پر کتنی ہی مرغن اور مکلف غذائیں سجاتے۔ مگر مولانا کا ہاتھ جب اٹھتا تو کسی معمولی کھانے کی طرف اور اتنی جلدی فارغ ہو جاتے کہ ساتھ کھانے والوں کے لئے بھی بڑی دشواری ہوتی اچار اور ترشی انھیں بہت مرغوب تھی۔ اپنی تندرستی سے بے فکر اور اصولِ صحت سے بے نیاز، کھانسی و نزلہ کی حالت میں بھی اپنی مرغوب کھٹائی اور ترشی کے استعمال سے کبھی باز نہیں رہتے تھے۔ سردیوں میں رس کی کھیر (رساول) کے بہت شوقین تھے۔ پھلوں میں ان کو خربوزہ کا بے حد شوق تھا۔ صبح شام چائے کے پابند تھے وہ بھی بہت ہلکی جس میں دودھ بھی کم ہوتا اور مٹھاس بھی برائے نام۔ گرمیوں میں تیز برف کا پانی انھیں پسند تھا۔ پھلوں میں آم سے بھی کافی رغبت رکھتے تھے۔ کئی برس سے احباب کے اصرار پر یہ معمول ہو گیا تھا کہ آموں کے موسم میں اپنے رفقاء سمیت کاندھلہ جاتے تھے اور وہاں بڑی پر رونق محفل رہتی تھی۔ ادھر نئی دہلی میں ہر سال انڈیا گیٹ کے قریب آموں کی ایک محفل جما کرتی تھی جس میں چالیس پچاس بے تکلف احباب کا اجتماع ہوا کرتا تھا۔ اس کے اہتمام میں مولانا فقیہہ الدین، حاجی محمد صالح، سلطان یار خاں صاحب وکیل اور ہم رفقاء دفتر شریک رہتے تھے۔

لباس اور خوراک کی طرح اپنے رہن سہن میں بھی بے حد سادگی پسند۔ اور تکلفات سے بہت دور تھے۔ دفتر جمعیۃ میں ہمیشہ فرش پر بچھی ہوئی چاندنی یا چٹائی ہی ان کی مسند تھی۔ یا رات میں ایک کھرا پلنگ اور ایک تکیہ۔ سونے میں تنہائی پسند تھے یہاں تک کہ ریل کے سفر میں بھی ہمیشہ ان کی فرمائش یہ ہوتی کہ 'کوپے' میں (یعنی فرسٹ کلاس کا وہ کمپارٹمنٹ جس میں صرف دو برتھ ہوتی ہیں) سیٹ حاصل کی جائے۔ کار میں ہمیشہ اگلی سیٹ پر بیٹھتے۔

غرضکہ سادگی ان کے مزاج کا وہ عنصر تھی جو ان کے لباس، خوراک، وضع قطع، رہن سہن اور زندگی کے تمام ہی پہلوؤں پر چھائی ہوئی تھی۔ مزاج کی دوسری خصوصیت تیز رفتاری تھی۔ یہ وصف بھی ان کے ہر کام میں نمایاں نظر آتا۔ بولتے بھی تیز، چلتے بھی تیز۔ کتنی اہم سے اہم سوال ہو یا کوئی پیچیدہ مسئلہ۔ انھیں نہ فیصلہ کرتے دیر لگتی نہ جواب دیتے۔ مخاطب کے منشا کو سمجھنے اور اس کے رجحان کا اندازہ لگانے میں بھی سبقت لے جاتے تھے۔ رفتار کی تیزی ان کے ہر عمل میں نمایاں رہتی۔ یہاں تک کہ نماز پڑھنے اور قرآن حکیم کی تلاوت میں بھی۔ لکھنے پڑھنے اور تقریر و خطابات میں بھی ان کی رفتار ہمیشہ تیز رہی۔

خدمات کا جذبہ اور کاموں کی دھن

کام کی لگن اور دھن مولانا مرحوم کو حد سے زیادہ تھی۔ سکون اور فرصت سے نہ ان کی زندگی کبھی آشنا ہوئی نہ انھیں کبھی اس کی جستجو ہوئی۔ کاموں کے ہجوم میں گھرا رہنا ہی انھیں راس آتا تھا اور خود بھی وہ کبھی چین سے بیٹھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ جس وقت سے انھوں نے اپنے ہوش و حواس کی زندگی میں قدم رکھا تھا۔ آخر تک تقریباً پینتالیس برس وہ مسلسل تگ و دو انہماک و عمل، بے شمار تحریکوں اور خدمت گزاریوں میں اس طرح مصروف رہے کہ آج بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا مرحوم نے اپنی عمر کی تھوڑی مہلت میں جو کام انجام دے لئے۔ دوسرے انسانوں کے لئے وہ کئی عمروں اور صدیوں کے کام تھے۔

ان کی مصروفیتوں اور ہجوم مشاغل کا صحیح اندازہ تو درحقیقت وہی کر سکتے ہیں جنھیں زندگی میں ان سے قریب رہنے کا موقع ملا ہے۔ کوئی تذکرہ نگار لکھنا چاہے بھی تو ان کی مصروف ترین زندگی اور بھرپور سرگرمیوں کو آخر کہاں تک لکھ سکتا ہے۔ ان کی لگن اور دھن کا حال ہی کچھ عجیب تھا۔ دفتر جمعیۃ کے اندرونی کمرے میں بیٹھے

ہیں۔ ذمہ دار شخصیتوں سے گفتگو ہو رہی ہے اور وہیں سے باہر اپنے کاموں میں لگے ہوئے کارکنوں کو چھوٹے سے چھوٹے معاملات میں ہدایت دیتے جا رہے ہیں۔ دفتر میں کوئی ملکی یا غیر ملکی مہمان آنے والا ہے تو مدارات اور تواضع کے ہر اہتمام میں خود شریک ہیں۔ مہمان کو پانچ بجے آنا ہے۔ قاضی اکرام الحق صاحب اپنے کمرے میں پڑے بے خبر سو رہے ہیں۔ ۴ بجتے ہی مولانا خود جا کر قاضی جی کو جگا رہے ہیں کہ آپ ابھی تک سو رہے ہیں نہ پھل فروٹ آئے، نہ چار پانی کا انتظام ہوا۔ قاضی جی نے ایک کروٹ لی اور پھر...... حضرت ابھی تو چار ہی بجے ہیں۔ ابھی جاتا ہوں۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کیجئے اور مولانا مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔

جمعیۃ کا کوئی سالانہ اجلاس ہو یا کوئی مقامی کانفرنس، مختلف ذمہ داریاں مختلف کارکنوں کے سپرد ہیں اور وہ انجام بھی دے رہے ہیں۔ مگر مولانا کی فکر مندیوں کا یہ حال ہے کہ گویا سب کچھ انھیں کی ذمہ داری ہے کبھی مہمانوں کی قیام گاہیں دیکھ رہے ہیں ابھی اسٹیج اور پنڈال کی بناوٹ کو جانچ رہے ہیں، روشنی اور پانی کے انتظامات کرا رہے ہیں یا کھانے اور ناشتہ کی تفصیلات کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے ہیں اور پھر تھوڑی ہی دیر میں اجلاس کے زیر غور مسائل، تجاویز اور تقریروں کے پروگرام مرتب کرا رہے ہیں کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے مولانا کسی سفر پر جانے والے ہیں۔ چند دوسرے رفقا بھی ساتھ ہوں گے۔ سب کی سیٹوں کا انتظام۔ پھر راستہ میں کھانے وغیرہ کا بندوبست۔ گزرتے ہوئے اسٹیشنوں پر چائے، ناشتہ کی جستجو، ہر چیز کا فکر مولانا کو ہے اور اس کی تکمیل کے لئے وہی سب سے آگے آگے دوڑ رہے ہیں۔

جمعیۃ کے تو وہ ناظم عمومی تھے ہی مگر افتادِ طبع اور ذوقِ عمل نے انھیں پورے قافلۂ امت کا منتظم عمومی بنا دیا تھا اور سچ یہ ہے کہ ان ہی کی تنہا ذات تھی جو گزشتہ پندرہ برس میں تو گویا تمام ہی قومی اور ملی سرگرمیوں کا محور بن کر رہ گئی تھی۔ پھر خوبی یہ کہ اپنی تمام تر ذمہ داریوں اور بے اندازہ مصروفیتوں پر بھی وہ کبھی شکوہ مند نہیں ہوئے۔ بلکہ حوصلہ مند طبیعت ھل من مزید کی متقاضی اور آمادہ کار ہی رہتی تھی۔ دہلی میں ہوں یا کہیں باہر سفر میں، چھوٹے سے چھوٹے ذاتی کاموں، اپنی پریشانیوں، سفارشوں اور مشوروں کے لئے عوام و خواص کی ایک بھیڑ ہر وقت ان کے ارد گرد رہتی تھی۔ اور مولانا ہر ایک کا معاملہ خود سنتے اور معاملہ کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے بات کر کے جواب بھی دیتے اور جد و جہد بھی فرماتے۔ اس طرح ان کے قیمتی اوقات کا کافی حصہ چھوٹے چھوٹے شخصی اور جزوی معاملات پر صرف ہو جاتا۔ اور یہ معمول ہی بن گیا تھا، یہاں تک کہ ان سے قریب رہنے والے ہم جیسے خدام بھی بعض اوقات یہ محسوس کرتے اور مولانا سے کہتے بھی رہتے کہ آپ کا قیمتی وقت زیادہ اہم اور وسیع کاموں پر صرف ہونا چاہئے۔ چھوٹے چھوٹے گھریلو جھگڑوں اور معاملوں کو تو آپ اپنے دوسرے خدام پر چھوڑ دیں۔ لیکن وہ اپنی طبیعت سے مجبور تھے اور کبھی بھی نہ اپنے اوقات کے تحفظ کے لئے آمادہ ہو سکے نہ اپنی ملاقاتوں میں انھوں نے کبھی ریزرو ہونا گوارا کیا۔ دفتر جمعیۃ میں بیٹھتے تب اور سفر میں کہیں جاتے تب، ہمیشہ کھلے بندوں عوام سے قریب رہتے کہ ہر صاحب معاملہ بآسانی اور براہ راست ان تک پہنچ سکے۔ زندگی کے آخری تیرہ برس وہ مسلسل دستور ساز اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبر رہے۔ پارلیمنٹ کے ممبروں کو نئی دہلی میں پارلیمنٹ ہاؤس کے قریب ہی کم خرچ پر سرکاری بنگلے رہائش کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ جہاں کافی سکون اور آرام کی رہائش میسر آتی ہے۔ مولانا سے بھی بارہا کہا گیا۔ لیکن انھوں نے کبھی بھی پرانے شہر کی گلی قاسم جان کو چھوڑ کر نئی دہلی میں رہنا پسند نہیں کیا اور ہر بار یہی جواب دیا کہ یہاں تو ہر ضرورت مند دن رات کے کسی بھی حصہ میں وقت بے وقت مجھ تک پہنچ جاتا ہے۔ میں نئی دہلی میں رہنے لگوں تو ان غریبوں کو وہاں تک پہنچنا دشوار ہو جائے گا، میں یہ گوارا نہیں کر سکتا۔ یہ حال تھا ان کے جذبۂ خدمت اور کاموں کی دُھن کا!

زندگی کے آخری سال جنوری ۱۹۶۲ء میں جب کہ ان کی صحت کافی گر چکی تھی اور مرض اندر ہی اندر پل رہا تھا، سخت سردی کے دنوں میں، انتہائی نزلہ، کھانسی بخار اور بلڈ پریشر کی حالت میں انھوں نے کان پور اور امروہہ میں جمعیۃ کی کانفرنسوں میں شرکت فرمائی۔ اور اسی حال میں اپنے حلقۂ انتخاب کے دیہات و قصبات کا دورہ کیا اور اسی حالت میں پندرہ دن کے شبانہ روز سفر کے بعد ۲۲ جنوری ۱۹۶۲ء کو شام کے آٹھ بجے مراد آباد سے دہلی واپس پہنچے۔ اگلے روز بمبئی میں سنٹرل حج کمیٹی کی میٹنگ تھی اور رات ہی کے ہوائی جہاز سے مولانا بمبئی جانے والے تھے ۱۰۔½ بجے مولانا کو ہوائی اڈہ پہنچنا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے مولانا گھر پہنچے، عشا کی نماز پڑھی اور بمبئی کے لئے سامان سفر تیار کرایا۔ ادھر میں ملنے کے خیال سے پہنچ گیا۔ قاضی اکرام الحق صاحب بھی دروازہ پر موجود تھے۔ ۹ بجے مولانا باہر آئے تو یہ حالت تھی کہ ۱۰۲ ڈگری بخار تھا۔ کھانسی دم نہیں لینے دیتی تھی۔ پھیپھڑوں میں پانی بھرا ہوا تھا اور سانس بھی بہت تکلیف کے ساتھ چل رہا تھا۔ اپنی گرم چادر گلے میں لپیٹے ہوئے نہایت مضمحل اور نڈھال چہرہ پیلا اور ناتوانی سے بے حال۔ مگر اس حال میں بھی دن بھر کے سفر کے بعد اب رات بھر ہوائی جہاز کے سفر کے لئے آمادہ و عازم۔ یہ حال دیکھ کر میں نے اور قاضی اکرام صاحب نے باصرار گزارش کیا کہ اس وقت سفر کا ارادہ ملتوی کر دیجئے۔ مولانا نے سختی سے انکار کیا اور سامان کار پر رکھنے کے لئے شفیق کو بھیج ہی دیا۔ سامان کار پر جا رہا تھا اور ہم لوگ مولانا کو گھیرے کھڑے تھے۔ ادھر سے محمد احمد صاحب وکیل بھی آ گئے۔ حالت دیکھ کر حیران۔ انھوں نے بھی سفر ملتوی کرنے پر بہت زور دیا۔ سامان

کا پروگرام رکھا جا چکا تھا مولانا فرما رہے تھے "حجاج کے بعض اہم معاملات درپیش ہیں۔ ضروری میٹنگ ہے، وہاں سب کو انتظار ہوگا بمبئی سے واپس آکر دو چار روز آرام کروں گا اس وقت تو مجھے جانا ہی ہے"۔ لیکن جب ہمارے اصرار نے انھیں بالکل مجبور ہی کر دیا تو بادل ناخواستہ سفر کا ارادہ ملتوی کیا اور گھر واپس ہوئے۔ اگلے روز ہم سب مولانا کو ان کے معالج ڈاکٹر پانڈے کے پاس لے گئے اور مرض کی گہرائی کا اندازہ ہوا۔ اور اسی وقت سے، زندگی بھر کی تھکن اپنے ساتھ لے کر مولانا بستر علالت پر گرے اور اسی علالت میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس دن کے بعد دفتر جمعیۃ میں جو عمر بھر ان کی سرگرمیوں کا مرکز رہا مولانا کو آنا نصیب ہی نہ ہوا۔

خلوص و ایثار

کی اس مجاہدانہ زندگی کا اندازہ کیجئے اور پھر سا تھ ہی یہ دیکھئے کہ اس تمام بھاگ دوڑ، مسلسل خدمت و عمل، رات دن کی سرگرمیوں اور انتھک محنتوں سے مولانا نے خود اپنے لئے کیا حاصل کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کے خطیب تھے، صاحب فکر و قلم، بلند پایہ مصنف تھے۔ ملک گیر شہرت و مقبولیت کا اعلیٰ مقام حاصل تھا، حکومت و اقتدار کے دائروں میں اونچی سے اونچی شخصیتوں سے ان کے برابر کے تعلقات تھے۔ اگر کسی درجہ میں بھی انھیں اپنا اور اپنی راحت و منفعت کا خیال ہوتا تو وہ اپنے لئے کیا کچھ نہ حاصل کر سکتے تھے۔

لیکن انھوں نے اپنے لئے جو زندگی اختیار کی وہ غریبی اور بے سروسامانی کی زندگی تھی۔ زندگی بھر کرایہ کے مکان میں رہے اپنے بیٹے اور بیٹیوں کا مستقبل بنانے کے لئے بھی وہ اپنے وسائل کبھی کام میں نہ لا سکے۔ نہ ان کے لئے اپنے بعد کوئی اثاثہ چھوڑ کر گئے۔ اپنی بھرپور صلاحیتوں اور زندگی بھر کی محنتوں اور کاوشوں کا پورا سرمایہ انھوں نے صرف کیا تو صرف ملک و وطن کی خدمت، اور قوم و ملت کی خوش حالی اور سربلندی کے لئے۔ پارلیمنٹ کے ممبر ضرور رہے، مگر سچ یہ ہے کہ ان کی رکنیت پارلیمنٹ بھی سراسر دوسروں ہی کے کام آئی۔

قومی اور وطنی خدمت کی سعادتیں دوسروں کو بھی میسر آئی ہیں۔ مگر بے غرضی اور خلوص و ایثار کا یہ مقام صرف مولانا ہی کو نصیب ہوا کہ وہ ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچے اور کوئی نہیں کہا جا سکتا جو عوام سے اتنا قریب رہا ہو۔ لیکن اکثر رات دن کے جماعتی رفقاء کار کو بھی آج تک یہ معلوم نہیں کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی اولاد بھی ہے۔ بحمد اللہ ان کا بیٹا بھی ہے اور بیٹیاں بھی۔ ان کے ہمہ گیر تعارف اور بے پناہ اثر و رسوخ کی فیض رسانیوں میں جس کا کوئی حصہ نہ تھا وہ صرف ان کی اپنی ذات تھی اور اپنی اولاد۔ اپنے اسفار یا اپنی مجلسی اور جماعتی سرگرمیوں میں انھوں نے اپنے بیٹے تک کو ساتھ رکھنا اور متعارف کرانا کبھی گوارا نہیں کیا۔

کئی بار ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ ایسے بلند پایہ اور صاحب بصیرت عالم اور ایسے اکابر کے صحبت یافتہ ہوتے ہوئے یہ کیوں نہیں ہوا کہ مولانا کم از کم بڑھاپے کی اس زندگی میں تو رات دن کی بھاگ دوڑ اور مشاغل کے ہجوم و ہنگامہ سے کنارہ کش ہو کر تسبیح و مصلیٰ سنبھال کر کسی گوشہ میں بیٹھ گئے ہوتے۔ آخر اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا وہ بھی ایک راستہ ہے۔ پھر زیادہ سوچا تو اس کی توجیہہ خود ہی ذہن میں آنے لگی کہ مولانا خلوص و ایثار کی جن بلندیوں پر فائز تھے وہاں عزلت نشینی کا ایسا تصور بھی عملاً دشوار ہی تھا کہ آخر "فکر خویش" کا جو داعیہ اس کا محرک ہوتا ہے۔ مولانا کے خلوص کا لبریز پیمانہ اس کی آمیزش بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

استغناء و بے غرضی

طبیعت کے استغنا کا یہ حال تھا کہ زندگی کے اس دور میں تو بڑے بڑے دولتمند، تاجر، نواب اور اصحاب اغنیاء ان کے احترام میں دوزانو رہتے تھے۔ اپنے ہاں دعوتوں پر بلاتے۔ بڑے بڑے قیمتی ہدیے پیش کرنا چاہتے۔ مگر مولانا کی بے نیازی اور بے رخی نے کبھی کسی کو موقع ہی نہ دیا۔ جمعیۃ علماء کی انھوں نے عمر بھر خدمت ہی نہیں کی بلکہ چار چاند لگا دیئے۔ اٹھارہ برس اس کے سربراہ رہے اور اپنی بھرپور صلاحیتیں اس کی آبیاری پر صرف کیں۔ لیکن کبھی کسی قسم کا کوئی معاوضہ، کوئی الاؤنس، آنریریم یا کسی طرح کی کوئی منفعت اس سے حاصل نہیں کی۔ اپنی کتابوں کی آمدنی ہی ان کا کسب و معاش تھا۔

کانگریس کے حلقوں میں بھی ان کا جو مقام تھا وہ ظاہر ہے۔ کانگریس ٹکٹ پر انھوں نے تین بار پارلیمنٹ کے الیکشن لڑے (۱۹۵۲ء میں حلقہ بلاری اور ۱۹۵۷ء ۱۹۶۲ء میں حلقہ امروہہ ضلع مرادآباد سے) مگر پیش کش اور اصرار کے باوجود انھوں نے کبھی کانگریس کے انتخابی فنڈ سے کوئی امداد قبول کرنا گوارا نہیں کیا۔

ہمدردیٔ خلائق

مخلوق خدا کی ہمدردی ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ بلا استثناء و بلا امتیاز ہر کس و ناکس، اپنے اور بیگانے، مسلم اور غیر مسلم سب کی خدمت ان کا عزیز ترین شغل تھا اور دن رات کا بیشتر حصہ اسی میں گذرتا تھا۔ کوئی سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت کا خواہاں ہے، کوئی وظیفہ اور امداد کے لئے سرگرداں۔ کسی کو کالج کے داخلہ میں دشواری پیش آ رہی ہے تو کوئی امتحان میں دو چار نمبروں سے رہ گیا ہے۔ کوئی اپنے پرمٹ کی میعاد میں توسیع چاہتا ہے۔ کوئی اپنی مقدمہ بازی کے لئے وکیل سے فیس میں رعایت کے لئے کوشاں ہے کسی کو مکان یا دکان کی ضرورت ہے تو کوئی بجلی اور پاور کا کنکشن لینا چاہتا ہے۔ کسی کی فصل اور کھیتی خراب ہو گئی ہے اور پورا لگان دینے کے قابل نہیں ہے۔ تو کسی کی بیٹی جوان بیٹھی ہوئی ہے اور کوئی مناسب رشتہ نہیں آ رہا ہے۔ غرضیکہ

صبح سے شام تک انسانی زندگی کے صدہا کام تھے جن کے لئے لوگ بے تکلف مولانا ہی کی مدد، مشورہ اور سفارش کا سہارا لیتے تھے اور مولانا مرحوم ہر ضرورت مند کے لئے وہ سب کچھ کرتے جو ان کے امکان میں ہوتا۔ کسی سرکاری افسر کو ٹیلی فون کر رہے ہیں کسی کو سفارشی خط لکھ کر دے رہے ہیں کسی کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کا کام کرا رہے ہیں اور کسی کے لئے واسطہ در واسطہ سفارشیں کرا رہے ہیں۔ خاص طور پر تقسیم ہند کے بعد تو سرکاری حلقوں میں ان کی قدر و منزلت اور ایک عوامی رہنما ہونے کے لحاظ سے یا پارلیمنٹ کے رکن کی حیثیت سے ان کے اثر و رسوخ پر لوگوں نے گویا حملہ شروع کر دیا تھا۔ مولانا کی طبعی شرافت اور ہمدردیوں کا دامن بھی اس قدر وسیع تھا کہ جس نے بھی ان کے سایہ میں سر چھپانا چاہا انھیں نہ راستہ چلتے کسی ضرورت مند کی مدد سے گریز تھا نہ آدھی رات گئے کسی کے آنے پر کوئی ناگواری۔ بعض اوقات تو بڑی بڑی اونچی شخصیتیں بھی اپنے کاموں کے لئے ان ہی کی مدد اور سفارش ڈھونڈتی تھیں۔ آج کون اندازہ کر سکتا ہے کہ کتنے ہزار خاندان ہیں جن کی معاش اور پرورش میں بڑا دخل مولانا ہی کی کوششوں کو تھا اور کتنے گھر ہیں جن میں آج چراغ بھی جل رہا ہے تو اس کی بتی مولانا ہی کے ہاتھوں نے بٹی ہے۔

قلب کی وسعت اور عالی ظرفی

یوں ان کے پایہ کے انسان ہزاروں نہیں، لاکھوں میں بھی شاید دو چار ہی مل سکیں۔ یوں تو ہر وقت ہی ان کے وسعت قلبی کے مشاہدات آنکھوں سے گزرتے رہتے تھے اور ہم خدام کار کے ساتھ تو ان کا سلوک، مہر و شفقت کا تو ذکر ہی کیا کہ ان کے جیتے جی افسر و ماتحت کا کوئی امتیاز کبھی درمیان میں حائل ہی نہیں ہوا۔ لیکن اس کا خاص منظر اس وقت سامنے آتا تھا جب وہی لوگ جنھوں نے مولانا کی دلآزاری اور بے وجہ مخالفت و ایذا رسانی میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ ہر طرح سے مجبور ہو کر اپنی کسی ضرورت کے لئے ندامت اور شرمساری کے ساتھ ان تک پہنچتے اور مولانا اپنی شفقت اور محبت سے اس طرح ان پر چھا جاتے اور ان کی مدد کرتے کہ ان کی ندامت اور شرمساری کا بوجھ بھی سر سے اتر جاتا۔ انتقام اور عداوت کے تو گویا نام سے بھی وہ ناآشنا تھے۔ ان کی زندگی کے دیکھنے والے اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ عمر عزیز کے کسی ایک لمحہ میں بھی مولانا کی زبان سے اپنے سخت سے سخت مخالفین بلکہ معاندین کے لئے بھی کلمۂ خیر کے سوا کوئی حرف نہیں نکلا۔ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے نظریہ کی انھوں نے ہمیشہ کھلم کھلا مخالفت کی اور اصولی طور پر مولانا کبھی بھی اس کو تسلیم نہ کر سکے۔ لیکن پاکستان بن گیا تو اس کے بعد جب بھی کسی نے ذکر کیا تو پوری جرأت قلب و نظر کے ساتھ انھوں نے یہی کہا کہ اب جب کہ وہ ایک ملک بن چکا ہے۔ ہماری آرزو یہی ہے کہ وہ خوش حال ہو اور اسے استحکام نصیب ہو۔ یہ ان کے قلب کی وسعت ہی تھی کہ ٹھیٹھ کانگریسی ہونے اور عقیدتاً دیوبندی مکتب فکر سے پختہ وابستگی کے باوجود انھوں نے اپنی نفع رسانی اور خدمت گزاریوں میں کبھی کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔ بلکہ بعض بعض مواقع پر تقاضائے حالات وہ خدمات بھی خود انجام دیں جن سے وہ کوئی نظریاتی لگاؤ نہیں رکھتے تھے۔ مثلاً ۱۹۴۷ء میں دہلی کی تباہی کے بعد محرم کے تعزیوں اور بزرگان دین کے مزارات پر عرسوں کا سوال آیا تو مولانا نے خود اس کا اہتمام کیا۔ کہیں کہیں خود شریک بھی ہوئے۔ قوالیاں بھی کرائیں اور عرسوں کی مروجہ رسوم سب ہی پوری کرائیں۔ یہ کہہ کر کہ اگرچہ ہم تعزیوں اور عرسوں کے اس رواج کے خلاف ہیں، تاہم یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ ملکی حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر مسلمان بادل ناخواستہ ان منکرات کو چھوڑیں

اپنے عقیدہ اور مسلک پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے جہاں تک خدمت و عمل کا تعلق ہے۔ ان کی دردمندیوں کے سایہ میں دارالعلوم دیوبند اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک ہی درجہ تھا۔ جدید و قدیم، مقلد اور غیر مقلد۔ شیعہ اور سنی، خوجے اور بوہرے، مسلم لیگی اور کانگریسی بلکہ مسلم اور غیر مسلم ہر انسان کی خدمت وہ اپنا حق سمجھتے تھے عقیدہ اور مسلک کا اختلاف ان کو کسی کی خدمت سے باز نہیں رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام حلقوں میں یکساں طور پر ان کو احترام اور اعتماد کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور کسی بھی گروہ نے ان کو اپنے لئے غیر اور اجنبی محسوس نہیں کیا۔

رواداری اور اعتماد

ان کی شرافت نفس کا قدرتی نتیجہ یہ بھی تھا کہ دوسروں کے ساتھ بے انتہا رواداری، احترام اور اعتماد کا معاملہ کرتے تھے۔ ہمیشہ ہر معاملہ میں دوسروں کا احترام ملحوظ رکھتے اور ہر موقع پر دوسروں کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے اپنے ساتھیوں اور کارکنوں پر حد درجہ اعتماد کرتے۔ کسی سے شکایت کا موقع بھی ملتا تو وقتی ناگواری کا اظہار ضرور کرتے۔ مگر دلی تعلق میں کبھی بال برابر فرق نہ آنے دیتے۔

جرأت حق اور مقام عزیمت

مولانا مرحوم کے افکار و کردار کا سب سے اہم اور جوہری وصف ان کی جرأت حق اور استقامت و عزیمت تھی۔ ان کی پوری زندگی اس وصف کمال کا ایک مسلسل اور شاندار مظاہرہ رہی ہے۔ اہم سے اہم اور نازک معاملات میں بھی جب وہ اپنی کوئی رائے قائم کرتے، تو کسی خوف۔ کسی اندیشہ اور کسی لالچ کی پرچھائیں بھی اس پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ ہر معاملہ کو کھلے دل سے اپنے اور اپنے خدا کے درمیان سوچنا اور فیصلہ کرنا اور فیصلہ کر لینے کے بعد اس پر پختگی کے ساتھ جم جانا، یہی ان کا صحیح موقف تھا۔ ان کی زندگی میں بارہا ایسے موقعے بھی آئے جہاں ان کی جرأت و

حوصلہ اور ثبات فکر و نظر کے لئے بڑی آزمائشیں درپیش تھیں۔ مگر ان کے کردار میں کوئی تزلزل راہ نہ پا سکا۔ چند برس پہلے ہی ایک صاحب نے گاندھی جی کی یادگار تقریب پر شرعی نقطۂ نظر سے فتویٰ چاہا۔ اگرچہ عام طور پر فتویٰ لکھنے سے مولانا ہمیشہ بچتے تھے اور دوسرے علماء کرام پر محول کر دیتے تھے۔ لیکن جب یہ خاص سوال سامنے آیا تو مولانا نے پوری اہمیت کے ساتھ فوراً اس کا جواب خود لکھا اور بہت صاف لفظوں میں مسلمانوں کے لئے یہ یادگار تقریب شرعاً ناجائز قرار دی۔ یہ سوال حقیقتاً ایسا تھا کہ مولانا تو خیر پکے کانگریسی اور گاندھی جی کو لیڈر ماننے والوں میں سے تھے۔ اگر کسی غیر کانگریسی عالم کے سامنے بھی رکھا جاتا تو ملک کے حالات اور گردوپیش میں بہت مشکل ہوتا کہ اس صفائی اور جرأت کے ساتھ اس پر نکیر کا فیصلہ دے دیتا۔

۵۶ء کا واقعہ مجھے یاد ہے۔ مولانا جنوبی ہند کے سفر میں تھے۔ ایک ایسے مقام پر جہاں خالص مسلمانوں کا (اور وہ بھی مسلم لیگی) اجتماع تھا کسی نے کشمیر کے متعلق سوال کیا۔ ایک منٹ کے تامل کے بغیر مولانا نے اپنی صاف اور قطعی رائے ظاہر کر دی اور فرمایا کہ ہماری خواہش تو یہی ہے کہ کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق ہو، تاکہ ہندوستان کی حدود میں کم از کم ایک ریاست خالص مسلم اکثریت کی نظر آ سکے اور اس سے ہندوستانی مسلمانوں کا وزن بڑھ سکے۔

اب آخری دنوں میں مسلم کنونشن کا معاملہ بھی مولانا کی جرأت فکر و عمل کی ایک مثال بن گیا۔ کیونکہ وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو تک شروع میں اس کے خلاف تھے لیکن مولانا کے لئے یہ بھی کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ کسی نے پوچھا کہ پنڈت جی کی قطعی مخالفت کے بعد بھی کیا آپ کنونشن ضرور بلائیں گے۔ مولانا نے پوری مضبوطی کے ساتھ جواب دیا کہ ہم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ پنڈت جی کی رائے بھی اس کے خلاف ہے تو ہو۔ ہم ان کی مخالفت کے ڈر سے کنونشن کا خیال ترک کر دیں، یہ ممکن نہیں۔

مقام علم و فضل

سیاسی اور جماعتی ذمہ داریاں مولانا کے وقت عزیز پر اس طرح چھا گئی تھیں کہ عوام کے سامنے زیادہ تر ان کی عملی زندگی رہی۔ لیکن حقیقتاً اپنی دینی بصیرت اور علم و فضل کی گہرائی میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ جس کا اندازہ ان کی فاضلانہ اور محققانہ تصانیف سے ہوتا ہے۔ خاص طور پر "قصص القرآن" اور "اسلام کا اقتصادی نظام" جو اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتابیں ہیں مولانا کی علمی عظمتوں کے روشن نقوش ہیں اپنی گفتگوؤں میں جب کبھی کسی دینی اور خالص علمی مسئلہ پر ان سے بحث و تمحیص کا موقع ملتا تھا خواہ مسئلہ فقہی ہو یا تفسیر و حدیث کا کوئی عنوان۔ مولانا کے فاضلانہ تبصرے سامعین پر ان کی وسعتِ نظر اور ذہانت و ذکاوت کا سکہ جما دیتے تھے۔

انداز فکر

قلب و نظر کے وہی ممتاز اوصاف جن کا اوپر تذکرہ ہوا۔ مولانا کے افکار و رجحانات کے بنیادی عوامل تھے ان کے انداز فکر میں جرأت حق، خلوص نیت۔ وسعت قلبی اور استقامت و عزیمت کے جوہر صاف جھلکتے تھے۔ زندگی اور اس کے تقاضوں کو مثبت اور ایجابی نقطۂ نظر سے دیکھنا۔ ہر حال میں ناامیدی اور مایوسی سے گریز۔ حوصلہ مندی اور تحمل و برداشت کے ساتھ وقت کی نزاکتوں سے گزر جانا، صحت مند شعور اور خودداری کے احساس کے ساتھ اپنے دین اور دنیا کی خدمت گزاری۔ اپنے وطن کی بے لوث محبت اور عام انسانی ہمدردی، یہی مولانا کے بنیادی افکار تھے اور عمر بھر اپنی تقریروں، تحریروں اور قول و عمل سے یہی پیغام انھوں نے دیا۔

حب وطن

وطن کی محبت مولانا مرحوم کے لئے جزو ایمان تھی۔ انھوں نے ایک طرف خود وطن عزیز کی آزادی اور آزادی کے بعد اس کی تعمیر و ترقی سربلندی و خوش حالی۔ عزت و نیک نامی کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا کر وہ سب کچھ کیا جو ایک سچے وطن پرور کا کردار ہو سکتا ہے اور دوسری طرف اپنے برادران ملت کو ہمیشہ یہی نصیحت کی کہ وہ وطن عزیز کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ اپنی تقریروں میں برملا فرمایا کرتے تھے کہ وطن کی محبت کا نعرہ ہم کسی کی خوشامد یا نمود و نمائش کے لئے نہیں بلند کرتے ہیں۔ بلکہ یہ ہمارا دین و ایمان ہے۔ ہمیں یہ سبق اسوۂ رسول کریم سے حاصل ہوا ہے۔ ہندوستان ہمارا وطن ہے ہمارا اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کی خوش حالی ہماری خوش حالی اور اس کی بربادی ہماری اپنی بربادی ہے۔ سرزمین ہند پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کسی دوسرے ہندوستانی کا۔ ہم یہاں اجنبی یا تماشائی نہیں ہیں۔ اس دیس کو بنانے میں دوسروں کے ساتھ ساتھ ہم نے بھی اپنی جان کھپائی ہے۔ کسی کے دکھاوے اور خوشنودی کے لئے نہیں، بلکہ اپنا فرض سمجھ کر۔ ہم اپنے اس فریضۂ وطنی اور اس کے تقاضوں سے کبھی غفلت کے روادار نہیں ہو سکتے۔

مجاہد ملتؒ زندگی کے مختلف ادوار میں

مختصر تذکرہ اور سوانح نگاری کے لحاظ سے دیکھا جائے تو حضرت مولاناؒ کی زندگی مشاغل و مہمات کے تین دوروں میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔

زندگی کا پہلا دور

جو زیادہ تر مدرسہ فیض عام سیوہارہ، کچھ جامعہ قاسمیہ مرادآباد اور پھر دارالعلوم دیوبند میں گزرا۔ دارالعلوم کے قیام میں مولانا مرحوم کو خاتم المحدثین حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ سے شرف تقرب و تلمذ حاصل ہوا۔ یہ تعلق ان کی عظیم شخصیت کے بنانے والے عوامل میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور کے خاص رفقاء حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، حضرت مولانا محمد بدر عالم میرٹھی (مقیم حال مدینہ منورہ) اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی ہیں۔

فراغت کے بعد کچھ عرصہ دارالعلوم ہی میں تدریس کا شغل رہا۔ پھر مدراس سے ایک فرمائش پر حضرت علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مجاہد ملت کو مدراس بھیج دیا۔ وہاں پیرامیٹ میں کم و بیش سال بھر درس و تبلیغ کی خدمت انجام دی۔ یہیں سے حضرت مولانا کی فکری اور قلمی کاوشوں نے انگڑائیاں لینی شروع کیں چنانچہ جنوبی ہند کے اس قیام میں دو مختصر رسالے "حفظ الرحمٰن لمذہب النعمان" اور "مالابار میں اسلام" تالیف کئے (یہ رسالے اب نایاب ہیں) مولانا مرحوم ذکر کیا کرتے تھے کہ مدراس کے قیام میں جو مشاہرہ مجھے حاصل ہوتا تھا۔ اسی کو جمع کر کے میں نے ۱۹۲۲ء میں حجاز مقدس کا سفر کیا اور حج و زیارت سے بہرہ مند ہوا۔ حج سے واپس آکر جلدی اپنے استاذ محترم حضرت شاہ صاحب کے ہمراہ ڈابھیل ضلع سورت چلے گئے۔ جہاں بڑے پیمانہ پر جامعہ ڈابھیل کی تشکیل عمل میں آئی۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے ساتھ ساتھ تقریباً تین برس (۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۱ء) حضرت مجاہد ملتؒ نے بھی وہاں درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔ سیرت رسول کریمؐ جو ذوق و مطالعہ اور بیان و تقریر میں زندگی بھر مولانا موصوف کا خاص سبجیکٹ (موضوع) رہا ہے۔ ڈابھیل کے قیام میں اسی عنوان پر مولانا نے ایک مختصر مگر جامع اور سلیس کتاب مرتب کی جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ڈابھیل اور مدراس کے قیام میں ہر آٹھویں، دسویں روز اپنے مستقر کے آس پاس دیہات و قصبات میں وعظ و تقریر کا سلسلہ بھی رہتا تھا۔ گویا خطابت و تقریر کی خداداد صلاحیت ان فرصتوں میں اپنا نکھار حاصل کر رہی تھی۔ کم و بیش تیس سال کے اس عرصہ میں عمر کے ساتھ ساتھ مولانا مرحوم کے فطری اوصاف کمال کی نوبت پا کر تکمیل و شباب کی منزل میں قدم رکھ چکے تھے۔ اب وہ ایک مستقل شخصیت۔ ایک بلند پایہ اور صاحب بصیرت عالم دین۔ ایک فطری خطیب مفکر اور صاحب فکر مصنف بن کر اُفق پر نمودار ہو رہے تھے۔ قدرت کا ہاتھ آہستہ آہستہ ان کو اس منصب بلند کی طرف لے جا رہا تھا جو ان کی زندگی کا منشار تخلیق تھا۔

کانگریس کی وطنی تحریک میں سرگرمیوں کا آغاز

مولانا مرحوم کی قومی اور جماعتی سرگرمیوں کا آغاز یوں تو ۱۹۱۹ء ہی سے ہو گیا تھا جبکہ ملک میں تحریک خلافت کا غلغلہ تھا اور آزادیٔ ہند کی تحریک بھی وسیع پیمانہ پر ملک بھر میں منظم ہو رہی تھی۔ جمعیۃ علماء ہند کی تاسیس بھی ان ہی دنوں عمل میں آئی۔ مولانا مرحوم کی جماعتی جدوجہد اسی زمانہ سے شروع ہوئی۔ اور اسی سلسلہ میں وہ سب سے پہلی بار ۱۹۲۲ء میں گرفتار بھی ہوئے تھے۔ لیکن کانگریس پلیٹ فارم سے مولانا مرحوم کی سرگرمیوں کا سلسلہ زیادہ تر ڈابھیل کے قیام ہی سے شروع ہوا۔ حضرت مفتی صاحب سے معلوم ہوا کہ ان ہی دنوں جب گاندھی جی نے ڈانڈی مارچ کی تحریک شروع کی اور نمک پر محصول کے بائیکاٹ کا پروگرام پیش کیا۔ ان دنوں گاندھی جی کا قیام دھراسنہ میں تھا۔ مولانا مرحوم اور حضرت مفتی صاحب ڈابھیل سے چل کر دھراسنہ پہنچے اور گاندھی جی سے ملے اور تحریک میں اپنی پوری خدمات پیش کیں۔ گاندھی جی ان حضرات کے جذبات اور تعاون کی پیش کش سے بہت متاثر ہوئے۔ ساتھ ہی کہا کہ میں نے سنا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ (ص) کی کوئی ایسی ہدایت ہے کہ نمک، پانی اور گھاس رفاہ عام کی چیزیں ہیں اس لئے اسلام میں بھی ان کو سرکاری محصول سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے — مولانا مرحوم نے اور حضرت مفتی صاحب نے اس کی تصویب کی۔ اور ساتھ ہی حضور سرور کائناتؐ کی حدیث مبارک بمعہ اردو ترجمہ لکھ کر گاندھی جی کو دی۔ جس کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ ان ہی دنوں بارڈولی میں سردار پٹیل نے کانگریس کے کارکنوں کا ایک بڑا اجتماع کیا تھا، جہاں یہ طے کیا گیا کہ عدم ادائیگی ٹیکس کی بنا پر پبلک کی جو جائدادیں برٹش حکومت ضبط کر کے سستے داموں نیلام کر رہی ہے عوام کو ان کی خریداری سے باز رکھنے اور نیلام کے بائیکاٹ کی ترغیب کی جائے۔ اسی موقع پر حضرت مفتی صاحب (مولانا عتیق الرحمٰن صاحب) نے اسلامی نقطہ نظر سے اپنا مشہور فتویٰ صادر کیا تھا۔ جس میں ضبط شدہ جائدادوں کو نیلام میں خریدنے کی شرعی ممانعت کا حکم تھا۔ کیوں کہ برٹش حکومت کی طرف سے جائیدادوں کی ضبطی ایک صریح

ظلم تھا۔ اور ایسی ضبط شدہ جائدادوں کو خریدنا شرعاً ظلم وعدوان کی تائید اور تقویت کے حکم میں آتا تھا۔ مفتی صاحب کا یہ فتویٰ سورت کے مشہور مسلم گجرات پریس میں چھپا اور اس کی پاداش میں فتویٰ کے ساتھ ساتھ پریس بھی ضبط کر لیا گیا تھا۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب پہلے ہی گرفتار ہو چکے تھے۔ مفتی صاحب کی گرفتاری کے احکام لے کر سپرنٹنڈنٹ پولیس مفتی صاحب کے پاس پہنچا۔ لیکن اس سے چند گھنٹے پہلے گاندھی اروِن پیکٹ ہو چکا تھا۔ اس لئے تمام وارنٹ واپس لے لئے گئے۔

بہر حال ان دونوں بزرگوں کی سیاسی سرگرمیوں سے اُس وقت جامعہ ڈابھیل کے منتظمین کو بڑی پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ اِن حضرات نے بھی اس کو محسوس کیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب تو جیل ہی میں تھے۔ مفتی صاحب بھی چند ماہ کے بعد مستعفی ہو کر وطن واپس آ گئے۔ اس طرح ڈابھیل کا تعلق منقطع ہو گیا اور رہائی کے بعد مولانا بھی واپس ڈابھیل نہ گئے۔

دوسرا دور

۳۰ء میں جیل سے رہائی کے بعد حضرت مولانا نے امروہہ پہونچ کر جمعیۃ علماء ہند کے اس معرکۃ الآرا اجلاس میں شرکت کی جہاں سے جمعیۃ کے حلقوں میں ان کے قائدانہ دور کا آغاز ہوا۔ اس اجلاس میں حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ، حضرت شیخ مدنیؒ، حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ جیسے اکابر ملت شریک تھے اور جنگ آزادیٔ وطن میں جمعیۃ کے موقف کی تعیین کا اہم سوال درپیش تھا۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی (جو اس وقت ملک کے مشہور لیڈر تھے) ان کی رائے کے خلاف مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے پوری قوت اور جوش کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کیا کہ جمعیۃ کو آزادیٔ وطن کی راہ میں کھلے بندوں انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دینا چاہیئے اور بلاشرط تعاون کرنا چاہیئے۔ مولانا مرحوم کی اس تحریک، زورِ بیان اور قوتِ استدلال نے علماء و افاضل کے اس مجمع کو بے حد متاثر کیا اور اس کی تائید میں بطل حریت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ولولہ انگیز تقریر کے بعد آخرکار یہی اجلاس کا فیصلہ قرار پایا۔

۳۴ء کے شروع میں انجمن تبلیغ الاسلام کی دعوت پر (جس کے سرپرست حضرت مولانا آزادؒ تھے) مجاہد ملتؒ کلکتہ تشریف لے گئے۔ ڈھائی سال وہاں قیام رہا درس قرآن حکیم خاص شغل تھا۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب پہلے ہی کلکتہ پہنچ چکے تھے۔ یہاں روزانہ صبح کو دفتر تبلیغ سراج بلڈنگ میں اور عشاء کے بعد مسجد جمال الدین میں درس قرآن حکیم کا سلسلہ جاری رہا۔ کلکتہ کی وسیع آبادیوں میں ان دونوں بزرگوں کی تقریروں نے بہت ہی جلد اپنا سکہ جما دیا۔ نئے اور دلنشین انداز میں قرآن حکیم کے مطالب ومعارف کے بیان میں جو امتیاز ان کو حاصل تھا اس کی شہرت دور دور تک پھیلی اور آج تک وہاں کے لوگ ذکر و بیان کی ان مجلسوں کو یاد کرتے ہیں۔

اسی دوران میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو مولانا آزاد مرحوم سے بہت قریب رہنے کا موقع ملا اور ان کی رفاقت نے مولانا کے سیاسی ذوق و لگن کو اور بھی دو آتشہ کر دیا۔ آنجہانی شری سبھاش چندر بوس نے کلکتہ سے ان ہی دنوں کانگریس کے حلقوں میں ماس کنٹریکٹ کی تحریک چلائی۔ مجاہد ملتؒ اور مفتی صاحب نے بھی اس میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔

خرابیٔ صحت کے باعث کلکتہ سے واپسی کے بعد مجاہد ملتؒ کچھ عرصہ امروہہ میں مقیم رہے اور وہاں کے دو عربی مدارس کے اہتمام و نگرانی کی خدمت انجام دیتے رہے اس کے بعد ۳۸ء میں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے ساتھ ندوۃ المصنفین دہلی کی بنیاد ڈالی اور اس کی ساخت و پرداخت میں مشغول ہو گئے۔ بحمد اللہ اس ادارہ کی معیاری علمی خدمات آج پورے ملک کے سامنے آ چکی ہیں اور اس کا شمار ہندوستان کے نامور علمی اداروں میں ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ ۳۰ء سے ۴۶ء تک حضرت مولانا کی مصروف زندگی کا یہ دوسرا دور کہا جا سکتا ہے جو زیادہ تر سیاسی ہنگاموں، آزادیٔ وطن کی خاطر مسلسل جد و جہد، سفروں اور جلسوں میں، کچھ قید و بند میں اور ذاتی مشغلوں کے لحاظ سے تصنیف و تالیف میں گزرا۔ مولانا مرحوم کی جلیل القدر علمی تالیفات قصص القرآن، اسلام کا اقتصادی نظام وغیرہ اسی دور کی قیمتی یادگاریں ہیں۔ تالیفات کا بیشتر حصہ سفروں میں مدون ہوا یا جیلوں میں۔

زندگی کے اس دوسرے دور سے گزرتے ہوئے مولانا مرحوم کی شخصیت ایک طرف جہاں تہاں اپنی شعلہ بار تقریروں اور سحر آفریں خطابت کے ذریعہ اپنی فاضلانہ اور محققانہ تالیفات کے ذریعہ اور دوسری طرف چوتھائی صدی سے مسلسل اپنی سیاسی سرگرمیوں اور تحریک آزادی کے ایک نہایت مؤثر و فعال کیرکٹر کی حیثیت سے ملک بھر میں شہرت و تعارف کی بلندیوں پر پہنچ چکی تھی اور ان کا شمار صف اول کے ارباب فکر و بصیرت اور سیاسی رہنماؤں میں ہونے لگا تھا۔

تحریک آزادی اور ملکی سیاست میں قائدانہ رول

علم وفضل کے اعلیٰ محاسن۔ فاضلانہ تصنیف و تالیف اور خطابت و تقریر کی ممتاز صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کے خمیر میں سیاست و تدبیر کا ذوق

ریت پسندی کے جذبات اور خدمتِ ملک و ملت کی بے مثال لگن بھی گوندھی ہوئی تھی۔ یہی اوصاف کمال ان کی شخصیت کے جوہری عناصر تھے۔ جن کی آب و تاب ان کی زندگی کے ہر دور میں نمایاں رہی ہے۔ خدمتِ ملک و ملت نوعمری ہی سے ان کا محبوب مشغلہ رہا۔ نوجوان ہی تھے کہ وطنی سیاست اور تحریکِ آزادی میں انھوں نے نہایت بے باکی اور اولوالعزمی کے ساتھ حصہ لینا شروع کیا۔ جس وقت وہ دارالعلوم دیوبند میں تھے ملک کی فضائیں خلافت اور انقلاب انقلاب کی صداؤں سے گونج رہی تھیں۔ مولانا مرحوم اسی وقت سے ایک سرگرم سیاسی کارکن بن گئے اور قوم پرور تحریکوں میں گرم جوشی کے ساتھ حصہ لینے لگے۔ سیاست سے وابستگی اور تحریکِ آزادیٔ وطن میں شرکت ان کے لئے گویا ایمان و عقیدہ کا درجہ رکھتی تھی۔ اسی لئے کوئی خوف، کوئی فکر، کوئی لالچ اور کوئی بھی طاقت زندگی کے آخری سانس تک ان کے سیاسی مشاغل اور سرگرمیوں میں حائل نہ ہو سکی۔ بلکہ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ اپنے اسی عشق و لگن کے ہاتھوں انھوں نے اپنی نوعمری، جوانی اور بڑھاپے کے ہر عیش و راحت اور مفاد و منفعت کو بے دریغ قربان کیا۔ سعی و عمل کی اس دشوار گزار اور صبر آزما زندگی کو اپنا کر انھوں نے عمر بھر اپنے ضمیر کے اطمینان کے سوا کوئی انعام حاصل نہیں کیا۔ درس قرآن حکیم اور تصنیف و تالیف (جس کی اعلیٰ صلاحیتوں سے وہ بہرہ مند تھے) ان کا پسندیدہ شغل تھا سیاسی سرگرمیوں کی بدولت اس کا ربط بھی قائم نہ رہ سکا۔ بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا کرتے کہ "کاش میرے حالات مجھے اس کا موقع دیں کہ اپنے اصل کام (یعنی درس قرآن حکیم اور تصنیف و تالیف) کی طرف لوٹ سکوں۔ افسوس کہ ہنگامی مصروفیتوں نے میرا تمام وقت مجھ سے چھین لیا ہے"۔

سیاست کی تیز رفتاری اور ہنگامی تقاضے کچھ اس طرح ان کے دامن سے لپٹ چکے تھے کہ کبھی جم کر اپنے اس محبوب مشغلہ سے وابستہ نہ ہو سکے۔ بار بار گرفتاری اور نظربندی کے مواقع پیش آتے رہے۔ کبھی چھ مہینے کبھی سال بھر کبھی دو سال، جیلوں میں گزارے۔ مجموعی طور پر لگ بھگ پانچ سال وہ تحریکِ آزادی میں نظربند رہے۔ سب سے آخری بار "کوئٹ انڈیا" (ہندوستان چھوڑ دو) کی مشہور تحریک ۱۹۴۲ء میں گرفتار ہوئے۔ تقریباً دو سال نظربند رہ کر ۱۴ جولائی ۱۹۴۴ء کو بریلی سنٹرل جیل سے رہا ہوئے اور ۱۸ جولائی کو دہلی پہنچ کر پھر اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ بار بار کی گرفتاری اور نظربندی محض سیاسی سرگرمیوں اور تحریکِ آزادیٔ وطن میں جرأت مندانہ شرکت کی پاداش تھی۔ جس نے مولانا مرحوم و مغفور کی صحت پر بھی بہت برا اثر کیا۔ دردِ سر کا مرض مرادآباد جیل ہی سے ان کے حصہ میں آیا تھا۔ اپنے گھر بار، متعلقین یہاں تک کہ اولاد کی ساخت پرداخت اور دیکھ بھال کے لئے بھی بہت ہی کم ان کو مہلت مل سکی۔ عام انسانی زندگی کے لئے یہ آزمائشیں کچھ آسان نہیں ہیں۔ لیکن مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بطیب خاطر ایثار و ابتلاء کی اس زندگی کو اپنایا اور اس کے ہر تقاضے کو حوصلہ مندی کے ساتھ پورا کیا۔ شروع ہی سے وہ انڈین نیشنل کانگریس کے سرگرم رکن اور اس کی تمام انقلابی تحریکوں میں پیش پیش رہے۔ کچھ عرصہ یو۔ پی کانگریس کی ایگزیکیٹیو میں شریک رہے ۱۹۳۶ء سے مسلسل آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن رکین رہے۔ کانگریس کی جانب سے مئی ۱۹۴۶ء میں ہاپوڑ، خورجہ سیٹ پر بلامقابلہ یو۔ پی اسمبلی کے ممبر، پھر جولائی ۱۹۴۹ء میں مسٹر رضوان اللہ کی خالی کردہ نشست پر دستور ساز اسمبلی کے ممبر اور ۳۱ جنوری ۱۹۵۰ء کو بلامقابلہ ہند پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔

آزادیٔ وطن کے بعد کانگریس ٹکٹ پر ہی جنوری ۱۹۵۲ء میں حلقہ بلاری ضلع مرادآباد سے اور پھر ۱۹۵۷ء میں اور ۱۹۶۲ء میں حلقہ امروہہ سے ہند پارلیمنٹ کے الیکشن لڑے اور ہر مرتبہ معاندین کی انتہائی زور آزمائیوں کے باوجود اپنے حلقہ سے مسلم و غیرمسلم ووٹروں کے بھرپور اعتماد اور کثیر تعداد ووٹوں کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ سب سے آخری الیکشن (فروری ۱۹۶۲ء) کے موقع پر وہ اپنی علالت کے باعث حلقہ انتخاب میں خود نہ جا سکے۔ پھر بھی الیکشن کے نتیجہ میں سخت مقابلہ کے باوجود انھیں شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔

جمعیۃ علماء ہند سے تعلق

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی و عملی سرگرمیوں کا دوسرا محور وہ جماعتی زندگی تھی جس کی قیادت و زعامت حاملین امانت دین و مصلحین امت علماء حق کے سپرد تھی اور جو "جمعیۃ علماء ہند" کے نام سے عوام و خواص میں متعارف ہے۔ مولانا مرحوم یوں تو ابتداء ہی سے جمعیۃ علماء کے رفیق کار رہے۔ لیکن ڈابھیل سے واپسی کے بعد سے وہ جمعیۃ علماء کے ساتھ بہت زیادہ مربوط ہو گئے تھے۔

۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علماء کے اجلاس امروہہ میں مولانا مرحوم نے اہم ترین کردار پیش کیا اور آپ ہی کی تجویز اس اجلاس کا ماحصل تھی۔ جمعیۃ کی تاریخ میں اجلاس امروہہ کا یہ فیصلہ ایک انقلابی فیصلہ تھا جس نے جمعیۃ علماء کو انڈین نیشنل کانگریس کے شانہ بشانہ اپنی جماعتی قوتوں کے ساتھ براہ راست تحریکِ آزادی سے مربوط کر دیا۔ آنے والے برسوں میں جمعیۃ علماء ہند نے حریتِ وطن کے ہر محاذ پر جس جرأت و استقامت کے ساتھ اپنا قیمتی کردار پیش کیا اس کی پشت پر اس انقلابی فیصلہ کی قدریں ہمیشہ کارفرما ہیں۔

حضرت مجاہد ملتؒ اس کے بعد مسلسل جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی کے رکن رکین اور اس کی قیادت میں شریک کار رہے یہاں تک کہ ۱۹۴۲ء میں جمعیۃ کے تیرھویں سالانہ اجلاس (منعقدہ لاہور ۲۰ تا ۲۲ مارچ۔ بصدارت حضرت شیخ مدنیؒ) میں جمعیۃ کی نظامت عامہ کا اہم ترین منصب آپ کے سپرد کر دیا گیا۔ اس اجلاس میں حضرت مولانا آزادؒ بھی

شریک تھے اور یہیں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو "مجاہد ملت" کا خطاب دیا گیا۔

اجلاس امروہہ (۱۹۳۰ء) سے اجلاس لاہور (۱۹۴۲ء) تک جمعیۃ علماء ہند کی عملی سرگرمیوں میں جہاد آزادی کا تسلسل اتنا غالب رہا کہ اس دور کی تاریخ میں جمعیۃ کی دوسری اصلاحی اور تعمیری خدمات زیادہ نمایاں نہ ہو سکیں، یوں بھی یہ عرصہ تحریک آزادی کے انتہائی شباب کا دور تھا، قدم بہ قدم حلقوں اور کارکنوں کو اس عرصہ میں بیرونی اقتدار سے مسلسل تصادم اور کشمکش کے باعث قدم قدم پکڑ دھکڑ، قید و بند، تعاقب و نگرانی کا سامنا رہا۔

مارچ ۱۹۴۲ء میں مجاہد ملتؒ نے جمعیۃ کی نظامت عامہ سنبھالی لیکن چند ہی مہینوں کے بعد "کوئٹ انڈیا" تحریک پورے ملک میں برپا ہو گئی اور دوسرے قائدین حریت کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا بھی نظر بند کر دیئے گئے۔

دو سال کے بعد جب ۱۳ جولائی ۱۹۴۴ء کو آپ رہا ہو کر آئے تو ملک انقلاب آزادی کے دروازے پر کھڑا تھا اور دہلی اور لندن میں ہندوستان کے مستقبل کے خاکے تیار ہو رہے تھے۔ سب سے اہم کام اس فیصلہ کن مرحلہ پر ملک کے مستقبل سے متعلق جمعیۃ کے نقطۂ نظر کی وضاحت اور اس کی پیروی تھی۔

مجاہد ملتؒ نے وقت کے اس اہم تقاضہ کو محسوس کرتے ہوئے جمعیۃ مرکزیہ کا چودھواں سالانہ اجلاس مئی ۱۹۴۵ء میں بصدارت حضرت شیخ مدنیؒ منعقد کرایا۔ ستمبر ۱۹۴۵ء میں دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس بلائی اور اس کے متفقہ فیصلہ کے مطابق مسلم پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل عمل میں لائی گئی۔ پھر مئی ۱۹۴۶ء میں جمعیۃ مرکزیہ کا دوسرا اہم اجلاس لکھنؤ میں منعقد کرایا اور لندن سے آنے والے مختلف وفود کے سامنے بھی اور خود کانگریس کے ارباب حل و عقد پر بھی جمعیۃ علماء کے موقف کی پوری وضاحت فرمائی۔ خاص طور پر آزادی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی وحدت کو برقرار رکھنے پر پورا زور دیا اور آخر تک اس کے لئے کوشاں رہے یہاں تک کہ ۹ جون ۱۹۴۷ء کو جب کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی تقسیم ہند کے فارمولے پر اپنی منظوری صادر کرنے کے لئے جمع تھی، پنڈت پنتھ نے اس کی تحریک اجلاس میں پیش کی اور مولانا آزادؒ نے بھی تائید میں تقریر کرتے ہوئے بتقاضائے حالات تقسیم کو منظور کر لینے کا مشورہ دیا۔ اس وقت بھی مجاہد ملت رح نے بھرے اجلاس میں تقسیم ہند کی پوری قوت کے ساتھ مخالفت کی اور فرمایا!

" حالات کے جس دباؤ اور جن الجھنوں کے باعث آج ہندوستان کی تقسیم کو منظور کر لینے کا مشورہ دیا جا رہا ہے، میں اپنے لیڈروں کے پورے احترام کے ساتھ یہ کہوں گا کہ ہندوستان کی تقسیم کا نتیجہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہوگا اور آج اگر کانگریس کے اسٹیج پر تقسیم ہند کی اسکیم منظور کر لی گئی تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ہم آج اپنی پوری تاریخ اور ہمیشہ کے اپنے یقین و اعلان پر خود اپنے ہاتھ سے خط تنسیخ کھینچ کر اٹھیں گے اور دو قومی نظریہ کے سامنے سر نیڈر ہو جائیں گے"۔ (مجاہد ملتؒ)

جو ہونا تھا وہ ہوا، تاریخ کا ورق پلٹا۔ لیکن مولانا مرحوم کے یہ کلمات بھی تاریخ کی ایک قیمتی امانت بن گئے۔

تیسرا دور

مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عزیز زندگی کا پہلا دور تعلیم و تعلم، تبلیغ دین، خدمت خلق، وعظ و بیان کے دقتی مشاغل میں گزارا۔ دوسرے دور میں ان کا تمام ہی وقت سیاسی سرگرمیوں، دوروں اور تقریروں، اسارت و نظر بندی اور تحریک آزادی وطن کو اپنی بھرپور صلاحیتوں سے آگے بڑھانے میں گزرا۔ اس دوران میں سکون و فرصت کے کچھ لمحات کبھی کبھی میسر آئے تو وہ تصنیف و تالیف کے فاضلانہ شغل میں گزرے

۱۹۴۷ء میں تحریک آزادی کامیابی کے ساتھ اپنی آخری منزل کو پہنچی۔ ہندوستان برطانوی اقتدار کی گرفت سے آزاد ہوا اور تاریخ نے وطن عزیز کو ایک عظیم انقلاب اور ایک نئے دور کی گود میں دے دیا۔ مگر تاریخ کا یہ واقعہ بھی کتنا عجیب ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی جتنی پر امن اور پر سکون فضاؤں میں لڑی گئی اس کا خمار اتنا ہی تیز و تند اور اعصاب شکن ثابت ہوا۔ کاش ہندوستان کی وسیع افق پر سیاسی انقلاب اور اقتدار و اختیار کی تبدیلی "طلوع فجر" کی طرح رونما ہوتی۔ کہ اس کے کیف آور لمحات اور حیات بخش پیغام سے ملک کے در و دیوار جگمگا اٹھتے۔ اس کے برعکس یہاں آزادی کی صبح "صبح محشر" بن کر نمودار ہوئی جس کے دامن میں انقلاب کی ہولناکیاں تھیں اور قہر و غضب کا وہ طوفان جو پچھلی چوتھائی صدی سے ملک میں پھیلی ہوئی کشمکش، جذبات و نظریات کے تصادم اور فرقہ وارانہ ہوسناکیوں کا انجام بد اور رد عمل تھا۔ اس لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ میں یہ وقت اتنا نازک اور بھیانک دور بن کر سامنے آیا کہ بڑے بڑے ارباب فکر و تدبیر کے ہوش و حواس کھو گئے۔ یہی تاریک اور بھیانک دور تھا جس میں حضرت مجاہد ملتؒ کی عزیمت اور استقامت کے تابناک جوہر مشعل راہ بن کر چمکے اور ملک و ملت کے کھوئے ہوئے قافلوں کی دستگیری ان کے حصہ میں آئی۔ مولانا موصوف اس وقت ملکی سیاست و قیادت کا اہم ترین جز تھے اور صف اول کے رہنماؤں میں اعتماد و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ کمال علم و فضل کے ساتھ ساتھ جہد و عمل کے

میدانوں میں بھی وہ اپنی جوہری صلاحیتوں کا اتنا شاندار اور اولوالعزم کردار پیش کر چکے تھے کہ اب ملک و ملت کے اہم سے اہم مسائل میں ان کی رائے اور رہنمائی کا انتظار کیا جاتا تھا۔ ایک فاضل اور نامور مصنف، سحر آفریں خطیب اور بے لوث رہنما کی حیثیت سے ان کی شہرت و مقبولیت ایک ہمہ گیر حقیقت بن چکی تھی۔ اپنی اس ممتاز اور وقیع حیثیت اور عظیم کردار کے ساتھ مجاہد ملتؒ نے اپنی زندگی کے تیسرے دور میں قدم رکھا اور اس دور میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جو انہی کا حصہ تھے۔ جن کی مثالیں دیکھنے کے لئے گردش روزگار کو صدیوں انتظار کرنا پڑتا ہے اور جن کو بلا مبالغہ انسانی تاریخ کا ایک سنہرا ورق قرار دیا جا سکتا ہے۔ حضرت مولاناؒ کی زندگی میں سعی و عمل کا یہ تیسرا دور سب سے زیادہ تابناک اور زریں دور تھا جو آزادیٔ وطن (۱۹۴۷ء) سے شروع ہو کر ۱۹۶۲ء میں اس وقت تک جاری رہا کہ حضرت موصوف اپنی اہمیت و افادیت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر "رفیق اعلیٰ" سے جا ملے۔

مجاہد ملتؒ نے اس دور میں جمعیۃ علماء کے اسٹیج سے جو عظیم الشان، ہمہ گیر اور دور آفریں خدمات انجام دیں حقیقت یہ ہے کہ وہ بجائے خود ایک مستقل تاریخ ہیں۔ کسی مختصر تذکرہ کے ضمن میں ان کا شمار بڑی ناقدری اور ناانصافی کی بات ہے۔ اسی لئے ہم آئندہ صفحات میں ان بے بہا خدمات کے صرف عنوان پیش کر رہے ہیں کہ مجاہد ملت نمبر کے صفحات اس کے بغیر مکمل بھی نہیں ہو سکتے۔ یہ مولانا مرحوم کی عالی ظرفی تھی کہ انھوں نے کاموں کا تمام بوجھ اپنے اوپر سنبھالتے ہوئے بھی ان خدمات کا کریڈٹ کبھی خود نہیں لیا اور ہمیشہ جمعیۃ علماء ہی کے سر پر سہرا باندھا۔ اس لئے کہ جمعیۃ علماء ہی ان کی سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا محور تھی۔ انفرادیت اور انانیت کے تصور سے بھی ان کو گریز تھا۔ وہ صرف جماعتی زندگی کے قائل تھے اور ان کا یہ عقیدہ بھی اسلام کی سچی تعلیم اور اسوۂ رسول کریم کے عین مطابق تھا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس پورے دور میں جمعیۃ کے رفقاء کار کا تعاون اور اعتماد مولانا کو قدم قدم حاصل رہا۔ لیکن فکری اور عملی قیادت اور پہل اور اقدام (INITIATIVE) کا جوہر خاص حضرت مولانا ہی کی ذات گرامی تھی۔

اسفار

مولانا مرحوم نے زندگی کا ایک بڑا حصہ سفروں میں گزارا۔ عام طور پر ان کے سفر جمعیۃ علماء کے تنظیمی سلسلہ، جلسوں، کانفرنسوں، وفود اور اہم ترین جماعتی مسائل و مہمات کے لئے ہوتے تھے۔ وعظ و تقریر اور خالص دینی تقریبات میں شرکت کے لئے یا کبھی کبھی کانگریس کے قومی مسائل اور انتخابی سرگرمیوں کے لئے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بے تکان سفر کرتے تھے۔ آج ہندوستان کی کوئی ریاست اور کوئی اہم شہر بلکہ قصبہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں مولانا نہ گئے ہوں۔ زندگی کے آخری پندرہ برسوں میں تو ان کے مشاغل و مہمات کا بڑا حصہ سفروں ہی میں طے ہوتا تھا۔ ریل، موٹر، ہوائی جہاز تو عام سواریاں ہیں ہی مولانا نے بسا اوقات بحری جہازوں، کشتیوں اور بیل گاڑیوں میں بھی سفر کئے۔ ایک مرتبہ سرپور کاغذ نگر سے واپسی میں دوسرے روز مولانا کو بھوپال پہنچنا تھا۔ وقت اتنا تنگ ہو گیا تھا کہ صرف ایک ٹرین (جی، ٹی ایکسپریس) ہی باقی تھی۔ مگر وہ کاغذ نگر ٹھہرتی نہ تھی۔ مولانا نے طے کیا کہ بلہارشاہ جا کر صبح سویرے جی، ٹی پکڑنا ہے، پھر بلہارشاہ تک کے لئے کوئی سواری نہیں تھی۔ بالآخر ایک مال گاڑی میں گارڈ کے ساتھ کھلے صحن پر آدھی رات سے صبح تک سفر کیا۔ میں اور حافظ جمیل الرحمٰن صاحب (جنرل سکریٹری جمعیۃ مدھیہ پردیش) ساتھ تھے۔ مال گاڑی حسب معمول اسٹیشن سے ایک میل دور یارڈ میں پہونچ کر رک گئی۔ وہاں سے سامان سفر ہم لوگوں نے خود لادا کچھ مولانا نے سنبھالا کچھ میں نے اور حافظ صاحب نے۔ صبح پانچ بجے کا وقت۔ ہم لوگ رات بھر کی نیند آنکھوں میں لئے ہوئے۔ اندھیرے میں لائنوں اور سگنل کے تاروں سے الجھتے سنبھلتے بمشکل اسٹیشن پہنچ پائے۔ سفر کی ایسی صعوبتیں مولانا کے لئے رات دن کا معمول بن گئی تھیں۔ نہ کبھی اکتاتے نہ شکوہ مند ہوتے

اپنی زندگی میں دو مرتبہ (۱۹۴۶ء اور ۱۹۵۶ء) مولانا نے زیارت حرمین شریفین کے لئے حجاز مقدس کا سفر کیا۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۳ء کو سنٹرل مسلم ایسوسی ایشن آف ایسٹ افریقہ کی دعوت پر مشرقی افریقہ کے مشہور شہر نیروبی (کینیا) تشریف لے گئے۔ اور ۲۶، ۲۷ دسمبر کو وہاں مسلمانان افریقہ کے ایک نمائندہ اجتماع میں شرکت فرمائی اور اپنے قیمتی مشوروں سے اجتماع کی رہنمائی فرمائی۔ وہاں سے واپسی میں دارالسلام، یوگنڈا، ٹانگانیکا اور عدن میں چار ہفتے بغرض سیاحت گزارتے ہوئے ۲۸ جنوری ۱۹۵۴ء کو دہلی واپس پہنچے۔

آخری دنوں اپنے علاج معالجہ کی غرض سے امریکہ کا سفر کیا۔ ۱۶ اپریل ۱۹۶۲ء کو دہلی سے پرواز کی اور پونے تین ماہ میامی بیچ میں زیر علاج رہ کر ۱۲ جولائی کو علی الصباح دہلی واپس پہنچے۔ اگر صحت اور تندرستی مہلت دیتی تو امریکہ سے واپسی میں وہ امریکہ کے اہم مراکز اور پھر لندن، فرینک فورٹ اور قاہرہ ٹھہرتے ہوئے واپس آنا چاہتے تھے۔ افسوس کہ یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

یوپی، بہار، راجستھان، مدھیہ پردیش، گجرات و مہاراشٹر کی ریاستیں تو آئے دن ان کے اسفار کی گویا آماجگاہ تھیں۔ لیکن خاص طور پر ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء

یں مولانا نے جنوبی ہند کے جو دورے کئے۔ اپنی خصوصیات، بے پناہ مقبولیت، محبت سے بھرپور استقبال اور مولانا کے ساتھ عوام و خواص کی والہانہ عقیدت کے وہ یادگار منظاہرے تھے جو مولانا کے رفیق سفر کی حیثیت سے مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے، پہلے دورہ کرناٹک (اودنی، بیجاپور، باگل کوٹ، رایا درگ، بلاری، ہوسپیٹ دھارواڑ، بلگام، یا چھاپور، ہلیال، ہبلی، سرسی، جوگ فال اور آخر میں بھٹکل) کا اہتمام رفیق مکرم مولانا محی الدین منیری ایڈیٹر البلاغ بمبئی نے کیا تھا جو خود بھی بھٹکل کے رہنے والے ہیں۔

منیری صاحب نے بڑی سلیقہ مندی اور کمال نظم کے ساتھ پروگرام ترتیب دیا تھا۔ ایک ہفتہ میں ساڑھے تین ہزار میل کا سفر مکمل کر کے سفر کے حسن انتظام اہتمام سے مولانا بھی بے حد متاثر تھے اور ان مقامات میں عوام و خواص کو مولانا کی قائدانہ بصیرت سے استفادہ کا بھی بہت موقع ملا

دوسرا سفر مولانا نے جنوبی ہند میں پہلی بار جمعیۃ کی تنظیم کے لئے فرمایا تھا۔ پونا، شولاپور، نیتالی، مدراس، میسور، بنگلور، کورگ، اور مالابار تک تشریف لے گئے تھے۔ اس دورہ کے تاثرات ان ہی دنوں حیدرآباد کے ایک اخبار نے ان الفاظ میں شائع کئے تھے۔

"حیدرآباد ۳ ار جنوری ۱۹۵۳ء۔ ہندوستان ہمارا وطن ہے اور اس سرزمین پر بسنے والے ایک مسلمان کو بھی شہریت کے وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو کسی غیر مسلم کو اپنے وطن کی تعمیر اور ترقی کے لئے ہمیں بھی اپنی پوری صلاحیتوں کو کام میں لانا ہے اور ملک کو خوش حال بنانا ہے۔ اس ملک میں ایک باعزت شہری اور سچا مسلمان بن کر اپنی زندگی گزارنی ہے اور اپنی نسلوں کے لئے بھی اسی احساس کا ترکہ و وراثت باقی چھوڑنا ہے۔ یہ ہے جمعیۃ علماء کا وہ پیغام جو حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند کے ذریعہ جنوبی ہند کی فضا میں گونج اٹھا ہے اور جس نے مسلمانوں میں فکر و عمل کی نئی امنگیں پیدا کر دی ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کی جنوبی ریاستوں کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی آواز نے مسلمانوں میں بیداری اور زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کی اور تقسیم ملک کے بعد سے مسلمانان جنوب میں جو انتشار، عام احساس کمتری و بے نوائی پیدا ہو گیا تھا، مولانا موصوف کے اس دورہ کے بعد وہ انتشار و احساس ختم ہو کر ان میں پھر اجتماعی زندگی اور اپنے وطن میں اپنے مقام و موقف کا احساس پیدا ہوا۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جو کئی سال سے مسلمانان جنوب کے پیہم اصرار پر اس کوشش میں تھے کہ وہ ملک کے نئے حالات میں شمالی ہند کے بعد جنوبی ہند میں بھی مسلمانوں کو ان کا موقف و مقام بتلائیں۔ اور انھیں اجتماعی زندگی کی دعوت دیں یہاں موصول شدہ اطلاعات کے مطابق حضرت مولانا اپنے اس دورہ میں بمبئی و حیدرآباد کے بعد آندھرا، مدراس، بنگلور اور میسور تک گئے۔

خاص طور سے آندھرا، مدراس اور بنگلور و میسور کے جن مقامات میں مولانا محترم تشریف لے گئے، ہر جگہ کے مسلمانوں نے انتہائی جوش و ولولہ کے ساتھ مولانا کا استقبال کیا، اس لئے کہ انھیں کئی سال سے مولانا موصوف کی آمد کا شدید انتظار تھا اور ان کی آواز کو سننے کے لئے وہ بے چین تھے۔ یہ بات مستقبل کے لئے بہت ہی خوش آیند ہے کہ مسلمانان جنوبی ہند میں ملک کے بدلے ہوئے حالات اور وطن و ملت کے جدید تقاضوں کا احساس پیدا ہو گیا ہے اور پچھلے تصورات اور خیالات ان کے ذہنوں سے عام طور پر وہ دور ہو گئے ہیں۔ مدراس و آندھرا سے بھی بڑھ کر بنگلور و میسور کے مسلمانوں میں حالات کا احساس اور اجتماعیت کا جذبہ دیکھنے میں آیا، جو قومی زندگی کی پہلی نشانی ہے۔

بنگلور شہر میں مولانا محترم نے دو روز گزارے لیکن ان دو روز میں بلا مبالغہ ایک ہفتہ کا کام انجام پایا۔ صبح سے شام تک ایک مشین کی طرح مصروف کار رہ کر مولانا محترم نے تقریباً پندرہ اداروں اور مرکزوں کا معائنہ کیا اور ان کے عمائدین سے تبادلہ خیالات کیا۔ متعدد مقامات پر عام جلسوں میں بسوط اور بصیرت افروز تقریریں فرمائیں پریس کانفرنسوں میں شریک ہو کر جمعیۃ علماء ہند کے مقاصد و نصب العین کو روشناس کرایا۔ اور مختلف مسائل پر جمعیۃ کے نقطۂ نظر کی وضاحت فرمائی۔ مسلمانوں نے کس طرح اس آواز پر دھیان دیا اور کس طرح مولانا موصوف کے پیغام کو سننے میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ پروگرام کے ایک ایک دن میں آٹھ آٹھ دس دس سپاس نامے مولانا کو پیش کئے گئے اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کے مختلف اداروں نے اپنے اپنے معاملات اور احوال کو مولانا کے سامنے پیش کیا۔ مولانا موصوف سے عام مسلمانوں کی محبت اور اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ بلا مبالغہ ایک ایک دن میں تیس تیس اور چالیس چالیس سیر پھولوں کے ہار مسلمانوں نے مولانا کے گلے میں ڈالے اور اپنی پرخلوص عقیدت و محبت کا ثبوت دیا۔ مدراس اور اسی طرح بنگلور و میسور کے مسلمانوں نے مولانا موصوف کی آمد کے اس موقع پر اپنے نہایت کامیاب اور زیادہ سے زیادہ نمائندہ اجتماع بلائے۔ جن میں قدیم و جدید تعلیم یافتہ حضرات، علماء، مشائخ، فضلا و عمائدین، برادریوں کے نمائندے اور مزدور جماعتوں کے سرپنچ بھی شریک ہوئے"

لکھنؤ کانفرنس سے مسلم کنونشن تک

مجاہدِ ملت کی دُور آفریں خدمات

(انیس الحسن)

مولانا حفظ الرحمن ـــــ ۴۷ء میں

۱۵ اگست ۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا۔ اسی شب کے بارہ بجے پارلیمنٹ ہاؤس نئی دہلی میں انتقالِ اختیارات کا منشور پڑھا گیا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھوں رسمی تقریبات انجام پائیں۔ اس کے فوراً بعد لارڈ موصوف نے "گورنمنٹ ہاؤس" میں (جو اس وقت تک "وائسرائے ہاؤس" کہلاتا تھا) منعقدہ ایک بڑی بارونق اور بھرپور محفل میں ہندوستان کے نئے گورنر جنرل کا استقبال کیا۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب نے خوشی خوشی ان تمام تقریبات میں شرکت کی۔ تماشائیوں میں ہم وطنوں کے ساتھی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ مولانا مرحوم نے آزادیٔ وطن کے لئے جس طرح جان کی بازی لگائی تھی۔ اور جوانی کی تمام امنگیں اس کے لئے قربان کردی تھیں۔ ۱۵ اگست ۴۷ء کو جب ہندوستان کی فضاؤں پر حریت و استقلال کی صبحِ مقصود نمودار ہوئی تھی۔ اس کی مسرتوں اور طرب آفرینیوں کا پورا لطف بھی کچھ ان ہی کو حاصل ہوا ہوگا اور ان ہی کا حق تھا۔

بہرحال ملک کو آزاد ہونا تھا۔ ایک تاریخ آئی اور آزادی کی رسم پوری ہوگئی۔ آزاد ہندوستان کے جھنڈے لہرانے لگے۔ آزادی کے ترانوں سے فضائیں گونج اٹھیں۔ یہ سب کچھ ہوا ـــــ لیکن تھوڑی دیر کے لئے ـــــ اور اس کے بعد...... یکایک ـــــ ایک سناٹا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ ایک ہیبت ناک منظر اور جان لیوا دہشت گویا اس دھرتی پر بلاؤں کا دیوتا اپنے پورے غیظ و غضب کے ساتھ برس ہی پڑا ہو۔ تاریخ کو شاید انتظار تھا ایک ایسے وقت کا جو ہمیں ۱۵ اگست کی خوشیاں بھلادے وہ وقت بھی کچھ دور نہیں تھا، مگر کسے معلوم!

ادھر حضرت مولاناؒ کی چہیتی بیٹی خالدہ مرحومہ ان دنوں مرضِ دق کی آخری منزل میں تھی۔ تشویشناک حالت کی خبر آتے ہی ۲۵ اگست کو مولانا سیوہارہ تشریف لے گئے۔ چند ہی روز بعد خالدہ کا انتقال ہوگیا۔ غم میں ڈوبے ہوئے دل کے ساتھ مولانا ۷ستمبر ۴۷ء کو اس حالت میں دہلی واپس ہوئے کہ گھر کے سب ہی عزیزوں نے روکا، مگر کسی غیبی کشش نے بے اختیار مولانا کو دہلی پہنچا ہی دیا۔ بعد کے حالات نے بتایا کہ مشیتِ الٰہی کس اہم خدمت کے لئے مولانا کو دہلی لا رہی تھی۔

دہلی، آزاد ہندوستان کی راجدھانی، اس وقت تاریخ کے بدترین دور کے دروازے پر تھی۔ مغربی اور مشرقی پنجاب اس وقت قتل و غارت کی آگ میں جھلس رہے تھے۔ مغربی پنجاب سے برباد قافلے دھڑا دھڑ مشرقی پنجاب کی طرف کوچ کر رہے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ وحشت و بربریت کا بے قابو سیلاب دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پنجاب سے آنے والے برباد و مجروح پناہ گزینوں کی ٹرینیں دہلی اسٹیشن تک پہونچیں اور یہاں بھی ایک آگ بھڑک اٹھی۔ تین روز تک نہ صرف دہلی اسٹیشن پر قتلِ عام ہوتا رہا، بلکہ شہر کے اندر بھی کشت و خون کی وہ گرم بازاری ہوئی کہ آناً فاناً نئی دہلی کی وسیع آبادی، پہاڑ گنج، قرول باغ سبزی منڈی، شاہدرہ اور قرب و جوار کے دیہات سے لاکھوں مسلمان اُجڑ کر جامع مسجد اور مقبرہ ہمایوں میں پناہ گزین ہوگئے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب دہلی پہنچے ہی تھے کہ شہر کا یہ بھیانک نقشہ ان کو دیکھنا پڑا۔ ستمبر سے بہتر گھنٹے کے لئے کرفیو آرڈر نافذ کر دیا گیا۔ پورے شہر پر موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا جس میں کوئی آواز آتی تھی تو صرف گولیوں کی یا بے بس مظلوموں کی چیخ و پکار کی۔ رات بھر خوفناک نعروں کے ساتھ پورے پورے محلوں پر مسلح چڑھائیاں، دور دور تک آگ کی لپٹیں اور دھوئیں کے غول کے غول۔ ہر طرف چھرے بازوں اور بے باک لٹیروں کی گویا حکومت قائم ہو گئی تھی۔ ایک اندازہ کے مطابق چالیس ہزار کے قریب بے گناہ تین چار روز کے اندر اندر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ یہ قیامت جن کے سروں سے گزری ان کا تو ذکر ہی کیا، جو باقی تھے وہ بھی دم بخود پوری مایوسی کے ساتھ اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ اس بھیانک اور ہیبت ناک فضا میں جب کہ بڑے بڑے لیڈروں کے ہوش و حواس جواب دے رہے تھے یہ سوچنا بھی کہ اس سیلاب بلا کو روکتے، بے گناہوں کو موت کے چنگل سے نکالنے اور ان کے تحفظ کے لئے کوئی قدم اٹھانے کی کوئی گنجائش بھی باقی ہے کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ ایک مولانا ہی کا دم تھا، جو سر سے کفن باندھ کر اٹھے اور بنام خدا ان کی ہمت نے کچھ ساتھی بھی تلاش کر لئے جمعیۃ کا دفتر یکایک ریلیف کیمپ بن گیا۔ حالات انتہائی سنگین تھے۔ مگر مولانا مرحوم کی ہمت اور جوش عمل ان سے بھی کچھ سوا تھا۔ انھوں نے فوراً مقامی ایڈمنسٹریشن کو للکارا، جمعیۃ اور کانگریس کے باہمت کارکنوں کو جمع کیا اور اصلاح حال کی مؤثر تدبیر شروع کی۔

گاندھی جی کی آمد

اسی اثنا میں ۹ ستمبر کو گاندھی جی دہلی پہنچ گئے۔ دہلی اسٹیشن کی حالت ناگفتہ بہ تھی گاندھی جی کو شہر سے چار میل دور شاہدرہ اسٹیشن پر اتار لیا گیا اور وہ برلا ہاؤس نئی دہلی میں مقیم ہوئے۔

مولانا مرحوم، پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور سردار پٹیل کو شہر کی حالت سے آگاہ کر ہی چکے تھے، گاندھی جی کے پہنچتے ہی حضرت مولانا احمد سعید صاحب کو ساتھ لے کر گاندھی جی کے پاس پہنچے اور تمام سرگزشت سنائی۔ دوسرے روز گاندھی جی کو ساتھ لا کر مقامی پناہ گزینوں کی حالت دکھائی۔ شہر کے وہ علاقے جہاں سے مسلمانوں کی وسیع آبادیاں نیست و نابود کر دی گئی تھیں، دکھلائیں۔ اصلاح حال کی تدابیر ان کے سامنے رکھیں۔ لاکھوں برباد شدہ مسلمان جو جامع مسجد مقبرہ ہمایوں اور پرانے قلعہ میں پناہ گیر تھے۔ ان کے لئے کھانے پینے کا، کپڑوں کا، بیماروں کی دوا دارو کا اور دوسری ضروریات کا بندوبست کیا۔ جب تک یہ کیمپ باقی رہے۔ دن میں کئی کئی بار ان کا چکر لگانا، پناہ گزینوں کے لئے خوراک اور دوسری ضروریات مہیا کرانا۔ ہسپتالوں میں جا کر زخمیوں کو دیکھنا۔ مایوس دلوں کو تسلی دینا ادھر شہر کے باقی ماندہ مسلم محلوں کی حفاظت۔ راہ گیروں کے ساتھ قتل و غارت کے واقعات کی روک تھام، صبح سے شام تک ان سینکڑوں امدادی کاموں میں مولانا اس طرح مصروف رہتے کہ تنہا ان کی ذات باقی ماندہ مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز بن گئی تھی۔ جہاں تہاں واقعات کے تسلسل اور خطرات نے بچے ہوئے مسلمانوں کو اپنی گلیوں، محلوں میں محصور کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ روزمرہ کی ضروریات کے لئے اپنے محلہ سے باہر قدم نہیں نکال سکتے تھے۔ غیر مسلم علاقوں سے غذائی راشن بیماروں کے لئے دوائیں اور دوسری ضروریات زندگی فراہم کرنا، کوئی میت ہو جائے تو اس کی تکفین و تدفین کا بندوبست، زخمیوں کو ہسپتال لانا لے جانا وغیرہ وغیرہ یہ سب کام مدت تک حفاظتی دستوں کی نگرانی میں انجام پاتے رہے۔ مولانا مرحوم نے اپنے رفقاء کار کو فرداً فرداً ڈیوٹیوں پر لگا رکھا تھا۔ مولوی فقیہ الدین، سلطان یار خاں وکیل۔ مسٹر محمد احمد وکیل۔ شیخ عبد الحق پراچہ، محمد عثمان آزاد۔ عنایت الرحمٰن فاروقی اور بعض دوسرے رفقاء نے ان دنوں بڑی تندہی کے ساتھ شب و روز امدادی کاموں میں ہاتھ بٹایا۔ جمعیۃ کا مرکزی دفتر ان تمام کوششوں کا مرکز بنا رہا اور تمام کاموں کی نگرانی مولانا مرحوم فرماتے رہے۔

ادھر گاندھی جی، حکومت کے ذمہ داروں سے بھی زیادہ خود تمام حالات کی نگرانی کر رہے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔ مولانا احمد سعید صاحب اور دوسرے جماعتی رفقاء کو ساتھ لے کر ہر روز گاندھی جی کے پاس جاتے اور دن بھر کی روداد ان کو سناتے۔ پنڈت نہرو۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد، مولانا آزاد، سردار پٹیل اور بسا اوقات دہلی کے چیف کمشنر و ڈپٹی کمشنر سب وہیں جمع ہوتے اور ضروری ہدایات جاری ہوتیں۔ دلی کانگریس کے صاف دماغ دوستوں، بالخصوص چودھری برہم پرکاش۔ برج موہن، چودھری شیر جنگ۔ شریمتی سبھدرا جوشی، مس مردولا سارابھائی نے بھی پوری تندہی کے ساتھ حالات کو بہتر بنانے کے لئے دن رات کام کیا۔ جمعیۃ کے کارکن اپنے اپنے محلوں کے ضروری کاموں کو سنبھالنے میں بڑی جانبازی کے ساتھ مصروف رہے۔ ہر روز نئے نئے حوادث اور مشکلات سامنے آتیں اور ان کے لئے تدابیر عمل میں لائی جاتیں۔ ان تمام سرگرمیوں کا مرکز حکومت کی اعلیٰ سطحوں میں گاندھی جی کی ذات تھی اور مسلمانوں میں مجاہد ملت کا تنہا دم تھا رات دن کی مسلسل اور جان توڑ کوششوں کے بعد بھی کئی مہینے گزرے تب جا کر حالات میں بہتری کے آثار پیدا ہوئے، لیکن قتل و غارت گری کے ہنگامے جوں جوں کم ہوتے گئے مسلمانوں کے لئے زندگی کی نئی نئی الجھنیں سامنے آتی رہیں اور ہر ہر معاملہ کے لئے مستقل جدوجہد کرنی پڑی۔

جو علاقے مسلمانوں سے بالکل خالی ہوگئے تھے ان کے کچھ مکانوں میں مدفون دفینوں کی برآمدگی کا سوال سامنے آیا۔ چنانچہ بہت معقول پولیس فورس کے انتظام میں یہ دفینے برآمد کرائے گئے۔ ان علاقوں میں واقع مسجدوں، درگاہوں وغیرہ پر ناجائز قبضے ہوگئے تھے۔ بہت سی مسجدوں کو توڑ پھوڑ کر، یا آگ لگا کر برباد کر دیا گیا تھا۔ ان کی حفاظت، مرمت، انخلاء اور اصلاح کا معاملہ بڑا پیچیدہ بھی تھا اور خطرناک بھی۔ تاہم ناسازگار حالات میں اس کی جد وجہد بھی شروع کی گئی اور مدتوں مسلسل جاری رہی۔

سینکڑوں مسلمان سرکاری محکموں کے ملازم تھے، جو ان حالات میں گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کو اُن کی ڈیوٹیوں پر پہنچانا، ان کی رکی ہوئی تنخواہیں یا پنشنیں دلوانا بھی ناممکن ہو رہا تھا۔ بالآخر اسپیشل پولیس کی معیت میں آمد ورفت شروع کرائی گئی اور مہینوں یہ معمول جاری رہا۔ دسیوں محکموں میں ایسے لوگوں کے ہمراہ مولانا مرحوم نے کبھی مجھے اور کبھی مولوی فقیہہ الدین کو بھیجا۔

ایک اہم سوال یو۔پی اور دوسرے صوبوں کے ان ہزاروں مسلمانوں کا تھا جو دہلی کے ان ناگہانی حالات میں گھر کر رہ گئے تھے اور بے چین تھے کہ کسی طرح اپنے اپنے وطن پہنچ سکیں۔ چناں چہ مولانا مرحوم نے کوشش کر کے اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کرایا۔ دہلی کا بڑا اسٹیشن چوں کہ خطرات کا گڑھ بنا ہوا تھا اس لئے یہ اسپیشل ٹرینیں نظام الدین اسٹیشن سے چلائی گئیں۔ مگر نظام الدین اسٹیشن تک صحیح سلامت پہنچنا بھی مسلمانوں کے لئے ممکن نہ تھا۔ اس لئے شہر کے مسلم علاقوں میں ملٹری ٹرک مہیا کرائے گئے اور ان کے ذریعہ ہزاروں ہزار خوف زدہ اور پریشان حال مسلمانوں کو نظام الدین لے جا کر اسٹیشن پر سوار کرایا گیا۔ مولانا مرحوم یہ تمام کام اپنے کارکنوں کے سپرد کر کے بھی خود ساتھ ساتھ ضرور رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے، ان ہی دنوں جب ایک ٹرک کے ساتھ میں نظام الدین پہنچا تو ایک صاحب جو کسی اونچے گھرانے کے معلوم ہوتے تھے اور اسپیشل ٹرین پر سوار ہونے والے تھے۔ اتفاق سے ان کی بیوی کو اسی وقت وضع حمل کی تکلیف شروع ہوگئی، چہرہ سے بے انتہا پریشانی ظاہر تھی۔ بالآخر انھوں نے مولانا پر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ مولانا مرحوم نے فوراً ان کو اپنی کار میں ساتھ لیا اور شہر واپس لا کر ان کی بیوی کو خود اسپتال میں داخل کرایا اور کئی روز تک برابر ان کی خیریت طلبی کے لئے ہسپتال جاتے رہے۔

اسی طرح ایک اور ناگہانی صورت حال سامنے آئی۔ وہ یہ کہ مغربی پنجاب سے آئے ہوئے مشتعل اور زخم خوردہ پناہ گزین جب مسلمانوں کے خالی کئے ہوئے تمام علاقوں اور ان سے لوٹی چھینی ہوئی دکانوں، بازاروں پر قابض ہو چکے تو انھوں نے شہر کے چند باقی ماندہ مسلم محلّوں میں گھسنا شروع کیا۔ عام قتل وغارت گری کے لئے اب حالات میں زیادہ گنجائش نہ تھی تو انھوں نے ڈرا دھمکا کر یا نقد لالچ دے کر ان محلّوں میں مسلمانوں سے مکان اور دکانیں حاصل کرنے کی طرح ڈالی۔ ایسے بدنصیب مسلمانوں کی بھی کمی نہیں تھی جو آسانی سے ان کا شکار ہو جاتے تھے، لیکن یہ صورت حال جاری رہتی تو دہلی، مسلمان کے نام ونشان سے بالکل خالی ہو جاتی۔

مولانا مرحوم نے یہ معاملہ جب گاندھی جی کے سامنے رکھا تو خود گاندھی جی نے اس کا یہ حل تجویز کیا کہ ان مسلم محلّوں کو "مسلم زون" قرار دے دیا جائے اور ان میں غیر مسلموں کی آبادی کو ہر قیمت پر روکا جائے۔ اس تدبیر کی بدولت دہلی کی باقی ماندہ مسلم آبادی کو بڑا تحفظ حاصل ہوا ورنہ خدا ہی جانے آج دہلی کا کیا حال ہوتا۔

ایک طرف دہلی اپنے اس نازک اور بھیانک دور سے گزر رہی تھی۔ دوسری طرف شر وفساد کی فوجیں دہلی سے متصل ضلع گوڑگانوہ۔ پانی پت، الور، بھرت پور کی مسلم آبادیوں پر یلغار کر رہی تھیں۔ پانی پت کے مسلمان تو پہلے ہی حملہ میں اکھڑ گئے اور سوائے مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی کے سب ہی نے ترک وطن کے ارادہ سے بستر باندھ لئے، لیکن میوات کے سخت جان اپنے وطن میں رہنے کے لئے آخر تک مصیبتوں کا سامنا کرتے رہے۔ مولانا مرحوم ان ہی دنوں گاندھی جی کے ساتھ بار بار میوات بھی گئے اور پانی پت بھی۔ دونوں رہنماؤں نے وہاں کے مسلمانوں کو کافی سمجھایا اور اپنی کوششوں کا یقین دلایا۔

میوات کے مشہور قصبہ گھاسیڑہ میں پنجاب کے چیف منسٹر ڈاکٹر گوپی چند بھارگو بھی اس وقت موجود تھے، جب گاندھی جی اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب وہاں پہنچے اور میواتیوں کے بڑے اجتماع کو تلقین کی کہ اپنے وطن میں ہمت کے ساتھ رہیں اور وقتی مصیبتوں کو جرأت مندی کے ساتھ برداشت کریں۔ افسوس کہ پانی پت کے مسلمانوں نے اثر نہ لیا، لیکن میوات کے مسلمانوں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو، ہم اپنے وطن کو نہیں چھوڑیں گے۔ بحمد اللہ آج تک ہرگونہ مصائب

کے بعد بھی ان کی بڑی تعداد اپنے وطن میں آباد ہے ۔

بہرحال ہماری تاریخ میں جہاں ۴۷ء کے بھیانک دور کا تذکرہ ہوگا اور آنے والی نسلیں یاد کریں گی کہ دہلی، پر ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب کہ حالات کے غضب ناک تیور ایک ہی ضرب میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کو مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ وہاں مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کے عزم و کردار، مجاہدانہ کارناموں اور دور آفریں خدمات کا تذکرہ بھی تاریخ کا ایک زریں باب بن کر چمکتا رہے گا اور دنیا اس حقیقت کو محسوس کرے گی کہ ہندوستان کی راجدھانی "دہلی" میں ۴۷ء کی قیامت صغریٰ سے گزر کر مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ اپنے ظاہری اسباب و عوامل میں بڑی حد تک جس اولو العزم کردار کی مرہون منت ہے وہ صرف "حفظ الرحمٰن" ہی کا کردار تھا جس کے عزم و ثبات نے، جس کی بے پناہ جرأت و استقلال نے حوادث کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا رخ پھیر دیا، اور جس کی بدولت دہلی میں مسلمانوں کو انتہائی نازک حالات سے گزر کر ایک نئی زندگی نصیب ہوئی - اور ساتھ ہی وطن عزیز کی آبرو اور نیک نامی بھی باقی رہ سکی۔

واقعہ یہ ہے کہ (عالم اسباب میں) اگر مجاہد ملت کی ذات درمیان میں نہ ہوتی تو نہیں کہا جا سکتا کہ ۴۷ء کا انقلاب دہلی کی سرزمین پر اسپین کی تاریخ دہراتا یا بغداد پر تاتاری یلغار کی یاد دلاتا اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ پایہ تخت "دہلی" کا جب یہ حال ہوتا تو اس کے مرکزی اثرات کہاں کہاں تک پہنچتے اور کیا رنگ لاتے اللہ تعالیٰ مجاہد ملت کو اپنی بے اندازہ بخششوں سے نوازے اور مسلمانان ہند کی تاریخ پر ان کے گراں بار احسانات کی جزائے خیر عطا فرمائے کہ ایک ایسے بھیانک دور میں ان کی ذات ملت اسلامیہ کے وجود و حفاظت کا سہارا بنی اور آج دہلی ہی نہیں، پنجاب و میوات ہی نہیں بلکہ وہ تمام علاقے جہاں انقلاب روزگار کی محشر سامانیوں نے مسلمانوں کی قسمت سے کھیلنا چاہا، اگر پھر زندگی کی توانائیوں سے سرسبز و شاداب نظر آ رہے ہیں تو درحقیقت ان کی آبیاری اور پرورش میں مولانا مرحوم کا خون جگر پیوست ہوا ہے اور ان کی فکری اور عملی صلاحیتوں کا بڑا قیمتی سرمایہ بے دریغ صرف ہوا ہے ۔

لکھنؤ کانفرنس

شمالی ہند میں خونین حوادث کی اس گرم بازاری اور دور دور تک اس کے مہیب اثرات نے پورے ملک کی زندگی پر ایک لرزہ اور بحران طاری کر دیا تھا، خاص طور پر مسلم اقلیت تو انتہائی دہشت اور سراسیمگی کی گرفت میں تھی - اقلیت و اکثریت میں باہم انتشار اور بے اطمینانی بڑھتی جا رہی تھی اور یہ احساس وسیع پیمانہ پر پھیلتا جا رہا تھا کہ شاید تقسیم کے بعد ہندوستان کے مستقبل میں مسلمانوں کا کوئی موقف نہ ہوگا، یہ چیز بھی کا سب سے زیادہ شکار وہ طبقہ تھا جو تقسیم ہند سے پہلے بڑی قوت کے ساتھ مسلمانوں کی دردمندی اور قیادت کا دم بھرتا رہا تھا۔ بہرحال بد دلی، بے اطمینانی اور مایوسی کے یہ بڑھتے ہوئے احساسات جس طرح مسلمانوں کے حق میں خطرناک تھے اسی طرح ملک کی جمہوری زندگی اور صحت مند فضا کے لئے بھی ان کی سمیت اور ہلاکت آفرینی ظاہر تھی۔ اس صورت حال کا شدید تقاضہ تھا کہ ملک گیر پیمانہ پر کوئی اور قدم اٹھایا جائے جو ناخوشگوار حالات میں ملک کو ایک نئی روشنی دکھائے، اکثریت و اقلیت میں باہم اعتماد پیدا کر سکے۔ اور دلوں کے خوف و ہراس کو دور کر کے مسلمانوں کے ماضی اور حال کو مستقبل کے ساتھ جوڑ سکے۔ وقت کے اس تقاضہ کو پوری قوت کے ساتھ امام الہند مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے محسوس کیا اور انہی کے ایماء پر ۲۷، ۲۸ دسمبر ۴۷ء کو لکھنؤ میں آزاد مسلم کانفرنس بلائی گئی جس کے پہلے ہی اعلان نے دور دور تک مسلمانوں کی نگاہوں میں امید کی ایک نئی چمک پیدا کی اور بڑی توقعات کے ساتھ جوق در جوق مسلم عوام و خواص اس میں شرکت کے لئے لکھنؤ پہنچ گئے۔

مقررہ تاریخوں میں یہ کانفرنس اپنی بے مثال کامیابی کے ساتھ منعقد ہوئی اور اس میں مولانا آزادؒ کے قائدانہ خطاب اور مجاہد ملت و ولولہ انگیز تقریر (جو صفحہ ۲۳۵ پر درج کی جا رہی ہے) نے حالات سے سہمے ہوئے مسلمانوں کو جرأت مندانہ زندگی اور اعتماد و خودداری کا جو پیغام دیا اور زندگی کے جو عزم اور حوصلے بخشے، اس نے پورے ملک کی فضا ہی بدل کر رکھ دی اور آج پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ کے اس تاریخی اجتماع میں ان دونوں بزرگوں نے ملک ملت کو جو رہنمائی عطا کی، وہ درحقیقت اس برصغیر میں جمہوری زندگی کا حرف آغاز اور ہندوستان کے مستقبل میں مسلمانوں کے باوقار موقف کا سنگ بنیاد تھا

دینی تعلیم کی ملک گیر تحریک اور اس کی آبیاری

آزاد ہندوستان کی جمہوری زندگی میں ملت اسلامیہ کی حفاظت اور اس پر منڈلاتی ہوئی آفات و مشکلات کے انسداد و مدافعت کی خاطر حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب نے جہاں دوسرے بے شمار کارہائے نمایاں انجام دیئے، وہاں دین و ملت کی سب سے اہم بنیادی اور تعمیری خدمت جس کی سعادت انہیں نصیب ہوئی وہ دینی تعلیم کی ملک گیر تحریک اور اس کی آبیاری ہے۔

۱۹۴۷ء کے سیاسی انقلاب کے بعد اگرچہ فوراً ہی ہنگامی حالات اور ناگہانی مصائب پر سعی و عمل کی بیشتر فرصتیں ضائع ہوتی رہیں، تاہم دور اندیش نگاہیں ان حالات میں بھی فکر مستقبل سے غافل نہیں رہیں۔

جمعیۃ علماء نے امام الہند مولانا آزاد کی رہنمائی میں ۲۰ مارچ ۱۹۴۸ء کے اجلاس دہلی میں پارلیمنٹری سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے اور اپنی تمام صلاحیتیں تعلیمی اور تہذیبی خدمات کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کیا۔ ادھر ملک کی جمہوری زندگی تیزی کے ساتھ نئے افکار و رجحانات کی طرف بڑھ رہی تھی اور یہ خیال ایک قطعی فیصلہ بنتا جارہا تھا کہ کروڑوں انسانوں کی اس وسیع آبادی کو جہالت و پسماندگی سے نکالنے کے لئے دنیوی تعلیم کی عام اور جبری اشاعت بے حد ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رہنمایان وطن کا یہ نظریہ اپنی جگہ بالکل درست بلکہ قابل قدر و تحسین تھا اور وطن عزیز کی اصلاح و ترقی کے لئے اس کی افادیت سے نہ مسلمان انکار کرسکتے تھے نہ غیر مسلم۔ تاہم دنیوی تعلیم کی عام اور جبری ترویج کی تہ میں جو اشکال لازمی طور پر پیش آنا تھا وہ یہ تھا کہ جب ملک بھر میں بچوں اور بچیوں کے لئے دنیوی تعلیم حاصل کرنا اور پانچ یا چھ سالہ سرکاری نصاب کی تکمیل ضروری ہوجائے گی اور بلا استثناء ہر بچہ بچی کو تعلیم کی ابتدائی مدت سرکاری اسکولوں میں گزارنی ہوگی اور ساتھ ہی یہ بھی قطعی تھا کہ ملک کے سیکولر جمہوری نظام میں کسی بھی فرقہ اور مذہب کی تعلیم سرکاری نصاب کا جزو نہ ہوگی تو پھر مسلمان بچے جو عام طور پر قرآن حکیم اور دینیات کی تعلیم ٹھیک اسی عمر میں گھروں پر یا مدرسوں میں حاصل کرتے ہیں اس کی گنجائش کہاں کہ باقی رہے گی اور ملک بھر میں ان کے لئے کیا بندوبست ممکن ہوگا۔

اس عام اور لازمی اشکال کے ساتھ ساتھ کچھ دور اندیش نگاہوں کو گردش لیل و نہار کے آثار و قرائن میں وہ خطرہ بھی نظر آرہا تھا جو بہت جلد امر واقعہ بن کر سامنے آنے والا تھا اور بالآخر سامنے آکر رہا کہ ایک خاص مسموم ذہنیت نے سرکاری نصاب تعلیم کو (سیکولرزم اور دستور ہند کی ہر منشا کے خلاف) اکثریت کے مخصوص مذہبی رجحانات میں رنگنا شروع کردیا اور ایک خاموش کوشش شروع ہوگئی کہ نصاب تعلیم کے ذریعہ ابتداء ہی سے آنے والی نسل کا ذہن اس طرح ڈھالا جائے کہ اسلامی عقائد و نظریات سے اس کو کافی دور کردیا جاسکے۔

وطن عزیز کے مستقبل میں پیش آنے والی اس نازک صورت حال کا تدارک اگر ہوسکتا تھا تو صرف اس طور پر کہ پورے ملک میں مسلمانان ہند کے شعور و احساس کو بیدار کیا جائے اور ان کو آمادہ کیا جائے کہ حرارت ایمانی کے ساتھ مستعد ہوکر آگے بڑھیں اور وقت کی نئی آزمائشوں اور ناسازگار حالات میں دین مبین کی مقدس امانت کو اپنے سینوں سے لگائے رکھنے اور اپنی نسلوں کے لئے بحفاظت باقی چھوڑنے کی تدابیر میں لگ جائیں۔ اس کے ساتھ ہی ملک گیر پیمانہ پر ایسی کوششیں منظم کی جائیں کہ مسلمان بچے ابتدائی عمر ہی میں (دنیوی لازمی تعلیم کے ساتھ ساتھ بھی) اپنے مذہب اور دینیات کی تعلیم اور عقائد و احکام کا ضروری حصہ حاصل کرسکیں اور دین حق کی روشنی آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے قابل ہوسکیں، تاکہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے بعد جس طرح وہ وطن عزیز کے معزز شہری ہوں اسی طرح خدائے واحد کے سچے پرستار اور دین محمدی کے علم بردار بھی بن سکیں۔

اس کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ ایک مختصر اور سہل دینی نصاب مرتب کیا جائے جو کم سے کم وقت میں مسلمان بچوں کو دین کے مبادیات، عقائد، احکام اور اخلاق سے آراستہ کرسکے اور سب سے بڑی ضرورت اس کی تھی کہ بے حسی، تعطل اور انتشار کی عام فضا میں ایک منظم اور وسیع تحریک پھیلا کر مسلمانان ہند میں اتحاد و عمل کی اسپرٹ پیدا کی جائے اور ان کو غفلت و جمود سے نکال کر سعی و اقدام کے لئے بیدار و مستعد کیا جائے۔

انقلاب ۴۷ء کے بعد ہندوستان کی وسعتوں میں ملت اسلامیہ کی یہ ٹھوس اور بنیادی خدمت اپنے دور رس نتائج اور اہمیت کے لحاظ سے کتنی قیمتی خدمت ہے اس کا پورا احساس شاید مسلمانوں کی آئندہ نسلیں ہی کر سکیں گی۔ بہرحال ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمانان ہند کی کوئی تحریک اور تنظیم گردش روزگار کے سامنے قائم نہیں رہ سکی تھی صرف جمعیۃ علماء ہی تھی جو اپنی شاندار روایات اور بے داغ کردار کے ساتھ انقلاب کی زور آزمائی کا مقابلہ کر سکی اور وہی قوت عمل کا ایک خزانہ تھی جو اس بار عظیم کو اپنے کاندھوں پر اٹھا سکتی تھی اور بالآخر اس نے اس فریضۂ خدمت کو سنبھالا اور ناسازگار حالات میں باحسن وجوہ انجام دیا۔ جمعیۃ کے حلقوں میں اس احساس کو بیدار کرنے والی سب سے پہلی شخصیت حضرت مولانا ناظم زادہ کی تھی۔ حضرت موصوف نے اپنی بے مثل فراست اور دور اندیشی کے ساتھ مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند میں بیٹھ کر ۴۸ء ہی سے اس کی سلسلہ جنبانی فرمائی اور رفقاء جماعت کو مشورہ دیا کہ جماعتی مقاصد میں دینی تعلیم کی مہم کو سب سے مقدم رکھ کر آگے بڑھیں۔ چنانچہ اس کامیاب اور مفید رہنمائی کی روشنی میں جمعیۃ نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ (اپریل ۴۹ء) میں دینی تعلیم کی مہم کو اپنا سب سے اہم پروگرام قرار دیا۔ اور اس کے خدام اس مہم کی ساخت پرداخت میں لگ گئے۔ مجوزہ نصاب کی تدوین و ترتیب کی سعادت اکثر و بیشتر حضرت مولانا محمد میاں صاحب کے حصہ میں آئی اور ملک گیر پیمانہ پر اس مہم کو برپا کرنے کا شرف مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ تعطل و انتشار کے اس دور میں اپنے اثر و نفوذ کے ساتھ پورے ملک پر اثر انداز ہونے اور مسلمانان ہند کو اس خالص تعمیری اور خاموش دینی خدمت کے لئے آمادہ و مستعد کر دینے والی جوہری شخصیت تنہا مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی ہی شخصیت تھی۔ اپنی ہر دلعزیزی اپنے ملک گیر تعارف و اعتماد، بے نظیر خطابت اور جذبۂ عمل کے ساتھ جب مولانا مرحوم اس مہم کو لے کر اٹھے تو ایک ہی آواز پر ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمانان ہند کے جمود و غفلت نے دم توڑ دیا، ان کے شعور و احساس میں ایک حرکت رونما ہوئی اور ملک کی فضا "دینی تعلیم" کی پکار سے گونج اٹھی۔

حضرت مولانا مرحوم خدمت و عمل کی دوسری ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس پیغام کو لے کر ملک میں نکلے تو بہت ہی جلد انھوں نے ایک ملک گیر انقلاب بپا کر دیا۔ مسلمانان ہند کے تمام ہی حلقے، مکاتب فکر، امیر و غریب، عوام و خواص یہاں تک کہ خالص جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی اس تحریک کی ضرورت اور وقت کے تقاضوں سے آشنا ہو گئے اور ملک کے چپہ چپہ پر مجاہد ملت کی تقریروں اور بیانوں نے ایک ایسا سماں پیدا کر دیا کہ ہر طرف یہاں تک کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے خالص جدید ماحول سے بھی استعداد و آمادگی کی صدائیں اٹھنے لگیں اور دینی تعلیم کی مہم وقت کی ایک پکار بن گئی۔ ہر طرف بیداری کی ایک لہر، آمادگی عمل اور اس تعمیری مہم سے وابستگی کا مظاہرہ، ان شاندار اجتماعات اور کانفرنسوں میں ہوا جو اس دوران میں جا بجا منعقد ہوئیں اور جن کی رہنمائی مجاہد ملت اور دوسرے بزرگان جمعیۃ نے فرمائی۔ خصوصیت سے احمد آباد کی بے مثال دینی تعلیمی کانفرنس جو ۱۹، ۲۰ اکتوبر ۵۲ء کو حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ کل راجستھان دینی تعلیمی کانفرنس جے پور جو ۲۳، ۲۴ دسمبر ۵۳ء کو حضرت مولانا سید محمد شاہد فاخری کی صدارت میں ہوئی۔ الہ آباد کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۲، ۳ اپریل ۵۵ء زیر صدارت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی۔ بھورہ ضلع بلیا کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۲۸ مئی ۵۵ء بصدارت مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی۔

مشرقی یو، پی کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ خلیل آباد ضلع بستی ۳۱ مارچ ۵۶ء اور ان سب کے بعد رائے پور (مدھیہ پردیش) دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۱۳، ۱۴ مئی ۵۸ء بصدارت سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب جس کا افتتاح وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد صاحب نے کیا۔ بمبئی کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۸، ۹ مارچ ۵۹ء زیر صدارت دیوان سید عنایت حسین صاحب مرحوم سجادہ نشین آستانہ خواجہ اجمیری (جس میں وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو بھی شریک ہوئے) اجین میں مدھیہ بھارت دینی تعلیمی کانفرنس بصدارت مولانا مسعود احمد صاحب صدیقی منعقدہ ۶، ۹ نومبر ۵۹ء مرہٹواڑہ کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ میرج ۲۳، ۲۴ اکتوبر ۶۰ء اور پالنپور (گجرات) کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۲۵، ۲۶ جون ۶۱ء بصدارت مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی۔

یہ اور ان کے علاوہ اور بیسیوں اجتماع جو ملک کے مختلف حصوں میں جمعیۃ کانفرنس کے عنوان سے اس دوران میں منعقد ہوئے۔ ان تمام اہم اجتماعات اور کانفرنسوں میں جس طرح مجاہد ملت نے شرکت فرمائی اور دینی تعلیمی تحریک پر اپنی ولولہ انگیز تقریروں اور ولولہ آفریں پیغام عمل سے مسلمانان ہند کے قلوب و اذہان کو منور کیا، اسی طرح یہ تمام اجتماع اس عام بیداری، لگن اور تحریک سے گہری وابستگی کے شاندار مظاہرے تھے، جو مجاہد ملت کے انقلاب آفریں پیغام نے ایک

خالص تعمیری خدمت کے لئے پورے ملک میں پیدا کردی تھی۔ یقیناً ناسازگار حالات اور بے سروسامانی کے عالم میں اس دینی تحریک کی کامیابی اور تیز رفتار پیش رفت کا محور مجاہد ملتؒ کی عظیم شخصیت اور ان کی ان تھک جدوجہد ہی تھی جس کی بدولت وہ ملک کی ایک زندہ اور پائیدار تحریک بن سکی اور بفضلہ تعالیٰ ملک کے گوشہ گوشہ میں آج ملت اسلامیہ اس کی نفع بخشیوں سے مستفید ہو رہی ہے

دینی تعلیمی کنونشن بمبئی

وحدت فکر و عمل کا ایک تاریخی مظاہرہ

۱۹۴۹ء سے مسلسل اپنے اسفار اور دوروں، تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ حضرت مولانا مسلمانان ہند کے شعور و جذبات کو بیدار اور دینی تعلیم کے تقاضوں سے آشنا کر چکے تو ضرورت محسوس ہوئی کہ اس عام بیداری اور آمادگی کو ایک مربوط و منظم عملی پروگرام دے کر کام میں لگا دیا جانا چاہئے، چنانچہ مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اجلاس بمبئی منعقدہ مارچ ۱۹۵۴ء میں کل ہند پیمانہ پر ایک نمائندہ اجتماع بلانے کا فیصلہ کیا کہ فکر و شعور کی وحدت اور ہم آہنگی کے ساتھ مسلمانان ہند کے تمام مکاتب خیال دینی تعلیمی مہم کا ایک دستور کار مرتب کر سکیں اور اس کے مقاصد کو بروئے کار لا سکیں۔ اپنی نوعیت کے اس بے مثال اور تاریخی اجتماع کے اہتمام و انصرام کی ذمہ داری مجاہد ملت رح کے سوا کون نباہ سکتا تھا۔ بمبئی کے رفقاء کرام نے حضرت مولانا کو فراخ دلی کے ساتھ اپنا پورا اعتماد اور تعاون پیش کیا اور بالآخر ۸، ۹ جنوری ۱۹۵۵ء کو قیصر باغ ہال بمبئی میں ملت اسلامیہ کا وہ تاریخی اجتماع "کل ہند دینی تعلیمی کنونشن" کے نام سے منعقد ہوا۔ جو ظاہری شان و شوکت حسن انتظام و انصرام کے علاوہ اپنی اثر آفرینی اور افادیت، مکمل نمائندگی بے مثال کامیابی اور وحدت فکر و عمل کے لحاظ سے بھی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک بے مثال اجتماع تھا۔ جہاں ملت اسلامیہ کے وہ تمام گروہ حنفی، شافعی، مالکی، مقلد، غیر مقلد، شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، خوجے، بوہرے، حسینی فاطمی وغیرہ جدید اور قدیم ماحول و مزاج کے اہل علم و ماہرین تعلیم، سربرآوردہ اکابر و زعماء جن کے فکر و عمل کے دائرے ہمیشہ جدا جدا رہے ہیں ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے اور وحدت کلمہ کی بنیاد پر ایک خالص دینی نصب العین کے لئے سر جوڑ کر بیٹھے اور صفائی قلب و ذہن کے ساتھ دینی تعلیمی مہم کو اپنا کر اٹھے اور اتحاد و عمل کا ایک یادگار نمونہ تاریخ کے حوالے کر گئے۔

کنونشن کا افتتاح صدر جمعیۃ علماء ہند حضرت شیخ مدنیؒ نے فرمایا ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کنونشن کے صدر۔ ملا یوسف نجم الدین صاحب صدر استقبالیہ اور الحاج احمد غریب صاحب جنرل سکریٹری مجلس استقبالیہ مہمان داری اور انتظامات کے روح رواں تھے۔ کنونشن نے اپنے غور و فکر کے نتائج ایک کل ہند دینی تعلیمی بورڈ کے سپرد کئے جس کی تشکیل میں پینتالیس نامور زعماء ملت و ماہرین تعلیم شریک ہوئے اور جنرل سکریٹری مجاہد ملتؒ بنائے گئے۔

جس وقت بمبئی میں یہ کنونشن منعقد ہو رہا تھا پورے ملک کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ ملک بھر کے مسلم اخبارات اور ارباب صحافت یہاں تک کہ جمعیۃ کے سیاسی مخالفین نے بھی جمعیۃ کی اس تحریک اور مجاہد ملت رح کے اس دور آفریں کارنامہ پر بے اختیار تحسین و آفریں کی صدائیں بلند کیں اور اس کی بے مثل کامیابی پر دلی تہنیت و تبریک کے پیغام بھیجے۔

دینی مدارس اور تعلیمی اداروں کی سرپرستی

اپنے دوسرے اہم قومی و ملی مشاغل اور ہنگامی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب کو عام تعلیمی سرگرمیوں سے بھی مسلسل شغف رہا۔ وہ خود دینی مدارس کے تعلیم و تربیت یافتہ تھے۔ فراغت کے بعد انھوں نے اپنی زندگی ایک استاذ اور معلم ہی کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ ابتداءً دار العلوم

دیوبند میں پھر پرائیویٹ مدارس اور اس کے بعد ڈابھیل، امروہہ وغیرہ میں انھیں علمی خدمت کی کافی سعادت حاصل ہوئی۔ آزادئ وطن کے بعد ان کے قیمتی اوقات کا بیشتر حصہ ہنگامی اور وقتی مسائل میں گزرا، لیکن اس دور میں بھی انھوں نے ملت کی جو سب سے اہم تعمیری خدمت انجام دی وہ جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے ملک گیر پیمانہ پر دینی تعلیم کی مہم برپا کرنا اور مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو الحاد و بے دینی سے بچا کر ان میں دینی حمیت و شعور اور حرارت ایمانی کا تحفظ و بقا ہی تھا، جس کے لئے انھوں نے پورے ملک کے دورے کر کے تحریر و تقریر کے ذریعہ برادران ملت کے شعور کو بیدار کیا اور وقت کے تقاضوں سے روشناس کرایا۔

دہلی کی تعلیم گاہیں

اس اہم بنیادی خدمت کے ساتھ ساتھ وہ موجودہ دینی مدارس اور دوسری تعلیم گاہوں کی ہر ممکن مدد اور سرپرستی بھی برابر فرماتے رہے۔ تقسیم ہند کے بعد دہلی کے مشہور دینی مدارس۔ مدرسہ امینیہ، مدرسہ عالیہ فتح پوری، مدرسہ حسین بخش، مدرسہ مولانا عبدالرب مرحوم نیز فتحپوری مسلم ہائی اسکول، دلی کالج اجمیری گیٹ اور اس کا اینگلو عربک ہائر سکنڈری اسکول، دہلی کی مسلم آبادی کے ساتھ ساتھ ویران ہو کر رہ گئے تھے۔ ان سب مدارس اور تعلیم گاہوں کو نئے سرے سے زندہ کرنے اور باقی رکھنے میں اور ان کی مشکلات کو دور کرانے میں بہت بڑا حصہ حضرت مجاہد ملتؒ کی مسلسل کوششوں کا ہے، وہ بذات خود ان تمام اداروں کی مجالس کے رکن رکین اور مددگار رہے اور اپنی انتہائی عدیم الفرصتی کے باوجود ان کی میٹنگوں میں پورے فکر و اہتمام کے ساتھ شریک ہوئے اور ان کے مسائل کو حل کراتے رہے۔

مدرسہ معینیہ اجمیر

اجمیر کی بربادی کے بعد جہاں درگاہ معلّٰی حضرت خواجہ اجمیریؒ کے تحفظ اور اس کے انتظامات کی اصلاح کے لئے مولانا مرحوم نے بھرپور کوششیں کیں، وہاں مدرسہ معینیہ اجمیر کی نشأۃ ثانیہ بھی حضرت مرحوم ہی کی مساعی جمیلہ کے سہارے عمل میں آئی اس مدرسہ کا افتتاح بھی خود حضرت مولاناؒ نے ۲۱ مارچ ۱۹۵۲ء کو اپنے دست مبارک سے فرمایا اور پھر زندگی بھر اس کے معاملات و مسائل میں مدد فرماتے رہے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ

تقسیم بنگال کے ہاتھوں کلکتہ کا مشہور مدرسہ عالیہ جو مقامی اصطلاح میں "کلکتہ مدرسہ" کہا جاتا ہے، ختم ہو گیا تھا۔ مجاہد ملتؒ نے حضرت مولانا آزادؒ وزیر تعلیم حکومت ہند کو توجہ دلا کر حکومت مغربی بنگال پر زور ڈلایا اور کافی جد و جہد کے بعد اس کا اجراء عمل میں آیا۔ مدرسہ کا تمام اثاثہ لٹ چکا تھا۔ از سر نو اس کی زندگی کے تمام سر و سامان مہیا کئے گئے۔ ابتداءً حضرت مولانا کے رفیق خاص "مولانا سعید احمد اکبرآبادی" اس کے پرنسپل رہے۔ بحمد اللہ آج مشرقی ہندوستان کا یہ بڑا مدرسہ علوم دینیہ و اسلامیہ کی خدمت گذاری میں مصروف ہے۔

دوسری درس گاہیں

جامعہ قاسمیہ مراد آباد۔ قادرت ہائی اسکول سیوہارہ۔ مسلم انٹر کالج اٹاوہ اور دوسری کتنی ہی درس گاہوں کو مسلسل حضرت مولانا کی عظیم شخصیت سے فیض پہنچا، وہ ایسے متعدد علمی اداروں کے رکن مجلس انتظامیہ رہے اور ہمیشہ ان کی مدد و رہنمائی فرماتے رہے۔

مدرسہ عالیہ رام پور۔ حمیدیہ کالج بھوپال۔ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ اور بعض دوسری اہم درس گاہیں جو تقسیم ہند سے پہلے سرکاری طور پر مستند اور اسلامی درس گاہیں رہیں اور دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کے مضامین اور دینی علوم بھی ان کے نصاب میں شامل رہے۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد متعلقہ ریاستی حکومتوں کے ذمہ داران محکمہ تعلیم مسلسل درپے رہے کہ ان کے نصاب سے اسلامی و مشرقی مضامین خارج ہو جائیں، بلکہ عملاً ان درس گاہوں کے سرکاری استناد (ریکگنیشن) کو ختم کر دیا گیا اور مروجہ امداد روک دی گئی۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں برسوں ریاستی حکومتوں سے مراسلت اور زبانی گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رکھا اور بالآخر ان کی قدیم حیثیت کو بڑی حد تک بحال کر دیا گیا۔

دسیوں چھوٹے بڑے دینی مدارس جو ٹونک، ہاپوڑ، بلند شہر، میرٹھ، مظفر نگر، امروہہ، بریلی، شاہجہاں پور، ہردوئی، مبارک پور، غازی پور وغیرہ میں چل رہے ہیں، اپنے معاملات و مشکلات میں حضرت مولانا مرحوم کی شفقتوں سے فیض یاب ہوتے رہے، ان مدارس کے سالانہ جلسوں میں بارہا مولانا مرحوم نے شرکت فرمائی ان کے لئے مالی امداد فراہم کرانے میں بھی کوشش اور سفارش کا بڑا وسیلہ حضرت مولانا ہی کی با اثر شخصیت تھی۔

جامعہ ملیہ دہلی

کے عمائدین و سربراہ بھی ۱۹۴۷ء کے بعد نئے اور الجھے ہوئے حالات میں مجاہد ملتؒ کی قیادت مندیوں سے جامعہ کے معاملات اور مشکلات میں مدد حاصل کرتے رہے اور بالآخر ان کو جامعہ کی با اختیار مجلس جامعہ کا رکن بھی بنا لیا گیا۔ ۱۹۵۹ء و ۱۹۶۰ء میں جبکہ جامعہ ایک اندرونی کش مکش اور الجھن سے گزر رہا تھا حضرت مولاناؒ ہی کی سعی و تدبیر نے اس کے لئے مسیحائی کا کام کیا اور ایک بڑے خلفشار سے جامعہ کو نجات حاصل ہوئی۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جو ہندوستان کی واحد مسلم یونیورسٹی ہے اور ہماری پچھلی ایک صدی کی عظیم الشان علمی وراثت ہے۔ لیکن ملکی سیاست میں اس اس کا ماحول، اس کی روایات اور سیاسی رجحانات تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں بالکل بے ربط اور اجنبی بن کر رہ گئے تھے۔ تحریک آزادی کے بالکل آخری دنوں میں علی گڑھ اسٹیشن پر قوم پرور ملکی رہنماؤں اور خاص طور پر حضرت مولانا آزادؒ اور خود حضرت مجاہد ملتؒ کے ساتھ جو حوادث پیش آچکے تھے ان کی یاد دلوں میں تازہ تھی۔ ۱۵ اگست ۴۷ء کی صبح اس عظیم درسگاہ کے لئے خطرات و آزمائش کا پیغام بن کر نمودار ہو رہی تھی۔ مگر یہی دونوں اولوالعزم رہنما تھے جو مسلم یونیورسٹی کے پشت پناہ بن کر سامنے آئے اور ان کی چارہ گری و دستگیری ملک کے نئے حالات میں مسلم یونیورسٹی اور اس کے عزت و وقار کو باقی رکھنے کا وسیلہ ثابت ہوئی۔ مولانا آزادؒ نے محترم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (موجودہ نائب صدر جمہوریہ ہند) کو بحیثیت وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کا سربراہ بنا کر بھیجا۔ ادھر شروع ۴۸ء ہی سے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے یونیورسٹی کے معاملات و مسائل سے دلچسپی لینی شروع کی اور ہر موقع پر اس کی مدد و رہنمائی میں پیش پیش رہے۔ یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے بھی پورے احترام اور قدرشناسی کے ساتھ حضرت مولانا کے تعاون اور مشوروں کو اپنایا اور یونیورسٹی کی ایگزیکٹو اور کورٹ کے معزز رکن کی حیثیت سے مسلسل ان کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک کے تنگ نظر حلقے ۴۸ء سے مسلسل مصروف کار رہے ہیں کہ اس یونیورسٹی کا نام و نشان تبدیل کر کے اس کی مخصوص حیثیت کو ختم کر دیا جائے۔ حکومت یوپی جس کی حدود کار میں مسلم یونیورسٹی واقع ہے اس کا رویہ شروع ہی سے بہت ہمدردانہ اور دوستانہ نہیں رہا۔ مرکز میں بھی ایک خاص طبقہ آج تک معاند اور نکتہ چین رہا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا نام بدل دینے کی بحثیں تو بارہا چھیڑی جا چکی ہیں۔ لیکن ۵۹ء و ۶۰ء میں ہند پارلیمنٹ تک میں مسلم یونیورسٹی کے خلاف کچھ کوششیں صف آرا ہو گئی تھیں۔ اس موقع پر تنہا مجاہد ملتؒ کی ذات تھی جو پارلیمنٹ میں مسلم یونیورسٹی کے دفاع اور مدافعت کیلئے سینہ سپر ہوئی۔ انھوں نے پارلیمنٹ میں ہی ان تمام الزامات اور نکتہ چینیوں کا جواب دیا جو یونیورسٹی کے خلاف عائد کئے گئے تھے۔ ساتھ ہی مرکزی وزارت تعلیم کی نظر میں یونیورسٹی کے دامن کو شکوک و الزامات سے صاف کرنے کے لئے پوری جدوجہد فرمائی۔ الغرض مسلم یونیورسٹی کے خلاف معاند اور تنگ نظر حلقوں کی ان تمام کوششوں کے تدارک اور روک تھام کے لئے جو سرگرمیاں پچھلے پندرہ برس میں مسلسل عمل میں آتی رہی ہیں اور جن کی بدولت مسلم یونیورسٹی کو تقسیم ہند کے بعد بقا و استحکام نصیب ہوا حقیقت یہ ہے کہ ان تمام سرگرمیوں کا محور امام الہند مولانا آزادؒ، ہمارے محبوب وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ ہی رہے ہیں

دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند جو ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی دینی درسگاہ ہے۔ مجاہد ملتؒ نے اس کے دامن فیض میں پرورش پائی تھی۔ مادر علمی کا حق خدمت جس گہرے احساس اور لگن کے ساتھ عمر بھر انھوں نے ادا کیا وہ درحقیقت بڑی سعادت و کرامت تھی جو ان کے حصہ میں آئی۔ مجاہد ملتؒ نہ صرف یہ کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین رہے بلکہ دارالعلوم کی فلاح و بہبود ان کے فکر و عمل کا نمایاں عنوان رہی ہے۔ خاص طور پر تقسیم ہند کے بعد کتنے ہی نئے اور پیچیدہ مسائل سامنے آئے جن کی عقدہ کشائی میں مولانا مرحوم کی با اثر شخصیت پیش پیش رہی۔ پاکستان اور دوسرے ممالک سے آنے والے طلبہ کے لئے پاسپورٹ اور ویزا کے نت نئے قوانین نے جب بھی کوئی پیچیدگی اختیار کی، مجاہد ملتؒ ہی کا اثر و رسوخ اس کو حل کرا سکا۔ ابھی آخری دنوں جب دارالعلوم پر ایک ناگہانی افتاد نازل ہوئی اور ریاستی حکومت نے بھی اس موقع پر غیر ہمدردانہ موقف اختیار کیا تو مولانا مرحوم ہی تھے جو سینہ سپر ہوئے اور پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں سے دارالعلوم کا دامن بے داغ رکھ سکے۔

دارالعلوم میں اسلامی ممالک کے سربراہ آئیں یا صدر جمہوریہ ہند، ان کے خیر مقدم میں دوسرے عمائدین کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کا یہ نامور فرزند عالی مقام بھی پیش پیش نظر آتا۔

مسافران حرم کی خدمت

حضرت مولانا مرحوم کو اپنی دوسری گراں بار مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ مسافران حرم کی خدمت گزاری اور ان کی سہولت و رفاہیت کا فکر بھی ہمیشہ عزیز رہا

کم و بیش ۲۹ء سے مسلسل حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سنٹرل حج کمیٹی
اور ہر ضرورت کے موقع پر مولانا مرحوم کی مساعی جمیلہ زائرین حجاز مقدس کے کام آسکیں۔
کے رکن رکین اور پورٹ حج کمیٹی بمبئی کے صلاح کار و مددگار رہے۔ اپنی وفات کے وقت مولانا ہی سنٹرل حج کمیٹی کے چیرمین تھے، حکومت ہند بھی حجاج کے معاملات
میں زیادہ تر آپ ہی کے قیمتی مشوروں پر اعتماد کرتی تھی کبھی بار حکومت کی فرمائش پر آپ نے بمبئی جاکر حجاج کے انتظامات، جہازوں کی ضروریات، کسٹم چیکنگ۔ بمبئی
کے قیام وغیرہ کا خود تفصیلی جائزہ لیا اور اپنی مفصل رپورٹ اور تجاویز حکومت کے سامنے رکھیں جو بیشتر عمل میں لائی گئیں۔

سب سے پہلی مرتبہ مولانا مرحوم نے، ستمبر ۵۰ء کو بمبئی پہنچ کر اپنے رفقاء کار حکیم اعظمی صاحب، مولانا حامد الانصاری غازی۔ الحاج احمد غریب صاحب وغیرہ
کے ہمراہ زائرین حرم کے انتظامات اور اسلامی جہاز کا معائنہ کیا۔ جہازوں میں حجاج کو دی جانے والی خوراک، پلنگ، روشنی، صفائی، ہوا، طبی ضروریات وغیرہ،
کسٹم چیکنگ، مسافر خانہ میں قیام، راشن۔ ٹیکہ وغیرہ تمام ہی معاملات پر ایک مبسوط رپورٹ مرتب کی جس کی بدولت آنے والے برسوں میں بہت کچھ اصلاحات
عمل میں آئیں۔ پھر ۹ جولائی ۵۱ء کو۔ ۱۵ اور ۱۶ جولائی ۵۴ء کو۔ ۲۳ جون ۵۵ء کو اور ۲۵ اپریل ۵۶ء بمبئی پہنچ کر اسی طرح تمام معاملات
کا معائنہ کیا اور برابر اپنے مفید مشورے حکومت ہند کے سامنے رکھتے رہے۔ اور وقتاً فوقتاً حجاج کو پیش آنے والی تکالیف و مشکلات کو بھی دور کراتے رہے۔

اپریل ۵۴ء میں ہندوستان سے باہر جانے والوں پر انکم ٹیکس کلیرنس سارٹیفکیٹ کی پابندی عائد ہوئی اور اس کی عملی دشواریاں حجاج کی کثیر تعداد کے لئے
ایک مستقل الجھن بنیں تو مولانا مرحوم نے فوراً سیکریٹری سنٹرل حج کمیٹی کو لکھا کہ حجاج کو اس پابندی سے مستثنیٰ کیا جائے۔ لیکن وزارت مالیات اس کے لئے آمادہ نہ
ہوسکی تو ۲۹ مئی کو عید الفطر کے روز حضرت مولانا خود وزیر اعظم ہند مسٹر نہرو سے ملے اور ان کو حجاج کی اس تکلیف پر توجہ دلائی۔ محترم وزیر اعظم نے دوسرے ہی
دن متعلقہ وزارتوں کو ہدایت فرمادی اور عام حجاج اس پابندی سے مستثنیٰ کر دیئے گئے۔

جون ۵۵ء میں عازمین حجاج کی تعداد معمول سے بہت زیادہ تھی، تمام جہاز پُر ہوچکے تھے۔ ہزاروں حاجی مایوس و ناکام بمبئی سے واپس ہورہے تھے
حضرت مولانا نے بمبئی ہی سے ٹرنک کال پر وزارت خارجہ کو توجہ دلائی اور بالآخر ان کی اس تجویز کو حکومت ہند نے منظور کرلیا کہ ہر جہاز میں مقررہ تعداد سے
دس فیصدی اضافہ کر دیا جائے۔ اس طرح مایوس عازمین کی بڑی تعداد زیارت حرمین سے بہرہ مند ہوسکی۔

۵۶ء میں حضرت مولانا خود سفر حجاز مقدس پر تشریف لے گئے۔ اس موقع پر بھی ہندوستان واپسی کے بعد آپ نے ساحل ہند سے حجاز مقدس تک
ہندی حجاج کے مسائل پر اپنی مفید تجویزیں حکومت کے سامنے رکھیں۔

عام طور پر ہر سال حج کے سیزن میں مولانا مرحوم بمبئی کا ایک سفر ضرور کرتے اور وہاں حجاج کی روانگی اور انتظامات کی دیکھ بھال، مسافر خانہ میں عام حجاج
سے ملاقات و گفتگو ضرور فرماتے۔

ستمبر ۵۶ء میں وزیر مالیات حکومت ہند مسٹر کرشنما چاری نے "خرچہ ٹیکس" کا بل پارلیمنٹ میں پیش کیا، مجاہد ملتؒ نے حج و زیارت کے مصارف، عام
مذہبی اخراجات، خیراتی اداروں کے چندوں اور بیرون ہند مقدس مذہبی مقامات کے لئے دی جانے والی رقوم کو اس بل سے مستثنیٰ کرانے کے لئے بڑی جد و جہد کی
اور بالآخر ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں

عالم اسلام سے روابط اور ان کی خیر سگالی

جمعیۃ علماء ہند کے مقاصد کار کا ایک اہم جز ممالک اسلامیہ اور خاص طور پر بلاد عربیہ سے روابط کی استواری اور انکی خیر خواہی و خیر سگالی بھی ہے۔
اس عنوان کے تحت جمعیۃ نے اپنے پچھلے دور میں تقسیم فلسطین کے عزائم اور صیہونی تحریک کے خلاف مسلمانان ہند کی رائے عامہ کو بیدار کرنے اور ان کے
جذبات کو بین الاقوامی سیاسی اسٹیج تک پہنچانے میں اپنا شاندار کردار پیش کیا۔ مجاہد ملتؒ بھی جمعیۃ کی اس تحریک میں پیش پیش رہے۔
ادھر مغرب اقصیٰ (شمالی افریقہ) کے مسلم ممالک، مراکش، تیونس اور الجزائر کی تحریک آزادی نے جب شدت اختیار کی تو ان کے برحق مطالبہ آزادی کی پرجوش
تائید وحمایت کے لئے جمعیۃ علماء کے اسٹیج سے مسلسل آواز بلند کی گئی، مجاہد ملت نے ۴۸ء میں اور اس کے بعد بار بار اپنے بیانات اور تقریروں میں جمعیۃ علماء کے نقطۂ نظر

کو پیش کیا۔ فرانس نے جب مطالبۂ آزادی کو بجبر دبانے کے لئے الجزائر میں وحشیانہ مظالم ڈھائے حضرت مولانا نے ہر موقعہ پر اس کے خلاف آواز بلند کی۔ ملک بھر کی ماتحت جمعیتوں کو ہدایات بھیج کر الجزائر ڈے کا اہتمام کیا۔ تیونس کے رہنما حبیب بورقیبہ، مراکش کے طیب سلیم اور الجزائر کے نمائندے حسین الاحول نے ہندوستان کے دورے کئے تو ان کے خیر مقدم اور تائید میں دوسرے ملکی رہنماؤں کے ساتھ ساتھ جمعیۃ علماء کی جانب سے مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ بھی پیش پیش رہے۔

نہر سوئیز کے قومیانے پر برہم ہوکر جب فرانس اور برطانیہ نے ستمبر ۵۶ء میں مصر پر یلغار کی۔ حضرت مولانا ان دنوں سفر حجاز سے واپس ہو رہے تھے۔ ہندوستان پہنچتے ہی انھوں نے اکتوبر ۵۶ء میں جمعیۃ کے سالانہ اجلاس منعقدہ سورت میں ایک خاص قرارداد کے ذریعہ مصر کے ساتھ دلی ہمدردی اور اس کی مظلومیت پر رنج وملال کا برملا اظہار کیا۔ سورت سے دہلی واپس پہنچتے ہی مصر کے سفیر ڈاکٹر مصطفیٰ کامل سے ملے اور مسلمانان ہند کی پیش کردہ امداد برائے مظلومین سوئیزان کے سپرد کی۔ ان کے علاوہ جب بھی مسلم ممالک کی نمایاں شخصیتیں ہندوستان آئیں مثلاً کرنل انوار السادات سکریٹری موتمر اسلامی (مصر) وسطی ایشیا کے بلاد سمرقند وبخارا سے مفتی ضیاء الدین ایشان باباخان۔ دمشق سے استاد سعید رمضان شیخ بھجۃ البیطار۔ استاذ عبد اللہ المبارک وغیرہ وغیرہ ان کے خیر مقدم اور برادرانہ تعارف و تقرب میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ صاحب ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ساتھ ذیل میں آپ نے ہندوستان کی تشریف آوری کے موقعہ پر جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے ۲۹ نومبر ۱۹۵۹ء کو تال کٹورہ گارڈن نئی دہلی میں اور ۱۰ دسمبر ۵۵ء کو بمبئی میں سعودی عرب کے سربراہ جلالۃ الملک سعود کے نہایت شاندار خیر مقدم اور عصرانہ کا اہتمام فرمایا۔ پھر ۱۱ فروری ۱۹۵۶ء کو کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی میں شہنشاہ ایران ہز مجسٹی رضا شاہ پہلوی اور ہر مجسٹی ملکہ ثریا کا، ۱۴ فروری ۱۹۵۸ء کو کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی میں شہنشاہ افغانستان ہز مجسٹی ظاہر شاہ کا اور ۳۰ مارچ ۱۹۶۱ء کو اسی کلب میں زعیم مصر صدر جمال عبدالناصر کا اسی طرح مہتم بالشان خیر مقدم کیا۔

اسلامی اوقاف کا تحفظ۔ راہ کی مشکلات اور ان کا تدارک

مسلم وقف ایکٹ ۔ ریاستی وقف بورڈوں کی تشکیل

ملک بھر میں پھیلے ہوئے لاکھوں اسلامی اوقاف، مساجد، مقابر، خانقاہوں، درگاہوں اور ان سے وابستہ دینی مقاصد کا تحفظ اور بقار بھی ایک اہم تعمیری مسئلہ تھا جس پر آزاد ہندوستان کے نئے جمہوری نظام وقوانین میں ایک متعین پالیسی کے ساتھ ملک گیر پیمانہ پر کوشش ضروری تھی

۴۷ء میں اور اس کے بعد دہلی، پنجاب، میوات، اجمیر اور راجستھان کے سرحدی اضلاع میں برباد شدہ اور مقبوضہ ہزاروں مساجد ومقابر، درگاہوں اور دیگر اوقاف کی بحالی، ناجائز قبضوں کا ازالہ، مرمت وصفائی، ان سے وابستہ زمینوں اور ملکیتوں کی بحالی وغیرہ فوری ہنگامی مسائل تھے جن پر پندرہ برس مسلسل حضرت مولانا نے جدوجہد جاری رکھی۔ ایک ایک مسجد، ایک ایک وقف ایک ایک درگاہ کے لئے ان کو بار بار متعلقہ حکام کو خطوط بھی لکھنے پڑے، وفود بھی بھیجنے پڑے دسیوں مرتبہ پنجاب، راجستھان اور اجمیر میں خود جاکر حالات کا مشاہدہ کرنے اور وزراء وحکام سے مل کر اصلاح حال کی کوشش بھی کرنی پڑی۔ مرکزی حکومت میں برسوں حضرت مولانا آزادؒ، وزیر بحالیات اور جنرل بھونسلے نائب وزیر بحالیات اور دوسرے ذمہ داروں سے سینکڑوں ہی مرتبہ مولانا مرحوم کو خود مل کر ایک ایک معاملہ کو ٹھیک کرانا پڑا۔

ان تمام کوششوں اور جانفشانیوں کے ساتھ ساتھ ایک نہایت اہم اور مستقل ضرورت تھی کہ یونین پارلیمنٹ اوقاف اسلامی کے بارے میں ایک جامع اور ملک گیر قانون وقف بنائے اور تمام ریاستوں میں اس کے مطابق ایسے ذمہ دار وقف بورڈ بنائے جائیں جو درو بست مسلم اوقاف کے تحفظ اور انتظام کے با اختیار ذمہ دار ہوں بحمد اللہ مولانا نے مسلمانان ہند کی اس اہم تعمیری خدمت کو بھی جمعیۃ علماء کے اسٹیج سے انجام دیا اور ان کی مساعی جمیلہ کامیاب ہوئیں، ۴۷ء، ۴۸ء کے ہنگاموں سے کچھ مہلت پاتے ہی یہ اہم مسئلہ جمعیۃ کی مجلس عاملہ میں اپریل ۴۹ء میں پیش کیا اور مسلسل دو سال کے غور وفکر کے بعد ماہرین قانون کے مشورہ سے شرعی نقطۂ نظر کے مطابق اسلامی اوقاف کے لئے ایک مسودہ قانون مکمل کیا گیا جو جمعیۃ کی طرف سے مرحوم محمد احمد کاظمی صاحب ایڈوکیٹ ممبر پارلیمنٹ نے ۱۲ اپریل ۵۱ء

کو پارلیمنٹ میں پیش کیا۔ اور حضرت مولانا نے   اس کی ضرورت پر وضاحتی تقریر فرمائی۔ پارلیمنٹ نے مسودہ کو غور و فکر کے لئے چیدہ کمیٹی کے سپرد کیا اور پھر رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے مشتہر کیا گیا۔ جمعیۃ علماء سے اختلاف رکھنے والے کچھ ناعاقبت اندیشوں نے اس موقع پر پورے ملک میں مخالفت کا ایک طوفان کھڑا کر دیا اور یہ مغالطہ دے کر کہ اس بل کی آڑ میں جمعیۃ علماء اور وہابی مولوی اوقاف اسلامی پر اپنا تسلط جمانا چاہتے ہیں۔ ایک نہایت ضروری تعمیری خدمت کی راہ میں حائل ہونے کی مذموم و ناکام کوشش کی۔ ان غلط کاروں کی روش نے معاملہ میں جو الجھن پیدا کر دی تھی۔ حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کو کافی محنت کر کے اس صورت حال کا تدارک کرنا پڑا۔ آخر کار اکثر صوبوں کے معتمد عوام و خواص نے بل کی ضرورت اور افادیت کی تصویب کی اور ۱۳ مارچ ۱۹۵۳ء کو چیدہ کمیٹی کی سفارش پر بحث و مباحثہ اور حضرت مجاہد ملتؒ کی وضاحتی تقریر کے بعد مسلم وقف بل ہند پارلیمنٹ میں منظور ہو گیا۔

اس سلسلہ میں ریاستی حکومتوں کا رجحان شروع ہی سے یہ رہا کہ ایک جمہوری نظام میں سب ہی فرقوں کے اوقاف کا مشترک بندوبست کسی ایک قانون کے تحت ہونا چاہئے۔ مسلم اوقاف کے لئے الگ مستقل قانون بنانا غیر ضروری ہے۔ لیکن دستور ہند کے مسلمات کی رُو سے چونکہ یہ خیال سراسر غلط تھا اور عملاً مسلم اوقاف کے لئے بڑا خطرناک ہو سکتا تھا۔ اس لئے مجاہد ملت نے پوری پامردی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔ تاہم وقف ایکٹ کے نفاذ کے بعد اس کی تعمیل اور وقف بورڈوں کی تشکیل میں ریاستی حکومتوں کی طرف سے ٹال مٹول اور دفع الوقتی کی پالیسی جاری رہی اور مجبوراً اس مرحلہ پر بھی مسلسل ایک مہم کی طرح کام کرنا پڑا۔

دہلی، یوپی، بہار اور بنگال میں ریاستی سطح پر پہلے سے اپنے اپنے وقف ایکٹ نافذ العمل تھے۔ ضرورت صرف اتنی تھی کہ تمام ریاستوں میں انتظامی سہولتوں اور یکسانیت کے لئے صوبائی وقف بورڈ نئے مرکزی ایکٹ کو اپنے یہاں اپنا کر دستور العمل بنا لیں، لیکن دوسری ریاستوں مثلاً پنجاب، راجستھان، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر آندھرا وغیرہ میں قانون کا نفاذ اور وقف بورڈوں کی تشکیل باقی تھی۔ اور اس کے لئے فرداً فرداً ہر ہر ریاست کے معاملہ میں حضرت مولانا کو خود بار بار جدوجہد کرنی پڑی۔ مرکزی وزراء سے بار بار توجہ مبذول کرائی۔ خود بھی مولانا مرحوم ان ریاستوں کے وزراء سے بار بار ملے۔ صوبائی جمعیتوں نے بھی تقاضے جاری رکھے تب بھی یہ مسلسل جدوجہد آندھرا، پنجاب، مدھیہ پردیش تک کامیاب ہوئی۔ راجستھان کا وقف بورڈ مولانا مرحوم کی آخری علالت کے ہی زمانہ میں بن پایا۔ کچھ ریاستیں ابھی تک باقی ہیں۔

اوقاف پر ناجائز قبضے اور قانون تمادی

اسی ذیل میں ایک اور اہم سوال سامنے آیا کہ پنجاب، میوات، دہلی وغیرہ میں جن مسلم اوقاف کے ناجائز قبضے ۱۹۴۷ء سے ابھی تک جاری ہیں اور مسلسل جدوجہد کے باوجود وہ بحال نہیں ہو سکے ہیں۔ بارہ سالہ قبضہ کا قانون تمادی ان کے لئے ایک مستقل خطرہ بن رہا تھا اور ناجائز قابضین اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو خدا تعالےٰ جزائے خیر دے کہ اس کے لئے بھی انھوں نے پوری بھاگ دوڑ کی۔ وزیر قانون سے ملے، ہوم منسٹر سے بات کی۔ قانون دانوں سے مشورہ کیا اور بالآخر صدر جمہوریہ ہند سے مل کر معاملہ کی نزاکت ان پر واضح کی اور اس کے نتیجہ میں ۲۱ جولائی ۱۹۵۹ء کو صدر جمہوریہ نے ایک خصوصی آرڈی نینس جاری کر کے ناجائز تصرفات میں تمام مسلم اوقاف کی حد تک قانون تمادی کی مدت ۱۲ سال سے بڑھا کر ۲۰ سال کر دی اور مسلم اوقاف ایک بڑے خطرہ سے محفوظ ہو گئے۔

اسی طرح ایک اور خطرہ اس وقت سامنے آیا جب کہ ستمبر ۱۹۵۷ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کا ایک لا کمیشن اس غرض کے لئے مقرر کیا گیا کہ وہ ہندوستان بھر کے خیراتی اداروں، اوقاف اور دوسرے عوام سکنا کی عطیات کے ملے جلے انتظام کے امکانات پر اپنی رپورٹ اور سفارش مرتب کرے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس رجحان میں لپٹے ہوئے خطرات کو بروقت محسوس کرتے ہوئے ایک بار پھر جدوجہد کی کہ اس کمیشن کی حدود کار سے اسلامی اوقاف کو دور رکھا جائے اور ان کا انتظام و اختیار مستقل حیثیت سے مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں باقی رہے۔ مولانا مرحوم کی مؤثر جدوجہد اس مرحلہ پر بھی کامیاب ہوئی اور مسلم اوقاف کے تحفظ کی راہ پیدا ہوئی۔

جہاں تک دہلی کے اسلامی اوقاف کا تعلق ہے ۱۹۴۷ء ہی سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (موجودہ نائب صدر جمہوریہ ہند) کے بعد حضرت مولاناؒ بذات خود، دہلی وقف بورڈ کے چیرمین رہے اور بارہ سال مسلسل دہلی کی مساجد، مدارس، مقابر اور تمام ہی وقف اداروں کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ کی نگرانی اور ان کے بقاء و تحفظ کی جان توڑ کوششیں فرماتے رہے۔ غرض یہ کہ اس تمام عرصہ میں ملک و ملت کی دوسری ہزاروں ذمہ داریوں اور اہم سے اہم معاملات کے فکر کے ساتھ ساتھ مولانا مرحوم کے قیمتی وقت اور توانائیوں کا بڑا حصہ اس راہ میں بھی صرف ہوتا رہا اور بفضلہ تعالےٰ اس نازک ترین دور میں اوقاف اسلامی کے تحفظ اور بقاء و فلاح کے لئے حضرت مولانا مرحوم بہت کچھ مفید اور کامیاب خدمات انجام دے کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

اُردو تحریک۔ قومی زبان کا مسئلہ اور اس کے عواقب

ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ ملک کی غیر قدرتی تقسیم نے "عمل اور ردعمل" کی جو ناگہانی صورت حال برپا کی اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ فکر و نظر کے تمام قالب بدل گئے اور متعدد بنیادی مسائل جو تحریک آزادی کے دنوں اپنی متعین صورت میں مسلمات کا درجہ رکھتے تھے، ملک کی وحدت کے ساتھ ساتھ ان کی متعین پوزیشن بھی بکھر کر رہ گئی، ان ہی مسلمات میں قومی زبان اور اردو کا مسئلہ بھی تھا۔

"آزاد ہندوستان کی قومی زبان وہ عام فہم ہندوستانی ہوگی جو پورے شمالی ہند میں رائج اور ملک کے دوسرے حصوں میں متعارف و مشہور ہے، اس کے رسم الخط اردو اور دیوناگری رہیں گے"، یہ تھا گاندھی جی کا واضح نظریہ جو کانگریس کے حلقوں میں طے شدہ مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن تقسیم ہند کی بدولت جوش و جذبات کا تلاطم ایسے سب ہی اصول اور مسلمات کو بہالے گیا اور ان کی جگہ غور و فکر کی نئی ادائیں بروئے کار آئیں۔ ٹھیک اس فضا میں (۱۹۴۹ء میں) قومی زبان کا سوال جب کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے سامنے آیا تو دو نقطۂ نظر زیر غور تھے۔ خود کانگریس پارٹی کا بڑا حصہ اس اہم سوال کو خالص وقتی جذبات کے رنگ میں دیکھ رہا تھا اور پوری قوت کے ساتھ اس پر تلا ہوا تھا کہ ہندوستان کی قومی زبان 'ہندی' ہو۔ بہت کم دماغ تھے جو جذبات کی سطح سے بالاتر ہو کر حقیقت بینی اور دور اندیشی کے ساتھ اس سوال کو طے کرنا چاہتے تھے۔ ان کی واضح رائے یہی تھی کہ عملاً پورے ملک کے لئے جو فیصلہ قابل قبول ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ گاندھی جی کی قطعی رائے کو بروئے کار لایا جائے۔ اور قومی زبان "ہندوستانی" رکھی جائے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اس گروپ کی صفوں میں پیش پیش تھے۔

مجھے آج تک وہ منظر یاد ہے کہ اس بنیادی مسئلہ کے تصفیہ کے لئے جس روز دستور ساز اسمبلی کی کانگریس پارٹی کا ایک ہنگامی اجلاس کانسٹی ٹیوشن ہاؤس نئی دہلی میں ہو رہا تھا۔ دونوں نقطہائے نظر کی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، مولانا مرحوم اور مسٹر رفیع احمد قدوائی مرحوم کے دست راست آنجہانی خورشید لال "ہندوستانی" کی حمایت اور پیروی میں سرگرم کار تھے۔ مولانا بار بار اجلاس میں جاتے اور آتے۔ اپنے ساتھی ایک ایک ممبر کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے اور بے چین تھے کہ کانگریس پارٹی حقیقت پسندی کے ساتھ قومی زبان کے مسئلہ کو طے کرے۔ اور پھر جب جذبات کی رو میں ڈوبی ہوئی عددی اکثریت 'ہندی' کا فیصلہ کرا کے گاندھی جی کی رائے "ہندوستانی" کو ہمیشہ کے لئے نظرانداز کر دیا گیا۔ مولانا مرحوم اپنے گہرے تاثر اور ملال کے ساتھ واپس آئے۔ ان کے دل پر ایک چوٹ تھی اور چہرے پر اپنی ناکامی سے زیادہ کانگریس کے بنیادی اصولوں کی شکست کا احساس۔

ان دنوں کانگریس پارٹی میٹنگ میں اور پھر دستور ساز اسمبلی میں قومی زبان کے عنوان پر حضرت مولانا نے جس وضاحت اور دلیری کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا اس کی یادگار مولانا کی وہ تقریر ہے جو اسی مجاہد نمبر کے صفحات میں کسی دوسری جگہ پیش کی جا رہی ہے۔ بہرحال دستور ساز اسمبلی میں لگاتار کوشش اور پیروی کے بعد بھی اردو زبان کے لئے صرف اسی قدر کامیابی ہو سکی کہ ملک کی دوسری تیرہ زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی ہندوستان کی ایک زبان تسلیم کر لیا گیا اور اس کے حقوق کی راہ متعین ہو سکی۔ لیکن فیصلہ اور دستور کی حد تک اردو کی ایک متعین حیثیت ہوتے ہوئے بھی جہاں تک عملی دنیا کا تعلق ہے اردو کے حق میں ہندوستان کی فضائیں برابر تنگ و تاریک رہی ہیں۔ بلکہ سرکاری دائروں میں اردو کے ساتھ معاندانہ سلوک اور قدم بقدم اس کو پامال کرنے کی روش بدستور آج تک قائم ہے اور واقعتہً ہماری تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ آزادی کے دور میں خود اسی ملک کی ایک زبان اردو کے حق میں ملک کی فضائیں اس قدر گھٹ کر رہ گئی ہیں کہ بڑی سے بڑی جمہوری اور دستوری کوششیں، ہر فرقہ اور خیال کے اونچے سے اونچے ارباب فکر و نظر اور محبوب وزیراعظم ہند کی انتہائی بااثر و بانفوذ شخصیت بھی اردو کی قدر و قیمت کے برملا اعتراف سے زیادہ عملاً اس کے جائز حقوق دلانا تو درکنار، اس کے حقوق کی پامالی کو بھی آج تک نہ روک سکیں

بہرکیف تاریخ کے اس منفی ریکارڈ اور حالات کی انتہائی ناسازگاری کے باوجود ملک کا ایک سنجیدہ حلقہ پچھلے پندرہ سولہ برس میں مسلسل سرگرم کار رہا اور اس کی تحریک آج بھی جاری ہے کہ اردو کے حق میں دستور ہند کی دی ہوئی گنجائشیں عملاً بروئے کار لائی جائیں اور ہندوستان کی اس عظیم زبان کو بھی ہندوستان میں زندہ رہنے اور پھولنے پھلنے کے مواقع حاصل ہوں۔

اس تحریک کے قائدین میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جتنی جانفشانی اور سرگرمی کے ساتھ کام کیا وہ انہی کا حصّہ تھا۔ اپنی مصروف ترین زندگی اور کاموں کے بے اندازہ ہجوم میں بھی انھوں نے پچھلے پندرہ برس مسلسل اردو کے لئے وہ سب کچھ کیا جو کسی بڑی سے بڑی تحریک کا قائد اپنے نصب العین کے لئے کر سکتا ہے۔ ہند پارلیمنٹ کے اندر اور اس سے باہر اردو تحریک کے ہر قدم پر وہ پیش پیش رہے۔ کل ہند انجمن ترقی اُردو کا کوئی اہم سے اہم فنکشن ہو یا دلّی کی مقامی اردو سبھا کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا جلسہ، مولانا مرحوم پورے اہتمام اور لگن کے ساتھ اس میں شریک ہوتے اور اس کے انکار و اعمال میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔

اس پورے دور میں اردو تحریک کا بنیادی پروگرام یہ رہا کہ دہلی، پنجاب، یوپی وغیرہ شمالی ہندوستان میں اردو کو علاقائی زبان کے طور پر پورے حقوق حاصل ہوں اور دوسری کوشش یہ کہ سرکاری تعلیم گاہوں میں، دفاتر اور عدالتوں میں تعلیمی نصاب اور سرکاری لٹریچر میں اردو کے ساتھ جہاں جہاں معاندانہ سلوک ہو رہا ہے اس کی روک تھام ہو اور اردو کے ساتھ انصاف کے لئے مسلسل پیروی و چارہ جوئی کی جائے۔ حضرت مولانا مرحوم نے جس سرگرمی کے ساتھ اردو تحریک کے دونوں پہلوؤں پر کام کیا۔ افسوس کہ اس کی تفصیل ان مختصر صفحات میں نہیں سما سکتی۔ اس لئے اپنی ڈائری کی یادداشتوں سے کچھ واقعات پیش کر رہا ہوں۔

سب سے پہلے ۲۲ مئی ۵۱ء کو انجمن ترقی اردو کا ایک وفد اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کی شکایات کا ایک محضرنامہ لے کر لکھنؤ میں یوپی کے وزیر تعلیم شری سمپورنانند سے ملا۔ اس وفد میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔ قاضی عبدالغفار مرحوم شریک تھے۔

۲۲، ۲۳ دسمبر ۵۱ء کو لکھنؤ میں کل ہند اردو کانفرنس ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اردو کے حقوق کی قانونی اور دستوری جدوجہد کے لئے بیس لاکھ دستخطوں کی مہم کا فیصلہ ہوا۔ حضرت مولانا نہ صرف یہ کہ کانفرنس میں شریک ہوئے۔ بلکہ اس کے اہتمام و انصرام میں بیشتر حصہ مولانا مرحوم ہی کی کوششوں کا تھا۔

۲۱-۲۲ مارچ ۵۲ء۔ اجمیر میں کل ہند اردو کانفرنس (قاضی عبدالغفار مرحوم کی صدارت میں) ہوئی۔ اس کا افتتاح مجاہد ملت ؒ نے ہی فرمایا تھا بیس لاکھ دستخطی مہم کو کامیاب بنانے میں جہاں جہاں ضرورت ہوتی مجاہد ملت ؒ خود سفر کر کے گئے۔ جلسوں میں شریک ہوئے۔ جمعیۃ علماء کی شاخوں اور کارکنوں کے ذریعہ اس مہم کو کامیاب بنانے میں پوری مدد فرمائی۔ جب مسلسل جدوجہد کے بعد بیس لاکھ دستخط پورے ہو گئے تو ۲۵-۲۶ جولائی ۵۳ء کو لکھنؤ ہی میں انجمن ترقی اردو کی دوسری کانفرنس ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں دستخطی مہم کی روداد اور فراہم شدہ دستخطوں کو صدر جمہوریہ ہند کے سامنے لے جانے کا پروگرام زیر غور تھا۔ اس کانفرنس کے انکار و اعمال میں بھی حضرت مولانا نے پورا حصہ لیا۔

۱۵ فروری ۵۴ء کو نئی دہلی میں انجمن کا معزز وفد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی سرکردگی میں ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند سے ملا اور یوپی میں اردو کو علاقائی زبان قرار دینے کے لئے بیس لاکھ سے زائد انسانوں کے تحریری مطالبہ کا گراں بار ریکارڈ صدر موصوف کو دیا۔ اس وفد میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے علاوہ حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی۔ شری کشن پرشاد کول۔ شریمتی اوما نہرو، قاضی عبدالغفار، پنڈت سندر لال پروفیسر مسعود حسن رضوی، حیات اللہ انصاری۔ بیگم حیات اللہ۔ شری کرشن چند۔ اور قاضی عزیز احمد شریک تھے۔

صدر جمہوریہ سے ملاقات کے دوسرے روز نئی دہلی کے ہوٹل دیگمبر میں وفد کی جانب سے ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا جس میں اردو کے مطالبات کی وضاحت اور وفد کی کوششوں کا تذکرہ تھا۔ کانفرنس میں وفد کی جانب سے بولنے والے حضرات ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت کشن پرشاد کول اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب تھے۔

۲۹ مارچ ۵۶ء کو جے پور میں کل راجستھان اردو کنونشن میں اور پھر ۵ جولائی ۵۶ء کو علی گڑھ میں منعقدہ اردو کانفرنس میں حضرت مولانا نے شرکت فرمائی ۴ اگست ۵۶ء کو مولانا مرحوم نے جے پور پہنچ کر راجستھان کے وزیر اعظم، وزیر تعلیم اور ڈائریکٹر تعلیمات سے ملاقات کی اور راجستھان کے اسکولوں میں اردو کو نظرانداز کئے جانے کی شکایات ان کے سامنے رکھیں۔ ملاقات میں سید الطاف احمد خیری صاحب صدر راجستھان اردو کانفرنس اور مولوی احترام الدین شاغل سکریٹری بھی مولانا مرحوم کے ساتھ تھے۔

۱۵ فروری ۵۸ء کو دہلی میں کل ہند اردو کانفرنس ڈاکٹر تاراچند کی صدارت میں منعقد ہوئی جس کا افتتاح وزیر اعظم ہند مسٹر نہرو نے کیا اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ؒ نے اپنی زندگی کی آخری تقریر بھی یہیں ارشاد فرمائی۔ کانفرنس کے اہتمام و انصرام کے ذمہ دار اعلیٰ اور صدر مجلس استقبالیہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب

ہی تھے ۔ اور بحیثیت صدر استقبالیہ حضرت مولانا مرحوم نے جو خطبہ اس کانفرنس میں پڑھا تھا ۔ وہ بلا مبالغہ اردو تحریک کی ایک اہم تاریخ کہا جا سکتا ہے ۔ کانفرنس کے بعد ۲۹ اپریل ۵۸ء کو نئی دہلی میں انجمن ترقی اردو کا وفد دوسری بار صدر جمہوریہ ہند سے ملا ۔ اس میں بھی دوسرے عمائدین تحریک کے ساتھ حضرت مولانا پیش پیش تھے ۔ اُردو کے سلسلہ میں مجاہد ملتؒ کی مسلسل کاوش و دلسوزی کا آخری نقش وہ مکتوب ہے جو انھوں نے اپنے مرض الموت کے دوران جب کہ وہ میڈیسن (امریکہ) میں زیر علاج تھے ، بستر علالت سے یو ، پی کے چیف منسٹر شری سی ، بی گپتا کو اور اس کی نقل وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو بھیجی اور جس میں یو پی کے سہ لسانی فارمولے میں اردو کو نظر انداز کرنے پر پُر زور احتجاج کے ساتھ ساتھ یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ مجوزہ فارمولے میں جس طرح جنوبی ہند تک کی زبانوں کے لئے گنجائش رکھی گئی ہے ، غریب اردو کے لئے بھی کچھ رحم دلی اور انصاف پسندی کا ثبوت دیا جائے ۔

وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو نے حضرت مولانا کو اپنا جواب امریکہ بھیجتے ہوئے ان کی رائے سے پورا اتفاق کیا اور لکھا کہ میں چیف منسٹر یو ، پی کو بھی ساتھ ہی خط لکھ رہا ہوں ۔

بعض تعلیمی اداروں کی غلط روش ، نصابی کتابوں اور مسلم آزار تحریروں کا مسئلہ

مجاہد ملت کے بعض بصیرت افروز مکاتیب

۴۷ء کے بعد خاص طور پر مسلمانان ہند کے لئے جو حوادث زیادہ سر اٹھاتے رہے ، ان ہی میں ایک اہم مسئلہ جو کبھی غیر مسلم مصنفین کی ناواقفیت اور کبھی فرقہ وارانہ تنگ دلی کی بدولت رونما ہوتا رہا وہ توہین آمیز اور غلط اور مسلم آزار تحریریں تھیں جو آئے دن اخبارات و رسائل اور پبلک لٹریچر میں بھی شائع ہوتی رہیں اور جن سے ملک کے مختلف حصوں میں تعلیمی نصاب کے صفحات بھی داغ دار ہوتے رہیں ۔

مثلاً " وشو اتہاس کی روپ ریکھا " ، جو ۵۱ء میں یو ، پی کے نصاب تعلیم میں شریک کی گئی ۵۲ء کا " فلم انڈیا بمبئی " اور تو مرچیاں کلکتہ " کے بعض شمارے جو اپریل ، مئی ۵۲ء میں شائع ہوئے " امرت پتریکا الہ آباد " کا ایک شمارہ جولائی پائنیر لکھنؤ ۔ سو تنتر بھارت ۔ جنوری ۵۶ء

ودیا بھون بمبئی کی ایک بدنام کتاب " ریلیجس لیڈرز " ، جو اگست ۵۶ء میں سامنے آئی ۔ ان کے علاوہ دسیوں نصابی کتابیں جن کی فہرست پیش کرنا یہاں غیر ضروری ہے ۔

ان کتابوں ، رسالوں اور اخبارات میں اکثر و بیشتر ایسے مضامین شائع ہوئے جن میں ذات اقدس سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کرام یا اسلامی عقائد و نظریات کی توہین و تضحیک تھی اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات پر بندلانہ حملے یا ہندوستان کے گزشتہ مسلم فرماں رواؤں کا اشتعال انگیز مذاق اڑایا گیا تھا ۔ وجہ اعتراض نصابی کتابوں میں ایسے اجزا بھی شامل ہوتے تھے اور ساتھ ہی ایسے اسباق بھی جو معصوم بچوں کو زبردستی ان کے اپنے مذہب کے برخلاف ، دوسرے مذہب کی تلقین کریں ۔

اس قسم کی تمام تحریریں نہ صرف یہ کہ مسلمانان ہند کے لئے ناقابل برداشت اور اشتعال انگیز تھیں ، بلکہ خود دستور ہند اور سیکولرزم کے تقاضوں کو بھی پامال کرتی تھیں ۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے پچھلے پندرہ برس میں ایسی سینکڑوں نصابی کتابوں پر برملا احتجاج کیا ۔ ریاستی اور مرکزی وزراء کو پر زور خطوط لکھے ، وقتاً فوقتاً ان سے خود ملاقات کر کے توجہ دلائی پارلیمنٹ میں تقریریں کیں (چنانچہ مولانا مرحوم کی اس سلسلہ کی بعض پارلیمنٹری تقریریں اسی " مجاہد ملت نمبر " میں آپ کے مطالعہ میں آئیں گی) اور آخر تک ان کا تعاقب کیا ۔ بالآخر اکثر و بیشتر وہ کتابیں یا تو نصاب سے خارج کی گئیں یا ان کی اصلاح کرائی گئی ۔

جہاں تک اخبارات و رسائل کے ایسے توہین آمیز مضامین کا تعلق ہے حضرت مولاناؒ نے بڑی پامردی کے ساتھ ان کا نوٹس لیا ۔ ملک گیر پیمانہ پر احتجاج

کی صفیں آراستہ کیں۔ حکومت ہند کے ذمہ داروں کو خطوط لکھ کر توجہ دلائی۔ اس سلسلہ میں کئی بار وزیر اعظم محترم پنڈت جواہر لال نہرو تک سے ملے اور ہر موقعہ پر مسلمانان ہند کے جذبات کی پوری پوری ترجمانی کی۔

کیرالا تعلیمی بل

شروع ۱۹۵۸ء میں ریاست کیرالا نے ایک تعلیمی بل منظور کیا جس کی دفعات اقلیتوں کو اپنے مذہبی تعلیم کے حق سے محروم کرتی تھیں۔ مجاہد ملت رح نے جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے اس بل کو سپریم کورٹ آف انڈیا میں چیلنج کرایا۔ دہلی کے مشہور بیرسٹر مسٹر نور الدین احمد نے اس پر بحث کی اور بالآخر سپریم کورٹ نے اس بل کو دستور ہند کے خلاف قرار دیتے ہوئے ناجائز ڈکلیر کر دیا۔

اسکولوں میں گاندھی جی کی پرارتھنا اور مسلم طلبہ

۲ اپریل کو ہیڈ ماسٹر صاحب ہائی اسکول پیپری ضلع مظفر پور (بہار) کا ایک خط مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو موصول ہوا جس میں سوال کیا گیا تھا کہ گاندھی جی کی مشہور پرارتھنا اگر مسلمان بچے سرکاری اسکولوں میں صبح کے وقت گائیں تو کیا ان کے مذہبی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی بات قابل اعتراض ہے۔ ایسے ہی سوالات بعض دوسرے اسکولوں کی طرف سے بھی کئے گئے۔ بلکہ بعض جگہ یہ شکایت بھی تھی کہ مسلمان بچوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اس پرارتھنا میں شریک ہوں اگرچہ کسی پرارتھنا یا دعائیہ گیت کے متعلق مسلمانوں کے مذہبی نقطۂ نظر اور جواز و عدم جواز کا اظہار چنداں دشوار نہیں۔ تاہم اس پرارتھنا کے ساتھ گاندھی جی کے نام کی نسبت نے معاملہ کی ایک خاص اہمیت اور نزاکت پیدا کر دی تھی۔ بہر حال حضرت مولانا نے اس اہم سوال کا بہت واضح، جرأت مندانہ اور بصیرت افروز جواب تحریر فرمایا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب پیپری ہائی اسکول کا خط

"پیارے مولانا صاحب! گاندھی جی کی پرارتھنا جو ذیل میں درج ہے، ہمارے ہوسٹل میں گائی جاتی ہے، پہلے ہندو مسلمان بچے مل کر اس کو گاتے تھے۔ لیکن اب مسلمان بچوں نے اپنی مذہبی بنیاد پر اعتراض شروع کر دیا ہے۔ اس لئے آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی بات قابل اعتراض ہے؟ پرارتھنا

رگھوپتی راگھو راجہ رام   پتت پاون سیتا رام
پتت پاون سیتا رام   ایشور اللہ تیرے نام
بھج پیارے تو سیتا رام   سب کو سمتی دے بھگوان
رگھوپتی راگھو راجہ رام   پتت پاون سیتا رام "

حضرت مولانا رح کا جواب

"محترمی آپ کا خط ملا شکریہ۔ گاندھی جی کا یہ مشہور گیت اسلام کے عقیدہ توحید کے بالکل خلاف ہے اس لئے کہ اسلام کا سب سے بڑا اور بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ، ایشور، خدا اس ذات کا نام ہے جو نہ کسی کا باپ ہے، نہ کسی کی اولاد، نہ کسی کا شوہر، نہ بیوی، وہ ان تمام رشتوں سے پاک ہے۔ اس کا کوئی ہمسر اور برابر نہیں۔ (سورۂ اخلاص۔ قرآن حکیم)

جس گیت میں رام، ایشور اور اللہ کو ایک ہی بتایا جا رہا ہے اور ساتھ ہی رام کو سیتا جی کا پتی۔ اور سیتا جی کو رام کی دھرم پتنی کہا جا رہا ہے تو ظاہر بات ہے کہ اسلام اس کو قبول نہیں کر سکتا۔ مسلمان بچے اگر پہلے اس پر اعتراض نہ کرتے تھے تو ممکن ہے کہ وہ اس حقیقت سے ناواقف ہوں، لیکن اب اگر واقف ہونے کے بعد ان کو اعتراض ہے تو بجا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان کو اس گیت کے گانے پر مجبور کیا جائے اس لئے کہ ایک سیکولر اسٹیٹ میں یہ کبھی جائز نہیں ہو سکتا۔

آپ کو غلط فہمی نہ ہو۔ گاندھی جی نے اس گیت کو کیوں پسند کیا۔ اور اگر پسند کیا تو مسلمان جو گاندھی جی کو اپنا پیارا اور محبوب لیڈر مانتے ہیں ان کی اس پرارتھنا کو کیوں پسند نہیں کرتے۔ اس لئے کہ گاندھی جی خود اس اصول کے زبردست حامی تھے کہ کسی کے مذہبی عقائد کو دوسروں پر زبردستی نہیں ٹھونسا جاسکتا اور صحیح اصول بھی یہ ہی ہے۔

رہی یہ بات کہ خود گاندھی جی اس پرارتھنا میں دونوں باتوں میں کیوں کر مطابقت کرتے تھے اور اس کو عقیدۂ توحید کے خلاف کیوں نہیں سمجھتے تھے۔ یہ گاندھی جی ہی جان سکتے تھے ہم اس کے لئے مجبور نہیں ہیں۔

اس لئے یہ ذہن ہرگز نہیں بننا چاہئے۔ کہ ہر وہ بات جو گاندھی جی نے اپنے لئے پسند کی ہر مذہب والا اس کو اپنے لئے ضرور روا رکھے، خواہ اس کے مذہب کے بنیادی اصول اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ والسلام

آپ کا مخلص —— محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہٗ "

گاندھی جی اور دوسرے لیڈروں کی تصاویر کا مسئلہ

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا حقیقت افروز مکتوب

ذیل میں مجاہد ملتؒ کا ایک روشن مکتوب جو آپ نے ۱۲ اکتوبر ۵۸ء کو مسٹر عزیز الٰہی کے جواب میں ارسال فرمایا تھا درج کیا جارہا ہے۔

" محترم عزیز الٰہی صاحب　السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ　مزاج گرامی

آپ کا خط ملا۔ آپ نے اپنے خط میں دو سوال کئے ہیں، جو یہ ہیں۔

(۱) کیا یہ صحیح ہے کہ مذہب اسلام کی رو سے کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی بھی تصویر یا مجسمہ پر ہار پھول وغیرہ چڑھائے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے مذہبی بزرگوں اور پیغمبروں کی تصویروں اور مجسموں پر بھی ہار پھول چڑھانا اسلامی شریعت کی رو سے قطعاً گناہ اور ناجائز ہے۔

(۲) کیا ملک کا سیکولر آئین یا کانگریس کا دستور کسی شخص کے لئے یہ لازم قرار دیتا ہے کہ وہ ملک و وطن کے کسی لیڈر کی تصویر یا مجسمہ پر ضرور ہار پھول چڑھائے اور جو شخص ایسا کرنے سے اپنے مذہب کی پابندی کرتے ہوئے انکار کردے اس کو مجرم سمجھا جائے۔ آپ نے اس ضمن میں مسٹر معین الحق وزیر آسام کے جس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے اور جو سوالات تحریر فرمائے ہیں ان کا جواب درج ذیل ہے۔

(۱) مسٹر معین الحق وزیر آسام نے جو عمل کیا وہ اسلامی بنیادی عقیدہ کے اعتبار سے قابل ستائش ہے۔ میں ان کو اس جرأت حق کی داد دیتا ہوں۔ اسلام کے عقیدۂ توحید کا تقاضہ ہے کہ کوئی عمل مسلمان ایسا نہ کرے جس سے اس کے بنیادی عقیدہ پر بالواسطہ یا بلا واسطہ زد پڑتی ہو۔ اسلام نے اسی وجہ سے نبی اور پیغمبر کے ساتھ بھی اس طرح کے عمل کی اجازت نہیں دی جس سے پرستش کا شائبہ یا واہمہ بھی پیدا ہوتا ہو۔ اسلام نے اسی بنا پر نبیوں اور پیغمبروں حتیٰ کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر بنانے کو حرام قرار دیا ہے اور اسلام کی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین تسلیم کیا ہے۔ اس لئے گاندھی جی کی عظیم شخصیت کی عظمت اپنی جگہ قابل تسلیم رہتے ہوئے بھی کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ گاندھی جی کی تصویر یا مجسمے یا کسی بھی مسلم یا غیر مسلم رہنما کی تصویر یا مجسمے پر ہار پھول چڑھائے۔

(۲) ہماری قومی حکومت کسی خاص مذہبی عقیدے کی حکومت نہیں ہے، بلکہ ملک کے عوام کی ملی جلی جمہوری حکومت ہے جس کو ہم سب سیکولر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ سیکولر اسٹیٹ کا جو بہترین دستور بنایا گیا ہے۔ اس میں مذہب کی آزادی کو بنیادی حقوق میں اہم ترین حق تسلیم کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اپنے عقیدے کے مطابق مذہبی آزادی حاصل ہو۔ یعنی کوئی شخصیت یا کوئی

کمیونٹی دوسروں سے اپنے مذہبی عقائد و اعمال زبردستی منوانے کی مجاز نہ ہوگی

پس آسام صوبہ کانگریس کمیٹی کے بعض ارکان نے اگر مسٹر معین الحق کے اس عمل پر انڈین نیشنل کانگریس کے پریذیڈنٹ سے ایکشن لینے کی درخواست کی ہے تو ان کا یہ فعل قطعاً باطل اور دستور کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ ایک مسلمان ملک و وطن کے سب سے بڑے شخص اور موجودہ دنیا کی عظیم شخصیت مہاتما گاندھی کی ہر طرح کی عزت اور عظمت کرتا ہے لیکن اپنے اسلامی عقیدہ کے خلاف کسی فعل یا عمل پر ہرگز ہرگز مجبور نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس سے گاندھی جی کی توہین لازم آتی ہے۔ مسٹر معین الحق کا قومی جھنڈے کا لہرانا خود اس کی دلیل ہے کہ جہاں تک وطن اور ملک کی محبت کا تعلق ہے اور ملک کی آزادی اور آزادی دلانے والے کی شخصی عظمت کا تعلق ہے مسٹر معین الحق کے دل میں وہ دوسرے محبان وطن کے مقابلہ میں کسی سے کم نہیں ہے اس لئے مسٹر معین الحق کا طرزِ عمل سرتا سر حق بجانب ہے

میں نے اس سلسلہ میں محترم شری ڈھیبر بھائی صدر انڈین نیشنل کانگریس کو بھی خط لکھا ہے۔

محمد حفظ الرحمٰن، ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند "

پردہ نشین خواتین کو سرکاری ملازمت میں بے پردگی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا

بہار کی بعض شکایات پر حضرت مجاہد ملتؒ کا نوٹس اور حکومت کا جواب

مارچ ۶۰ء میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ریاست بہار کے بعض علاقوں بالخصوص ضلع چمپارن سے یہ شکایات موصول ہوئی تھیں کہ محکمہ تعلیم کی جانب سے پردہ نشین مسلمان استانیوں اور انسپکٹریس وغیرہ کو جو سرکاری ملازم ہیں محکمہ کی جانب سے مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ پردہ چھوڑ دیں یا سروس سے دست بردار ہو جائیں۔ ممکن ہے ملک کے کسی دوسرے حصہ میں بھی کہیں کوئی ایسی شکایت درپیش ہو۔ بہر حال مولانا محترم نے اپنے خصوصی مراسلے کے ذریعہ وزیر اعلیٰ بہار اور وزیر تعلیم بہار کی توجہ اس افسوسناک شکایت پر مبذول کرائی اور لکھا :۔

"میں ان شکایات کو دیکھ کر حیران ہوں کہ اگر واقعتہً حکومت بہار نے کچھ ایسے احکام جاری کئے ہیں تو قانوناً وہ کہاں تک جائز اور قابل برداشت ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دستور ہند اور بنیادی حقوق کی دفعات ایسے احکام کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسے غلط احکام کو اگر واقعتہً (وہ جاری کئے گئے ہیں) دستور کی روشنی میں چیلنج کروں۔ براہ کرم آپ مجھے اپنے ذمہ دارانہ اور اطمینان بخش جواب سے مطلع فرمائیں۔ میں منتظر رہوں گا"

وزیر اعلیٰ بہار شری ایس۔ کے سنہا نے مولانا محترم کو اس سلسلہ میں جو جواب بھیجا وہ بہت صاف تھا جو ایسے امور پر سرکاری موقف کو برملا واضح کرتا تھا ذیل میں اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

"پٹنہ۔ مارچ ۶۰ء۔ ڈی۔او نمبر ۳۸۸

مائی ڈیر مولانا صاحب۔ آپ کے شکایت نامے پر میں نے ایک مکمل انکوائری کرائی ہے اور میں مطمئن ہوں کہ جو شکایت آپ تک پہنچائی گئی، وہ سراسر بے بنیاد اور غلط ہے اس لئے کہ میری حکومت کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ سابق دستور اور ہدایات کو جہاں تک ممکن ہو سکے نباہا جائے اور ان میں کوئی مداخلت نہ کی جائے۔ چنانچہ مسلم خواتین کو خواہ وہ استانیاں ہوں، طالبات ہوں یا گورنمنٹ کی کسی دوسری سروس میں ہوں، بے پردگی پر مجبور کرنے اور پردہ سے دست بردار ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا۔

آپ کا مخلص (دستخط ایس۔ کے سنہا)

حیدرآباد کی تباہی اور اس کے بعد ـــــ مجاہد ملت کا دورہ

تقسیم ہند کے عواقب میں دہلی، پنجاب، الور، بھرت پور اور اجمیر کے بعد جہاں مسلم اقلیت کو ہولناک تباہی سے گزرنا پڑا، وہ ریاست حیدرآباد تھی، ستمبر ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد پر پولیس ایکشن ہوا، اور اس کا پورا خمیازہ خاص شہر حیدرآباد کو چھوڑ کر ریاست کے وسیع علاقہ اور اضلاع و مضافات کی مسلم اقلیت کو بھگتنا پڑا، تباہی اور بربادی کی جو گرم بازاری حدود ریاست میں رونما ہوئی اس کی دہشت نے باقی ماندہ مسلم آبادی کو زندہ درگور کر دیا تھا۔ شمالی ہند کی طرح جنوبی ہند کی اس دم بخود اور نیم جان آبادی کو بھی جس مجاہد وقت کی دستگیری نے نئے سرے سے زندگی کی شاہراہ دکھائی وہ حضرت مولانا رح کی ذات گرامی تھی۔

دردناک حوادث اور پیش آمدہ واقعات سے مضطرب ہو کر مجاہد ملت نے دسمبر ۱۹۴۸ء میں جمعیۃ علماء کا سب سے پہلا وفد حیدرآباد بھیجا جس میں مولانا عبداللہ مصری اور پنڈت سندرلال شریک تھے۔ ارکان وفد نے حیدرآباد کا دورہ کیا اور اپنے مشاہدات کی رپورٹ مجاہد ملت کے ذریعہ پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور سردار پٹیل کے سامنے رکھی۔ پھر ایک دوسرا وفد ۳ جنوری ۱۹۴۹ء کو بھیجا جس میں مرحوم مولانا بشیر احمد، مولانا نور الدین بہاری، مولانا سید محمد میاں صاحب اور مسٹر سید محمد جعفری شریک تھے۔ تیسرا وفد مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی اور مقبول جالبی صاحب پر مشتمل فروری ۱۹۴۹ء میں روانہ کیا۔

ان وفود نے ریاست کے اہم علاقوں کا دورہ کیا۔ حالات کو بچشم خود دیکھا، سہمے ہوئے مسلم و غیر مسلم عمائدین سے ملے۔ ان کی ڈھارس بندھائی، ہنگامی مسائل و ضروریات کے ساتھ مسلم اقلیت کے تحفظ اور زندگی کی تدابیر ساتھ لے کر لوٹے اور دہلی واپس آکر اصلاح حال کے لئے جد و جہد شروع کی۔

ان ہی دنوں حیدرآباد میں جمعیۃ علماء کی داغ بیل پڑی۔ مولانا عبدالسبحان صاحب، انور خاں صاحب، مسٹر یونس سلیم وکیل اور مولانا حمید الدین قمر اور ان کے رفقاء کرام نے جماعتی زندگی کے پیغام پر سب سے لبیک کہا۔ یہ حضرات بڑے عزم و ہمت کے ساتھ کام کے لئے کھڑے ہوئے اور اس وقت سے کئی برس تک مسلسل دہلی آ آ کر حضرت مجاہد ملت کے ذریعہ حیدرآباد کے حالات کو بہتر بنانے کی جد و جہد کرتے رہے۔

نادار مظلوموں کی امداد، اجڑے ہوئے لوگوں کی آبادکاری، مساجد اور عبادت گاہوں کا تخلیہ اور بحالی، پولیس ایکشن میں کام آجانے والوں کے لاوارث یتیم اور بیوہ پس ماندگان کی نگہداشت جیسے دسیوں وقتی مسائل کے ساتھ ساتھ دہشت زدہ مسلمانوں میں اطمینان و اعتماد کی فضا پیدا کرنا اور ان کو ملک کے بدلے ہوئے حالات کے ساتھ مربوط کر کے عزت نفس، خودداری اور صحت مند زندگی کی راہ پر لانا، حکومت اور برادران وطن کے حلقوں میں ان کے کھوئے ہوئے اعتماد کو لوٹانا۔ اس وقت سرزمین حیدرآباد پر یہ تمام الجھے ہوئے اور نازک کام جس خوبی تدبیر اور دور اندیشی کے ساتھ انجام پائے آج مسلمانان حیدرآباد کی باوقار شہری زندگی بڑی حد تک ان ہی کوششوں کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔

مرکز میں ان تمام وفود کی سرگرمیوں کا محور اور حکومت ہند تک ان کی رسائی کا وسیلہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ہی تھے۔ حضرت مولاناؒ کی سرپرستی میں مسلسل کوششوں کی بدولت ریاست کے حالات نے بتدریج اصلاح کی شکل اختیار کی۔ جب ہنگامی اور وقتی جد و جہد ایک مرحلہ تک پہنچ پائی تب مجاہد ملتؒ نے بذات خود ۹ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو دہلی سے روانہ ہو کر دس روز تک اضلاع و مضافات حیدرآباد کا دورہ کیا۔ بہت سے معاملات وہیں ملٹری گورنر مسٹر ویلوڈی اور ریاستی چیف سکریٹری مسٹر جین سے مل کر حل کرائے۔ جو کام مرکز کے تھے۔ ان کے لئے واپسی کے بعد مرکز میں مسلسل جد و جہد فرمائی۔ مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی پانی پتی اس دورہ میں حضرت مجاہد ملت رح کے ہمراہ تھے۔

سال بھر کی ان تھک کوششوں کے بعد حضرت مولانا کے اس دورہ نے حیدرآباد کی فضا پر جو گہرے اور مفید اثرات ڈالے اور ان کی حیات بخش تقریروں نے حیدرآباد کو جرأت و استقامت کا جو پیغام دیا اس کی شہادت کے طور پر ہم روزنامہ شعیب حیدرآباد اور ہمارا اقدام حیدرآباد کے بعض اقتباس ذیل میں پیش کر دیتے ہیں جو اخبارات مذکور نے ان ہی دنوں شائع کئے تھے۔

معاصر شعیب حیدرآباد کا مقالہ افتتاحیہ

"جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ان دنوں حیدرآباد میں تشریف فرما ہیں اور اضلاع کا دورہ کر رہے ہیں

تاکہ مسلمانانِ حیدرآباد کے حقیقی دکھ درد کو معلوم کر سکیں اور اس کا علاج سوچیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے ہندوستان اور مسلمانوں کی جو خدمات انجام دی ہیں اگر ان کا شمار کیا جائے تو شاید ایک دفتر بن جائے۔ یہ شخص خلوص اور اصول پروری کا پیکر ہے اور ایثار و قربانی کا مجسمہ۔ آپ وطن کی خدمت میں بھی صف اول میں رہے اور مسلمانوں کی خدمت میں بھی اوّل درجے پر۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ میں وطن پروری کا جذبہ زیادہ ہے یا مسلم پروری کا۔ ایک سچے مسلمان کو کیسا ہونا چاہئے، مولانا حفظ الرحمٰن اس کے مجسم نمونہ ہیں اور ایک سچا ہندوستانی کیسا ہونا چاہئے۔ اس کا نمونہ بھی آپ کی ذات ہے۔ آپ بیک وقت ایک سپاہی۔ ایک والنٹر۔ ایک رہنما ایک مدبر۔ ایک جادو بیان مقرر سبھی کچھ ہیں۔ اور تمام خوبیوں کے بعد جو سب سے بڑی خوبی ہے وہ آپ کی کسرنفسی اور وہ بے غرضی اور بے لوثی ہے۔ مولانا قومی کاموں میں اس طرح مصروف رہتے ہیں کہ کبھی اپنے متعلق انھیں سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ جن لوگوں کو آپ کے ساتھ قومی کام کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے، انھوں نے دیکھا ہے کہ اس شخص کو سوائے کام کے اور کوئی دھن ہی نہیں۔ مولانا کو جس شخص نے دہلی کے فسادات کے زمانہ میں کام کرتے دیکھا ہے اسے یقیناً اس شخص کی عظمت اور خلوص کا قائل ہونا پڑتا ہے اور ہم نہایت احتیاط کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر دہلی میں مولانا حفظ الرحمٰن کی ذات گرامی نہ ہوتی تو آج وہاں ایک مسلمان بھی زندہ نہ بچتا۔

اس وقت جمعیۃ علماء ہند کی روح رواں یہی مولانا کی ذات ہے اور مولانا حفظ الرحمٰن اس وقت جمعیۃ علماء کا سب سے بڑا سرمایہ اور اثاثہ ہیں۔

بہرحال حیدرآباد کے مسلمانوں کی خوش نصیبی ہے کہ مولانا یہاں تشریف لے آئے ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ حیدرآباد کے مسلمان اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنا سیاسی لائحہ عمل مرتب کرنے میں مولانا کی بصیرت سے فائدہ اٹھائیں گے "

روزانہ ہمارا اقدام کا مقالہ

" آج سے دو سو سال پہلے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے ہندوستان کو مستحکم، خوش حالی اور بیرونی تسلط سے کامل آزاد سلطنت بنانے کے لئے اپنی مجاہدانہ مساعی سے وہ آگ روشن کی تھی جس نے ایک طرف بے ہمتی اور خوف کی تاریکی کو کافور کر کے لاکھوں ہندوستانیوں کے دل میں آزادی کی شمع فروزاں کی تو دوسری طرف سرفروشوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کیا جو آزادیٔ ہند کے لئے بلا خانہ سلاسل کا مسکراتے ہوئے استقبال کرتے ہیں۔ اس راستہ میں زہر غم کے ہر پیالے کو قند و نبات کا شربت سمجھ کر پیتے رہے، بجلیوں سے کھیلتے اور موت سے ٹکراتے رہے۔ نہ سرحد کی صحرا نوردی ان کے عزائم میں ضعف پیدا کر سکی نہ مالٹا میں قید فرنگ کی ہوش ربا تکلیفیں ان کے جذبۂ آزادی کو کچل سکیں۔ اگر کابل کی گلیوں میں عبید اللہ نے اسی آزادی کا ترانہ سنایا تو انڈیمان میں کالے پانی کی جاں گسل تکلیف برداشت کرتے ہوئے فضل حق خیرآبادی نے دنیا سے کوچ کرتے ہوئے اسی نعرہ سے اس ہولناک ویرانہ میں زندگی کے نقش و نگار قائم کئے۔ اسی قافلہ کے ایک اولوالعزم رہبر اور اسی فوج کے ایک نڈر سپاہی یعنی مولانا حفظ الرحمٰن ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند کے زندگی کے چند گوشے ان کی تشریف آوری کی خبر سن کر بے اختیار سامنے آگئے ہیں، جو منزل آزادی کے مسافر کے لئے سامان شباب اور مایوسیوں کے ماحول پر قابو پالینے کا عملی نسخہ فراہم کرتے ہیں

مجسمۂ کردار

مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی کی ہر ادا کا اگر تجزیہ کیا جائے تو بہ آسانی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے ہر گوشے پر سچی کردار کا ایک خوش گوار اور جنون طراز جذبہ ابر نو بہار کی طرح چھایا ہوا ہے، ان کا پیکر خدا پرستی اور خدمت خلق کے ولولہ انگیز خمیر سے اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ سچائی کو منوانے کے لئے کسی بڑی سے بڑی قوت سے کبھی مرعوب نہیں ہوتے اور انتہائی معصیت کے وقت بھی جبکہ قیامت پر قیامت ٹوٹ رہی ہو، حادثات خوفناک اژدہے کی صورت پھنکار رہے ہوں، خوف و سراسیمگی کی وجہ سے کلیجے منہ کو آرہے ہوں، کسی طرف امید کی کوئی کرن نظر نہ آرہی ہو۔ ایسی پرخطر گھڑی میں بھی موصوف کا دل امید کی ایک ایسی جلوہ گاہ معلوم ہوتا ہے جس میں مایوسی کی ہر تاریکی پہنچ کر روشن مستقبل کی بشارت دیتی ہے۔

چنانچہ تقسیم ہند کے بعد دلی میں قیامت خیز قتل و غارت گری کا وہ خونین ہنگامہ جس نے ہزاروں گھروں کا چراغ گل کر دیا۔ گلی کوچے انسانی خون سے لالہ زار بن چکے تھے۔ ہر طرف موت کی حکمرانی تھی۔ فرقہ پرستی کا جنون جنگل کے درندوں کو شرمندہ کر رہا تھا۔ ایسی حالت میں مولانا ہی کی ذات تھی جو موت و تباہی کی اس خوفناک جنگ میں ہر خطرہ سے بے پرواہ ہو کر دیوانہ وار میدانِ عمل میں کود پڑی اور مظلوم انسانیت کی خدمت کے لئے وہ نقش قائم کر گئی جس پر جواں مردی ناز کرتی رہے گی۔

اور انسانیت فخر کرتی رہے گی۔

پاسبانی

خدمت خلق کا راستہ ایک ایسا خارستان پُرخطر ہے کہ جس میں راہی کو برہنہ پا دوڑایا جاتا ہے۔ قدم قدم پر غیروں ہی کی طرف سے نہیں، بلکہ اپنوں کی طرف سے بھی رکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں، یہی نہیں بلکہ ان کے جسم میں طعنہ و تشنیع کے تیر و نشتر چبھا کر ان کے جذبہ کو پرکھا جاتا ہے اور کبھی کبھی اس راہ میں اپنے خون کے سمندر میں خود ہی غوطہ لگانے کا تقاضہ کیا جاتا ہے۔ اس منزل کے یہ ایسے راہ و رسم ہیں جس میں آزمائش ناگزیر ہے اور یہ آزمائش بالآخر کامیاب ہونے والوں کو حیات جاودید کی بشارت دیتی ہے۔ اس روشنی میں جب ہم مولانا کی سیاسی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو موصوف کے اس حوصلہ کی بلندی پر سخت حیرت ہوتی ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے ایک فرقہ پرستی کے خلاف اعلان جنگ کے بعد وہ کون کون سی ذلتیں نہ تھیں جو ان پر لاد نہ دی گئی ہوں۔ اور آزادی ہند کے بعد دوسری فرقہ پرستی کے خلاف مورچہ قائم کرنے کی وجہ سے وہ کون کون سے بدترین القاب اور ننگی گالیاں ہیں جو ان کے لئے استعمال نہ کی گئی ہوں مگر ہر دور کی زندگی کو ہر طرف سے الٹ پلٹ کر دیکھ ڈالیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیسی مٹی کے بنے ہوئے پتلے ہیں جو ان تمام سامانِ ذلت کو اپنے لئے سب سے بڑی عزت سمجھتے ہوئے ایک والہانہ جذبہ کے ساتھ ایک ہی ڈھن اور ایک ہی سودے کو سر میں لئے ہوئے اپنے نصب العین کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

اسی والہانہ جذبہ نے مسلمانانِ ہند کی پاسبانی کے لئے ایسی حالت میں جب کہ شدید انقلاب کے جابر جھٹکوں نے مسلمانوں کی زندگی کو بری طرح پراگندہ کر دیا ہے اور وہ ایک خطرناک قسم کی ذہنی طوائف الملوکی کا شکار ہو چکے ہیں۔ موصوف کے دردمند دل میں تڑپ پیدا کی ہے جو صبح و شام آپ کو بےچین رکھتی ہے۔

ناخدائی

آزادی کے اس پانچ سال میں مسلمانوں کے تعلق سے جتنے تباہ کن مخمصے پیدا کئے گئے ان کو موصوف نے حسن و خوبی سے حل کیا ہے اس کی صحیح داد مابعد انقلاب، مورخ کا قلم ہی دے سکتا ہے۔ کسٹوڈین کے حیات سوز ہنگاموں، فرقہ پرستوں کے لرزہ انگیز منصوبوں اور اسلامی معابد ماثر کو برباد کرنے والی صبر سوز تحریکیں کہ جس سعی پیہم اور کاوش روز و شب کے بعد مولانا کی ہستی نے کہیں ختم کرنے اور کہیں اس کو بے اثر کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے اس کی صحیح داد نہیں دی جا سکتی۔ موصوف کی ان مساعی سے جن کا اظہار ان کی زبان یا ذات سے کیا جاتا ہے ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے، جہاں آپ اگرچہ خاموش نظر آتے ہیں۔ مگر حکومت کی ذمہ دار شخصیتوں کی زبان سے آپ ہی کے الفاظ اور آپ ہی کا منشا اس طرح گرجتا ہے جیسے کہ آپ ہی کی بےباک اور حقیقت پسند زبان مقرر کے منہ میں بول رہی ہے۔ موصوف کی دوسری بہت سی خصوصیات مثلاً ایک بےباک صحافی، مہتمم بالشان مصنف، عمیق نظر اسلامی مورخ، قابلِ رشک خطیب، بلند نگاہ مفسر اور اولوالعزم مبصر ہونے کی حقیقت قدرت کی ایسی بخششیں ہیں جن کا خوبصورت اجتماع ایک ہی ذات میں بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ ان عنوانات پر بحث طویل ہمت کی داعی اور فی الحال اس مختصر تعارف نامہ کے حدود سے خارج ہے۔ لہٰذا عقیدت کے ان چند ہی غیر مربوط جملوں کو مولانا کی خدمت میں پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے

خوش گو　روزنامہ ہمارا اقدام حیدرآباد (دکن)

بہرحال مسلمانان حیدرآباد کی نشاۃ ثانیہ اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے مجاہد ملت رح نے تدبیر و چارہ گری کا جو عظیم کردار پیش کیا اس کی مقبولیت اور برملا اعتراف کا پہلا نقش یہ تھا کہ مسلمانان حیدرآباد نے گرم جوشی کے ساتھ مجاہد ملت کو دعوت دی کہ وہ جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس حیدرآباد میں بلائیں۔ دعوت قبول ہوئی کہ یہ بھی ان کوششوں کے سلسلہ کی ایک موثر کڑی تھی۔ جنوبی ہند کے اطراف میں پہلی بار جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس ۲۷ تا ۲۹ اپریل ۱۹۵۱ء کو اپنی بے مثال کامیابی کے ساتھ منعقد ہوا جو اپنی شان و شوکت اور عظیم اجتماع و کامیابی کے لحاظ سے مجاہد ملت رح کے ساتھ مسلمانان حیدرآباد کی عقیدت و شیفتگی کا ایک لازوال ثبوت تھا۔

ہندوستانی افسروں کو دلی سے جو ہدایات ملیں ان پر سچے جذبے سے عمل کریں حیدرآباد میں ہندوستانی عہدداروں سے تکلیف پہنچی تو وہ جواب دہ ہوں گے

سقوط ریاست کے بعد اپنے پہلے دورہ میں حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب نے حیدرآباد کے جلسہ عام میں جو تقریر کی تھی اس کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"میں نے حیدرآباد کے اضلاع، قصبوں، دیہات اور خود حیدرآباد کے بعض مقامات کا دورہ کیا ہے، مجھے حیدرآباد کے مسلمانوں کا پورا احساس ہے

میں نے دیکھا کہ دیہات میں ابھی تک پوری طرح حالات اعتدال پر نہیں آئے۔ اور پوری طرح امن قائم نہیں ہوا۔ اب بھی دیہات کے مسلمانوں کو قتل و خون کا خوف ہے ان کی زمینوں پر دوسروں کا قبضہ ہے اور ان کے گھر اب بھی کہیں کہیں ویران ہیں۔ میں نے بعض مسجدیں بھی دیکھیں جنھیں یا تو مندروں میں تبدیل کر دیا گیا ہے یا وہ شہید کر دی گئی ہیں اور ویران ہیں۔ بہت سے لوگ جو بے گناہ ہیں آج بھی جیلوں میں قید ہیں اور ان کے خاندان پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ میں اس وقت نہیں کہہ سکتا کہ اس معاملہ میں کیا خدمت مجھ سے ہو سکتی ہے اور میں دہلی میں کیا کروں گا لیکن یہاں ایک بات میں کہنا چاہتا ہوں انڈین یونین کے ان عہدہ داروں سے جنھیں یہاں حالات سدھارنے اور نظم و نسق سنبھالنے کے لئے متعین کیا گیا ہے وہ حیدرآباد پر قابض نہیں ہیں۔ اگر انڈین یونین کے عہدہ داروں کے ہاتھوں کسی کو یہاں تکلیف پہنچ رہی ہے تو کل انھیں جواب دینا ہوگا۔ وہ یاد رکھیں کہ نئے ہندوستان میں سرکاری عہدہ دار حاکم نہیں ہیں بلکہ خادم ہیں۔ لہٰذا جو ہدایات انھیں دہلی سے دی گئی ہیں ان پر خدمت کے جذبہ کے ساتھ عمل کریں جن کی زمینیں ہیں انھیں واپس دلائیں مسجدوں کی بازیابی کا انتظام کریں اور جن کی مدد کرنی ہے ان سے غفلت نہ کریں اس طریقہ سے جب وہ دہلی واپس ہوں گے تو سرخرو بھی ہوں گے۔ وہ یاد رکھیں کہ کسی کو تباہ کرنے والا کبھی آباد نہیں ہو سکتا، مجھے مسرت ہے کہ سوامی جی سے مل کر میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ میں سوامی جی سے اس وقت بھی کہوں گا کہ وہ فرقہ پرستوں پر پوری نگرانی کریں۔ میں اس شکایت سے اتفاق نہیں کرتا کہ حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس نے مسلمانوں کو اس طریقہ سے دعوت نہیں دی جس طریقے سے دینی چاہئے تھی۔ ان کا سواگت نہیں کیا گیا۔ خود مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ تمام رکاوٹوں کی پروا کئے بغیر کانگریس میں گھس جائیں (بعض فرقہ پرست عناصر کو جواب دیتے ہوئے) قومیں غدار نہیں ہوتیں، البتہ افراد غدار ہوتے ہیں اور مسلمانوں سے اس قسم کا مطالبہ کرنا قطعاً غلط ہے کہ وہ اپنی وفاداری کا اعلان کریں "

صدر کانگریس سوامی رامانند تیرتھ نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر نے میرے دل پر بے حد اثر کیا ہے۔ میں نے بڑے بڑے جلسوں میں شرکت کی، بہت سے نیتاؤں کی تقریریں سنیں۔ لیکن پوری زندگی میں شاید ہی کبھی میں نے اتنی اچھی تقریر سنی ہو۔ میں اس موقع پر مسلمانوں کو یقین دلاتا ہوں کہ حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس ان تمام شکایات کو دور کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔

کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی بارہ سالہ سرگذشت

مجاہد ملتؒ کی مسلسل جدوجہد

پچھلے پندرہ برس میں فرقہ واریت کے جنون اور بدمستیوں نے جس طرح شہری زندگی میں جا بجا بدامنی، قتل و غارت، ہنگامہ و فساد بپا کر کے مسلمانانِ ہند کو وسیع پیمانہ پر پامال و برباد کیا ہے، اسی طرح قانونِ تخلیہ کنندگان کی قہرمانی بھی ان کے لئے مسلسل وبالِ جان بنی رہی ہے۔

حقیقتاً یہ قانون بھی اسی بھیانک ماحول کا ایک ثمرِ تلخ تھا جس کی بدولت تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ ہندوستان و پاکستان کے لاکھوں بے گناہ، اپنی جان بچانے کی خاطر ترکِ وطن کرنے پر مجبور ہوئے اور انسانی تاریخ نے آبادیوں کے تبادلہ کا حیرت انگیز تماشہ دیکھا۔ قانونِ تخلیہ کنندگان (ایویکوئیز پراپرٹیز) کا منشا صرف یہ تھا کہ تارکینِ وطن کی چھوڑی ہوئی املاک اور جائیدادوں کو حکومت کا ایک محکمہ اپنی تحویل میں لے کر ان کا مناسب بندوبست کرے۔ اسی منشا کی تکمیل کے لئے محکمہ کسٹوڈین کا تقرر ہوا لیکن محکمہ کے اسٹاف اور کارندوں نے اس قانون کو ایک انتقامی اور جنگی ہتھیار کی طرح گھمانا شروع کر دیا اور اپنے حدود سے تجاوز کر کے ہر اس جائیداد کو جس کی نسبت مسلمان سے تھی، یہاں تک کہ اوقاف، مساجد اور قبرستانوں تک کو (اندھا دھند) "نکاسی جائیداد" قرار دینا شروع کر دیا اور قانون کے نفاذ میں ایسی دیدہ دلیری اور چابکدستی کا مظاہرہ کیا کہ خود ہندوستان کے شہری مسلمانوں کی لاکھوں بلکہ کروڑوں کی جائدادیں تھوڑے ہی عرصہ میں ایویکوئی ڈیکلیر کر دی گئیں، اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں پر، جو پہلے ہی حالات کی سنگینی اور اقتصادی بدحالی کا شکار تھے، کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی اس لاقانونیت نے اور بھی زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا مسلمانانِ ہند کی مظلومیت اور بے چارگی کے اس محاذ پر بھی حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ ہی مدافعت کے لئے آگے بڑھے اور اس صورتِ حال کے ازالہ

چنانچہ مولانا مرحوم نے اس کے تدارک اور چارہ گری کی کوششیں شروع کردیں۔ پھر آنے والے برسوں میں کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی کارفرمائیوں کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا کی اصلاحی سرگرمیاں پوری قوت اور پامردی کے ساتھ آخر تک جاری رہیں۔

اس سلسلہ میں دہلی کے ابتدائی واقعات جب سامنے آئے تو مجاہد ملتؒ نے فوراً ہی وزیر اعظم ہند مسٹر نہرو اور حضرت مولانا آزادؒ کو اُن سے آگاہ کیا اور محکمہ مذکور کی غلط روش کی روک تھام کے لیے حکومت ہند کی اعلیٰ سطح پر بھی جدوجہد کی اور قانونی راستہ سے بھی معاملات کی پیروی کے لئے جمعیۃ علما کی جانب سے ایک قانونی امدادی کمیٹی بنائی جس کے کنوینر مسٹر سلطان یار خاں وکیل بنائے گئے اور دوسرے فاضل قانون دانوں کا تعاون حاصل کیا گیا۔ جمعیۃ کی یہ قانونی امدادی کمیٹی ۱۹۴۸ء سے مسلسل چھ سات سال تک کام کرتی رہی اور اس نے کسٹوڈین کی گرفت میں آئے ہوئے ہزارہا مظلوم مسلمانوں کے جن میں بڑی تعداد خود دہلی کے اُجڑے ہوئے غریبوں کی تھی، معاملات کی پیروی کا حق ادا کیا۔

اس کے ساتھ ہی جب کسٹوڈین کی غلط کاریوں کا سلسلہ دہلی سے باہر ملک کے دوسرے حصوں میں بھی پھیلنے لگا تو مولانا مرحوم نے وسیع پیمانہ پر اس مصیبت کے انسداد کے لیے جدوجہد شروع کی، چنانچہ یکم ستمبر ۱۹۴۹ء کو جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام ایک مخصوص میٹنگ بلائی گئی جس میں دوسرے صوبوں کے ذمہ داران جمعیۃ بھی بلائے گئے اور حضرت مولانا آزادؒ کی موجودگی میں ان سب نے اپنے اپنے صوبوں کے واقعات و مشاہدات بیان کئے اور ان تمام واقعات کی روشنی میں ایک میمورنڈم تیار کیا گیا جس میں محکمہ کسٹوڈین کی ہمہ نوع غلط کاریوں پر واقعات کے حوالے دیئے گئے تھے۔ یہ میمورنڈم لے کر مجاہد ملتؒ اور حضرت مولانا احمد سعیدؒ وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیر بحالیات سے ملے اور یہ مطالبہ کیا کہ اگر واقعی حکومت کا منشا وہی ہے جو یہ محکمہ انجام دے رہا ہے تو ایک واضح اعلان کرکے مسلمانان ہند کو سوچنے سمجھنے کا موقع دیا جائے۔ ورنہ محکمہ مذکور کی غلط کاریوں کو سختی سے روکا جائے۔ اس کوشش کے نتیجہ میں وقتی طور پر حالات میں کچھ اصلاح رونما ہوئی اور متعلقہ آرڈیننس کو قانون کی شکل دیتے ہوئے کچھ ترمیمات عمل میں لائی گئیں کہ محکمہ مذکور کی مطلق العنانی کو روکا جاسکے۔ تاہم اس محکمہ کے کارپرداز جس انتقامی جذبہ کے ساتھ مصروف کار تھے اس نے قانون میں طرح طرح کی موشگافیاں کرکے اپنی من مانی کارروائیوں کے لیے نئی نئی راہیں نکال لیں۔ ادھر مجاہد ملتؒ روزمرہ کے واقعات برابر پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور وزیر بحالیات کے نوٹس میں لاتے رہے۔ بہت جلد نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ حکومت ہند کی قطعی پالیسی پر بھی محکمہ کے افسران اعلیٰ نے اپنے حاشیئے چڑھانے شروع کردیئے۔ ایک معاملہ محکمہ مذکور کی اعلیٰ سطحوں تک پہنچ کر بھی جب انصاف اور قانون کے تقاضوں سے بے ربط رہتا اور پھر مجاہد ملتؒ اس کو محترم وزیر اعظم ہند کے علم میں لاتے تو انھیں بھی حیرانی ہوتی۔ محکمہ کسٹوڈین کی اس مطلق العنانی نے یہاں تک طول کھینچا کہ دہلی کے ایک تاجر محمد دین چھتری والا کے کیس میں پوری یونین کیبنٹ نے غور کرکے اپنی واضح پالیسی سے جب کسٹوڈین جنرل آف انڈیا مسٹر اچھرو رام کو مطلع کیا تو انھوں نے کیبنٹ کے فیصلے سے بھی اتفاق نہ کیا اور اس کے خلاف اپنی رائے پر قائم رہے اور بالآخر ۲۰ ستمبر ۱۹۵۰ء کو وہ اپنی اس اعلیٰ ذمہ داری سے سبک دوش کردیئے گئے

مسٹر اچھرو رام کسٹوڈین جنرل نے سبک دوشی کے بعد اخبارات میں بحث چھیڑ کر پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کے جذبات کو ابھارنا چاہا اور یکم اکتوبر ۱۹۵۰ء کو بعض پناہ گزین ممبروں نے یہ سوال پارلیمنٹ میں پیش کرہی دیا۔

جس کے جواب میں خود محترم پنڈت نہرو کو حکومت کے موقف پر اپنا وضاحتی بیان پارلیمنٹ میں پیش کرنا پڑا۔

اس تمام سرگزشت سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے شہری مسلمانوں کو کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی لاقانونیت سے بچانے کے لیے مجاہد ملتؒ نے کس پامردی اور تسلسل کے ساتھ اعلیٰ سطحوں تک اپنی مؤثر جدوجہد جاری رکھی۔

مرکز میں ان کوششوں کے ساتھ ساتھ مختلف صوبوں سے فرمائشیں موصول ہوئیں تو مولانا مرحوم نے اس قانون کے نشیب و فراز سے باخبر اپنے قانونی مشیروں کو بالخصوص مسٹر نورالدین بیرسٹر، مسٹر محمد احمد ایڈوکیٹ اور مسٹر سلطان یار خاں ایڈوکیٹ کو جے پور، جودھ پور، الہ آباد وغیرہ بھیج کر درپیش معاملات میں مدد دی۔ بمبئی کی فرمائش پر حضرت مولانا خود تشریف لے گئے اور جمعیۃ علماء صوبہ بمبئی کے وکلاء کے اجتماع میں حکومت ہند کی پالیسی اور طریق کار کی وضاحت فرمائی۔ ہندوستان بھر کے صوبوں کے وفود بھی وقتاً فوقتاً دہلی آکر اس بلائے بے درماں کے علاج کے لئے حضرت مجاہد ملتؒ کی ہدایات اور مشورے حاصل کرتے رہتے۔

پھر علاوہ اس کے کہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۰ء تک واقعات اور تجربات کی روشنی میں ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے حضرت مولانا کی جدوجہد اور محترم پنڈت نہرو اور مولانا آزادؒ کے توسط سے خود قانون نکاسی جائیداد میں بار بار ضروری تبدیلیاں عمل میں لائی جاتی رہیں۔ جن سیکڑوں بلکہ ہزاروں انفرادی

واقعات میں کسٹوڈین عدالتوں نے کسی نہ کسی بہانہ اپنے غیر منصفانہ فیصلوں پر اصرار جاری رکھا۔ ان کے آخری تدارک اور درستگی کے لئے خود مجاہد ملتؒ نے کئی کئی برس تک وزارتی سطح پر جدوجہد جاری رکھی اور سینکڑوں معاملات کے تجربہ سے حکومت ہند کے ارباب حل و عقد کو بھی جب یقین ہوگیا کہ اس محکمہ کی مطلق العنانی کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے تو بالآخر محترم وزیر اعظم پنڈت نہرو نے اپنے پرنسپل پرائیویٹ سکریٹری مسٹر کول، حضرت مولانا اور وزارت بحالیات کے جوائنٹ سکریٹری مسٹر ذتیاگی پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کردی جس نے کم و بیش چھ، سات ماہ تک دسیوں ایسے معاملات کو جانچا اور درست کرایا جن میں کسٹوڈین کی اعلیٰ عدالتیں بھی آخر تک غلط فیصلے صادر کرتی رہیں

اس کمیٹی کے بعد بھی وزارتی سطح پر ملک بھر کے ہزاروں انفرادی معاملات کی پیروی اور اصلاح کی جدوجہد حضرت مولاناؒ نے اپنی زندگی کے آخر تک جاری رکھی اور ان ہی کی تنہا ذات اور سرگرمیاں کسٹوڈین کے مارے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کی آخری امیدگاہ بنی رہیں۔ اس سلسلہ کی چندہ سالہ کش مکش اور کارگزاریوں پر خود حضرت مرحوم کا ایک حقیقت افروز بیان اسی مجاہد ملت نمبر کے دوسرے صفحات میں شامل ہے جو انھوں نے موجودہ وزیر بحالیات شری مہر چند کھنہ کے نام ایک کھلے خط کی شکل میں اگست ۱۹۶۱ء میں ارسال فرمایا تھا۔ اس کے مطالعہ سے ناظرین کرام مزید اندازہ فرماسکیں گے۔

اجڑے ہوئے انسانوں کی آبادکاری۔ تارکین وطن کی واپسی

دہلی، پنجاب، الور، بھرت پور، اجمیر وغیرہ میں ۱۹۴۷ء کے قیامت خیز ہنگاموں کے بعد بقیۃ السیف لاکھوں مسلمان جو چھپ چھپا کر کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ان کی کچھ تعداد تو ہندوستان ہی میں قرب و جوار کی محفوظ بستیوں میں منتقل ہوگئی تھی اور کچھ وہ تھے جو اس غضبناک فضا میں کوئی اور راہ نہ پاسکے اور بادل ناخواستہ پاکستان کی طرف جا نکلے۔ پھر جوں ہی حالات کچھ سکون کی طرف آئے، ان بے گناہ مصیبت زدوں نے بڑی تعداد میں واپس ہوکر اپنے گھروں میں آباد ہونا چاہا، خود گاندھی جی دنیا سے جاتے جاتے اس کے لئے بے چین رہے کہ دونوں ملکوں کی اقلیتوں کو اپنے اپنے وطن میں واپسی کا موقع ملنا چاہئے۔

جہاں تک حکومت ہند کا تعلق ہے اس کی بھی طے شدہ پالیسی یہی تھی۔ لیکن عمل کے درجہ میں صورت حال یوں کہ ایسی ہو چکی تھی کہ پاکستان سے آنے والے پناہ گزینوں کے لئے واپسی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا اور یہ لوگ ہندوستان کے ان علاقوں سے اجڑے ہوئے مسلمانوں کی جگہ لے چکے تھے اس لئے بڑی الجھن درپیش تھی۔

تاہم گاندھی جی کے جانشینوں اور خاص طور پر وطن کے دوراندیش لیڈر پنڈت نہرو نے مشکلات کے باوجود یہ تہیہ کیا کہ ایسے لوگوں کو پھر بسانے کی ہر ممکن کوشش ہونی چاہئے۔

ان دنوں واپس آنے والے مسلم پناہ گزینوں کی بڑی تعداد علاقہ میوات والور، بھرت پور کی تھی اور سب سے پہلے ان ہی کے بسانے کی کوششیں شروع ہوئیں اور شری ونوبا بھاوے۔ سینم بھائی۔ ایک نیک نہاد خاتون مس مردولا سارا بھائی نے اس مہم کے لئے خود کو بڑی تندہی کے ساتھ وقف کردیا اور حضرت مجاہد ملتؒ، حضرت مولانا احمد سعید صاحب، مولانا لقاء اللہ صاحب پانی پتی، مولوی محمد ابراہیم میواتی اور دوسرے کارکنوں نے اس خدمت کا بیڑا اٹھایا۔ مرکز میں ان کوششوں کے سرپرست مولانا آزادؒ اور پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ اس طرح قدم قدم دشواریوں اور الجھنوں سے گزرتے ہوئے ماتحت سرکاری عمال کی عام بے دلی اور بے رخی کی فضا میں یہ کوششیں آہستہ آہستہ آگے بڑھیں۔ مجاہد ملتؒ نے بار بار میوات و پنجاب کے سفر کرکے، نیچے سے اوپر تک ریاستی اور مرکزی حکام و افسران سے پیہم ملاقاتیں کرکے اور خود ان اجڑے ہوئے انسانوں کو صبر و برداشت کی بار بار تلقین کرتے ہوئے پوری دل سوزی کے ساتھ اس مہم کو آگے بڑھایا اور پھر بسائے جانے والوں کے لئے زمینیں، مکانات اور ہر طرح کے سرو سامان زندگی کے فراہم کرانے میں پیہم جدوجہد کی۔ پھر یہ سلسلہ سال دو سال نہیں، بلکہ مستقل طور پر چلتا ہی رہا۔ بحمد اللہ ان ہی ان تھک کوششوں کی بدولت آج میوات میں، اجمیر میں، ہماچل پردیش اور پنجاب میں جابجا اُجڑے ہوئے مسلمانوں کی آبادیاں نظر آرہی ہیں کاش پاکستان میں بھی کچھ ایسے ہی مخلص اور جاں باز کارکن سامنے آئے ہوتے اور وہاں بھی پناہ گزینوں کا کچھ حصہ واپس ہوا ہوتا۔

پاکستان جانے والوں کی واپسی

جولائی ۱۹۴۸ء سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آزادانہ آمد و رفت پر پرمٹ سسٹم کی پابندی عائد ہوئی جس کے قوانین بھی دن بدن بدلتے رہے اور کچھ عرصہ بعد پرمٹ سسٹم کی جگہ پاسپورٹ کا نفاذ ہوگیا ادھر ہنگامی حالات اور مار دھاڑ سے مجبور ہوکر دہلی، یو، پی وغیرہ سے پاکستان جانے والے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے وطن میں واپس آنے کے لئے مضطرب

رہا ہے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں خاندان ایسے بھی ہیں جن کے نابالغ بچے دوسرے عزیزوں کے ساتھ افراتفری کے عالم میں پاکستان پہنچ گئے۔ لیکن والدین آج تک ہندوستان ہی میں ہیں یا جوان اولاد یہاں رہ گئی اور ضعیف و بے وسیلہ ماں باپ وہاں پہنچ گئے۔ کوئی خاوند اِدھر رہ گیا اور بیوی پاکستان جا نکلی۔ اسی نوعیت کے ہزاروں کیس پرمٹ سسٹم کے نفاذ کے بعد سے اب تک برابر سامنے آتے رہے، جن کے لئے مستقل طور پر ہندوستان واپس آنے کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا اور پرمٹ سسٹم کی روز افزوں پابندیاں ان کی راہ میں برابر حائل رہیں۔

مجاہد ملتؒ نے شروع دن سے ایسے ہزاروں کیسوں میں فرداً فرداً کوشش شروع کی۔ حضرت مولانا آزادؒ اور محترم پنڈت نہرو کے توسط سے اصولی طور پر یہ پالیسی طے کرلی گئی کہ ہندوستان کے شہری مسلمانوں کا یہ حق ہے کہ ان کی نابالغ اولاد، بیوی بچے یا خاص خاص صورتوں میں ضعیف ماں باپ اور بے وسیلہ بہن بھائی کسی بھی وجہ سے پاکستان میں رہ گئے ہیں تو اب ان کو مستقل طور پر ہندوستان میں بسنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ اس اصول کی روشنی میں پاکستان سے واپس ہونے والے ہزاروں ہزار مسلمانوں کے معاملات کی فرداً فرداً پیروی حضرت مجاہد ملتؒ نے فرمائی۔ جمعیۃ کے دفتر میں یہ شعبہ حاجی حسام الدین صاحب کے سپرد رہا۔ آج ہندوستان میں جہاں تہاں ہزاروں ایسے مسلم افراد آباد ہیں جو پاکستان میں گھر کر رہ گئے تھے اور تنہا مجاہد ملتؒ کی سعی و سفارش کی بدولت انھیں اپنے وطن میں مستقل واپسی کا موقع ملا۔

اس کے ساتھ ہی عارضی طور پر پاکستان جانے آنے والوں کے لئے پرمٹ و پاسپورٹ سسٹم کی الجھنیں۔ عورتوں کے فوٹو کی پابندی۔ انکم ٹیکس سارٹیفکیٹ کی پابندی یا مقررہ وقت سے زیادہ ٹھہرنے پر داروگیر کی جو جو دشواریاں وقتاً فوقتاً مسلمانوں کو پیش آتی رہیں ان کے ازالہ کے لئے بھی مولانا مرحوم ہمیشہ پیش پیش رہے۔

اغوا شدہ خواتین کی بازیابی

۴۷ء کے تاریک دور میں سرزمین ہند و پاکستان پر دوسری تمام حشر سامانیوں سے بڑھ کر جو شرمناک حرکت عمل میں آئی وہ مظلوم و بے کس خواتین کا وسیع پیمانہ پر اغوا اور ان کی پامالی تھی۔

چنانچہ ۴۷ء کے بعد دوسرے ہنگامی مسائل میں یہ مسئلہ بھی سرفہرست تھا۔ دونوں مملکتوں کے سربراہوں نے تاریخ کے اس شرمناک داغ کو دھونے کے لئے باہم ایگریمنٹ کر کے ایسی مغویہ خواتین کی بازیابی کے لئے راہ پیدا کی اور قومی کارکنوں نے اس خدمت کا بیڑہ اٹھایا۔ ہندوستان میں خاص طور پر دہلی۔ پنجاب اور بھرت پور سے بڑی تعداد میں معصوم عورتیں اغوا کی گئیں تھیں اور جب بازیابی کی مہم شروع ہوئی تو اس خدمت کے لئے مردوں سے زیادہ کچھ نیک نہاد عورتیں آگے بڑھیں۔ خاص طور پر شریمتی رامیشوری نہرو۔ مس مردولا سارابھائی۔ بیگم انیسہ قدوائی نے تو خود کو اس خدمت کے لئے وقف ہی کر دیا۔ اور پوری تندہی کے ساتھ انجام دیا۔ دوسرے قومی کارکنوں کا تعاون بھی ان کو برابر حاصل رہا۔ جنرل شاہ نواز صاحب بھی جو آج کل ہندوستان کے نائب وزیر ریلوے ہیں ۴۸ء میں مس مردولا سارابھائی کے ساتھ اس خدمت میں سرگرم عمل تھے۔ اونچی سطح پر نگراں اور مشیر کار حضرات میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ بھی شامل تھے۔ ویسے جمعیۃ علماء کی جانب سے اس خدمت کی ذمہ داری مولانا مرحوم نے مجھے سونپی تھی اور سرپرستی خود فرماتے تھے۔ ۴۸ء سے مسلسل پانچ چھ سال یہ سلسلہ جاری رہا اور ان تھک کوششوں کی بدولت اغوا شدہ خواتین کی ایک بڑی تعداد اس مدت میں برآمد کر کے اپنے ورثاء تک پہنچائی جا سکی۔

ہنگامی حالات میں مرتد ہونے والوں کا اعلان اسلام

اسی زمانہ میں پنجاب، میوات، اور بھرت پور کے دیہات و قصبات میں ایک بڑی تعداد ایسے مسلمانوں کی رہ گئی تھی جو غضبناک حالات اور کشت و خون میں اپنی جان بچانے کے لئے، اس کے سوا کچھ نہ کر سکے کہ جس طرح ان پر جبر کیا گیا انھوں نے دوسرے مذاہب قبول کر لئے۔ حالات کے سدھرنے کے بعد بعض بعض مقامات میں ایسے لوگوں سے اچانک سابقہ پڑا اور پھر اندازہ ہوا کہ جا بجا ایسے مسلمان موجود ہیں جنھوں نے ارتداد کی آڑ میں اپنی جان بچا رکھی ہے اور حسرت و یاس کے ساتھ اپنی زندگی پر آشوب بتا رہے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اگر حکومت ان کی پشت پناہی کے لئے آمادہ ہو تو پھر وہ کھل کر اپنے اصل مذہب کی زندگی اختیار کریں۔ ایسے کچھ لوگ چوری چھپے دہلی پہنچ کر حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے ملے اور انھوں نے دوسروں کی بھی نشان دہی کی اور اپنی خواہش کا اظہار کیا تو مولانا مرحوم نے یہ معاملہ حضرت مولانا آزادؒ اور محترم پنڈت نہرو تک پہنچایا اور ان کی کوششوں سے ریاستی حکومتوں کے نام ایک ہدایت نامہ جاری ہو گیا جس کا مفاد یہ تھا کہ حکومت ہند ایسے جبری تبدیل مذہب کو چونکہ تسلیم نہیں کرتی ہے اس لئے جہاں جہاں ایسے واقعات درپیش ہوں وہاں لوگوں کو سرکاری طور پر پوری مدد دی جائے تاکہ وہ اپنے اصل مذہب کو علی الاعلان ظاہر کر سکیں اور اس معاملہ میں ان کی مشکلات کو دور کیا جائے۔

ہدایت نامہ اگرچہ کانفیڈینشل تھا تاہم پرائم منسٹر سکریٹریٹ سے اس کی ایک نقل حضرت مجاہد ملتؒ کو دے دی گئی اور اس سے کام لے کر پنجاب و راجستھان میں ایسے مرتدین کی بڑی تعداد کو دوبارہ اعلان اسلام کا موقع بہم پہنچایا گیا۔ اور آج وہ لوگ کھل کر اپنی اسلامی زندگی گزار رہے ہیں۔ والحمد للہ

کچھ اور خدمات

تقسیم ہند کے ری ایکشن نے جس طرح زندگی کے دوسرے گوشوں کو متاثر کیا اس کا خاص اثر ہندوستان میں باقی ماندہ پانچ کروڑ مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشی زندگی میں بھی نمایاں ہوا۔ پاکستان بننے کے ساتھ ساتھ ایک طرف اونچے درجہ کے تاجر اور سرمایہ دار ہمت کر پاکستان چلے گئے اور دوسری طرف سرکاری اور نیم سرکاری سروسوں میں بھی جو اونچے عہدوں پر فائز تھے انھوں نے بھی اپنا مستقبل پاکستان ہی میں محفوظ سمجھا۔ پھر یہاں فرقہ واریت کے سیلاب اور آئے دن قتل و غارت کی گرم بازاری نے مسلمانوں کی رہی سہی امیدوں اور امنگوں کو خاک میں ملا دیا۔ وقت کی فضا اتنی مکدر اور حالات کے تیور اس قدر برہم تھے کہ نہ کاروباری زندگی میں مسلمانوں کے لئے کوئی خاص گنجائش باقی رہی، نہ سروسوں اور ٹھیکوں وغیرہ میں۔

پھر زمینداری اور جاگیرداری کے خاتمہ نے اور بھی قافیہ تنگ کر دیا اور ان سب سے بڑھ کر جو ہمہ گیر مصیبت وبال جان بن رہی تھی وہ کسٹوڈین کی مار تھی جس نے مسلمانانِ ہند کی اقتصادیات کی رگیں خشک کر دی تھیں۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ آزادی کے بعد وطن عزیز کی تعمیر و استحکام، خوش حالی اور ہمہ گیر ترقی کی بنیادیں استوار کی جا رہی تھیں ملک کے اندر ایسی کثیر التعداد اقلیت کی معاشی زبوں حالی اور بربادی خود ملکی اور وطنی نقطۂ نظر سے بھی ناقابل برداشت اور باعث فکر و تشویش تھی۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ جن کے فکر و شعور پر بیک وقت ملک اور ملت دونوں ہی کے تقاضے اور فکرمندیاں چھائی ہوئی تھیں اس صورت حال کے تدارک اور اصلاح کے لئے بھی وہ اپنے اثر و رسوخ اور قوت عمل کے ساتھ برابر کوشاں رہے۔ ملک کے نئے نظام اور رجحانات میں اگرچہ اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ سروسوں، ٹھیکوں اور کاروباری سہولتوں میں مختلف فرقوں کا تناسب ملحوظ رکھا جاتے۔ تاہم مولانا مرحوم اپنے ذاتی تعلقات اور اثرات کے بل پر فرداً فرداً سینکڑوں بلکہ ہزاروں اُمیدواروں کو سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ سروسوں اور کاروباری سہولتوں کے حصول میں پوری مدد دیتے رہے اور بلا مبالغہ ان کی سعی و سفارش کی بدولت اس دور میں ہزارہا مسلمانوں کو روزگار اور معاش کے مواقع مل سکے اور ان ہزاروں گھرانوں کی اقتصادی زندگی سدھر سکی۔ انفرادی کوششوں کے ساتھ ساتھ وہ مجموعی طور پر برابر اس کی کوشش کرتے رہے کہ سرکاری ملازمتوں اور کاروباری وسائل میں اقلیت کو اس کے جائز حقوق سے بالکل محروم نہ رکھا جائے اپنی پارلیمنٹری تقریروں میں بھی بار بار انھوں نے اس اہم قومی ضرورت کو پیش کیا اور انہی کی کوششوں کی بدولت مرکزی حکومت نے کئی بار ایسی ہدایات اپنے اداروں کو بھی اور ریاستی حکومتوں کو بھی دیں اور اس کا چیکنگ بھی کیا کہ مسلم اقلیت کے نظرانداز کئے جانے کی شکایات کیوں درپیش ہیں۔

جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس سورت (اکتوبر سنہ ۵۰ء) میں ایک مستقل تجویز کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کی اقتصادی فلاح و بہبود کا ایک مستقل پروگرام جمعیۃ کے سامنے رکھا اور اگر ہنگامی حالات و مشاغل نے مہلت دی ہوتی تو وہ اس راہ میں بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔

تقسیم ہند کے وقت خاص طور پر ریلوے ڈپارٹمنٹ، پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف اور دوسرے محکموں میں ایسے مسلم ملازمین کی تعداد ۳۵ ہزار سے زائد تھی جنھوں نے آپشن فارم میں "مستقل ہندوستان" یا "عارضی پاکستان" کے فارم پر کئے تھے۔ لیکن بعد میں حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ ان میں سے بڑی تعداد جس نے ہندوستان میں ہی رہنا طے کیا تھا مختلف بہانوں سے نظرانداز کر دی گئی اور ان کی سروسیں ختم کر دی گئیں۔ ان کے وفود مولانا کے پاس پہنچے اور ۴۸ء سے مسلسل چار پانچ برس تک مولانا مرحوم ان کے معاملات کی پیروی کرتے رہے۔ مرکزی کیبنٹ میں ایک واضح پالیسی طے کرائی اور پھر اس پالیسی پر عمل درآمد کے لئے برابر جدوجہد فرماتے رہے اور بحمداللہ ان کی کوششوں سے ایسے ہزاروں ملازمین کو دوبارہ سروسوں میں لے لیا گیا۔

ان سلسلوں کے علاوہ آئے دن ماتحت افسروں کے فرقہ وارانہ جذبات کی بدولت مسلم ملازمین کو مختلف محکمانہ ناانصافیوں کی جو صدہا شکایات پیش آتی رہیں ان کے تدارک کے لئے مولانا کی فکرمندیاں برابر مصروف کار رہیں اور سینکڑوں معاملات کو خود انھوں نے اپنی گفتگوؤں اور خطوط کے ذریعہ طے کرایا۔

مسلمانوں کی طرح غیر مسلم اور خاص طور پر پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزیں بھی ان معاملات میں مولانا مرحوم کی نفع بخشیوں سے برابر فیض یاب ہوتے رہے اور وہ یکساں دردمندی اور ہمدردی کے ساتھ ہر مسلم و غیر مسلم کی خدمت اور سعی و سفارش فرماتے رہے۔

ریلویز ڈپارٹمنٹ میں جب مسلم ملازمین کو نماز جمعہ کی جماعت سے محروم کر دیا گیا تو یہ معاملہ بھی مولانا نے اس وقت کے ریلوے منسٹر مسٹر گوپالا سوامی آئینگر کے سامنے رکھا اور بالآخر وزیر موصوف نے یہ سرکلر جاری کر دیا کہ مسلم ملازمین کو نماز جمعہ کے لئے ایک گھنٹہ کی تعطیل بوضع تنخواہ بلا تامل دے دی جائے۔

ایک اور پریشانی ۴۹ء، ۵۰ء سے ظہور میں آئی جب کہ ریلوے اسٹیشنوں کو خاص طور سے شمالی ہند میں مسلمان ٹھیکیداروں کے ریسٹوران، ریفریشمنٹ روم

اور ٹی اسٹالس کے کنٹریکٹ ختم کر دیئے گئے اور اس کے نتیجہ میں سینکڑوں گھرانوں کے روزگار ہاتھ سے جاتے رہے۔ ان کی فریاد بھی مولانا مرحوم نے مرکزی وزراء اور بالخصوص وزیر اعظم ہند تک پہنچائی۔ اور ان کی توجہ سے اس وقت بڑی حد تک یہ مسئلہ حل ہو سکا۔

کلکتہ کی مشہور "مسلم چیمبر آف کامرس" کا سرکاری ریکوگنیشن ختم کر دیا گیا تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا یہ تنہا چیمبر باقی رہا تھا۔ اس کے لئے بھی مولانا مرحوم نے کامیاب جدوجہد فرمائی اور بحمداللہ آج وہ "اورینٹل چیمبر آف کامرس" کے نام سے باقی اور سرکاری ریکوگنیشن سے بہرہ مند ہے۔

اقتصادی اور معاشی زندگی کی طرح تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی سیاسی زندگی اور اس کے تقاضے بھی پامال ہو کر رہ گئے تھے اور ٹھیک اسی طرح جس طرح ان کے اقتصاد و معیشت کی از سر نو تعمیر کے لئے کوششیں کی گئیں، ملکی سیاست اور نظام جمہوریت کے دائروں میں بھی مسلمانوں کی واجبی نمائندگی اور صلاحیت کار کے لئے مولانا مرحوم نے اپنی ذاتی حیثیت سے مسلسل جدوجہد فرمائی۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کو ہمیشہ یہ تلقین فرماتے رہے کہ وہ پوری جرأت مندی کے ساتھ وطن عزیز کی تعمیر اور پیش رفت میں حصہ لیں اور خود کو ملکی زندگی میں ایک لمحہ کے لئے بھی اجنبی اور تماشائی نہ سمجھیں اور دوسری طرف اپنی جماعت "کانگریس" کے حلقوں میں برابر اس کی کوشش کرتے رہے کہ مسلمانوں کو وسعت قلبی کے ساتھ اپنایا جائے۔ مرکزی اور ریاستی مجالس قانون ساز میں ان کے تناسب کے بقدر ان کو پورے مواقع دیئے جائیں۔ خاص طور پر جنرل الیکشنوں کے موقع پر تو مولانا ہی کی ذات گرامی پورے ملک کے مسلمانوں کی امیدوں اور کوششوں کا محور بنی رہتی تھی۔ دفتر جمعیۃ میں ایک میلہ سا لگ جاتا تھا اور تین تین مہینے سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔ ایک ایک سیٹ اور ایک ایک ٹکٹ کے لئے مولانا لڑتے تھے اور پوری کوشش فرماتے تھے۔

ان تمام مواقع پر مولانا کے اثر و رسوخ اور ان کی کوششوں سے مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی برابر فیضیاب ہوتے اور مولانا کی سفارش کا سہارا پاکر اپنی کوششوں کو آگے بڑھاتے تھے۔

آج جب کہ مولانا مرحوم ہم سے رخصت ہو چکے ہیں، ہزاروں اور لاکھوں دلوں پر یہ احساس طاری ہے کہ عوام و خواص کی خدمت و مدد کا ایک بڑا سہارا جاتا رہا اور ایک ایسا ستون گر چکا ہے جس کی پشت پناہی ہزاروں کو سنبھالتی اور سہارا دیتی تھی۔

اوپر کے صفحات میں جو کچھ لکھا گیا وہ بھی مولانا کی ہمہ گیر اور دور آفریں خدمات اور ان کے جذبۂ عمل کا محض ایک مختصر خاکہ اور نا تمام نقش ہے، غریبوں اور مظلوموں کی مدد میں انھوں نے بیسیوں خدمات وہ انجام دیں جن کا تذکرہ زبان و قلم تک لانا انھوں نے کبھی گوارا نہ کیا۔ بہرحال اس نا تمام خاکہ سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خاص طور پر زندگی کے آخری پندرہ برسوں میں ان کے جذبۂ عمل اور ان تھک خدمات کا کیا عالم تھا اور خدمت و عمل کی کن کن راہوں کو انھوں نے بیک وقت آباد رکھا اور فکر و تدبیر کے کون کون سے محاذ تھے جہاں تنہا انہی کی ذات برابر سینہ سپر رہی اور ان کے سایۂ خلوص و شفقت میں خدا کی کتنی مخلوق کو چین و سکون کا سانس لینا نصیب ہوا۔

فرقہ وارانہ فسادات اور مجاہد ملت کی خدمات

سرزمین ہند پر فرقہ واریت کے جوش و خروش نے ۱۹۴۷ء میں جو انگڑائیاں لیں وہ بدترین دور بالآخر گاندھی جی کی قیمتی جان لے کر رہا۔ کاش سیہ بختی کی یہ تاریخ یہیں ختم ہو گئی ہوتی اور اس کے بعد ہندوستان کا دامن عزت حوادث قتل و غارت سے داغدار نہ ہوتا۔ مگر افسوس کہ ۱۹۴۷ء کے بعد بھی آئے دن جنون فرقہ پرستی کی بدمستیاں جاری رہیں اور اگلے برسوں میں لگ بھگ کوئی سال بھی ایسا نہ گزرا جس میں فرقہ وارانہ ہنگامے اور فسادات رونما نہ ہوئے ہوں۔

ملک کے اندر بدامنی اور حوادث کا یہ تسلسل اقلیت کے لئے تو ایک مستقل آزمائش، بددلی اور بے اطمینانی کا سبب بنا ہی رہا۔ مگر اس کے ہاتھوں وطن عزیز کی عزت و نیک نامی کا دامن بھی تار تار ہوا اور اس کی ترقی اور خوشحالی کی منزل بھی دور ہوتی رہی، انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آزادیٔ ہند کے بعد فسادات کا تسلسل ہی سب سے بڑا حربہ تھا، جو دنیا کی نظر میں ہندوستان کی امن پسندی، شرافت اور تہذیب کو رسوا کرنے کے لئے کام آتا رہا اور جس نے دوسروں کے ہاتھ مضبوط کئے

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جیسے سچے وطن دوست جو آزاد ہندوستان کو امن و خوشحالی کا گہوارہ اور دنیا کی نظروں میں نیک نام اور سربلند دیکھنے کی تڑپ رکھتے تھے اور اسی جذبہ کے ساتھ انھوں نے اپنی جان کی قیمت پر حریت و انقلاب کے جھنڈے اٹھائے تھے۔ آزادی کے بعد ملک کے اندر مسلسل ہنگامے اور

آئے دن فسادات کی خبریں ان کے لئے کس قدر کوفت اور قلبی اذیت کا باعث تھیں، اس کا اندازہ دشوار نہیں۔ پھر بھی ان ہی کا ظرف اور حوصلہ تھا کہ پندرہ برس برابر یہ سب کچھ دیکھتے رہے اور مایوس ہونے کی بجائے آخر دم تک اصلاح حال کی کوششوں میں لگے رہے۔ ایک طرف بے سہارا اقلیت کا یہ حال تھا کہ جہاں کہیں کوئی فرقہ وارانہ یورش ہوتی مولانا ہی کی طرف امید کی نگاہیں اٹھتیں اور ان سے بڑھ کر تھا بھی کون جو خدمت گزاری کی لگن میں اپنی جان عزیز سے بھی بے نیاز ہو چکا ہو اور دوسری طرف خود مولانا کا یہ حال رہا کہ ملک کے کسی بھی گوشہ سے فساد کی خبر آئی اور مولانا تلملا کر اٹھے۔ ہو سکا تو خود موقع واردات پر پہنچے یا اپنی طرف سے اپنے رفقاء کار کو بھیجا۔ صحیح واقعات پر فوراً حکومت کے سربراہوں کو توجہ دلائی۔ پارلیمنٹ کے بھرے اجلاس میں فرقہ پرستوں کی حرکتیں کھول کر بیان کیں اور ان پر اپنے دل کی چوٹ کا برملا اظہار کیا۔ برباد ہونے والے مظلوموں کی مدد کی فکر کی۔ زخمیوں اور ستم رسیدگان کی ڈھارس بندھائی اور جو کچھ خدمت وہ کر سکتے تھے اس کی تکمیل کے بغیر چین سے نہ بیٹھے۔

۵۰ء میں

آخر ۵۰ء میں ہولی کے موقع پر یوپی کے مغربی اضلاع مرادآباد، بریلی، پیلی بھیت، شاہجہان پور اور علی گڑھ میں ہنگامے برپا ہوئے اور دوسری طرف کلکتہ و نواح کلکتہ میں خوفناک اور شدید نوعیت کے حوادث قتل و غارت کی گرم بازاری ہوئی۔ مولانا مرحوم نے ہم لوگوں (انیس الحسن، مولانا فقیہہ الدین، مسٹر خلیل باغ والا اور مولوی شفیق احمد مرحوم) پر مشتمل ایک وفد اضلاع یوپی میں بھیجا اور خود ۵ مارچ ۵۰ء کو کلکتہ پہنچ کر وہاں کی مصیبتوں کا جائزہ لیا۔ واقعات کی سنگینی کے پیش نظر حضرت مولانا آزاد مرحوم اور وزیر اعظم نہرو بھی کلکتہ پہنچ چکے تھے۔ مجاہد ملتؒ نے پنڈت جی کے ساتھ فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا، مظلوموں اور پناہ گزینوں سے ملے اور اصلاح حال کی تدبیروں میں پورا ہاتھ بٹایا۔ پانچ روز کلکتہ میں کام کرنے کے بعد ۱۲ مارچ کو مولانا لکھنؤ آئے اور وزیر داخلہ شری لال بہادر شاستری سے یوپی کے حوادث پر تفصیل سے بات چیت کی اور واپسی میں خود شاہجہان پور، بریلی، پیلی بھیت ہوتے ہوئے حالات کا خود مشاہدہ کر کے دہلی لوٹے۔

ان ہی دنوں فسادات کی آگ یوپی و بنگال کے علاوہ گوالیار اور سی پی میں بھی بھڑک اٹھی۔ حضرت مولانا نے جمعیۃ کا دوسرا وفد (مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی اور مسٹر محمد احمد وکیل) گوالیار کٹنی وغیرہ بھیجا اور دہلی میں بیٹھ کر ریاستی اور مرکزی حکومتوں کو اصلاح حال پر متوجہ فرماتے اور تدبیر و چارہ جوئی میں مصروف رہے اور ۲ مئی کو خود کٹنی، ساگر، جبل پور کا دورہ کر کے پیش آمدہ مصائب و مشکلات کی مفصل رپورٹ مرکزی اور ریاستی حکومت کو دی۔ اور مصیبت زدوں کی مدد کے لئے ہر ممکن جد و جہد فرمائی۔

اسی دوران (اپریل ۵۰ء) ٹونک میں ہنگامے ہوئے تو حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب اور سلطان یار خاں صاحب وکیل کو ٹونک بھیجا اور پھر ۲۹ جنوری کو مالپورہ (راجستھان) سے فساد کی خبر آئی اور مولانا نے مسٹر شاکر علی خاں و مولانا محمد عاقل صاحب الہ آبادی کو مالپورہ روانہ کیا۔ اسی مہینہ میں ایک طرف کاٹھیاواڑ کے علاقوں دھوراجی، سید پور وغیرہ میں سخت ہنگامے رونما ہوئے، جہاں مرکزی جمعیۃ کی طرف سے حضرت مولانا محمد میاں صاحب اور مسٹر آفتاب احمد بی۔ اے پر مشتمل ایک وفد کو روانہ کیا اور دوسری طرف بڑنگر (مدھیہ بھارت) میں شرپسندوں نے سر اٹھایا تو مولانا سید محمد میاں صاحب، مسٹر سلطان یار خاں وکیل اور مولانا مسعود احمد صدیقی کو ادھر بھی بھیجا۔

ملک بھر سے ان حوادث قتل و غارت کی پوری رپورٹیں موصول ہونے کے بعد حضرت مولانا ایک طویل یادداشت ساتھ لے کر ۱ جولائی ۵۰ء کو دہلی میں وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو سے ملے اور مظلوم اقلیت کی پریشان حالی اور تباہیوں کا پورا نقشہ ان کے سامنے رکھا۔

اسی اثنا میں آسام کے تنگ نظر فرقہ پرستوں نے غریب اور بے سہارا اقلیت کو ستانے کے لئے ایک نئی ٹیکنک ایجاد کی اور جا بجا پاکستانی ہونے کے الزام میں مسلمانوں پر داروگیر شروع ہو گئی۔ حضرت مولانا نے اس صورت حال کی تحقیق اور ضروری کوششوں کے لئے مرکزی جمعیۃ کی جانب سے حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا محمد میاں صاحب اور مسٹر سلطان یار خاں وکیل کو آسام روانہ کیا اور اس وفد کے پہنچنے سے حالات میں خوش گوار تبدیلی پیدا ہوئی اور مسلمانوں کی بے چینی بھی بڑی حد تک دور ہو سکی۔

۲۷ ستمبر ۵۰ء کو بھاگلپور ضلع بھاگلپور میں فساد ہوا۔ جہاں حضرت مولانا محمد میاں صاحب اور حضرت مولانا نور الدین صاحب بہاری بشکل وفد پہنچے اور مجاہد ملتؒ نے وزیر اعظم بہار مسٹر سری کرشن سنہا کو تار دے کر متوجہ کیا۔ پھر ۱۱ ستمبر کو دہلی میں وزیر اعظم ہند سے دوبارہ ملاقات کی۔

۵۱ء میں

۳۱ جنوری کو کمار دھوبی (دھنباد) میں سخت ہنگامہ ہوا۔ مولانا نے پہلے چیف منسٹر کو تار بھیجا۔ پھر ۹ فروری کو خود وہاں پہنچ گئے ۲۳ مارچ کو نولگڈھ (راجستھان) سے بدامنی کی خبریں آئیں۔ مولانا نے ٹیلی فون پر چیف منسٹر شری جے نرائن ویاس سے مفصل گفتگو کی۔ شروع مئی ۵۱ء میں ودھرا (گجرات) میں فرقہ وارانہ فتنوں نے سر اٹھایا تو فوراً مولانا محمد رفیق دہلوی اور چودھری شیر جنگ کو وہاں بھیجا۔ جولائی کو اجین شہر میں ہنگامے ہوئے تو مدھیہ بھارت کے چیف منسٹر شری تخت مل جین کو متوجہ کیا اور مولانا مسعود احمد صاحب صدیقی سے پوری رپورٹ طلب کی۔

اکتوبر میں محرم کے دنوں بارہ بنکی اور بہرائچ میں فسادات رونما ہوئے تو حضرت مولانا سید محمد شاہد فاخری صاحب کو فوراً وہاں بھیجا۔

۵۲ء میں

۱۲ فروری کو جے پور میں کچھ حوادث پیش آئے۔ وہاں راقم السطور کو اور مسٹر عتیق احمد کو بھیجا۔ پھر ہولی کے دنوں آگرہ و فیروز آباد میں بدامنی ہونے پر مولانا اخلاق حسین قاسمی اور مسٹر اسرار احمد آزاد کو ۱۷ مارچ کو روانہ کیا۔ چند ہی روز بعد مظفر نگر میں بھی گڑبڑ ہوگئی اور مجاہد ملت خود وہاں تشریف لے گئے۔ پھر ستمبر میں ۸ تاریخ کو علی گڑھ میں کچھ واقعات پیش آئے۔ جہاں مولانا فقیہہ الدین کو بھیجا گیا۔ ادھر ۲۸ ستمبر کو دہلی میں محرم کے جلوس پر ہنگامہ ہوا، تو مولانا نے اس کی روک تھام کے لئے بھی بروقت بھاگ دوڑ کی۔

۵۳ء میں

سب سے پہلے یکم مارچ (عین ہولی کے دن) اور پھر ۵ مارچ (رنگ پنچمی کے روز) بھوپال میں شدید فساد ہوا جہاں حضرت مولانا محمد میاں صاحب، مسٹر یوسف فیروزی اور مولانا فقیہہ الدین پر مشتمل وفد بھیج کر اصلاح حال کی پوری کوششیں فرمائیں۔ ۱۷ اپریل کو چومو (ضلع جے پور) میں گڑبڑ ہوئی اور وہاں مسٹر سلطان یار خاں وکیل کو بھیجا

اسی زمانہ میں گجرات کی نواح میں شدھی تحریک نے پوری قوت کے ساتھ سر اٹھایا تو اس کے مقابلہ اور روک تھام کے لئے ناظم جمعیۃ علما حضرت مولانا محمد میاں صاحب گجرات پہنچے اور مرحوم مولانا شمس الدین صاحب بڑودوی کے ساتھ انھوں نے نہایت مؤثر مفید اور خاموش خدمات انجام دیں اور اس فتنہ کی سرکوبی ہوگئی

۵۴ء میں

۵ جون کو علی گڑھ میں پھر مار دھاڑ کی شورشیں بپا ہوئیں۔ مولوی فقیہہ الدین اور مولانا محمد زبیر قریشی کو حالات کی دیکھ بھال کے لئے بھیجا ادھر جولائی و اگست میں بیلی بھیت۔ ہلدوانی۔ متھرا، جودھپور۔ پالی، ڈیڈوانہ وغیرہ میں جزوی وارداتیں ہوئیں اور بڑے پیمانہ پر دکن کی طرف نظام آباد۔ اندور۔ جالنہ، عادل آباد، گلبرگہ وغیرہ میں "پاکستانی جھنڈا لہرانے" کا بے جا الزام دے کر شرپسندوں نے شہری امن و سکون کو برباد کیا مولانا مرحوم نے ان تمام واقعات پر جمعیۃ کے ریاستی کارکنوں کو اصلاح حال کے لئے بھیجا۔ اور خود مرکزی و ریاستی حکومتوں سے ربط قائم کرکے حالات کی درستی کے لئے کوشاں رہے۔ ان فسادات کے سلسلے میں ۲۶ اگست ۵۴ء کو مولانا نے پارلیمنٹ میں ایک شورٹ نوٹس سوال رکھنا چاہا جو انڈمٹ نہیں کیا گیا تاہم مولانا ۲۸ اگست کو لکھنؤ پہنچے اور ریاستی ذمہ داروں سے ملے اور وہاں سے مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا عبدالرؤف صاحب کو ساتھ لے کر پیلی بھیت گئے جہاں مسلم اقلیت پر حوادث کا بہت اثر تھا۔ ۲ ستمبر کو دہلی میں جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس تھا۔ مولانا نے تمام حالات اجلاس کے سامنے رکھے اور طے پایا کہ جمعیۃ کا ایک معزز وفد وزیر اعظم ہند سے مل کر مسلمانوں کی بربادی اور پریشانیوں پر ان کو توجہ دلائے۔ ۱۸ ستمبر کو یہ وفد (جس میں حضرت مولانا احمد سعید صاحب سید محمد جعفری صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا شاہد فاخری صاحب، مولانا نورالدین صاحب بہاری، مولانا سید محمد میاں صاحب اور خود حضرت مجاہد ملتؒ شریک تھے) حضرت شیخ مدنیؒ کی قیادت میں محترم پنڈت نہرو سے ملا۔ پنڈت جی نے وفد کی گزارشات اور تجاویز کو بڑی توجہ اور دردمندی کے ساتھ سنا اور اسی کے نتیجہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی جانب سے تمام ریاستی شاخوں کو ایک سرکلر کے ذریعہ ہدایات دی گئیں کہ فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام اور مقامی حکام کی کوتاہ کاریوں پر کانگریس کے عمائدین اور کارکن پوری توجہ رکھیں اور اقلیت کی پریشانی اور بے اطمینانی دور کرنے میں پوری دلچسپی لیں۔

ان ہی دنوں حضرت مجاہد ملت کی فکر مندانہ دوڑ دھوپ کو دیکھتے ہوئے کلکتہ کے مشہور روزنامہ۔ آزاد ہند۔ نے اپنے اداریہ میں لکھا تھا!

"بڑھاپے میں آدمی کمزور پڑ جاتا ہے۔ دل بجھ جاتا ہے۔ خون میں ٹھنڈک دوڑ جاتی ہے۔ کام کرنے کی نہ تو امنگ باقی رہتی ہے اور نہ حوصلوں میں بلندی مگر ہندوستان کے دو بوڑھے ایسے ہیں جو نوجوانوں کو بھی مات دیئے ہوئے ہیں۔ ایک تو ہیں پنڈت نہرو وزیر اعظم ہند۔ اور دوسرے جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سیکریٹری مولانا حفظ الرحمٰن۔ ان دو بوڑھوں نے اس وقت ملک کا اپنے کمزور کندھوں پر جواں اور مضبوط ہمت کے ساتھ اٹھالیا ہے۔ یہ فرق اپنی جگہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ ایک شخص عوامی لیڈر شپ کے علاوہ سرکاری کرسی بھی سنبھالے ہوئے ہے اور دوہری محنت کر رہا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے آج سے چند برس پیچھے کے ہمت شکن

ہندوستان میں جواں مردی سے عوام کی جو خدمت کی ہے۔ وہ ان کی زندگی کا ایسا ورق ہے جسے زمانے کی کسی عمر میں بھی بھلایا نہ جا سکے گا۔ اور آج بھی وہ آسمان پر گھنگھور بادل دیکھ کر جس طوفانی انداز سے ملک کے ایک گوشہ سے دوسرے کونے تک دوڑتے پھر رہے ہیں اور ٹوٹتی ہوئی ہمتوں کو سنبھال رہے ہیں۔ یہ انھیں کا کام ہے۔ اگر آج کوئی یہ سمجھے کہ وہ صرف مسلمانوں کے لئے کام کر رہے ہیں تو موجودہ حالات میں ایسا سمجھنا غیر قدرتی نہیں ہے۔ جب عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں تو دوست بھی دشمن نظر آنے لگتے ہیں۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ مولانا نے مظلوم مسلمانوں کے حق میں جو آواز بلند کی ہے۔ وہ پورے ہند کے لئے آواز ہے۔ اس آواز کے مخاطب ہندوستان کے ۳۶ کروڑ آدمی ہیں۔ مولانا کا خطاب انھیں سے ہوتا ہے۔ وہ انھیں کو بتاتے ہیں کہ آخر تم کس قسم کے جنون میں مبتلا ہوگئے ہو کہ اپنے ہی ناک کان کاٹ رہے ہو۔ مسلمان اس ملک کی رونق ہیں، عزت ہیں، حرمت ہیں۔ تم نادان اسے پیروں تلے روندے ڈال رہے ہو۔ چاہے آج یہ باتیں سمجھ میں نہ آئیں۔ کل ضرور سمجھ میں آجائیں گی۔ اور تب مولانا کی خدمت کو بلا تفریق مذہب و ملت سراہا جائے گا۔ آنکھوں سے لگایا جائے گا۔"

اسی سال اکتوبر میں مدھوبنی (دربھنگہ) اور ضلع مظفر پور کے قصبات جھوپیا و فتح پور میں اور ۱۹ نومبر کو برہم پور (اڑیسہ) میں افسوسناک حوادث پیش آئے۔ مولانا محترم ان دنوں دینی تعلیمی کنونشن کی تیاریوں میں بے حد مصروف تھے۔ پھر بھی وہ ان ہنگاموں پر ریاستی حکام وزراء کو برابر توجہ دلاتے رہے۔

۵۵ء میں

۲ مارچ کو مندسور میں ہنگامہ ہوا جہاں مولانا مسعود احمد صدیقی کو تحقیق حال کے لئے بھیجا۔ سرونج کے واقعات پر مجھے اور مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی کو بھیجا اور پھر ستمبر کو کوٹہ میں فرقہ وارانہ حوادث کی گرم بازاری ہوئی۔ مولانا خود کوٹہ پہنچے (راقم السطور بھی ساتھ تھا) اور حادثات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے راجستھان کے چیف منسٹر شری سکھاڑیا، آئی جی پولیس اور ڈی آئی جی کو کوٹہ بلایا۔ یہ لوگ دوسرے روز پہنچ گئے۔ مولانا نے تمام حالات ان کے سامنے رکھے۔ چنانچہ کلکٹر اور ایس پی کوٹہ کا تبادلہ عمل میں آیا اور حالات کی درستی کے لئے کافی کوششیں ہوئیں۔

۱۵ اکتوبر کو کاس گنج میں کچھ شورش ہوئی اور مولانا نے فوراً مجھے، مولانا فقیہہ الدین اور مولانا عبداللہ بیشتر دانی کو وہاں بھیجا

۵۶ء میں

۲۴ فروری کو آلوٹ میں کچھ گڑبڑ ہوئی جس پر ریاستی حکومت کو توجہ دلائی۔ ۷ اپریل کو دہلی میں جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی کے عین اجلاس میں بھوپال سے ٹیلی فون پر شدید حوادث کی اطلاع ملی۔ دوسرے ہی روز مولانا شاہد فاخری صاحب کو اور مجھے بھوپال روانہ کیا۔

ادھر ۱۳ مئی کو گودھرا اور ۲۹ مئی کو دھولیہ میں کچھ بدامنی ہوئی۔ اور پھر ستمبر میں "ریلیجیس لیڈرز" نامی کتاب نے ملک بھر میں جو فتنہ کھڑا کیا۔ اس کے نتیجہ میں اورئی، جبل پور، کھام گاؤں، علی گڑھ، مراد آباد اور جگہ جگہ بڑے پیمانہ پر فسادات کی آگ بھڑکی۔ مولانا نے حافظ جمیل الرحمٰن صاحب اور مسٹر عبدالستار فاروقی کو جبل پور وغیرہ اور مولوی فقیہہ، مسٹر سلطان یار خاں اور مولانا عبدالشکور ایم پی کو علی گڑھ روانہ کیا۔ خود مراد آباد پہنچے اور دہلی آتے ہی پنڈت نہرو، پنڈت پنتھ اور صدر کانگریس سے ملے اور تمام حالات ان کے نوٹس میں لائے۔ پنڈت نہرو پر ان حوادث کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ ۲۳ ستمبر کو انھوں نے دہلی کے جلسۂ عام میں فرقہ پرستوں کی فتنہ سامانی اور توہین مذاہب کے خلاف سخت الفاظ میں تنبیہ کی اور ان حرکتوں کو ملک کی عزت و نیک نامی کے لئے ناقابل برداشت قرار دیا۔

۵۷ء و ۵۸ء میں فسادات کا تسلسل بڑی حد تک دبا رہا۔ راوریہ، ساگلی، بھوساول، جل گاؤں وغیرہ میں کچھ چیدہ چیدہ واقعات ضرور پیش آئے، لیکن عام حالات پرسکون رہے۔ لیکن

۵۹ء میں

شر و فساد کی کوششوں نے پھر سر اٹھایا۔ چنانچہ ۹ جنوری ۵۹ء کو کشن گنج (ضلع پورنیہ) میں ہنگامے برپا ہوئے اور مجاہد ملت نے فوراً مولانا محمد میاں صاحب، مولانا محمد طاہر صاحب ایم پی اور مولانا سید محمد نور اللہ صاحب کو وہاں روانہ کیا۔ پھر ہولی کے موقع پر ۲۴ مارچ کو مبارک پور و بہرائچ میں اقلیت کشی کے شدید حوادث پیش آئے اور ان سے بھی بڑھ کر پولیس کے مظالم نے حالات کو سنگین بنا دیا۔ رمضان کے دن تھے پھر بھی ۲۸ مارچ کو مولانا خود روانہ ہوئے اور جو دردناک حالات وہاں دیکھ کر آئے۔ ان سے بے حد مغموم اور متاثر تھے۔ واپسی میں لکھنؤ ٹھیر کر چیف منسٹر یوپی کو مولانا نے اپنے تاثرات اور مشاہدات سے آگاہ کیا۔

دہلی پہنچے ہی تھے کہ دتا نگر (ضلع میرٹھ) کا ایک وفد اپنی بپتا سنانے کے لئے مولانا کے پاس آیا۔ مولانا نے فوراً مولوی فقیہہ الدین صاحب کو روانہ کیا۔ ادھر رنگ پنچمی کے دن (۲۹ مارچ کو) بھوپال میں پھر قتل و غارت کی گرم بازاری ہوئی اور مولانا ۳ اپریل کو مجھے ہمراہ لے کر بھوپال پہنچ گئے۔ حالات کو خود دیکھا اور بھاری تعداد میں گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ مولانا نے جیل کا دورہ بھی کیا۔

ادھر ۱۰ اپریل کو رام نومی کے دن سیتا مڑھی اور آختہ میں بڑے پیمانہ پر مار دھاڑ شروع ہو گئی۔ مولانا نے فوراً جمعیۃ علماء بہار کا وفد وہاں بھیجا اور خود ریاستی وزیر اعظم کو تار دیئے۔ ساتھ ہی دہلی میں مرکزی جمعیۃ کی جانب سے صدر کانگریس کو ایک مفصل میمورنڈم دیا اور ۷ مئی کو مسلم ممبران پارلیمنٹ کے نمائندہ وفد کے ساتھ پرائم منسٹر صاحب سے ملے اور فرقہ واریت کی بستیوں پر حالات و مشاہدات کی ایک مؤثر یادداشت ان کے سامنے بھی رکھی۔ چنانچہ ۹ مئی کو کانگریس ورکنگ کمیٹی میں ملک کے ان افسوسناک حالات پر غور کیا گیا۔ خصوصی دعوت پر مولانا مرحوم بھی اس میں شریک ہوئے۔ مدھیہ پردیش کے چیف منسٹر شری کاٹجو بھی بلائے گئے۔ اس میٹنگ میں بہت صفائی کے ساتھ مولانا نے فرقہ پرستوں کی حرکتوں کے ساتھ مقامی حکام کے عملی تعاون اور گہری دلچسپیوں کے شواہد پیش کئے۔ ادھر سیتا مڑھی اور آختہ سے مولانا کو مسلسل بلایا جا رہا تھا۔ چنانچہ ۲ جولائی کو وہ خود وہاں پہنچے اور ضروری جدوجہد عمل میں لائے۔

۶۰ء میں

۱۲ اگست کو فیروز آباد کی جامع مسجد پر جو شدید حادثہ پیش آیا۔ اس کی یاد ابھی ذہنوں میں تازہ ہو گی۔ یہاں مولانا مرحوم نے پہلے جمعیۃ کے وفد کے طور پر مولانا فقیہہ الدین اور ڈاکٹر محمود قادری صاحب کو بھیجا اور خود ٹیلیفون پر یو، پی کے وزراء سے بات کی۔ ادھر وزیر اعظم ہند سے ملے اور پھر جب حالات زیادہ بگڑے اور ۱۸ ستمبر کو دوبارہ فیروز آباد سے آگرہ تک آگ پھیلی تو مولانا مرحوم خود دونوں جگہ پہنچے۔ آئی، جی، پی اور ڈی، آئی، جی۔ کمشنر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے ملے اور دونوں فرقوں کی کشمکش کو ختم کرانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

۶۱ء کے بھیانک حوادث

۶۱ء شروع ہوا تو اس کے تیور اور بھی غضبناک تھے۔ ادھر مولانا ۲۳ جنوری سے آسام اور بہار کے دورہ پر تھے۔ ۸ فروری کو دہلی واپس پہنچے۔ ادھر ۶ فروری سے جبل پور میں بھیانک اور دہشتناک حوادث کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ دہلی واپس پہنچتے ہی مولانا نے ٹرنک کال پر چیف منسٹر مدھیہ پردیش ڈاکٹر کاٹجو سے بات کی۔ انھوں نے اطمینان دلایا کہ حالات قابو میں ہیں۔ مگر اگلے ہی روز ۹ فروری کو وہاں قتل و غارت کا سلسلہ اور بھی تیز ہو گیا۔ آنے والی خبروں سے اندازہ ہوا کہ حالات زیادہ بگڑ چکے ہیں اور آگ دور دور تک پھیل رہی ہے۔ مولانا نے فوراً محترم پنڈت نہرو وزیر اعظم ہند کو ایک ذاتی خط لکھا اور اپنی گہری تشویش کا اظہار کیا ساتھ ہی حالات کی تحقیق کے لئے مرکزی جمعیۃ کا وفد جس میں راقم السطور (انیس الحسن) اور مولانا مسعود احمد صدیقی شریک تھے جبل پور روانہ کیا۔ ہم لوگ ۱۳ فروری کو بھوپال رہ کر انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر رستم جی سے ملے جن کے لئے مولانا نے ایک مفصل خط ہمارے سپرد کیا تھا اور دوسرے روز جبل پور پہنچ کر ہم نے سب سے پہلے مسٹر عثمانی وکیل اور صدر جمعیۃ (سیٹھ احمد علی رجب علی) سے ملاقات کی اور پھر شہر کے فساد زدہ علاقوں۔ آتش زدہ اور برباد شدہ دکانوں، مکانوں وغیرہ کو دیکھا زخمی ہونے والوں سے ملے اور شہر کے مختلف محلوں کا گشت کیا۔ جہاں مسلمان پناہ گزین تھے۔ شہر کے میونسپل میئر شری بھگوانی داس اور شری جگموہن داس کے ساتھ بعض علاقوں میں ریلیف کا کام دیکھا۔ جمعیۃ کے عمائدین مولانا ریاست علی صاحب اور محمد رمضان بابا صاحب برابر ہمارے ساتھ رہے۔ جبل پور سے واپسی پر ہم لوگ ساگر ٹھہرے اور وہاں کی تباہیوں کا نقشہ بھی دیکھا۔ اور حاجی محمد شفیع صاحب ایم، ایل، اے کے مکان میں پناہ گزینوں سے ملاقاتیں کیں۔ پھر مولانا مسعود صاحب اُجین واپس ہو گئے۔ اور میں نے دہلی پہنچ کر حضرت مولانا کو اپنے مشاہدات اور تاثرات سے مطلع کیا۔

یہاں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ان دنوں جبل پور، سرریا، ساگر اور گردو پیش میں جو بھیانک اور دردناک حوادث پیش آئے، ان کی سنگینی کا چرچا دور دور تک ہوا۔ اور بعد میں کانگریس، کمیونسٹ، سوشلسٹ پارٹیوں کے وفود بھی پہنچے۔ ممبران پارلیمنٹ کی ایک جماعت بھی وہاں گئی اور دوسری جماعتوں کے وفد اور لیڈر پہنچتے رہے مگر ان حوادث کے فوراً بعد خطرناک حالات میں سب سے پہلا وفد جو وہاں پہنچا وہ ہم خدام پر مشتمل جمعیۃ علماء ہند ہی کا وفد تھا ۱۴/۱۵ فروری کو ہم لوگ جبل پور میں تھے۔ وہیں ۱۵ فروری کو ہم نے رمضان المبارک کا چاند دیکھا تھا۔

بہر حال ان حوادث کا جتنا گہرا اثر مجاہد ملتؒ پر ہوا اس کا کچھ اندازہ ان مضطرب اور دردمندانہ کوششوں سے ہی ہو سکتا ہے جو ان حوادث کے بعد مولانا مرحوم نے مسلسل انجام دیں۔ اور جو بالآخر ان کی تندرستی اور زندگی کا سودا ثابت ہوئیں۔

ہماری رپورٹ دیکھنے کے بعد مولانا مرحوم نے ایک طرف وزیر اعظم ہند کو تمام حالات سے مطلع کیا اور دوسری طرف ۲۱ فروری کو (اور پھر اسی سلسلہ میں ۲۹ مارچ کو) ہند۔ پارلیمنٹ میں وہ معرکۃ الآراء تقریریں کیں جن پر پورے ملک سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں اور جن کو مجاہد ملتؒ کی جرأت گفتار و کردار کا آئینہ کہا جا سکتا ہے یہ دونوں تقریریں اس نمبر کے صفحات ۲۵۷ تا ۲۶۶ پر شائع کی جا رہی ہیں۔ ساتھ ہی مولانا نے پورے ملک سے ان مظلومین کی امداد کے لئے اپیل کی تو

ملک کے کونہ کونہ سے امدادی سامان اور رقوم کا ایک سیلاب امنڈ آیا۔ آخر تک کُل تقریباً تین لاکھ روپیہ موصول ہوا۔ اس امداد کی سب سے پہلی قسط لے کر ۲۶ فروری کو مولانا روانہ ہوئے، مسٹر مظہر امام ایم پی اور ہمارے رفیق ادارہ مسٹر سلیمان صابر ساتھ تھے۔ پانچ روز وہاں ٹھہر کر مولانا مرحوم نے تمام حالات اور امدادی ضروریات کا خود مشاہدہ کیا۔ ساگر وغیرہ بھی گئے۔ پھر ۵ مارچ کو دوبارہ تشریف لے گئے۔ اور اس کے بعد بار بار جبل پور و ساگر جاتے آتے رہے۔ اپنے علاوہ جماعت کے رفقاء کار میں سے حضرت مولانا محمد میاں صاحب۔ مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی۔ مولانا محمد عاقل صاحب الٰہ آبادی۔ مولانا فقیہہ الدین، مولانا شاہد فاخری صاحب، مسٹر ظہیر الدین صدیقی اور جمعیۃ کے دوسرے کارکنوں کی مستقل ڈیوٹیاں لگادیں اور خدمت و امداد کا ایک مستقل مشن قائم کردیا۔ ساتھ ہی مقدمات کی پیروی اور انکوائری کمیشن کے سامنے واقعات کے پہلوؤں کو واضح کرنے کے لئے ممتاز قانون دانوں کی ایک قانونی امدادی کمیٹی بھی بنائی۔ دوسری جماعتیں اور افراد جو امدادی خدمات انجام دے رہے تھے ان کے ساتھ تعاون میں بھی مولانا نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

کل ہند مسلم کنونشن

ایک طرف خدمات کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ دوسری طرف مولانا کو گہرا احساس تھا مسلمانان ہند کی اُس عام بے چینی اور بددلی کا جو جوش پسندوں کی آئے دن کی شورشوں اور دردناک حوادث کے تسلسل اور گراں باریوں کا قدرتی نتیجہ تھی اور آزادی کے تیرہ برس بعد بھی ان سے چھٹکارہ کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی۔ مولانا کو سخت اضطراب تھا کہ اگر ہندوستان کی اس عظیم الشان اقلیت پر بددلی اور مایوسی کی گرفت یوں ہی مضبوط ہوتی رہی اور اس کے اسباب و عوامل یوں ہی قائم رہے تو وہ خود اس کے لئے بھی موت کا پیغام ہوگا اور وطن عزیز کی قدر و قیمت کو بھی خاک میں ملا کر رہیگا مولانا کی نگاہ میں تیرہ سال کی پوری سرگزشت تھی اور وہ مستقبل کے اندیشوں کو بھی پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ اپریل ۶۱ء میں جب مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کے سامنے مولانا نے اپنے تاثرات رکھے تو جہاں اور کچھ چیزیں طے کی گئیں وہاں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ جلد پورے ملک کے مسلمانوں کا ایک نمائندہ کنونشن بلایا جائے اور ملک میں فرقہ پرستی کی فتنہ سامانیوں کا کوئی مؤثر حل تلاش کیا جائے۔ چنانچہ مجاہد ملت تو فوراً ہی کنونشن کی تیاریوں میں لگ گئے۔ لیکن ملک میں اس فیصلہ کے اعلان نے ایک نیا موضوع بحث قائم کردیا۔ فرقہ پرست افراد اور جماعتوں کا اختلاف تو متوقع تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ اور خلاف امید ملک کے بڑے بڑے سنجیدہ ارباب فکر و سیاست، صف اول کے انگریزی، اردو، ہندی اخبارات اور خود کانگریس کے قوم پرور رہنماؤں اور لیڈروں کی تنقیدات سامنے آئیں کسی نے اس کی اہمیت اور افادیت کو برملا سراہا اور کسی نے اس کو بے محل اقدام قرار دیا۔ شدہ شدہ کچھ دوراندازوں نے معاملہ کو تاریک بنا کر محبوب وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو تک پہنچا دیا اور جس طرح بات کو ان تک پہنچایا گیا تھا اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ پنڈت جی بھی کنونشن کے مخالفین کی صف میں آگئے۔ مولانا مرحوم جس اضطراب اور فکرمندیوں کے ساتھ کنونشن کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ملک کے تمام اخباری اور سیاسی حلقوں میں موافق و مخالف تنقیدات نے مولانا کے فکر و اضطراب میں کچھ اضافہ ضرور کیا۔ لیکن ان کے عزم راسخ اور جرأت عمل میں ایک لمحہ کے لئے کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوئی پرائم منسٹر کی مخالف رائے معلوم ہوجانے کے باوجود وہ اپنی جگہ اٹل رہے اور بالآخر پنڈت نہرو اور صدر کانگریس نے بھی ان کی اصابت فکر اور برمحل اقدام کے حق میں اپنی رائے بدل دی اور ۱۰، ۱۱ جون ۶۱ء کو سپرو ہاؤس نئی دہلی میں ڈاکٹر سید محمود صاحب ایم پی کی صدارت اور مجاہد ملت کے اہتمام میں مسلمانان ہند کی تاریخ کا یہ دور اندیش اقدام (مسلم کنونشن) بھرپور کامیابی اور حسن وخوبی کے ساتھ تکمیل پاسکا اور ملک و ملت کے مستقبل پر بہت گہرے اور دور رس اثرات قائم کرسکا۔

کنونشن کی تیاریوں میں مولانا کے سب ہی رفقاء اور ہم خدام شب و روز مصروف رہے اور تمام انتظامات کی نگرانی خود مولاناؒ فرماتے رہے مجلس استقبالیہ کے صدر بھی مولانا ہی تھے (مولانا کا خطبہ استقبالیہ ان کے افکار و عزائم کی آخری یادگار رہ گیا ہے جو صفحہ ۳۳۶ پر آپ کے ملاحظہ سے گزرے گا)

جنرل سکریٹری سید مظہر امام صاحب ایم پی اور سکریٹری مسٹر ظہیر الدین صدیقی ایم اے، ایل ایل بی اور مسٹر یونس سلیم ایڈوکیٹ حیدرآباد تھے۔

کنونشن کی پبلسٹی اور نشر و اشاعت کا پورا کام مولانا نے ظہیر صاحب کے سپرد کر دیا تھا۔ اور انھوں نے بڑی محنت اور خوبی کے ساتھ اس کو انجام دیا۔ مولانا بھی آخر تک اس کے مداح رہے۔

۲۲ مئی کو دہلی سے کنونشن کا دعوت نامہ جاری کیا گیا جس پر ملک بھر کے ۲۳ نامور ارباب فکر و بصیرت کے دستخط تھے اور اس میں کہا گیا تھا!

"جناب محترم!

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ وطن عزیز کی آزادی اور ملک میں سیکولر جمہوری دستور کے نفاذ سے لے کر آج تک مسلمانان ہند زندگی کے تقریباً

تمام اہم شعبوں میں اپنے جائز حقوق سے بڑی حد تک محروم رہے ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اس سلسلہ میں جماعتی اور انفرادی مسلسل جدوجہد کے باوجود جداگانہ و مرکزی لیجسلیچرز کے اندر اور باہر جاری ہے۔ خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکی ہے۔

یہ صورت حال نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے لئے انتہائی ہمت شکن اور شدید اضطراب کا باعث ہے بلکہ خود ملک و قوم کی سالمیت، استحکام، وقار اور ترقی کی راہ میں بھی زبردست رکاوٹ ہے۔ اس لئے شدید ضرورت ہے کہ ہندستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کے ارباب فکر و عمل اپنے اپنے جماعتی اختلاف نقطہائے نظر سے بالاتر ہو کر وحدتِ فکر و عمل کے تعمیری جذبہ کے ساتھ ایک جگہ جمع ہوں اور مسطورۂ ذیل بنیادی امور پر متحد و متفق ہو کر غور کریں، اور کوئی مؤثر راہِ عمل تلاش کریں۔

(۱) — ایسے طریقوں اور تدبیروں پر غور کرنا جن سے ملک کے تمام باشندوں کے درمیان اپنے اپنے مذہب اور کلچر پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے باہمی اتفاق و اتحاد میں ترقی ہو تاکہ ملک کی ہر جہتی ترقی اور استحکام کو زیادہ سے زیادہ تقویت حاصل ہو۔

۲ — مسلم اقلیت آئے دن فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجہ میں جن بھیانک جانی و مالی بربادیوں کا شکار ہوتی رہتی ہے۔ ان کے انسداد کے مؤثر وسائل و ذرائع معلوم کرنے کے لئے غور و فکر۔

۳ — ایسی تجاویز جن کے بروئے کار لانے سے مسلمان سرکاری ملازمتوں میں اپنا واجبی حصہ پا سکیں اور لیجسلیچرز میں ان کو حق کے مطابق نمائندگی حاصل ہو سکے

۴ — وہ تدابیر اور وسائل جن کو اختیار کر کے مسلمان تجارت اور معاش کے دیگر ذرائع مثلاً پرمٹوں، لائسنسوں، ٹھیکوں وغیرہ میں عملی طور پر اپنے حق کے مطابق نمائندگی حاصل کر سکیں۔

۵ — اردو زبان سے متعلق ابھی تک اصل دستوری مطالبہ پورا نہیں ہو سکا ہے۔ اگرچہ انجمن ترقی اردو کی مشترکہ جدوجہد جاری ہے تاہم اس مسئلہ سے متعلق ایسی تدابیر کی تلاش جن سے اردو کو اس کا اصلی مقام حاصل ہو سکے اور ہماری ملی تہذیبی زندگی کا حسن برقرار رہ سکے۔

۶ — سرکاری نصاب تعلیم کی منظور شدہ کتابوں میں آئے دن ایسے اجزاء کی شمولیت جو اسلامی نقطۂ نظر سے ناقابل برداشت اور وجہ اعتراض ہیں ان شکایات کے ازالہ کے لئے مؤثر و اطمینان بخش تجاویز۔

۷ — عام تعلیمی اداروں، بالخصوص میڈیکل اور ٹیکنیکل تعلیم کے اداروں میں داخلے اور سرکاری وظائف کے حصول میں معیاری قابلیت کے باوجود مسلم طلباء کو امتیازی سلوک اور ناانصافی کی عام شکایت ہے۔ اس کے تدارک کے لئے ضروری تدابیر ——————"

مولانا مرحوم نے جس خوبی تدبیر کے ساتھ کنونشن کے نازک مسائل اور کارروائی کو تکمیل تک پہنچایا۔ اس کے بعد وہ تمام اندیشے خود بخود کافور ہو گئے جو بعض حلقوں نے قبل از وقت محسوس کرنے شروع کر دیئے تھے۔

۲۲ رجون ۱۹۶۱ء کو نئی دہلی میں کنونشن کی طرف سے تمام تجاویز پنڈت نہرو وزیر اعظم ہند کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ پنڈت جی نے گہرے تاثر اور توجہ کے ساتھ ان کو قبول کیا اور ان ہی تجاویز کی صدائے بازگشت تھی جو ملک بھر میں قومی اتحاد اور یک جہتی کی مہم کی شکل میں رونما ہوئی اور جس کا بیڑا خود وزیر اعظم موصوف نے اٹھایا۔ خود مسلمانوں کے حق میں اس کنونشن کی بڑی افادیت یہ تھی کہ ان کی پریشانیاں اور ان کے مسائل پوری وضاحت کے ساتھ ملک کے سامنے آئے اور تمام ہی سنجیدہ حلقوں نے ان کی تائید اور حمایت کی۔ بہت سی غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ ساتھ ہی مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی مایوسی اور بددلی کی جگہ عزم و عمل اور جرأت مندانہ زندگی کے نئے آثار پیدا ہوئے۔ اور وطنی زندگی میں اپنے موقف کا زیادہ صحیح شعور بیدار ہوا۔

بحمد اللہ آج اثرات و نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ۱۸۵۷ء کی قیامت صغریٰ کے بعد "لکھنؤ کانفرنس" نے زندگی کی مایوسیوں میں عزم و عمل کی ایک نئی راہ دکھائی اور تاریخ کا رُخ بدل دیا تھا ٹھیک اسی طرح مجاہد ملتؒ کی زندگی کا یہ آخری کارنامہ "مسلم کنونشن" بھی ملک و ملت کی تاریخ کا ایک دور آفریں واقعہ تھا جس نے نہ صرف دلوں اور دماغوں کو ایک نئی روشنی بخشی، بلکہ عزم و کردار کی خشک رگوں کو بھی زندگی کا نیا خون اور شادابی عطا کی۔ یہ بھی مجاہد ملتؒ ہی کی مقبولیت اور ان کا نفوذ و رسوخ تھا کہ ایک آواز پر ملک کے گوشہ گوشہ سے پانچسو سے زائد ڈیلی گیٹ گرمی کی شدت اور سفر کی صعوبتوں کو انگیز کر کے دہلی پہنچے اور وحدت فکر و عمل کا ایک شاندار مظاہرہ تاریخ کی نگاہیں دیکھ سکیں۔

زندگی کے آخری ایام ۔ مرض اور وفات

جبل پور، ساگر وغیرہ کے ان حوادث سے مولانا مرحوم کو جو قلبی اور ذہنی اذیت پہونچی اور اصلاح حال کے لئے ان تھک جد وجہد کا جو بے پناہ بوجھ پڑا۔ اس نے مولانا مرحوم کی بڑھاپے کی صحت اور توانائیوں کو بے حد مضمحل کر دیا۔ رمضان کا مہینہ تھا اور اپنے معمول میں وہ سال کے گیارہ مہینے بھاگتے دوڑتے رہتے تھے۔ مگر رمضان میں دہلی سے باہر قدم نکالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر اس سال حالات کی سنگینی نے ان کے اس معمول کو بھی قائم نہ رہنے دیا۔ ۷ر فروری کو جب وہ آسام کے طویل سفر سے واپس آئے بے حد تھکے ہوئے تھے۔ بخار بھی تھا۔ یہاں آتے ہی انھیں جبل پور کی تشویشناک خبروں سے واسطہ پڑا۔ اور پھر مسلسل کاموں میں لگا رہنا پڑا۔ رمضان ہی میں وہ جبل پور ساگر وغیرہ گئے۔ پھر کنونشن کی تیاریوں کا عظیم بوجھ بھی ان ہی پر پڑا۔ اس دوران میں بعض رفقاء کار نے بھی اپنی غلط روش سے مولانا کی قلبی اذیتوں میں اضافہ کیا اور ایسے نازک وقت میں ان کا دل دکھایا شاید اسی وقت سے مولانا کے شعور پر مستقبل کی پرچھائیاں پڑنی شروع ہوگئی تھیں۔ چنانچہ مسلم کنونشن سے چند روز پہلے مقامی مسلم ورکرز کی ایک میٹنگ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا کی زبان سے وفات سے ایک سال قبل یہ کلمات بے اختیار نکلے۔!

"میں نے تو اپنے خدا سے معاملہ کر لیا ہے۔ میں نعرہ ہائے تحسین و نفرین سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔ دنیا کی عمر ہی کتنی ہے، میری تو بس یہی خواہش ہے کہ اللہ کے روبرو جاؤں تو سرخرو ہو کر۔"

مولانا کے ان جملوں کو دہلی کے نوجوان شاعر کامل قریشی صاحب نے اشعار کے رنگ میں یوں ادا کیا تھا ؎

مانا کہ غم و رنج نے مارا ہے مجھے ہر تلخیٔ دنیا نے بھی گھیرا ہے مجھے
للہ ذرا وقت کے نباض سمجھ ملت کی تباہی نے پکارا ہے مجھے

میں وقت کی تنقید سے مرعوب نہیں تنقید نے اے دوست سنوارا ہے مجھے
دنیا کے سہاروں کا میں قائل ہی نہیں اللہ کی رحمت کا سہارا ہے مجھے

غرضیکہ یہ تمام اندرونی اور بیرونی عوامل آہستہ آہستہ ان کی صحت کی جڑیں کاٹ رہے تھے۔ تھوڑے ہی دن بعد رانچی میں (ستمبر کے تیسرے ہفتہ میں) شدید فساد ہو گیا۔ وہاں بھی مولانا فوراً ہی پہنچے اور ان کے پہنچ جانے سے حالات پر بہت ہی اچھا اثر پڑا۔ اور حکومت بہار نے بروقت مفید قدم اٹھائے۔ رانچی سے مولانا دہلی پہنچے ہی تھے کہ اکتوبر شروع ہوتے ہی علی گڑھ، میرٹھ، ہاپوڑ اور چندوسی میں شر پسندوں نے ایک طوفان بپا کر دیا۔ مولانا کی صحت رفتہ رفتہ اتنی بگڑ چکی تھی کہ مرض و اضمحلال ان کے چہرہ سے نمایاں ہونے لگا تھا۔ ویسے بھی بخار، نزلہ اور کھانسی کی گرفت میں تھے۔ ایک قابل مقامی معالج "ڈاکٹر علیم" نے مولانا کا معائنہ کیا تو بڑی تشویش محسوس کی اور تمام مشاغل چھوڑ کر کم از کم دس دن کے لئے مکمل آرام اور علاج کا مشورہ دیا۔ لیکن مولانا کی طبیعت ان بندشوں کو گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ انھوں نے ڈاکٹر علیم سے صاف کہا کہ میرٹھ، علی گڑھ اور چندوسی میں لوگوں کی جان کے لالے پڑے ہیں اور میں اپنی صحت کی خاطر گھر میں لیٹا رہوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا اور پھر واقعۃً اسی شام مولانا علی گڑھ اور پھر میرٹھ وغیرہ پہنچ گئے۔ ان دنوں خاص طور پر محترم حافظ ابراہیم صاحب، جنرل شاہ نواز صاحب چودھری چرن سنگھ وغیرہ جو بھی مولانا سے ملا چہرہ کی حالت دیکھ کر تشویش محسوس کی اور اصرار کیا کہ آپ اپنی صحت پر توجہ دیں۔ مگر مرض اپنی جڑیں پکڑتا رہا اور مولانا اپنے کاموں میں اسی تن دہی کے ساتھ لگے رہے۔ چندوسی بھی گئے۔ دہلی میں پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی ملتے رہے۔ ۱۵۔۱۶ نومبر کو (زندگی میں آخری بار) جبل پور، ساگر بھوپال کا سفر بھی اسی حال میں کیا۔ دسمبر بھی زیادہ تر سفروں میں گزرا۔ جنوری میں میرٹھ، کانپور، امروہہ کے بعض جلسوں میں شریک ہو کر اپنے حلقۂ انتخاب میں واپس آئے اور آٹھ دس روز سخت سردی کے عالم میں دیہات و قصبات کا گشت کیا۔ یہاں تک کہ مرض پوری قوت کے ساتھ مولانا کی صحت پر چھا گیا۔ ۲۲ر جنوری کو بمبئی جانے کے لئے دہلی واپس پہنچے اور ان کی حالت کو دیکھ کر ہم خدام نے زبردستی بمبئی کا سفر ملتوی کرایا۔ ۲۳ جنوری ۶۲ء کی تاریخ تھی کہ مولانا زندگی بھر کی تھکن اور مرض جانکاہ کو ساتھ لے کر بستر علالت پر ایسے گرے کہ آخر کار اللہ کی رحمتوں نے انھیں بستر علالت سے نہیں، دنیا ہی سے اٹھا لیا۔

علاج کے سلسلہ میں سب سے پہلے مولانا نے اپنے پرانے معالج ڈاکٹر پانڈے سے رجوع کیا اور پہلے ہی دن انھوں نے پھیپھڑوں سے جو پانی نکالا اس میں خون کی گہری آمیزش دیکھ کر وہ کھٹک گئے۔

مزید تحقیق کے لئے خون ٹیسٹ کرایا گیا تو اس میں کینسر کے جراثیم پائے گئے۔ ڈاکٹر پانڈے نے فوراً ہی مولانا کو بمبئی لے جانے کی ہدایت کی۔ چنانچہ ۲۶ جنوری کو صبح ہی ہوائی جہاز سے مولانا کو بمبئی لے جایا گیا۔ گورنر بمبئی شری سری پرکاش مولانا کے پرانے رفیق اور دوست تھے۔ انھوں نے پورے اہتمام کے ساتھ ٹاٹا ہوسپٹل میں مولانا کو داخل کرایا۔ ایک ماہ وہاں علاج ہوتا رہا اور ۲۶ فروری ۱۹۶۲ء کو مولانا دہلی واپس پہنچے، یہاں بہترین اور ماہر ڈاکٹروں اور معالجوں سے رجوع رہا مگر مولانا صحیح معنیٰ میں مریضِ عشق تھے۔ ان کی حالت بھی یہ تھی کہ ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ علاج کی آخری کوششوں کے لئے یہ طے ہوا کہ مولانا کو امریکا لے جایا جائے۔ چنانچہ ۱۶ اپریل ۱۹۶۲ء کو شام کے آٹھ بجے مولانا مرحوم عالمی ایرویز دم "پالم" سے امریکا روانہ ہوئے۔ مولانا کے داماد مسٹر عزیز الرحمٰن رفیق سفر رہے۔ امریکا کی ریاست "وسکونسن" کے مشہور شہر میڈیسن میں ڈھائی ماہ بغرض علاج مقیم رہ کر ۱۲ جولائی کو علی الصباح دہلی واپس پہنچے۔ حالت بہت گر چکی تھی اتفاق سے ان دنوں دہلی میں گرمی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور بجلی کے تعطل نے اور بھی غضب ڈھا رکھا تھا۔ گرمی کی تکلیف سے مولانا بہت بے چین تھے، اور گلمرگ (کشمیر) جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ تیاری بھی ہو گئی تھی۔ مگر قضائے الٰہی ان کے لئے گلمرگ کی بجائے گلزارِ بہشت میں ابدی و سرمدی راحتوں کا اہتمام کر چکی تھی۔ اکیس دن اور قیدِ حیات کے گزار کر ع

آخر اس بیماریٔ دل نے اپنا کام تمام کیا

۲ اگست ۱۹۶۲ء مطابق یکم ربیع الاوّل ۱۳۸۲ھ کو صبح ۳½ بجے بارگاہِ ربّی سے تقرب کی مخصوص ساعتوں میں، وقت اور تاریخ کے طوفانوں سے کھیلنے والی پاکیزہ روح نے اس دیارِ فنا کو خیرباد کہا ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مۓ مرد افگنِ عشق   ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

حضرت مولانا کی علالت نے پورے ملک کو اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا اور ان کی صحت و شفا کے لئے پورے ملک میں دعائیں ہو رہی تھیں مگر مشیت الٰہی کو ان سے جو کام لینا تھا وہ پورا ہو چکا تھا ؎

کام تھے عشق میں بہت، پر میرؔ   ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے

صبح ہوتے ہوتے یہ اندوہناک خبر ہندوستان و پاکستان کی وسعتوں میں پھیل گئی۔ ۱۱ بجے ہم خدام (راقم السطور، مولانا فقیہہ الدین، علی محمد صاحب شیخ محمد ادریس صاحب میر محلہ حویلی حسام الدین دہلی۔ اور بسمل صاحب شاہجہان پوری) نے اپنے مخدوم مجاہد ملتؒ کو غسل دیا۔ کھادی کا کفن پہنایا، عطر و کافور میں بسا کر سفرِ خلد بریں کے لئے دولھا بنایا اور احباب و مخلصین کے آخری دیدار کے لئے ۴ بجے تک بنگلہ کے ایک کمرہ میں آرام سے لٹا دیا جہاں روشن صدیقی صاحب اور دوسرے حضرات قرآن حکیم تلاوت کرتے رہے اور مولانا سے تعلق خاطر رکھنے والی بے شمار مخلوق خدا قطار در قطار اپنے محبوب رہنما کی آخری بار زیارت کرتی رہی۔ ان میں دہلی کے لاکھوں ہندو مسلم عوام و خواص بھی تھے اور باہر سے پہنچنے والے احباب کے قافلے بھی۔ مولانا کے پرانے رفیق وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو بھی آئے۔ دوسرے وزراء اور پارلیمنٹ کے سینکڑوں ممبر بھی، مسلم ممالک کے سفراء اور عمائدین بھی۔ صدر جمہوریہ ہند، نائب صدر جمہوریہ اسپیکر لوک سبھا، آل انڈیا کانگریس کمیٹی، دہلی پردیش کانگریس کمیٹی، دہلی میونسپل کارپوریشن وغیرہ کی طرف سے ملک و وطن کے اس عظیم رہنما کے قدموں پر خراج عقیدت و محبت کے نشان "پھولوں کے حلقے" (ریتھ) نچھاور کئے گئے۔ ۴½ بجے دو لاکھ انسانوں کے بے حال و اشکبار ہجوم نے مجاہد ملتؒ کا جنازہ اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔ دہلی دروازہ کے بیرونی میدان میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے نماز جنازہ پڑھائی اور مغرب کے وقت ملک و ملت کا یہ سرمایۂ عزیز پہلوئے محدثین کرام میں آغوشِ رحمت کے سپرد کر دیا گیا۔

نغفراللّٰہ لہٗ و نور مرقدہٗ واکرم مثواہ واعلیٰ درجاتہٗ فی جنۃ الخلد وجزاہ عنا وعن سائر الامۃ

احسن الجزاء

دل کو سکون روح کو آرام آگیا   موت آگئی کہ دوست کا پیغام آگیا

آخری نقوش

یوں تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی فکر و عمل کی ممتاز صلاحیتیں ملک و ملت کی خوش حالی کے لئے مسلسل جد و جہد اور عظیم الشان کارنامے بجائے خود انسانی تاریخ کا ایک سنہرا ورق ہیں اور ان کی یاد ہزاروں لاکھوں دلوں میں مدتوں باقی رہے گی۔ لیکن زندگی کے آخری چھ مہینے بھی جو انھوں نے بسترِ علالت پر گزارے اپنی سرگزشت اور کوائف کے لحاظ سے ایک عجیب یادگار بن گئے ہیں۔ جن میں ایک طرف

مولانا کے ساتھ عوام و خواص کی بے اندازہ محبت و عقیدت کے نقش بھی بہت ابھر کر سامنے آئے اور دوسری خود مولانا مرحوم کی بے مثل استقامت و عزیمت، صبر و رضا اور زندگی کے آخری لمحات تک ملک و ملت کی لگن اور دردمندیوں کے جوہر بھی بہت ہی نکھر کر دنیا کے سامنے آئے یقیناً مولانا مرحوم کے تذکرہ اور سوانح حیات میں ان آخری نقوش کی آب و تاب اور دلآویزی بھی ہمیشہ نمایاں رہے گی۔ خاص طور پر مولانا کے آخری پارلیمنٹری الیکشن میں جب کہ وہ اپنی بیماری کے باعث آخر تک اپنے حلقہ سے دور رہے نہ صرف ان کے حلقہ کے ہندو مسلم عوام و خواص کا جوش محبت بلکہ دور دور سے مخلصین کی آمد اور کوششیں اور مشرق سے مغرب تک اردو صحافت کے وہ اداریئے جن میں مولانا کی خدمات جلیلہ کو برملا سراہا گیا تھا اور مولانا کے الیکشن کو پورے ملک کی عزت و وقار کا سوال قرار دیا گیا تھا اور پھر الیکشن کے نتیجہ میں سخت مقابلہ کے باوجود مولانا کی شاندار کامیابی۔ اور دوسری طرف ملک بھر میں مولانا کی علالت سے انتہائی تشویش اور صحت یابی کے لئے مسلسل بے تاب دعائیں، اس انتہائی قدر و قیمت کے مظاہرے تھے جو مجاہد ملتؒ کے لئے ہندوستان کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دلوں میں جاگزیں تھی۔

گذشتہ صفحات میں یہ ذکر آ ہی چکا ہے کہ شروع ۱۹۶۱ء میں جبل پور وغیرہ کے حوادث نے جو وحشت ناک شکل اختیار کی، دل و دماغ پر اس کی چوٹ نے اتنا گہرا اثر کیا تھا کہ اسی وقت سے مولانا کی صحت کو گھن لگ گیا تھا جوں جوں وقت گزرتا گیا، وہ کاموں کے بے انتہا بوجھ کو سنبھالے ضرور رہے۔ مگر اندر ہی اندر ان کی تندرستی گھلتی جا رہی تھی اور اس کا پورا اندازہ اس وقت ہوا جب جنوری ۱۹۶۲ء میں وہ بیماری سے نڈھال ہو کر بالکل ہی گر گئے۔

اور تحقیق و معائنہ کے بعد ڈاکٹروں کو یہ یقین ہو گیا کہ کینسر جیسا مہلک مرض ان پر قابو پا چکا ہے ۲۵ جنوری ۱۹۶۲ء کو جب وہ جوشی ہوسپٹل میں تھے اور کینسر کی تشخیص قطعی ہو گئی تھی اور بہت عجلت کے ساتھ ان کو بمبئی لے جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ کوشش یہ تھی کہ مولانا کو ڈاکٹروں کی اس تشخیص کا علم نہ ہو، لیکن اپنے خدام اور تیمارداروں کے چہروں پر تشویش کے آثار کو بالآخر انھوں نے پا ہی لیا۔ عصر کے بعد محترم حافظ ابراہیم صاحب پہنچ گئے اور مزاج پرسی کرنے لگے تو مولانا خود بول اٹھے کہ "ان لوگوں کو کینسر کا اندیشہ ہے۔ ویسے تو مجھے کچھ سکون معلوم ہو رہا ہے اور بہرحال جو بھی کچھ ہو۔ اللہ کی مرضی۔ اگر بمبئی جانا طے ہے تو اس کا انتظام ہونا چاہیئے" مولانا کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے اور میں حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس بیماری کو جانتے کے بعد ذرا بھی ان کے چہرے پر گھبراہٹ یا فکرمندی کا کوئی نشان نہ تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ ان جیسا زیرک انسان اس مرض کے انجام سے ناواقف نہ تھا۔ اگلے مہینوں میں یہ تاثر ایک دو بار خود ان کی زبان پر آ بھی گیا کہ تدبیر و علاج تو جاری رکھنا ہی ہے مگر انجام بھی نامعلوم نہیں۔

ایک طرف اپنی مہلک بیماری کا یہ ادراک اور یقین اور دوسری طرف زندگی کی آخری ساعتوں تک ان کی استقامت اور صبر و تحمل کا یہ حال کہ بلاناغہ سینکڑوں ہی احباب و مخلصین مسلم و غیر مسلم۔ امیر و غریب۔ اپنے بیگانے روزانہ اس پورے عرصہ میں ان سے ملتے رہے مگر ایک لمحہ کے لئے بھی کسی ملنے والے نے ان میں مایوسی اور بے صبری کا کوئی اثر محسوس نہ کیا۔ اسی خندہ پیشانی اور محبت کے ساتھ ہر کسی سے ملنا جو زندگی میں ہمیشہ سے ان کا معمول تھا، آخر تک قائم رہا۔ بڑے بڑے انسانوں کے کردار میں عزم و تحمل کی ایسی مثالیں کم ہی ملیں گی۔

یہی نہیں بلکہ قومی اور ملی مسائل کی فکر اور کاموں کی دھن جو تندرستی میں ان پر چھائی رہتی تھی، مہلک بیماری کے ان ایام میں بھی ان سے چھوٹ نہ سکی بمبئی سے واپس آ کر جب تک دہلی میں رہے تمام ہی معاملات کی پرسش احوال کرتے رہے، خاص طور پر جمعیۃ علماء کی مہمات اس زمانہ میں بھی انھیں عزیز رہیں۔ حضرت مولانا محمد میاں صاحب کو تاکید کر کے اپریل میں مجلس عاملہ کا اجلاس بلوایا جس میں وہ خود اپنے رفقاء جماعت کو اہم ہدایات دینے کے لئے مضطرب تھے۔ (اگرچہ اجلاس کی تاریخ سے پہلے ہی سفر امریکہ کی تیاری ہو گئی اور وہ پروگرام پورا نہ ہو سکا) اور اسی لئے ۱۶ اپریل کو جس روز امریکہ جا رہے تھے، عصر کے وقت میں حاضر ہوا، تو سب سے پہلے مجھ سے (اپنی زندگی کا آخری) پیغام لکھوایا۔ جس میں جمعیۃ کی تنظیم اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے عامۃ المسلمین اور رفقاء جماعت کو پُر زور نصیحت فرمائی تھی۔

امریکہ کے قیام میں اخبار الجمعیۃ جو ان کے پاس برابر پہنچتا رہتا تھا۔ برابر دیکھتے اور ہندوستان کے حالات معلوم کرتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے چیف منسٹر یو۔ پی کو اردو زبان کے سلسلہ میں خط لکھا تھا۔ امریکہ سے واپسی کے بعد ناتوانی اور تکلیف کی انتہائی شدت میں بھی اگر ان کے دماغ پر کوئی فکر تھا تو قومی اور ملی مسائل کا۔ یہ تھا ان کی فدائیت اور دردمندیوں کا عالم۔ افسوس کہ مولانا دنیا سے رخصت ہوئے تو خدمت و عمل کی پوری تاریخ بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ اب کون صاحب دل ہے جس کی تنہا ذات خدمتِ خلق کی ہزار محفلوں پر بھاری ہو گی ——— کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

فما کان قیس هلکہٗ هلك واحد، ولكنهٗ بنیان قوم تهدما

جمعیۃ علماء ——— مجاہد ملتؒ کے دور میں

۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء کی تشکیل اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی قومی و ملی سرگرمیوں کا آغاز تقریباً ساتھ ساتھ ہوا اور اس وقت سے مولانا مرحوم جمعیۃ علماء سے وابستہ رہے، جوں جوں وقت گزرتا گیا، یہ وابستگی اور تعلق بھی بڑھتا رہا، یہاں تک کہ مارچ ۱۹۴۲ء کے اجلاس لاہور میں جمعیۃ علماء ہند کی نظامت عامہ مجاہد ملتؒ کو تفویض کر دی گئی۔ جمعیۃ کے اس اجلاس میں حضرت شیخ الاسلامؒ، حضرت مولانا آزادؒ، حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ جیسے اکابر امت کی موجودگی میں اس منصب جلیل پر باتفاق رائے مولانا مرحوم کا انتخاب ہوا۔ اور آنے والے وقت میں مولانا مرحوم نے جس حسن و خوبی کے ساتھ اس عظیم منصب کا حق ادا کیا اور اس کی قدر و منزلت کو چار چاند لگائے، وہ درحقیقت ان ہی کا حصہ تھا، مولانا مرحوم اپنی زندگی کے آخری سانس تک یعنی بیس سال مسلسل ملت اسلامیہ کے اس عالی قدر اعزاز و اعتماد پر فائز رہے۔

جمعیۃ علماء کی تاریخ میں مجاہد ملتؒ کا یہ دور اپنی بھرپور خدمات، وسیع تنظیم، ولولہ آفریں کارناموں اور عوام و خواص میں اپنے اعتماد و مقبولیت کے لحاظ سے جمعیۃ کی تمام تاریخ پر بھاری نظر آتا ہے۔ نصب العین اور اغراض و مقاصد کے لحاظ سے اس سے پہلے بھی جمعیۃ علماء اپنا یہی موقف رکھتی تھی، لیکن ان دنوں جنگ آزادی کی ہما ہمی اس شدت کے ساتھ جاری رہی کہ جماعتی خدمات اور سرگرمیوں کا بڑا حصہ اسی محاذ پر صرف ہوتا رہا۔ اسی لئے جمعیۃ علماء اس وقت ملک کی ایک حریت پسند سیاسی جماعت کی حیثیت سے نمایاں رہی۔

ایک دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ جمعیۃ علماء اس وقت عوام سے زیادہ علماء کی مخصوص تنظیم سمجھی جاتی تھی۔ دستوری لحاظ سے بھی اس کی تنظیم اتنی وسیع اور ہمہ گیر نہ تھی۔ مجاہد ملتؒ نے اس کی قیادت سنبھالی تو اس وقت وطن عزیز کی تحریک آزادی اپنی آخری منزل میں تھی۔ اسی سال (۱۹۴۲ء) کے وسط میں "کوئٹ انڈیا" کی آخری تحریک برپا ہوئی اور دوسرے عمائدین جماعت کے ساتھ ساتھ مجاہد ملت بھی نظر بند کر دیئے گئے۔ دو سال قید و بند میں گزار کر ۱۴ جولائی ۱۹۴۵ء کو آپ بریلی جیل سے رہا ہو کر آئے اور فوراً ہی اپنی جماعتی ذمہ داریوں کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت سے اب تک جمعیۃ کے افکار و اعمال میں مجاہد ملتؒ کا قائدانہ کردار مسلسل نمایاں رہا۔ اور اس میں شک نہیں کہ مولانا مرحوم نے جس تندہی اور انہماک کے ساتھ بیس سال کے اس طویل عرصہ میں خدمت و عمل کی راہوں کو آباد رکھا، اس نے جمعیۃ کو ایک نئی تاریخ اور ایک نیا کردار بخشا اور بلند سے بلند تر موقف تک پہنچایا۔ مجاہد ملت کے اس دور میں جمعیۃ علماء ہند ایک سیاسی تحریک سے بڑھ کر جہد و عمل کا مرکز بن گئی اور اس کی خدمات کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں تک پھیل گیا۔ ساتھ ہی دستوری اور تنظیمی لحاظ سے وہ ملک بھر کے مسلمانوں کی وسیع واحد نمائندہ تنظیم بن گئی، اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اس کی قیادت و اعتماد کے پرچم لہرانے لگے۔ وطن عزیز کے کتنے ہی علاقے ایسے تھے جہاں ۱۹۴۷ء تک جمعیۃ کے تنظیمی نشان قائم نہیں ہوئے تھے۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد سرزمین ہند کی کوئی ریاست، کوئی علاقہ اور کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہا جہاں جمعیۃ علماء کی مقبولیت و اعتماد نے اپنا اثر نہ قائم کیا ہو اور یہ سب کچھ نتیجہ تھا مجاہد ملتؒ کی فکری اور عملی صلاحیتوں اور ان کی ان تھک جد و جہد کا۔

مرکزی دفتر

جمعیۃ کی تاریخ میں مجاہد ملت کا دور ایک ایسے وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ جمعیۃ اپنے سر و سامان کے لحاظ سے بھی کچھ بہت منظم اور مضبوط نہ تھی۔ تحریک آزادی کی دار و گیر اور سیاسی افکار کے تصادم نے اس کے پھولنے پھلنے کی راہیں بڑی حد تک مسدود کر رکھی تھیں۔ جمعیۃ کا مرکزی دفتر اس وقت کرایہ کے ایک مکان میں، مالی لحاظ سے مقروض و زیربار اور دفتری نظم کے لحاظ سے بہت محدود تھا۔ صرف ایک محرر اور ایک کارندہ ہی اس کی بساط تھی۔ نہ ٹیلی فون تھا، نہ ٹائپ مشین۔ عوام و خواص کے رجوع اور مشاغل کار کے لحاظ سے بھی اس کا دائرہ محدود تھا۔ لیکن مجاہد ملت کے دور میں اپنے ساز و سامان اور وسعت کار کے لحاظ سے اس کی مرکزی حیثیت اتنی نمایاں ہوئی کہ بجا طور پر وہ ایک ملک گیر تحریک کا مرکزی دفتر معلوم ہونے لگا۔ آج حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کے تخمینہ کے مطابق مرکزی دفتر کا اثاثہ لاکھوں کی مالیت کا ہے۔ اس کی اپنی جائداد ہے، ٹیلی فون ہے، کئی کئی کاریں ہیں۔ مختلف شعبے ہیں اور وسیع اسٹاف ہے۔ پورے ملک سے مراسلت کا رابطہ ہے اور دسیوں انفرادی اور اجتماعی مسائل ہر روز اس کے مشاغل کار میں جگہ پاتے ہیں۔

اخبار

آج کی دنیا میں کسی بھی زندہ جماعت اور تنظیم کی آواز اخبار ہی کے ذریعہ پھیلتی اور بڑھتی ہے۔ اسی خیال سے جمعیۃ علماء کا جماعتی آرگن الجمعیۃ ایک بار پہلے بھی جاری کیا گیا تھا۔ مگر برطانوی دور حکومت اس کو برداشت نہ کر سکا۔ مجاہد ملتؒ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور نظامت میں سب سے پہلے جماعت کی جن ضرورتوں پر جد و جہد فرمائی وہ دفتر کا اپنا مکان اور الجمعیۃ کا دوبارہ اجراء ہی تھا۔ چنانچہ مولانا موصوف کے دور میں جمعیۃ کا سب سے پہلا اجلاس عام

مئی ۱۹۴۵ء میں سہارن پور میں ہوا۔ اور وہیں تعمیر فنڈ اور اخبار فنڈ کی تجویزیں بروئے کار آئیں اور دو ہی سال کے بعد یعنی دسمبر ۱۹۴۷ء میں ایک طرف دفتر نے وہ مکان خرید لیا جہاں پہلے اس کی حیثیت کرایہ دار کی تھی اور دوسری طرف روزنامہ الجمعیۃ کا دوبارہ اجراء عمل میں آیا جو بحمد اللہ آج تک جاری ہے اور اسی کو عوامی اور سرکاری حلقوں میں مسلمانوں کی جماعتی آواز سمجھا جاتا ہے۔

میسیج ویکلی

روزنامہ الجمعیۃ کے کامیاب اجراء کے بعد مولانا مرحوم کی دوسری کوشش یہ تھی کہ مسلمانانِ ہند کی آواز کو زیادہ مؤثر اور مضبوط بنانے کے لئے جماعتی سطح پر ایک انگریزی اخبار بھی جاری کیا جائے۔ چنانچہ ملک کے ہنگامی حالات نے جوں ہی ان کو کچھ مہلت دی انھوں نے انگریزی اخبار کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ نومبر ۱۹۵۰ء میں سب سے پہلے وہ اس کوشش میں بمبئی گئے پھر جنوری ۱۹۵۱ء میں اپنے رفیق محترم مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے ہمراہ بمبئی کا دوسرا سفر کیا۔ اور دس روز وہاں مقیم رہ کر مخیر مسلمانوں کو اس اہم ملی اور جماعتی ضرورت پر متوجہ کیا۔ اسی سال میں مالی گاؤں، راندیر، ڈابھیل، سورت، وغیرہ اور بار بار بمبئی کے سفر کئے، یہاں تک کہ ان کی کوششیں بار آور ہوئیں اور تقریباً ایک لاکھ روپیہ کے سرمایہ سے ہفتہ وار میسیج ۲۲ دسمبر ۱۹۵۱ء سے جاری ہوگیا۔ اس کے اجراء میں بمبئی اور دیگر مقامات کے مسلمانوں نے فراخ دلی کے ساتھ مولانا مرحوم کی اپیل پر لبیک کہا۔ افسوس کہ مسلمانوں کی عام اقتصادی زبوں حالی اس کی راہ میں حائل رہی اور میسیج ویکلی تین سال سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ پھر بھی مولانا مرحوم انگریزی اخبار کی فکر میں برابر رہے اور زندگی کے آخری دو برس تو انھوں نے برابر اس لگن میں گزارے کہ کس طرح مسلمانوں کی اس اہم خدمت کو بھی اپنے جیتے جی انجام دے جائیں۔

پریس۔ بک ڈپو اور لائبریری

مرکزی دفتر کے دوسرے شعبے جو مولانا مرحوم کے دور میں قائم ہوئے اور بفضلہ تعالیٰ ترقی کر رہے ہیں وہ الجمعیۃ بک ڈپو۔ لائبریری (جس میں کم و بیش پانچ ہزار کتابیں اب تک فراہم ہو چکی ہیں) اور الجمعیۃ پریس ہے۔ ان میں خاص طور پر پریس کا قیام بڑی جدوجہد کا متقاضی تھا۔ لیکن ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۵ء تک مولانا مرحوم کی مسلسل کوششوں اور کاوشوں کے بعد الجمعیۃ پریس قائم ہو سکا جس کا افتتاح ۳۰ مارچ ۱۹۵۵ء کو حضرت شیخ مدنیؒ نے فرمایا۔

مرکزی دفتر کی اس تمام ترقی اور تنظیم میں مولانا کے رفقاء کرام (مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور مولانا سید محمد میاں صاحب) کی شبانہ روز جدوجہد اور مسلسل تعاون کو بھی بڑا دخل ہے۔ اگر یہ حضرات ہاتھ نہ بٹاتے تو مولانا کے رات دن کے ہنگامی مشاغل میں نہ جانے کب تک یہ سلسلہ تشنۂ تکمیل ہی رہتا۔

مرکزی دفتر کی توسیع اور تنظیم سے الگ خود جماعت کی وسیع تنظیم۔ ملک گیر پیمانہ پر اس کو روشناس اور مقبول بنانے، اس کے اغراض و مقاصد کو ایک تحریک کے طور پر ملک کے گوشہ گوشہ میں برپا کرنے اور اس کی سرگرمیوں کا وسیع سے وسیع تر دائرہ بنانے کے لئے مولانا مرحوم نے جس انہماک اور تندہی کے ساتھ جد و جہد فرمائی آج ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جمعیۃ علماء کا پھیلا ہوا انتظام، اس کی ہزاروں شاخیں۔ ان کے دفاتر اور مخلص کارکنوں کی دن رات خدمت گزاری یہ سب کچھ اسی جدوجہد کے روشن آثار اور ناقابلِ تردید شہادت ہیں۔

مولانا مرحوم کی اس لگن اور ان تمام کوششوں کا محرک صرف ان کے عہدہ اور منصب (نظامت عامہ) کی ذمہ داریاں ہی نہیں تھیں، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ مولانا مرحوم کی نظر، دین مبین کی سچی تعلیمات پر تھی ـــ ایک روشن ضمیر اور صاحب بصیرت عالمِ دین کی حیثیت سے وہ ہمیشہ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کو ایک باوقار جماعتی زندگی سے مربوط دیکھنا چاہتے تھے۔ ملت اسلامیہ میں انفرادیت اور انتشار کے رجحانات سے وہ ہمیشہ نالاں رہے اور برابر اس کوشش میں رہے کہ چھوٹی چھوٹی گروہ بندیاں اور کشمکش سے بالاتر ہو کر "وحدت کلمہ" کی بنیاد پر ہندوستان کے مسلمان منظم ہوں اور صحیح ایجابی شعور کے ساتھ اپنی جماعتی زندگی بنائیں۔ ایک طرف پوری جرأت مندی اور استقامت کے ساتھ اپنے دین و ایمان پر قائم رہیں اور دوسری طرف اپنے وطن اور پوری انسانیت کی خدمت اور خیر خواہی کے علمبردار ہوں کہ یہی ایک سچے مسلمان کا کردار ہو سکتا ہے۔ خاص طور پر آزاد ہندوستان کے اس نئے اور تعمیری دور اور بدلے ہوئے حالات میں یہ اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ مسلمان تنگ نظری اور افتراق باہم کے سایہ سے بھی دور رہیں۔ تب ہی وہ اپنی وطنی زندگی میں آبرومندی اور عزت کا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

اپنے اس بنیادی فکر اور پیغام کو لے کر وہ ہندوستان کی آخری سرحدوں اور ساحلوں تک گئے، عوام و خواص سے ملے اور مسلمانوں کے ہر اجتماع۔ ہر مجلس اور ہر طبقہ کو انھوں نے دعوت دی کہ جمعیۃ علماء کو اپنائیں، کیونکہ یہی ایک تحریک ہے جس کی مرکزیت پر آج کے حالات میں مسلمانانِ ہند اپنی جماعتی زندگی کی بنیادیں استوار کر سکتے ہیں

پھر یہی بنیادی نقطۂ نظر داعی تھا کہ تقسیم ہند کے فوراً بعد حضرت مولانا نے جمعیۃ کے دستوری اور تنظیمی دائروں کو بھی اتنا وسیع کرادیا کہ ہر مسلمان مرد و عورت اس کی ممبری قبول کرسکے اور اس کی تنظیم کسی مخصوص حلقہ تک محدود نہ رہے چنانچہ آج جمعیۃ علماء اپنے دائرۂ تنظیم و کار کے لحاظ سے تمام مسلمانانِ ہند کی ایک عام، وسیع اور ہمہ گیر تحریک بن چکی ہے اور یہ تمام تر نتیجہ ہے حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی قائدانہ صلاحیتوں، دوراندیشیوں اور ان تھک کوششوں کا، اور یہی ان کی مجاہدانہ زندگی کا یادگار مشن اور آخری پیغام ہے۔

واقعہ یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ تقسیم ہند کے بعد ملک میں طبقاتی کش مکش اور جذباتی شورشوں نے بڑی قوت کے ساتھ سر اٹھایا اور اس کے باعث نت نئے ہنگامی اور وقتی مسائل رونما ہوتے ہی رہے اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جیسے اولوالعزم رہنما کی فکری اور عملی صلاحیتوں کا ایک بڑا حصہ اس دور کی ناگہانی آفات و مشکلات پر صرف ہوتا رہا۔ لیکن اگر یہ صورت حال رونما نہ ہوتی اور ہنگامی مسائل و مہمات سے ان کا وقت بچ سکتا تو وہ یقیناً اپنی پوری توجہات اور سرگرمیوں کے ساتھ اپنے اسی مشن کی آبیاری اور تکمیل میں مصروف رہتے اور ان حالات میں بھی جتنا کچھ کرسکے اس سے کہیں زیادہ مسلمانانِ ہند کی جماعتی زندگی کو منظم اور مستحکم کر جاتے۔ مولانا مرحوم کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد اب یہ ہمارا فرض ہے کہ اس مقدس نصب العین کو ہمیشہ سربلند رکھنے کا عہد کریں کہ اس کی سربلندی ہماری اپنی سربلندی اور کامیابی ہے

آج ہندوستان کی جغرافیائی وسعتوں کا ایک حصہ تو وہ ہے جو ابتدا ہی سے جمعیۃ علماء ہند کی قومی اور ملی سرگرمیوں سے متعارف اور قریب رہا ہے اور تقسیم ہند سے پہلے بھی جمعیۃ کے نظام کار میں شریک و سہیم رہا ہے لیکن متعدد ریاستیں اور علاقے ایسے ہیں جنھوں نے جمعیۃ علماء کو مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ ہی کے ذریعہ پہچانا اور ان کی عظیم خدمات اور دردمندیوں نے جمعیۃ کے ساتھ وابستگی اور گرویدگی کی فضا پیدا کی۔ خاص طور پر ہندوستان کی نئی اور وسیع ریاست "راجستھان"، مدھیہ بھارت، مہاکوشل و مدھیہ پردیش۔ آندھرا، کرناٹک و میسور۔ بنگلور۔ کیرالا (مالابار) کورگ۔ کاٹھیاواڑ (اور سابق بمبئی گجرات و مہاراشٹر کے متعدد علاقے) ان تمام علاقوں اور ریاستوں میں جمعیۃ علماء کی تنظیم ۴۷ء کے اواخر سے شروع ہوئی۔ ان میں سے ہر جگہ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ خود بار بار تشریف لے گئے اور بڑی محنت اور تندہی کے ساتھ انھوں نے خدمت و عمل کا یہ سدا بہار چمن لگایا جو آج "جمعیۃ علماء" کے نام سے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہلہا رہا ہے۔

راجستھان میں وہ سب سے پہلے دسمبر ۴۷ء میں جے پور تشریف لے گئے اور وہاں شیخ محمد اسلام صاحب (مرحوم) عبدالغفار صاحب وکیل اور حاجی نہال احمد و حاجی محمد عثمان صاحب (مرحوم) نے مولانا کی جماعتی اپیل پر لبیک کہا۔ جنوری ۴۹ء میں جودھ پور کے احباب مرحوم مولانا حکیم محمد ابراہیم صمصامی، مولانا حکیم محمد علی غوری۔ وکیل احمد بخش صاحب سندھی بیکانیری وغیرہ نے مولانا کی دعوت کو اپنایا۔ ادھر ٹونک کے احباب خاص طور پر حکیم سید ظہیر احمد صاحب برکاتی اور مولانا سید قاضی الاسلام۔ ناگور کے وکیل رشید احمد صاحب۔ عبدالقیوم غوری صاحب۔ سوائے مادھوپور میں حکیم سید شاہد علی صاحب نگینوی اور سید عابد علی صاحب وکیل۔ بھیلواڑہ کے عبدالشکور غوری صاحب، کوٹہ کے حافظ عبدالحلیم صاحب اور وکیل احمد بخش صاحب۔ جھالاواڑ کے حاجی جان محمد اور اعجاز محمد خاں صاحب۔ اجمیر میں مولانا عبدالشکور۔ دیوان سید عنایت حسین صاحب اور سید عباس علی صاحب وغیرہ الور سے مولوی ابراہیم صاحب غرضیکہ رفتہ رفتہ مخلص احباب کی ایک پوری جماعت سامنے آگئی جس نے راجستھان کے گوشہ گوشہ میں جمعیۃ کی تنظیم قائم کی

جنوبی ہند میں بھی مولانا مرحوم کی آمد و رفت ۴۸ء میں شروع ہوئی۔ کرناٹک، میسور، بنگلور، مالابار، کورگ وغیرہ کے دوروں کا ذکر کسی دوسری جگہ آچکا ہے۔ اُس وقت سے ان وسیع علاقوں میں جمعیۃ کی بنیادیں استوار ہوئیں۔

مدھیہ پردیش کے مختلف حصوں میں بھی مولانا مرحوم نے در در کی خاک چھان کر جماعتی نظام کو برپا کیا۔ خاص طور پر دسمبر ۶۲ء، نومبر ۵۴ء اور پھر اپریل ۵۶ء میں محترم حافظ جمیل الرحمٰن صاحب۔ سید نور علی شاہ صاحب اور مولانا مسعود احمد صاحب صدیقی کے ہمراہ بہت تفصیلی دورے کئے اور ریاست کے چپہ چپہ پر جماعتی زندگی کی شمعیں روشن کیں۔

خدا کرے کہ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کا لگایا ہوا یہ چمن تا دیر سرسبز و شاداب رہے اور اس کی نفع بخشیوں سے ملک و ملت مستفید ہوتے رہیں۔

مجاہد ملتؒ کے دور میں جمعیۃ کے سالانہ اجلاس

★ **جمعیۃ علماء ہند کا تیرھواں سالانہ اجلاس** ۲۰ تا ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء لاہور میں منعقد ہوا۔ اسی اجلاس میں مرکزی جمعیۃ کی نظامت عمومی حضرت مجاہد ملت کو تفویض ہوئی

★ **جمعیۃ علماء ہند کا چودھواں سالانہ اجلاس** ماہ مئی ۱۹۴۵ء سہارن پور شہر میں ہوا۔ صدر اجلاس حضرت شیخ الاسلامؒ اور صدر استقبالیہ خواجہ اطہر حسین تھے۔ کشمیر کے رہنما شیخ محمد عبداللہ بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔

★ **جمعیۃ علماء ہند کا پندرھواں سالانہ اجلاس** زیر صدارت حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ ۲۶، ۲۷ اپریل ۱۹۴۸ء بمبئی میں ہوا جس کا افتتاح مولانا آزاد نے کیا اور وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس میں شریک ہوئے۔

★ **جمعیۃ علماء ہند کا سولھواں سالانہ اجلاس** منعقدہ لکھنؤ ۱۶، ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۴۹ء۔ بصدارت حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ مولانا مصطفیٰ حسن صاحب صدر استقبالیہ تھے

★ **جمعیۃ علماء ہند کا سترھواں سالانہ اجلاس** منعقدہ ۲۷، ۲۸، ۲۹ اپریل ۱۹۵۱ء حیدرآباد دکن۔ بصدارت شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ مولانا حکیم مقصود جنگ مرحوم صدر استقبالیہ تھے۔

★ **جمعیۃ علماء ہند کا اٹھارواں سالانہ اجلاس** ۱۱-۱۲-۱۳ فروری ۱۹۵۵ء کلکتہ بصدارت حضرت شیخ الاسلامؒ

★ **جمعیۃ علماء ہند کا انیسواں سالانہ اجلاس** ۲۷-۲۸-۲۹ اکتوبر ۱۹۵۶ء سورت۔ صدر حضرت شیخؒ سکریٹری استقبالیہ جناب محسن بھائی حضوری اور جمعیۃ علماء گجرات کے مخلص اور سرگرم رفیق سید عبدالحق قادری صاحب اور مولوی محمد میاں صاحب ابن مولانا مفتی جہدی حسن صاحب نے اس اجلاس کی کامیابی کے لئے بڑی ہی تندہی اور سرگرمی کے ساتھ کام کیا۔ مسٹر غلام رسول قریشی صدر استقبالیہ تھے۔

★ **جمعیۃ علماء ہند کا بیسواں سالانہ اجلاس** ۹-۱۰-۱۱ دسمبر ۱۹۶۰ء اجین بصدارت حضرت مولانا فخر الدین صاحب صدر استقبالیہ حضرت مولانا مفتی محمود احمد صدیقی صاحب تھے

مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اور کانگریس

یوں تو حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اپنے ہوش و شعور کے وقت سے آخر تک پورے عزم و یقین کے ساتھ نہ صرف اپنے نظریات میں بلکہ عمل اور مجاہدوں میں بھی انڈین نیشنل کانگریس سے وابستہ رہے۔ لیکن ملک میں سیاسی ہما ہمی اور تحریک کے ساتھ ساتھ یہ تعلق اور بھی پختہ ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ جذبات کے انتہائی عروج اور نظریات کے شدید تصادم کے دور میں بھی مولانا مرحوم کے اس تعلق میں کبھی کوئی کمزوری نہیں آئی۔

آزادیٔ وطن کے بعد اگست ۱۹۵۰ء میں اجلاس ناسک کے موقع پر آنجہانی پرشوتم داس ٹنڈن کانگریس کے صدر ہوئے اور گیارہ مہینے انتہائی کشمکش میں گزار کر بالآخر انھیں صدارت سے دست بردار ہونا پڑا۔ ٹنڈن جی کا دور صدارت کانگریس کی تاریخ میں اندرونی خلفشار اور انتہائی کشمکش کا دور رہا ہے۔ یہاں تک مرحوم رفیع احمد قدوائی جیسے بڑے بڑے کٹر کانگریسی بھی اس زمانے میں الگ ہو گئے تھے۔ پنڈت نہرو اور مولانا آزادؒ نے بھی یہ دور انتہائی بیزاری اور ناراضی کے ساتھ گزارا۔ لیکن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے (ٹنڈن جی کے بعض نظریات سے انتہائی بیزار ہوتے ہوئے بھی) اس دور میں اپنی پسندیدہ جماعت کو نہ چھوڑا۔ اس لئے کہ ملکی سیاست میں وہ انڈین نیشنل کانگریس ہی کو سچے اصول و نظریات کا علم بردار سمجھتے تھے۔ پھر جب ہم اس پہلو پر بھی نظر رکھیں کہ کانگریس کے ساتھ اتنی گہری اور عملی وابستگی عمر بھر مولانا مرحوم کے لئے ایک کڑی آزمائش اور ایثار و فداکاری کا مسلسل امتحان بنی رہی ہے اور اس کی بدولت انھوں نے ہمیشہ اپنے ہم مذہبوں کے سخت سے سخت تیور بھی گوارا کئے۔ گالیاں بھی کھائیں۔ اذیتیں بھی سہیں۔ طرح طرح کے نقصان اور صدمے برداشت کئے اور ساتھ ہی اپنی زندگی کی راحتوں، اپنے کسب معاش بلکہ صحت اور تندرستی

سے بھی منہ پھیر دیا تو ان کی اصول پسندی، استقامت اور کردار کی بلندی اور بھی نمایاں ہوتی ہے۔

کانگریس سے تعلق رکھنے والے بہت سے ایسے بھی ہیں جنھوں نے پوری عافیت پسندی کے ساتھ اپنی کانگریسیت نباہ دی۔ لیکن مولانا مرحوم اس سطح سے بہت بلند تھے۔ انھوں نے کانگریس کو اپنایا تو ہر فکر و لالچ سے بلند ہو کر، اس کے مقاصد کی تکمیل اور اس کی تحریکوں کی کامیابی کے لئے اپنی جان کھپائی اور دکھل کر اس کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ آزادیٔ وطن کی خاطر پچھلی چوتھائی صدی میں کانگریس کی جتنی تحریکیں اٹھیں اور جب جب گرفتاری اور قید و بند کی نوبت آئی، مولانا ہر موقع پر پیش پیش ہی نظر آئے۔

صوبہ یو، پی کانگریس میں مدت تک مولانا ایگزیکیٹو کے رکن رہے۔ ۳۶ء سے آخر تک آل انڈیا کانگریس کے ممبر بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قائدین کی صف میں شامل رہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد کانگریس ٹکٹ پر ہی وہ چودہ سال مسلسل دستور ساز اسمبلی اور پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوتے رہے۔ اے آئی، سی، سی کے ہر اجلاس میں بڑے اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے۔ ضرورت ہوتی تو درپیش مسائل پر تقریر بھی کرتے۔ الیکشن کا زمانہ آتا تو پورے جوش اور تندہی کے ساتھ کانگریسی امیدواروں کی کامیابی کے لئے جہاں تہاں دورے اور تقریریں کرتے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ۵۲ء اور ۵۷ء کے جنرل الیکشن میں مولانا مرحوم کا مقام ان گنے چنے کانگریسی رہنماؤں میں تھا جن کا بے پناہ اثر و نفوذ، جن کے بیان و تلقین اور ساحرانہ تقریریں یوپی کانگریس کی بھرپور کامیابی کا مدار ہوتا تھا اور جن کی کوششیں پورے ملک کی فضا بدل دیتی تھیں۔ مولانا کی ہمیشہ یہ عادت رہی کہ جب بھی کسی ہنگامی معاملہ میں کسی جگہ جاتے تو سب سے پہلے کانگریس کے کارکنوں کو جمع کرتے اور ان کی ذمہ داری یاد دلاتے، ان کے تعاون ہی سے معاملہ کا حل اور اصلاح کی تدبیر فرماتے۔ یہ بھی ان کے جماعتی احساس اور وضعداری کا نشان تھا۔

ملک کی آزادی سے پہلے کانگریسی ہونا جتنا خطرناک اور حوصلہ طلب تھا، آزادی کے بعد اتنا ہی آسان بلکہ مصلحت وقت بن گیا تھا لیکن مولانا مرحوم نے جس عزم و استقامت، عالی حوصلگی، بے غرضی اور خلوص نیت کے ساتھ آزادی سے پہلے دور میں کانگریس کو اپنایا تھا، آزادی کے بعد بھی کردار کی اسی بلندی پر قائم رہے یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد جب ۴۷ء سے اکثریت کی فرقہ پرستی اور نفسا نفسی نے سر اٹھایا اور ہندوستان کے شہری مسلمانوں کو طرح طرح سے پامال کرنے پر کمر باندھی تو مولانا مرحوم تیور بدل کر اٹھے اور ان ہی رفقاء جماعت کو جو کل تک جیل کے ساتھی اور آج اقتدار و اختیار کے مسند نشین تھے، مولانا نے قدم بقدم ٹوکا، گاندھی جی پنڈت نہرو، سردار پٹیل اور مولانا آزادؒ کا ہاتھ پکڑا۔ بڑے بڑے منسٹروں اور چیف منسٹروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے کہا!

"اگر ہندوستان کا بنیادی دستور کوئی زندہ حقیقت ہے تو یونین کے پانچ کروڑ مسلم شہریوں کو یرغمال نہیں بنایا جا سکتا۔ ان مسلمانوں کی وفاداری کا مسئلہ ایک فرسودہ سوال بن چکا ہے۔ بار بار اس کو زیر بحث لانا نہ ملک کی کوئی خدمت ہے نہ دماغ کی کوئی ذہانت۔ اگر کچھ مسلمان اس لئے غیر وفادار ہیں کہ انھوں نے ملک کی تقسیم کے لئے رائے دی تھی اور ایک ہی رات میں ان کے دل نہیں بدل سکتے تو آر ایس ایس اور دوسری فرقہ وار جماعتیں جو آج تک جمہوری مقاصد کو تباہ کرتی رہی ہیں۔ کانگریس میں شامل ہو کر بھی کس طرح ایک ہی رات میں اپنے دل و دماغ کو بدل سکتی ہیں اگر ان کو اپنانے کی تدبیریں کی جا سکتی ہیں تو یہ کیوں ناممکن ہے کہ انصاف و جمہوریت کی فضا پیدا کر کے ان مسلمانوں کے دلوں کو بھی اپنا لیا جائے"

"کسی بھی جائز شکایت کے موقع پر پاکستان یا لیگ کا نام لے کر ہماری آواز کو دبانے کی کوشش نہ کی جائے، ہم نے وطن کی آزادی کے لئے اسی طرح اپنی جان کی بازی لگائی ہے، جس طرح دوسروں نے۔ آج وطن کی سرزمین پر جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل اپنا حق رکھتے ہیں تو حسین احمد، کفایت اللہ اور حفظ الرحمٰن کو بھی وہی حق حاصل ہے اور ان کے اس حق کو چھینا نہیں جا سکتا"

آج بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحریک آزادیٔ وطن اور کانگریس میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی شرکت اور سرفروشانہ جدوجہد جس طرح وطن عزیز کی سربلندی کا ذریعہ بنی مسلمانانِ ہند کو بھی، خاص طور پر پچھلے پندرہ برس میں اسی کردار کی بدولت بہت کچھ تحفظ اور سہارا حاصل ہو سکا۔ آج اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ۴۷ء سے ۶۲ء تک آزادی کے دور میں مسلسل اکثریت کی فرقہ پرستی کو چیلنج کرنے اور مسلمانان ہند کے ساتھ کی جانے والی بے انصافیوں کے انسداد و اصلاح کے لئے انتہائی بے جگری اور تندہی کے ساتھ مجاہدانہ کارنامے انجام دینے کی جو سعادت مولانا مرحوم کے حصہ میں آئی اس کا سرچشمہ مولانا مرحوم کا یہی بلند و بالا،

بے باک و بے غرض کردار تھا جو ہر موقع پر ان کی آواز میں اثر اور ارادوں میں قوت بن کر ابھرتا تھا اور ماحول پر چھا جاتا تھا۔

یو، پی اور دہلی تو خیر ان کا گھر تھا۔ اس پوری مدت میں میرا خود مشاہدہ یہ ہے کہ وہ جب خالص مسلمانوں کے مسائل و معاملات کو لے کر ہندوستان کے کسی بھی حصہ میں جاتے خواہ پنجاب ہو یا راجستھان۔ مدھیہ پردیش ہو یا اڑیسہ۔ مہاراشٹر ہو یا گجرات، بہار، بنگال ہو یا آسام حتیٰ کہ جنوبی ہند میں آندھرا۔ مدراس اور میسور تک کہیں بھی وہ پہنچتے، کسی پہلی ملاقات اور تعارف کے بغیر بھی، وہاں کے ریاستی حکام، وزراء اور وزیر اعلیٰ بھی اسی احترام و عقیدت کے ساتھ ان سے ملتے، ان کی بات سنتے اور دھیان دیتے تھے جس کی توقع دہلی یا یو، پی میں ہو سکتی تھی۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

بھوپال کا واقعہ

مارچ ۵۹ء میں بھوپال شہر میں سخت فساد رونما ہوا۔ رمضان شریف کے دن تھے۔ حالات کی سنگینی کو سن کر مولانا فوراً بھوپال پہنچے میں ساتھ تھا۔ وہاں شہر کے حالات دیکھے۔ جمعیۃ کے مقامی ذمہ دار حضرات سے پوری سرگزشت سنی۔ اتفاق سے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر کاٹجو باہر گئے ہوئے تھے اور ڈپٹی ہوم منسٹر صاحب ہی (جو گوالیار کے باشندہ تھے اور پہلے کبھی مولانا سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی) صورت حال کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ مولانا نے ان سے وقت لیا اور ان کے بنگلہ پر ملاقات ہوئی۔ انسپکٹر جنرل پولیس بھی موجود تھے۔ مولانا کے ساتھ صرف میں تھا۔ گفتگو شروع ہوئی۔ مولانا نے اپنے مشاہدات بتا کر جب حکومت کی غلط روش اور بے محل اقدامات کا ذکر کیا تو وہ کچھ برہم ہونے لگے۔ مولانا تو پہلے ہی جوش میں تھے۔ گفتگو کی تلخی بڑھی اور منسٹر صاحب موصوف کے اکھڑے اکھڑے جواب سن کر اور بھی گرما گئے۔ منسٹر صاحب کو شاید اس جرأت گفتار سے پہلی بار سابقہ پڑا تھا۔ کچھ تیور دکھانے لگے پھر جو مولانا نے انہیں للکارا ہے

"میرے دیکھے ہوئے واقعات کو بھی جب آپ جھٹلا رہے ہیں تو اصلاح حال کی کیا امید ہو سکتی ہے .... میں آپ کے سامنے مسلمانوں کی طرف داری کر رہا ہوں؟ آپ مجھے جانتے ہی نہیں۔ آج کاٹجو یہاں ہوتے تو وہ مجھے اس طرح جواب نہ دیتے جس طرح آپ دے رہے ہیں... وغیرہ وغیرہ

تو وہ بے چارے دم بخود ہو کر رہ گئے اور کچھ سوچنے کے بعد بڑی ندامت کا اظہار کیا اور کہنے لگے، واقعی مولانا۔ میں نے دیر میں آپ کو پہچانا۔ میں تو آپ سے ملنے کا خود آرزو مند تھا آپ کو گوالیار بلانا چاہتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ رنگ ہی بدل گیا بڑی محبت سے باہر تک پہنچانے آئے اور بہت کچھ اطمینان دلا کر رخصت کیا۔

جالور کا واقعہ

اسی طرح ایک اور واقعہ جالور میں پیش آیا۔ دسمبر ۵۶ء میں مولانا نے جمعیۃ علماء جودھ پور ڈویژن کی دعوت پر پالی، سوجت جودھ پور وغیرہ کا دورہ کیا اور جالور بھی پہنچے جمعیۃ علماء راجستھان کے روح رواں الحاج حکیم محمد علی غوری، وکیل احمد بخش سندھی اور میں رفقاء سفر تھے۔ یہ ایک دور افتادہ بستی ہے۔ جمعیۃ کا نظام وہاں نیا نیا قائم ہوا تھا۔ دفتر کا افتتاح اور جھنڈا لہرانے کی رسم مولانا کے ہاتھوں انجام پانی تھی۔ مقامی مہا سبھائیوں نے بستی میں شور برپا کر دیا کہ آج یہاں مسلم لیگ کا جھنڈا لہرایا جا رہا ہے۔ ہم اس کو نہیں لہرانے دیں گے۔ شہر میں ایک ہیجان بپا ہو گیا۔ مسلمان بھی خائف مقامی کانگریسی بھی کچھ چھپے چھپے (اور ذکر مت۔ جوں توں کر کے جھنڈا تو لہرا دیا گیا۔ مگر رات کو عام جلسہ میں گڑبڑ کرنے کے ارادے قطعی تھے۔

جلسہ شروع ہوا۔ مہا سبھائی کوئی فتنہ اٹھانے کے لئے موقع کے منتظر ہی تھے۔ مولانا کو بھی صورت حال سے جوش آ گیا تھا تقریر شروع کی تو اپنی عادت سے بڑھ کر اس قوت اور روانی کے ساتھ بولے کہ ایک سماں بندھ گیا۔ تقریر کیا تھی۔ ایک بوچھار تھی۔ جس میں بجلی کی سی کڑک اور سیلاب کا جوش تھا۔

"میں یہاں مسلم لیگ بنانے آیا ہوں۔ یہی ہے آپ کی سمجھ بوجھ کی پرواز! مجھے آپ جانتے نہیں ہیں تو پہلے گاندھی جی کی سمادھی پر جا کر پوچھئے جواہر لال نہرو کے دل سے پوچھئے کہ میں کون ہوں۔ میں یہاں مسلم لیگ کا جھنڈا لہراؤں گا اور آپ اس کو روکیں گے۔! آپ بھول میں ہیں۔ کان کھول کر سن لیجئے (جس دن مسلم لیگ کا جھنڈا لہرایا گیا تھا۔ اس کو روکنے کے لئے آپ میں ہمت نہیں تھی۔ میں ہی آگے بڑھا تھا۔ اور پھر سن لیجئے کہ آج بھی اگر لیگ کا جھنڈا لے کر کوئی اٹھے گا تو آپ سے پہلے اس کا ہاتھ پکڑنے والا میں ہی ہوں گا اور یہ جمعیۃ کے غریب کارکن ہی اٹھیں گے۔ یہ آپ کے بس کی بات نہیں ہے اب آپ ایک آزاد و آباد جمہوری ملک کے باشندے ہیں۔ ہوش و حواس کی بات کیجئے" وغیرہ وغیرہ

جالور والوں کے لئے نئی بات تھی کہ ایک انسان چاروں طرف سے بکھرے ہوئے ماحول میں کھڑا ہو کر اس جرأت، تیز رفتاری اور گھن گرج کے ساتھ بولے، حیرانی کے عالم میں وہ بھی سب کچھ بھول گئے جن کے ارادے ہی کچھ اور تھے۔ دل ہی دل میں شرمسار اور کھوئے کھوئے ہوئے الٹے پاؤں واپس ہو گئے۔ جمعیۃ اور کانگریسی کارکنوں میں ہراس کی جگہ ہمت اور جوش ابھرا۔ اگلے روز شہر بھر نے بڑی محبت اور قدر کی نگاہوں سے مولانا کو رخصت کیا۔

جناب سالم لکھنوی

مُجاہد کو میداں میں نیند آگئی ہے

بیادِ مجاہدِ ملت رحمۃ اللہ علیہ

(مسدس حالی کی زمین میں)

زمانے کو غفلت سے جس نے جگایا
حوادث سے ٹکرا کے جو مسکرایا
فضا پر جو ابرِ کرم بن کے چھایا
خبر سن کے یہ روح تھرا گئی ہے
مجاہد کو میداں میں نیند آ گئی ہے

مخالف ہواؤں کا رُخ جس نے موڑا
غلامی کی زنجیر کو جس نے توڑا
کبھی جس نے ہمت کا دامن نہ چھوڑا
سحر شامِ غم کی ستم ڈھا گئی ہے
مجاہد کو میداں میں نیند آ گئی ہے

وہ ناموسِ اسلام پر مرنے والا
وطن کی محبت کا دم بھرنے والا
مصائب میں ہنس کر گزر کرنے والا
گھٹا خون کے اشک برسا گئی ہے
مجاہد کو میداں میں نیند آ گئی ہے

وہ ہندو مسلماں کی آنکھوں کا تارا
وہ مظلوم انساں کے دل کا سہارا
بھنور سے سفینے کو جس نے ابھارا
وفات اس کی دل پر ستم ڈھا گئی ہے
مجاہد کو میداں میں نیند آ گئی ہے

(مولانا) حفظ الرحمٰن (رحمۃ اللہ علیہ)

مولانا عبدالماجد دریابادی

مرحوم و مغفور سے پہلی ملاقات آج سے تیس تینتیس سال قبل دہلی کے سفر میں ہوئی۔ مرحوم اس وقت عملی سے زیادہ ایک علمی آدمی تھے۔ تفصیل تو اب یاد نہیں۔ اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ گفتگو زیادہ تر علمی و دینی رہی، خصوصاً قرآن مجید کی تفسیروں اور ترجموں سے متعلق۔ سنجیدگی، فکر اور اپنے کام میں تندہی و انہماک کے آثار اس وقت بھی نمایاں تھے۔

پھر اس طویل عرصہ میں ملاقاتیں بارہا رہیں، کبھی کبھی طویل بھی، اور مراسلت بھی وقتاً فوقتاً رہی۔ مولانا کا رُخ بھی بجائے دین کی علمی خدمت کے رفتہ رفتہ سیاسی و ملّی خدمات کی طرف زیادہ پھرتا گیا، اور وہ عالم و مقتدائے دین سے بڑھ کر مجاہد و قائد بنتے گئے اور ۱۹۴۷ء کے بعد سے تو کہنا چاہیے کہ ملت کے مرجع امید وہی رہ گئے تھے۔ ایک طرح مولانا ابوالکلام و رفیع احمد قدوائی صاحب کے ہم پلہ اور ایک طرح ان دونوں سے بھی بڑھ کر۔

اگلی سطروں میں کوشش یہ ہوگی کہ طویل سابقہ میں جو تاثرات ان کے متعلق قائم ہوئے انھیں مختصر اور سادہ لفظوں میں قلمبند کیا جائے۔

(۱) **مولانا کی خصوصیت**، شاید سب سے بڑی، ان کا انہماکِ عمل، سرگرمی اور یکسوئی تھی۔ جس کام کو ہاتھ میں لیتے اپنا سارا وقت اور اپنی ساری قوت وقف کر دیتے اور ان کی سنجیدگی فضولیات اور گپ شپ کے لئے کوئی مہلت ہی ان کے لئے نہ رکھتی تھی۔ وہ تفریح بھی کام ہی سے حاصل کرتے تھے۔

(۲) ان کی دوسری بڑی بنیادی صفت ان کی گہری ——— آج کی زبان میں "بے پناہ" محبت اسلام اور ملت اسلامی کے ساتھ تھی۔ ان کی "نیشنلزم اور وطن پرستی" خدمت اسلام کے منافی ہونا کیا معنی، اس سے ایک ذرّہ الگ نہ تھی۔ نیشنلزم کے تقاضوں کی خاطر وہ اپنے دینی تصلب میں ڈھیل دینا یا مداہنت برتنا جانتے ہی نہ تھے۔ نیشنلزم کی "علم" برداری کے ساتھ ساتھ اتنا درد اسلامی رکھنے والا اور ایسا کھرا اور پکا مسلمان ذرا کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ خود جمعیۃ علماء کے حلقہ میں ان کی سی مثالیں بہت زیادہ نہیں۔

(۳) تیسری بڑی چیز ان کا امتزاج جوش و ہوش تھا۔ محض جوشیلے مسلمان تو بہت دیکھنے میں آئے ہیں، جو اپنے اندھا دھند جوش میں آگے پیچھے کچھ نہیں دیکھتے اور نہ کسی خطرہ کی پرواہ کرتے ہیں نہ کسی مصلحت کی رعایت رکھتے ہیں ــ نتائج سے بے پرواہ یہ نادان دوست بارہا مقصد کو نقصان ہی پہنچا چکے ہیں۔ ان کے ٹھیک مقابل ایک طبقہ محض ہوشمندوں اور مصلحت شناسوں کا ہے، ملت پر کچھ بھی گزر جائے، دین کو جتنا بھی صدمہ پہنچ جائے یہ اپنی حکمت عملی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں ——— مرحوم کی ذات جوش و ہوش کی جامع، دل و دماغ سے بیک وقت کام لینے کی عادی تھی۔ صفحۂ اول کے مسلمان لیڈروں میں فہم و فراست تدبر اور جوش وغیرہ کے اچھے نمونوں کی افسوسناک کمی بارہا محسوس ہوئی، اس سے بڑی حد تک بڑی اور مستثنیٰ ذات دیکھنے میں آئی وہ انہیں مرحوم و مغفور کی تھی۔

(۴) چوتھا بڑا وصف مرحوم کا طبعی انکسار تھا۔ جاہ و مرتبہ پاکر یا بڑے مقام پر پہنچ کر وہ آج بھی اپنی زندگی میں ایسے سادہ تھے کہ جیسے لیڈر نہیں، اب تک طالب علم ہی ہو۔ لیڈری پر پہنچ کر اچھے اچھے بہک جاتے ہیں۔ یہ منزل خاصی امتحان کا کام دیتی ہے۔ مرحوم کی بات چیت میں کوئی فرق آنے پایا نہ وضع و لباس میں نہ اور کسی چیز میں سوا اس کے کہ اب دسترخوان شاید زیادہ وسیع ہوگیا تھا اپنے غریب عزیزوں سے ملنے ملانے یا ان کا کام کرنے سے وہ ہرگز نہ شرماتے نہ جھجکتے۔

(۵) پانچواں امتیازی وصف میں نے مرحوم میں شرافت مزاج کا پایا۔ نظریات کے اختلاف کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے۔ دل میں اپنے حریف یا مقابل کیمپ والے کی طرف سے ذرا بھی میل نہ لاتے بلکہ اپنے معاندانہ یا سب و شتم کرنے والے کی طرف سے بھی دل تنگ نہ ہوتا۔ اور موقع پانے پر ہمدردی، مروت، رواداری، درگزر برابر اس کے ساتھ بھی کرتے رہتے ——— اتنی عالی ظرفی اور برداشت ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ۔

(۶) ایک اور وصف جو مرحوم کا میرے تجربہ میں آیا، وہ ان کی مہمان نوازی اور فیاضی تھی۔ اور اس کے لئے کچھ اس کی قید نہ تھی کہ کوئی ان کے گھر ہی پر جاکر ان کا مہمان بنے، کہیں ریل میں اتفاق سے ساتھ ہوگیا تو یہاں بھی بے تکلف وہ مہمان داری میں مشغول ہو جاتے اور اپنے ساتھی کو اصرار کر کے کھلاتے پلاتے۔ ایک بار گرمیوں کے موسم میں لکھنؤ سے مولانا کا ساتھ دہرہ ایکسپریس پر ہوا۔ وہ دہلی سے آرہے تھے اور خربوزے ان کے ساتھ تھے بس چھیل کاٹ کاٹ کر مجھے کھلانے شروع کر دیئے، حالاں کہ میزبانی کا

حق اگر تھا تو مجھی کو پہنچتا تھا کہ میں خربوزہ کی منڈی "لکھنؤ" سے سوار ہوا تھا

(۷) سال ڈیڑھ سال ہوا، لکھنؤ کونسل گھر میں مرحوم کا ساتھ ایک اُردو زبان کی کمیٹی کے سلسلہ میں رہا۔ میٹنگ ختم ایسے وقت ہوئی کہ نمازِ عصر کا وقت آگیا مولانا نے برآمدہ میں جھٹ اپنی شیروانی اتار بطورِ جانماز بچھائی اور مجھے امامت کے لئے آگے کر دیا۔ اب میں ہر چند انکار کرتا ہوں، لیکن ان کا اصرار اسی قوت سے بڑھتا جاتا ہے۔ آخر میں ہارا۔ مجھی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

اس ایک واقعہ سے علاوہ اہتمامِ نماز کے مولانا کے اس وصف پر بھی روشنی پڑ گئی کہ اپنے سے کمتروں کو دینی پیشوائی میں بھی آگے بڑھاتے رہتے تھے۔

مولانا اپنی نفع رسانیِ خلائق و خدمتِ ملت کے عین شباب میں اٹھا لیے گئے اللہ کی مصلحتوں کو کون سمجھ سکتا ہے۔ تاہم اتنی بات تو کھلی ہوئی نظر آتی ہے کہ حشر میں خدا معلوم کتنی تعداد میں اللہ کے بندے ایسے نکلیں گے جو ہر طرح مولانا کے ممنونِ کرم اور زیر بارِ احسان ہوں گے۔ وہ سب کے سب مولانا کا بوجھ اتار کر اپنے سر لینے کو شوق سے دوڑیں گے اور مولانا کتنے سبک ہو کر، کیسے ہلکے پھلکے، شاداں و فرحاں، خرم و خنداں انشاء اللہ جنت کی طرف روانہ ہوں گے۔

اس دنیا میں رہ جانے والوں کی تو بس یہی دعا ہے کہ اللہ انھیں اپنے ان الطافِ خصوصی سے سرفراز فرمائے جو مقربین کے لئے مخصوص ہیں

اشک و آہ

وارث القادری

آج سارے اہلِ دل ہیں وقفِ درد و اضطراب
آج ہر فردِ بشر ملتا ہے با چشمِ پُرآب

یا ہمہ مایوسی و حرماں بصد رنج و محن
رو رہے ہیں آج تجھ کو صاحبانِ علم و فن

چیخ اٹھی یک بیک، یک لخت گریاں ہوگئی
عالموں کی ساری "جمعیت" پریشاں ہوگئی

ہند ہی تنہا نہیں مرنے پہ تیرے سوگوار
تیرے غم میں ہوگئے دیگر ممالک بے قرار

کیوں نہ تڑپائے دلوں کو انتقالِ پُرملال
علم و حکمت، فہم و دانش میں نہ تھی تیری مثال

آہ اے روحِ روانِ اتقا تیرے بغیر
ہوگئے سینوں میں دل وقفِ بکا تیرے بغیر

غم میں ڈوبا ملک و ملت کا چمن تیرے لئے
آبدیدہ ہوگئے قوم و وطن تیرے لئے

ایک جانب دین کا تھا رکن از فضلِ خدا
دوسری جانب سیاست کا بھی اعلیٰ رہنما

کیا کوئی سمجھے گا تیری خوبیوں کی انتہا
دین کا رہبر بھی تھا دنیا کا تو لیڈر بھی تھا[۱]

ہند میں کیا چیز تھا تو ہم سمجھتے تھے تجھے
"قوتِ بازوئے نہرو" ہم سمجھتے تھے تجھے

تیرے مرقد پہ عمائد دین کے گریہ کناں
تیری ممنونِ کرم آزادیِ ہندوستاں

ہے دُعا وارثؔ کی اک اک خستہ جاں کو صبر دے
اے مرے معبود ان پس ماندگاں کو صبر دے[۲]

[۱] خط کشیدہ حروف کے اس مصرع سے سن عیسوی نکلتا ہے ۱۹۶۲ء۔ [۲] اس مصرع کے خط کشیدہ حروف سے سن عیسوی ۱۹۶۲ء نکلتا ہے قادری

مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم اے۔ صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

وقت کی اہم ترین شخصیت

مندرجہ ذیل مضمون ۱۹۵۵ء میں لکھا گیا تھا۔ اُس وقت مولانا اکبر آبادی نے گذارش کی تھی کہ وہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کو جس قسم کا لیڈر درکار ہے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی اُن تمام اوصاف و کمالات کے جامع ہیں اگر میرا خیال صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ اس حقیقت کو محسوس کریں اور ان کی خدمات سے فائدہ اٹھائیں۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ سات برس بعد ہی جبکہ اس عرصہ میں مولانا مسلمانان ہند کے مسلمہ لیڈر کے درجہ پر پہنچ چکے ہوں گے ہمیں ان کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہوگا ——— "ادارہ"

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رشتہ میں مجھ سے بڑے میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔ دار العلوم دیوبند کے ساتھ تعلق کی نسبت سے میرے خواجہ تاش جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی زندگی کے ساتھی اور اس کے بعد ندوۃ المصنفین دہلی کے رفیق ہیں۔ اس بنا پر میں نے ان کی زندگی کا مطالعہ بہت قریب سے کیا ہے ان کی خانگی زندگی اور خاندانی ماحول سے واقف ہونے کے ساتھ میں نے اُن کو خلوت میں، جلوت میں اور بے تکلف دوستوں کی مجلس میں، غرض ہر جگہ اور ہر مقام پر دیکھا ہے اور ان کی سیرت و کردار کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لیا ہے اور اسی کا یہ اثر ہے کہ اس وقت میں یہ چند سطریں تحریر کر رہا ہوں، جو احباب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ میں کسی زندہ انسان کی مدح سرائی میں خواہ وہ دنیا کا کتنا ہی بڑا انسان ہو، کس درجہ کوتاہ قلم واقع ہوا ہوں، ان کو یہ یاد کرنے میں تکلف نہ ہوگا کہ ان سطور کا مقصد مسلمانوں کو خصوصاً اور اہل ملک کو عموماً صرف یہ بتانا ہے کہ تعمیر نشاۃ ثانیہ کے اس مرحلہ پر قدرت نے حفظ الرحمٰن کے نام سے اُن کو ایک کیسی جامع اور قابل قدر شخصیت عطا فرمائی ہے تاکہ وہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں اور اللہ کی اس نعمت پر شکریہ ادا کر سکیں، ورنہ جب وقت نکل جاتا ہے تو پھر پشیمان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

ابتدائی زندگی مولانا کے دو بھائی، بہنوئی اور بھتیجے سب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اعلےٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اُن میں سے کچھ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں سے پنشن لے چکے ہیں اور کچھ اب تک برسرِ روزگار ہیں خاندان میں انگریزی تعلیم کا اس قدر چرچا ہونے کے باوجود ایک تنہا قابل ذکر ہستی مولانا حفظ الرحمٰن کی ہی ہے جن کو شروع ہی سے انگریزی کے بجائے عربی تعلیم کی طرف میلان پیدا ہوا اور سیوہارہ کے ایک مقامی مدرسہ میں طالب علمی شروع کر دی، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات مشہور ہیں میں بہت کمسن تھا اور آگرہ میں مکان پر ہی ایک اتالیق کے زیر نگرانی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ اس زمانہ میں میرے ماموں قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی اکثر آگرہ آتے جاتے تھے اور ہفتوں ہمارے گھر قیام کرتے تھے ماموں صاحب کے بڑے لڑکے عثمان مرحوم تقریباً ایک ڈیڑھ سال سے آگرہ میں ہمارے ہاں مسلسل ہی رہتے تھے۔ جب کبھی ماموں سیوہارہ سے آتے تو وہ اور ان کے صاحبزادہ عثمان یہ دونوں اکثر سنایا کرتے تھے کہ سیوہارہ میں تمہارا بھائی حفظ الرحمٰن ایسا حاضر جواب ہے، خوب مناظرے کرتا ہے۔ ابھی سے وعظ کہتا ہے اور علیگڑھی بھائیوں سے ایسی ایسی بحثیں کرتا ہے کہ ان کو مات کر دیتا ہے پھر ساتھ ہی ایسا نیک ہے، ایسا ہمدرد اور بااَدب ہے اور حسین و جیاں ہے۔ غرضکہ ماموں مزے لے لے کر مجھ کو اور والد صاحب اور والدہ صاحبہ رحمتہ اللہ علیہما کو بھائی حفظ الرحمٰن صاحب کی باتیں سناتے تھے اور جی بھر کر تعریفیں کرتے تھے۔

جذبۂ خدمت خلق ان خوبیوں کے ساتھ موصوف میں خدمت خلق کا

جذبہ جو اس راہ میں تکالیف برداشت کرنے کا حوصلہ بھی شروع ہی سے تھا۔ [illegible]ء میں مراد آباد کے مدرسہ امدادیہ میں پڑھتا تھا کہ سنا کہ سیوہارہ سے پانچ میل کے فاصلہ پر رات کے دو بجے کے قریب دون ایکسپریس کو ایک بڑا شدید حادثہ پیش آیا جس میں بیسیوں آدمی مظلومیت و بیچارگی کے ساتھ لقمۂ اجل بن گئے بھائی حفظ الرحمٰن کو جوں ہی اس حادثہ کی اطلاع ملی اسی وقت اندھیری رات میں پانچ میل پاپیادہ سفر کر کے موقع واردات پر پہنچ گئے اور پھر جو کچھ وہ کر سکتے تھے کیا اور اس عالی حوصلگی کے ساتھ کیا کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے

تحریکِ خلافت

انھیں دنوں میں تحریک خلافت اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا ملک اس کے ہنگامہ سے گونج اٹھا، حفظ الرحمٰن ایسی طبیعت اس سے کس طرح الگ رہ سکتی تھی اس میں شریک ہوئے اور جیل خانہ پہونچے۔ موصوف جس جیل میں تھے اس کے افسر اعلیٰ کرنل زیڈ احمد تھے جو اپنے زمانہ کے بڑے ہی سخت قسم کے افسر تھے ان کی صاحبزادی فخریہ حمیدہ سلطان جو اردو زبان کی مشہور ادیبہ اور افسانہ نگار ہیں اور ان کی بیگم صاحبہ جو دلی کے مشہور خانوادہ کی چشم و چراغ اور بڑی عابدہ و زاہدہ ہیں یہ دونوں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے اس زمانہ اسارت کا بڑی دلچسپی سے ذکر کرتی ہیں۔

ایک مرتبہ فخریہ حمیدہ سلطان نے کہا کہ میں اس وقت کم عمر میں تھی مگر اب تک مجھ کو یاد ہے کہ مولوی حفظ الرحمٰن اور ان کے ساتھی جیل میں قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے اور نماز پڑھتے تھے۔ والدہ صاحبہ کو یہ معلوم ہوا تو ابّا سے کہا کرتیں کہ آپ نے خدا کے کتنے بندوں کو جیل خانہ میں بند کر رکھا ہے۔ بہر حال بیگم صاحبہ بیچاری کر کیا سکتی تھیں "حکم حاکم مرگ مفاجات" پھر بھی اتنا ضرور کرتی تھیں کہ عمدہ عمدہ کھانے پکوا کر اپنے شوہر سے ان قیدیوں کے لئے بھجواتیں اور ان کی خاطر مدارات کرتیں۔ اسی اثنا میں عید آگئی تو بیگم صاحبہ نے بہت بڑی مقدار میں سویاں، دودھ شکر اور شیر وغیرہ بھیجا اور اس طرح ان کی دلجوئی اور دلدہی کی کہ مرزا غالب کے لفظوں میں ان اسیران فرنگ کو یہ کہنے کا موقع نہ رہا کہ ؎

اُگ رہا ہے درو دیوار پہ سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

کرنل زیڈ احمد صاحب مرحوم کے پورے خاندان کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے ساتھ جو غیر معمولی خلوص و عقیدت اور ارادت و محبت ہے وہ اسی زمانہ سے ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں

۱۹۲۱ء میں میں دارالعلوم دیوبند چلا آیا، اور میرے وہاں پہنچنے کے ایک سال بعد جب تحریکِ خلافت کا بحرانی دور ختم ہوگیا تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی علوم و فنون کی تکمیل کے لئے وہاں پہنچ گئے اور غالباً دورہ حدیث میں داخلہ لیا۔ موصوف نے دیوبند پہنچتے ہی وہاں کی سوسائٹی میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا اور بہت جلد حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیری کے مقربین خاص اور مخصوص تلامذہ میں جن میں اس وقت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور شیخ الحدیث مولانا محمد بدر عالم نمایاں تھے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی شامل ہوگئے۔ دورۂ حدیث سے فراغت تو ایک سال میں ہو ہی گئی لیکن مولانا اس کے بعد مختلف فنون کی اعلیٰ کتابیں پڑھنے کے ساتھ صحیح بخاری کی سماعت مسلسل کئی سال تک کرتے رہے۔ چنانچہ میں جس سال دورۂ حدیث میں تھا اس سال بھی یہ صحیح بخاری کی سماعت بڑی پابندی سے کر رہے تھے اور میرے لئے حضرت شاہ صاحب کی تقریر قلمبند کرتے تھے۔ میرے پاس بھائی حفظ الرحمٰن صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ دو موٹی موٹی کاپیاں محفوظ تھیں۔ مگر ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں جب گھر لٹا تو یہ کاپیاں بھی نہ رہیں۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

۱۹۲۸ء میں حضرت شاہ صاحب اپنے چند رفقاء اور تلامذہ کے ساتھ ڈابھیل ضلع سورت تشریف لے گئے تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی ایک رکن کی حیثیت سے اس جماعت کے ساتھ ڈابھیل آئے اور طبقۂ علماء کی کتابوں کا درس دینے لگے۔ طبیعت ایسی رسا اور ذہین پائی ہے کہ یہاں ہر فن کی اونچے درجہ کی کتاب پڑھایا کرتے تھے اور یہ کہنا مشکل تھا کہ انہیں سب سے زیادہ مناسبت کس فن سے ہے۔

سیاسیات

ڈابھیل میں کم و بیش تین سال قیام رہا اور اصلاً مشغلہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف ہی رہا لیکن سینہ میں استخلاص وطن کا جو جذبہ موجزن تھا وہ ابھر آنے کے لئے مواقع و محل کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا چنانچہ گاندھی جی کی تحریک سول نافرمانی شروع ہوئی اور ملک نے سیاسیات میں ایک نئی کروٹ لی ہی تھی کہ مولانا حفظ الرحمٰن اپنی ملازمت سے مستعفی ہو کر اپنی پوری قوت کے ساتھ سیاسیات کے خارزار میں کود پڑے۔ اس وقت ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ ۱۹۳۰ء میں بمقام امروہہ جمعیۃ علماء ہند کا جو سالانہ اجلاس ہوا اس میں مولانا محمد علی مرحوم ایسی شخصیت کے ساتھ ٹکر لے کر شرکت کانگریس کا رزولیوشن منظور کرا لیا اور اس طرح مسلمانان ہند کے لئے ایک واضح اور روشن نصب العین متعین کر دیا۔ جمعیۃ علماء ہند کے سرگرم کارکن ہونے کے ساتھ کانگریس کے برابر ممبر رہے اور صوبہ کانگریس میں ہمیشہ باوقار سمجھے گئے متعدد بار جیل گئے لیکن

جب ہزاروں آدمی جیل جارہے ہوں اور "مرگ انبوہ جشن دارد" کا عالم ہو صرف جیل جانا کوئی معیار فضیلت نہیں قرار پاسکتا۔ البتہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جس خلوص، انہماک، ایثار اور عزم و استقلال کے ساتھ جیل کے مصائب اور اس کے متعلقات کو برداشت کیا ہے وہ بے شبہ اُن کی کتاب فضائل کا ایک روشن باب ہے۔ سال ۱۹۳۲ء کا ہے کانگریس کو غیر قانونی جماعت قرار دیا گیا ہے اور اس کے باوجود کانگریس نے فیصلہ کیا ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ مسز سروجنی نائیڈو کی صدارت میں دہلی میں گھنٹہ گھر کے پاس ہوگا۔ گاندھی ٹوپی میں جو نظر آتا ہے پکڑا جاتا ہے۔ کھدر میں جو دکھائی دیتا ہے دھر لیا جاتا ہے اب ممبران کانگریس ہیں کہ عجیب عجیب طرح سے بھیس بدل بدل کر آرہے ہیں اُنہیں میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی تھے مگر اپنی وضع میں، پولیس کو پتہ چل گیا اور وہ ان کے تعاقب میں چلی لیکن مولانا ہیں کہ دلی میں ہی ایک گھر سے دوسرے میں اور دوسرے سے تیسرے میں چھپے اور اس طرح پولیس اور سی آئی ڈی کو جُل دیتے پھر رہے ہیں یہاں تک کہ جلسہ کا مقررہ وقت ہوا۔ اور گھنٹہ گھر پر متعین پولیس نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سامنے ہی نظر آئے انجام تو پہلے ہی سے معلوم تھا، پکڑ لئے گئے جیل گئے لیکن جلسہ کرنا تھا وہ کر چکے تھے۔ روپوشی کے ان دنوں میں سے ایک دن میرے گھر میں بھی رہے تھے۔ مجھ کو یہ دیکھ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ پولیس کی لاٹھیاں کھانی اور پھر جیل جانا یقینی تھا مگر کیا مجال کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی پیشانی پر فکر و فکر و تشویش کی ایک شکن بھی کہیں نظر آجائے۔ وہی روزانہ کے معمولات کی پابندی، ہر ایک کے ساتھ ہنسی خوشی سے بات چیت، کھانا پینا اور وقت پر سوجانا، گویا انہیں کوئی نیا حادثہ پیش آنے والا ہی نہ تھا اور گویا انھوں نے کسی خطرناک وادی میں کوئی قدم ہی نہ رکھا۔

۱۹۴۲ء میں اس کے بعد اسی سلسلہ کا دوسرا واقعہ جو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا وہ ۱۹۴۲ء میں پیش آیا جنگ عالمگیر زوروں پر تھی۔ کانگریس خلاف قانون جماعت قرار دی جا چکی تھی ورکنگ کمیٹی اور ہزاروں ممبران کانگریس گرفتار ہوچکے تھے اور روزانہ ہو رہے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کا بھی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر ہونے کی حیثیت سے گرفتار ہونا یقینی تھا اور صبح شام ہو رہی تھی۔ ان دنوں میں مولانا ندوۃ المصنفین کے رفیق کی حیثیت سے تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے تھے۔ فضا میں اس درجہ بحران اور گرفتاری کے یقین کامل کے باوجود ان کا معمول تھا یعنی صبح آٹھ بجے دفتر ندوۃ المصنفین میں پہنچ جانا اور شام کو چار بجے وہاں سے رخصت ہو کر دفتر الجمعیۃ میں بیٹھنا، کیا مجال کہ اس میں سرمو بھی فرق آجائے وقت مقررہ پر آتے اور مطالعہ کرتے، لکھتے، بولتے چالتے اور تھوڑی دیر کے لئے درمیان میں قیلولہ کرتے۔ یہ سب معمولات بدستور قائم رہے۔ چنانچہ ایک دن دوپہر کے دو بجے کا وقت تھا کہ اچانک پولیس دفتر ندوۃ المصنفین میں داخل ہوئی اور وارنٹ دکھایا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ہنستے ہوئے شیروانی پہنی، ٹوپی سنبھالی، اپنے کاغذات لپیٹ کر رکھے اور سب سے مل ملا مصافحہ کر پولیس کے ساتھ چل دئے نہ پھر ان کے لئے کوئی پیغام ہے نہ گھر سے متعلق کوئی ہدایت ہے، چہرہ ہے کہ اسی طرح شگفتہ ہے لب ہیں کہ ان پر تبسم کھل رہا ہے، اُن کے ساتھی جو اس طرح ان کو جاتے دیکھ رہے ہیں دم بخود ہو کر رہ گئے ہیں۔ آنکھیں ڈبڈبا آئی ہیں، لیکن اس بطل حریت کا یہ عالم ہے کہ جیل خانہ کی طرف اس طرح قدم بڑھاتے جا رہا ہے کہ گویا اسے وہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی ہے اور وہ رفتار تیز کر کے اب تلافی مافات کر رہا ہے

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

اس زمانہ اسارت میں کئی مرتبہ ان سے جیل خانہ میں ملاقات ہوئی مگر ہمیشہ یہی ہوا کہ ملاقات کے وقت جیل خانہ کا ماحول، آہنی سلاخیں اور کوٹھریاں دیکھ کر ہمارا دل ہے کہ اندر ہی اندر اداس ہو رہا ہے لیکن مولانا حفظ الرحمٰن ہیں کہ خوش و خرم نظر آرہے ہیں گویا کہ ملک کے آسمان پر شدائد و مصائب کے جو گہرے بادل چھائے ہوئے تھے مولانا نے ان بادلوں کی نقاب اٹھا کر آزادی کی روشن نا ظورہ خوش جمال کو دیکھ لیا تھا جو ان کے پیچھے چھپی بیٹھی تھی اور جو جلد ہی عالم ظہور میں آنے والی تھی۔

تقسیم کے بعد کہتے ہیں کہ انسانی کیریکٹر کے اصل نقوش و خطوط جو عام حالات میں ڈھکے چھپے اور دبے دبے رہتے ہیں۔ انتہائی غم یا جوش کے عالم میں یک بیک سطح پر اُبھر آتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو آئیے اس آئینہ میں حفظ الرحمٰن صاحب کے کیریکٹر کی ایک جھلک دیکھتے چلیں۔

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کا دن حفظ الرحمٰن کے روزنامچۂ حیات میں گویا ایک جھٹ پٹے کا وقت تھا جبکہ صبح مسرت اور شام غم دونوں

ایک دوسرے سے مصافحہ کر رہے تھے۔ مسرت اس کی کہ وطن آزاد ہوا، اور رنج والم اس بات کا کہ ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے اور اس کے نتیجہ میں سرحد کے اُس پار اِس پار دونوں طرف شرافت و انسانیت ننگی ناچنے لگی۔

حادثہ جانکاہ

مولانا حفظ الرحمن صاحب کی ایک نہایت پیاری نوجوان بیٹی خالدہ جو دو تین برس سے تپ دق میں مبتلا تھی اور جس کے علاج معالجہ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا تھا آخر ۱ یا ۲ ستمبر ۱۹۴۷ء کو مفارقت ابدی کا داغ دے کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔ مولانا انتقال کے وقت سیوہارہ میں ہی تھے اور ابھی ان کے غم کے آنسو خشک بھی نہ ہوئے تھے کہ خبر ملی کہ مشرقی پنجاب کا طوفان برق و باد دہلی میں پہنچ گیا ہے اور چلتی ٹرین میں حادثات ہونے لگے ہیں، بچی کے انتقال کے دوسرے ہی دن سامان اٹھا کر اور تمام گھر والوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر دہلی کے لئے روانہ ہو گئے۔

ان دنوں میں ریلوں میں مسلمانوں پر حملے ہونے شروع ہی ہو گئے تھے۔ خود مولانا جس ڈبہ میں تھے اس پر بھی حملہ ہوا جس کا ظاہر ہے کہ سب سے بڑا نشانہ آپ ہی تھے لیکن چونکہ قدرت کو ان سے کام لینا تھا اس لئے فوج کا ایک افسر اعلیٰ جو سکھ تھا اور مولانا کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اُس نے ان لوگوں کو ڈرا دھمکا کر واپس کر دیا اور اس طرح آپ دہلی بخیریت پہنچ گئے۔ دہلی میں پہنچ کر انھوں نے کیا کیا؟ اے کاش دہلی کی جامع مسجد کو گویائی عطا ہوتی اور وہ اس داستان کو سنا سکتی۔ یا شاہجہاں آباد کے گلی کوچے، وہاں کے بازار اور سڑکیں وہاں کے محلے اور آبادیاں بول سکتیں اور وہ یہ کہانی بیان کر سکتیں۔ دہلی کی مسلم آبادی کے محلے، آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے تھے وحشت و بربریت کا راون برہنہ رقص کرتا پھر رہا تھا جو انسانیت کے ہمدرد اور غمگسار تھے، وہ کس مپرسی کے عالم میں دم بخود تھے۔ مسلمان غریب اپنے مکان کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے بھی ڈرتا تھا، مگر دلی کا چپہ چپہ گواہ ہے کہ ایسے عالم رعد و برق میں ایک مولانا حفظ الرحمن ہیں کہ ایک چھوٹی سی موٹر میں صبح و شام اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ جہاں فساد کی اطلاع ملی اور یہ موقع پر پہنچے۔ حکام کو اُن کے فرائض کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ ان کو مشورہ دے رہے ہیں جو لوگ مکان چھوڑ رہے ہیں اُن کے تخلیہ کا انتظام کرا رہے ہیں کہ وہ جائے پناہ تک صحیح و سلامت پہنچ جائیں شہر میں جہاں جہاں جو صورت حال پیدا ہو رہی ہے یا اس کے پیدا ہونے کا امکان ہے اُس کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لے رہے ہیں اور پل پل کی خبر حکومت دہلی اور حکومت ہند کو پہنچا رہے ہیں اور اس سلسلہ میں ضروری احکام لے رہے ہیں۔ غرض ایک تنہا جان ہے جو ہر وقت متحرک، ہر آن بیدار اور برابر سرگرم عمل ہے۔ راستہ میں موٹر پر کئی بار بم گرے، لاٹھیاں برسیں، پتھر پھینکے گئے۔ قتل کی سازشیں ہوئیں، دھمکیوں کے خط ملے لیکن جس نے اپنی جان جان آفریں کے بندوں کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی وہ ان سب چیزوں سے کیا ڈرتا۔ اُس کی سرگرمی اور جوش میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ اس وقت کون کہہ سکتا ہے کہ حفظ الرحمن کے دل میں غم والم کے کتنے بادل ہوں گے جو آنکھوں کی راہ سے برس کر کھل جانا چاہتے ہوں گے۔ لیکن کیا مجال کہ چہرہ پر اداسی اور افسردگی کی کوئی ایک سلوٹ بھی ہو۔" وہی ایک بہادر سپاہی کا عزم واستقلال، وہی ایک خود اعتمادی اور ہمت جو حوادث کے ہاتھوں شکست کھا کر بھی تازہ دم رہتی ہے اور اپنے مستقبل کو ماضی و حال کی مایوسیوں کے سپرد نہیں کرتی۔ اس تمام مدت میں مولانا حفظ الرحمن صاحب کے چہرہ بشرہ سے اور اُن کی ہر ہر ادا سے عیاں اور نمایاں تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ آج دہلی میں اور اس کے اطراف و نواح میں لاکھوں مسلمان آباد ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حکومت اور دوسرے پبلک ورکرز کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ لیکن مجھ کو اس میں ذرا شک نہیں کہ مولانا حفظ الرحمن ان تمام کوششوں کے روح رواں تھے جو ایک طرف پبلک اور دوسری طرف حکومت دونوں سے پوری طرح وابستہ تھے یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی دلی آتے تو انہیں سب سے زیادہ اعتماد مولانا حفظ الرحمن پر ہی تھا۔ روزانہ صبح کو ان کا گاندھی کے پاس پہنچنا، حالات سے باخبر کرنا، اور اس سلسلے میں انتظامی مشورے دینا یہ ان کا مقررہ معمول تھا، اگر کسی دن مولانا کو ذرا دیر ہو جاتی تو گاندھی جی سخت پریشان ہو جاتے تھے کہ خدا خیر کرے آج حفظ الرحمن اب تک نہیں آئے اور کوئی شگوفہ تو کہیں نہیں کھل پڑا۔

مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ سلوک

انسانی کیریکٹر کی سب سے بڑی عظمت یہ ہے کہ مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کا معاملہ کیا جائے اور وقت پڑنے پر اُن سے انتقام نہ لیا جائے۔ ان مذکورہ بالا تمام کاموں کے ساتھ سیکڑوں، ہزاروں، مسلمان تھے جو کل تک مولانا حفظ الرحمن صاحب کے شدید مخالف اور بے حد نکتہ چین رہے تھے۔ مولانا نے اس وقت دوست دشمن کا کوئی امتیاز نہیں برتا اور اُن لوگوں کے لئے جو پاکستان جانے کا ارادہ کر چکے تھے سفر کی سہولتوں کا انتظام کیا۔ غرض کہ اس

وقت مسلمانوں کی امداد اور اس کے ذریعہ سے خود ملک کی خدمت کا کوئی ایک کام بھی ایسا نہیں تھا کہ جس کو مولانا پوری سرگرمی، جوش، تندہی اور کمال ایثار و قربانی کے ساتھ انجام نہ دیتے ہوں۔

غیرت وحمیّت اسلامی

تقسیم کے بعد مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ تباہ کن ان کا احساس کمتری تھا مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ملک کے طول و عرض کا دورہ کر کے اپنی حقیقت افروز تقریروں سے اس احساس کو جس طرح دور کیا ہے اُسے تمام باخبر حضرات جانتے ہیں۔ لیڈروں کا عام طور پر ظاہر و باطن ایک نہیں ہوتا۔ پلیٹ فارم پر کچھ کہتے ہیں اور خلوت میں کسی اور طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن یہاں معاملہ بالکل یکساں ہے۔

دو واقعات

ایک مرتبہ ۱۹۴۸ء میں میں اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب دونوں ایک ساتھ دہلی سے لکھنؤ جا رہے تھے۔ وہاں یو۔ پی گورنمنٹ کی ایک تعلیمی سب کمیٹی کے جلسہ میں شریک ہونا تھا۔ راستہ میں میں نے اُن سے کہا کہ پاجامہ اور دھوتی کی جنگ ختم کرنے کے لئے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح مغربی لباس اختیار کر لیا جائے؟ مولانا نے فوراً تڑاق سے جواب دیا کہ اگر مسلمانوں نے ہندوؤں سے مرعوب ہو کر اسی طرح اپنی قومی تہذیب اور ملّی تمدن کو چھوڑ کر مغربی تہذیب و تمدن کو اختیار کر کے اپنی عافیت و اطمینان کا سہارا ڈھونڈا تو پھر بات ہی کیا ہوئی۔ ؟ اور یہ تو کسی آزاد ملک کے ایک آزاد باشندہ کی زندگی نہ ہوئی۔ اسے میں ہرگز پسند نہیں کر سکتا۔

اسی طرح میرا ذاتی خیال تھا کہ ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر مسلمانوں کو گاؤ کشی کے انسداد کا اعلان کر دینا چاہئیے کیونکہ مذہباً ایسا کرنا جائز بھی ہے اور اس سے ہندو مسلم تعلقات کے خوشگوار ہونے کی امید بھی ہو سکتی ہے۔

ایک دن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے میں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو حسب عادت سنتے ہی بگڑ پڑے اور لگے تقریر کرنے۔ انہوں نے کہا کہ تقسیم سے پہلے اگر ہم کرتے تو اس کی قدر بھی ہوتی لیکن اب تو یہ کہا جائے گا کہ مسلمانوں نے ڈر کر ایسا کیا ہے تو پھر کرنے کا کیا فائدہ؟ اس لئے میں ہرگز مسلمانوں سے نہیں کہوں گا کہ وہ انسداد گاؤ کشی کا اعلان کر دیں۔ حکومت سیکولر ہے۔ دستور جمہوری ہے۔ اگر ہندو اس سیکولرزم اور جمہوریت کو عریاں کرنا چاہتے ہیں تو وہ بڑے شوق سے گاؤ کشی قانوناً بند کرا دیں۔ اُس وقت ہمارا موقف دوسرا ہوگا اور ہم اس مسئلہ پر پھر از سر نو غور کریں گے۔

مجھ کو اپنی رائے پر اتنا اصرار تھا کہ میں نے اس پر برہان میں لکھا مگر ساتھ ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن کو اپنی رائے پر اس قدر پختگی تھی کہ انہوں نے میرے مضمون کا جواب برہان میں بھی دیا اور بڑے زور و شور کے ساتھ دیا۔ اس وقت تو بات میری سمجھ میں نہ آئی تھی لیکن اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ہی غلطی پر تھا اور رائے انہیں کی درست تھی۔

ٹھنڈا دماغ

۱۹۴۷ء کے انقلاب نے ہندو اور مسلمان کانگریسی اور مسلم نیشنلسٹ سب کے دماغ کا توازن ہی بگاڑ دیا جو کل تک گاندھی جی کے دست راست تھے وہ آج فرقہ پرستی میں ننگ وطن ہیں جو کل تک بہادر تھے آج بزدل ہیں اور ان پر مرعوبیت چھائی ہوتی ہے لیکن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب آج سے دس برس پہلے جہاں تھے وہیں آج بھی ہیں۔ ایک طرف سیاسیات اور قومی و ملکی معاملات کے مسائل میں اوّل درجہ کے نیشنلسٹ اور جمہوریت پسند، لیکن ساتھ ہی مذہبی اور ثقافتی امور میں پکے مسلمان اور دونوں میں ایسا توازن اور تناسب قائم رکھتے ہیں کہ ع

ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان باختن

ان کا جو فیصلہ ہوتا ہے ٹھنڈے دماغ کے ساتھ ہوتا ہے اس میں نہ کسی مرعوبیت کو دخل ہوتا ہے اور نہ کسی کو خوش کرنے کا جذبہ!

بے لوثی

اسی وجہ سے وہ کانگریس کے سرگرم کارکن اور اس کے ٹکٹ پر پارلیمنٹ کے ممبر ہیں لیکن اس میں کانگریس کے مرہون احسان بالکل نہیں دو مرتبہ کانگریس کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا مگر کانگریس کے سخت اصرار کے باوجود اس سلسلہ میں ایک پیسہ کانگریس سے نہیں لیا سب اخراجات جوں توں کر کے خود ہی برداشت کئے ان کا یہی معاملہ جمعیت کے ساتھ ہے دن رات وہ اس کی خدمت کے لئے وقف ہیں لیکن پھر تمام خدمات آنریری ہیں یہاں تک کہ پارلیمنٹ تک آنے جانے میں وہ جمعیت کی موٹر استعمال کرتے ہیں۔ تو اس کے لئے پچھتّر (۷۵) روپیہ ماہوار اپنی جیب سے جمعیۃ کو ادا کرتے ہیں۔

بعض شکایات

کچھ لوگوں کو اب ان سے یہ شکایت پیدا ہو گئی ہے کہ ان کا غصہ بڑھ گیا ہے بات بات پر بگڑ جاتے ہیں اور ان کا لب و لہجہ سخت و کرخت ہو جاتا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس کی وجہ ان کی کمزوری ہے کہ وہ ہر چھوٹا بڑا کام خود کرنا چاہتے ہیں اور کرتے ہیں یہاں تک کہ جلسہ میں مقرر کے نام کا اعلان بھی کریں گے تو خود ہی! اس بنا پر ان کا نقصان ایک طرف تو یہ ہے کہ ان کے رفقاء اور ساتھیوں کو بھی بدگمانی ہوتی ہے کہ مولانا کو ان پر اعتماد نہیں ہے اور اس وجہ سے وہ تقسیم کار کے اصول پر عمل پیرا نہیں ہوتے اور دوسری جانب ان کا دل و دماغ خود دونوں پریشان ہو جاتے

ہوجاتے ہیں اور اس کی وجہ سے مزاج میں اور کرختگی پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ کرختگی صرف ظاہری اور سطحی ہوتی ہے ورنہ ان سے بڑھ کر کوئی ہمدرد نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ بڑے نرم اور مہربان ہوجاتے ہیں اور پوری ہمدردی کے ساتھ کہنے والوں کی بات سنتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں۔ بہرحال ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کو جس قسم کا لیڈر درکار ہے مولانا اس کے تمام اوصاف وکمالات کے جامع ہیں اور اگر میرا خیال صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ اس حقیقت کو محسوس کریں اور ان کی خدمات سے فائدہ اٹھائیں

قطعۂ تاریخ وفات حضرت مجاہد ملت علیہ الرحمۃ

(از:۔ سید شمیم الحسن صاحب زیدی۔ مرادآباد)

خطیب بے بہا آں حفظ رحمٰن — کہ در آفاق مقبولِ زماں شد
امیرِ حریت جانباز ملت — پناہِ قوم در ہندوستاں شد
صد افسوس و ملال و حسرت و غم — کہ از دارِ فنا رحلت کناں شد
شمیمؔ زار در تاریخ فوتش — بگفتہ "فخرِ ملت در جناں شد"

۱۹ ۶ ۶۲

قطعۂ تاریخ وفات حضرت مجاہد ملت علیہ الرحمۃ

(حکیم نور العین حسن صاحب راغبؔ چھتاروی)

روحِ جمعیۃ امیرِ کارواں — حفظِ رحمٰن بے مثال و بے بہا
تم نے دیکھا ہی نہ ہوگا دوستو ں — بے غرض جانباز ایسا رہنما
بعد مدت کے ملا تھا قوم کو — اک مجاہد اور سچا رہنما
قوم کی حرماں نصیبی آہ آہ — وہ بھی دنیا سے اچانک اٹھ گیا

راغبؔ اِس مژدہ پر اب تو صبر کر
حفظِ رحمٰن وارد جنت ہوا

۱۹ ۶ ۶۲

جی بہلتا ہی نہیں ہے کسی افسانے سے

بہ یاد مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ

(از:- ایم حفیظ بنارسی، ایم اے بی ایڈ)

تو کہ تھا انجمنِ دانش و حکمت کا چراغ   محفلِ علم کی ضو بزم سیاست کا چراغ
تو کہ تھا بارگہہ فہم و فراست کا چراغ   نورِ عرفان و یقیں رُشد ہدایت کا چراغ

ہو گیا ختم ترے ساتھ محبت کا چراغ
گل ہوئی شمعِ وفا بجھ گیا الفت کا چراغ

خدمت قوم وطن تجھ کو مگن رکھتی تھی   بے نیازِ ہوسِ کام و دہن رکھتی تھی
مضطرب تجھ کو سدا فکر چمن رکھتی تھی   تیری ہر بات عجب حُسن سخن رکھتی تھی

ناز فرماتے تھے تری طاقتِ گفتار پہ ہم
فخر کرتے تھے تری عظمتِ کردار پہ ہم

جانبِ فکر و عمل سب کو پکارا تو نے   بے سہاروں کو دیا بڑھ کے سہارا تو نے
قوم کی زلفِ پریشاں کو سنوارا تو نے   ڈوب کر کشتیٔ ملت کو اُبھارا تو نے

زندگی آئینۂ حسنِ عمل تھی تیری
تو مجاہد تھا ہر اک بات اٹل تھی تیری

تو نے اوروں کیلئے زیست کا ساماں کیا   اپنا سب کچھ وطن و قوم پہ قرباں کیا
سب کی تسکیں کیلئے خود کو پریشاں کیا   اپنے آرام کا کب تو نے کوئی دھیان کیا

جہد کرتا رہا تو امن و اماں کی خاطر
سعیٔ پیہم رہی تعمیر جہاں کی خاطر

راہِ انصاف و مساوات دکھائی ہم کو دینِ اسلام کی رو داد سنائی ہم کو
زندگی کیا ہے مجاہد کی بتائی ہم کو تو نے حق گوئی و بے باکی سکھائی ہم کو

اہلِ باطل تری آواز سے تھراتے تھے
تری جرأت ترے کردار سے گھبراتے تھے

تیری تصویر سے ظاہر تھا عجب رُعبِ جمال تیری شخصیت ذی شاں کی نہیں ملتی مثال
بسترِ مرگ پہ بھی تھا تجھے اُردو کا خیال کیوں نہ ہو تیری جدائی کا ہر اک دل کو ملال

دیکھ کر تجھ کو قرارِ دل و جاں ملتا تھا
ذات سے تیری ہمیں عزمِ جواں ملتا تھا

کوئی ہمدم کوئی غمخوار نہیں ہے اپنا تجھ سا اب کوئی مددگار نہیں ہے اپنا
پوچھئے سچ تو کوئی یار نہیں ہے اپنا اب کوئی قافلہ سالار نہیں ہے اپنا

چوٹ وہ دل پہ لگی ہے ترے مر جانے سے
جی بہلتا ہی نہیں ہے کسی افسانے سے

سوگوار آج ہے ہر بزمِ ادب تیرے لئے حُزن اور یاس کی تصویر ہیں سب تیرے لئے
انجمن ہند کی ہے آہ بلب تیرے لئے کشتۂ غم ہے عجم اور عرب تیرے لئے

دیدۂ اہلِ زمانہ میں نمی ملتی ہے
کوئی محفل ہو مگر تیری کمی ملتی ہے

باعثِ صد الم و رنج ہے تیری رحلت آج معلوم ہوئی ہے ہمیں تیری قیمت
سایہ گستر ترے مرقد پہ ہو ابرِ رحمت مرنے والے تجھے حاصل ہو بہارِ جنت

بیکراں رحم و کرم تجھ پہ خدا فرمائے
ہم کو نعم البدل اللہ عطا فرمائے

آلِ احمد سرورؔ۔ جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند۔

مولانا حفظ الرحمٰن ــ ایک تاثر

"تمہاری خوبیاں زندہ، تمہاری نیکیاں باقی"

انتخابات کے زمانہ میں اچانک خبر ملی کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بہت علیل ہیں، کینسر کا شبہ ہے اور بمبئی علاج کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ کینسر ایسا موذی مرض ہے کہ اس کا نام سُن کر ہی خون خشک ہو جاتا ہے اور موت سامنے منڈلانے لگتی ہے۔ مولانا بمبئی سے واپس آئے تو یہ شبہ قوی ہو گیا، مگر انسان دل کو کسی نہ کسی طرح ڈھارس دے ہی لیتا ہے۔ اس وقت روس اور امریکہ میں کینسر پر بہت کام ہوا ہے اور ابتدائی مرحلے میں اس مرض کو دور کرنے میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔ مولانا کے متعلق ضروری ریکارڈ روس اور امریکہ بھیجا گیا۔ روس کے ڈاکٹروں نے کہا کہ مرض خاصی خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے اور چھ مہینے سے زیادہ زندگی کی توقع نہیں ہے۔ امریکہ کے ڈاکٹروں نے ایک نئی دوا آزمانے کے لئے بلایا۔ اپریل میں مولانا میڈیسن تشریف لے گئے، جولائی کے وسط میں واپس آئے۔ اخبار سے معلوم ہوا کہ مرض زائل ہو چکا ہے، صرف کمزوری اور بیانی کی شکایت ہے مگر یہ سب طفل تسلیاں تھیں۔ میں تین اگست کو میسور میں تھا، وہیں اخبار میں دیکھا کہ مولانا نے اپنی جان جان آفریں کو سپرد کر دی۔

بیماری میں انسان کے کردار کا امتحان ہوتا ہے۔ مولانا سے دو دفعہ بیماری کے زمانے میں ملاقات ہوئی۔ سخت کھانسی اور تکلیف میں مبتلا تھے مگر کیا مجال تھی جو مزاج کی شگفتگی اور طبیعت کے تحمل میں ذرا بھی فرق آتا۔ عقیدتمندوں، دوستوں اور مدّاحوں کا ہجوم تھا۔ سب سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ ہر ایک کے معاملات پر بھی گفتگو کرتے تھے۔ اس عالم میں بھی ضرورتمندوں کی امداد کے لئے لوگوں سے کہتے تھے۔ خط لکھتے تھے اور ضروری مشورے دیتے تھے۔ بیماری بھی مولانا کی ہمّت وجرأت، استقلال واستقامت کو متاثر نہ کر سکی۔ بہت مختصر الفاظ میں مرض کا تذکرہ کرتے تھے۔ کوئی بھی جاتا اس کی تواضع ہوتی، پاس بلاتے، خیریت دریافت کرتے اُس کے مسائل پر اظہارِ خیال کرتے جس طرح زندگی میں سب کے کام آتے رہے، سب کی دلجوئی کرتے رہے، اسی طرح مرض الموت میں بھی اپنی وضع قائم رکھی۔ خدا انہیں اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے۔

مولانا کو آزادی کے سپاہی، ایک بلندپایہ عالم دین، ایک معزز سیاسی رہنما کی حیثیت سے سارا ملک جانتا اور مانتا تھا۔ جب مسلم لیگ کا زور تھا تو بہت سے قوم پرست گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ کون آندھی کے گرد وغبار کا سامنا کرے۔ مگر مولانا میدان چھوڑنے والے نہ تھے۔ ڈٹ کر فرقہ پرستی کا مقابلہ کرتے رہے۔ لیاقت علی خاں کے مقابلہ میں ہار تو گئے مگر ان کے بھی چھکے چھڑا دیئے جب دہلی میں فساد اور قتل وغارت کی گرم بازاری ہوئی تو مولانا نے جان پر کھیل کر مسلمانوں کی امداد کی۔ اُنہیں مسلمانوں کی جو اُنھیں گالیاں دیتے تھے اور برا بھلا کہتے تھے۔ اُس زمانے میں جلے پاؤں کی بلّی کی طرح مولانا رات دن ایک محلّے سے دوسرے میں، شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھرتے رہتے تھے، ہزاروں کو خطرے سے نکال کر لاتے، سینکڑوں کو موت کے منہ سے بچایا۔ خدمت کا کوئی موقع ایسا نہ تھا جس میں مولانا سب سے آگے نہ رہے ہوں، حق گوئی کا کوئی مرحلہ نہ تھا جس میں مولانا نے جرأت اور بے باکی سے سچی بات نہ کہی ہو۔ وہ سچّے اور پکے مسلمان تھے، مگر انھوں نے اپنا وقت دوسروں کے ایمان میں کیڑے نکالنے میں صرف نہ کیا۔ وہ مضبوطی کے ساتھ اپنی رائے دیتے تھے، کھلے الفاظ میں بنیادی باتوں میں اختلاف کرتے تھے، مگر جزئیات میں دوسرے کی بات سننے اور ماننے میں اُنھیں کبھی تامّل نہ ہُوا۔ وہ کام کرنے والے آدمی تھے، کہیں فساد ہوا، یا کہیں سے زیادتی یا ظلم کی خبر آئی۔ مسلمانوں کے بہت سے خود ساختہ لیڈر بیان دینے یا افسوس کرنے پر اکتفا کرتے تھے، مولانا خود پہنچتے تھے۔ مظلوموں کی مدد کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے تھے، پارلیمنٹ میں سچی اور کھری بات کہنے میں اپنی مثال آپ تھے۔ پھر اُن میں خود نمائی نہ تھی۔ اردو کی تحریک میں مولانا لیڈر کی حیثیت سے نہیں سپاہی کی حیثیت سے انجمن کا کام کرتے تھے۔ جہاں مولانا کی ضرورت محسوس ہوئی بھیجدیا۔ جہاں دقت ہوئی مولانا نے سلجھا دی، جہاں اختلاف ہُوا مولانا کی وجہ سے دور ہو گیا۔ انھوں نے ہمیشہ فصل کے بجائے وصل پر زور دیا۔ وہ کام کرنے والوں کو ساتھ رکھنے اور اُن کی دلجوئی کرنے میں اپنی نظیر آپ تھے۔

۱۹۵۷ء کی علی گڑھ کی کانفرنس میں طے ہوا کہ انجمن کی کل ہند کانفرنس ۱۹۵۸ء میں دہلی میں ہو۔ مولانا کو پس و پیش تھا کیونکہ وہ انتظامی دشواریوں سے واقف تھے۔ میں نے کہا مولانا آپ ذمے داری نہ لیں گے تو یہ کام رہ جائے گا۔ بس اتنا کہنا تھا کہ تیار ہو گئے۔ اپنے سیاسی کاموں کا حرج کر کے اس کانفرنس کے انتظامات کئے۔ اُنہیں کی وجہ سے دہلی کی کانفرنس اس قدر شاندار ہوئی کہ پنڈت جی آئے۔ مولانا آزاد نے کانفرنس کو خطاب کیا اور ہماری تحریک کا اثر پورے ملک نے محسوس کیا۔

مولانا ڈسپلن کے قائل تھے۔ اردو کے سلسلے میں بہار کی ایک کانفرنس میں مولانا نے ایک ایسی تقریر کی جو میرے خیال میں انجمن کے ایک ممتاز ممبر کو نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ میں نے ایک اداریہ میں اس کی طرف اشارہ کیا۔ مولانا نے ایک طویل خط اخبار میں اشاعت کے لئے لکھا۔ میں نے خط روک لیا اور مولانا کو لکھا کہ آپ یہ مسئلہ کونسل میں پیش کریں لیکن اخبار میں آپ کا یہ کھلا ہوا اختلاف کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ مولانا میری بات مان گئے اور پھر کونسل میں بھی میری ہم نوائی کی۔ آج کتنے لیڈر اور سیاسی رہنما ایسے ہیں جو اپنی بات کی پچ نہیں کرتے۔ مولانا نے کبھی بات کی پچ نہیں کی، ہمیشہ اپنے نصب العین پر نظر رکھی اور حقائق کی روشنی میں منزل کی طرف سفر کی تیاری کرتے رہے۔

قومی کارکنوں کے سامنے ایک بہت سخت مرحلہ آتا ہے۔ جب انھیں شہرت حاصل ہو جائے اور کچھ اختیارات بھی مل جائیں تو ہر قسم کے ضرورتمند ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں کوئی اپنے لڑکے کے لئے نوکری چاہتا ہے، کسی کی ترقی کا سوال ہے، کسی پر کوئی الزام لگا دیا گیا ہے اور اُس کی ملازمت خطرے میں ہے۔ کہیں مذہبی تعصّب کی وجہ سے زیادتی ہوتی ہے، کہیں ذات پات کا سوال کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر کسی فرد یا گروہ کے ساتھ زبردستی ہوتی ہے پولیس نے بلا وجہ کچھ لوگوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ کہیں فساد ہو گیا ہے اور بجائے شر پسند عناصر کی خبر لینے کے، صلح جو اور امن پسند اور بے گناہ آدمیوں کو دھر لیا گیا ہے۔ یہ سب ہمارے دَور کی حقیقتیں ہیں مولانا کو ان سب سے سابقہ پڑتا تھا۔ ہر وقت لوگ انہیں گھیرے رہتے تھے۔ مولانا کا دفتر گلی قاسم جان دہلی میں تھا۔ ان کا سارا وقت دفتر ہی میں یا مختلف کاموں، تقریبوں یا جلسوں میں صرف ہوتا تھا۔ رات کو دیر سے گھر جاتے تھے۔ کوئی اشد ضرورت ہوئی تو گھڑے ہو آتے، اُن کی ذاتی زندگی گویا تھی ہی نہیں۔ سارا وقت پبلک کے کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ وہ ہر ضرورتمند سے خود ملتے، اس کی ضرورت رفع کرنے کی پوری کوشش کرتے۔ خط سے کام چل جاتا تو خط لکھتے۔ ملنا ضروری ہوتا تو مل آتے۔ وفد لے جانے کا مسئلہ ہوتا تو وہ بھی ترتیب دے لیتے۔ کہیں کوئی فساد یا ہنگامہ ہوا اور مولانا کو خبر ملی تو کیسا ہی ضروری کام کر رہے ہوں چھوڑ چھاڑ کر پہنچتے تھے۔ مصیبت زدہ لوگوں سے ملتے، ان کو تسکین دیتے اُن کی دیکھ بھال کرتے اور حفاظت کرتے۔ اس سلسلے میں بڑے سے بڑے افسروں میں مباحثہ، جھگڑا سب ہی کچھ کرتے رہتے تھے۔ پارلیمنٹ میں نہایت صفائی سے، نہایت دلیری سے، نہایت بے باکی اور بے خوفی سے سچی بات کہتے۔ مگر اُن کا کمال یہ تھا کہ کسی کے ظلم یا زیادتی کی وجہ سے اُن کے بنیادی عقائد میں کبھی فرق نہ آیا تھا۔ کچھ مسلمانوں کے ساتھ اگر کچھ ہندوؤں نے زیادتی کی تو انھوں نے اُس پر برملا اظہار خیال کیا اور متعصب و تنگ نظر ہندوؤں کو بُرا بھلا کہا، مگر اپنے قومی نقطۂ نظر کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جہاں فرقہ پرستی اور علٰحدگی کا جذبہ دیکھا، اُس پر سخت نکتہ چینی کی۔ کچھ لوگوں کو پاکستان جانے کے لئے پرمٹ ملنے میں دشواری ہوئی، مولانا نے دور کرا دی۔ جو لوگ وہاں سے واپس آئے، اُن کے مکان اُن کو واپس دلوانے کے لئے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی۔ عموماً انہیں کامیابی ہوئی۔ ہر چیز ایک آدمی کیسے کرا سکتا تھا۔

مجھے اکثر یہ خیال آتا تھا کہ مولانا کا بہت سا وقت چھوٹی موٹی باتوں میں سفارشوں میں گزر جاتا تھا اور بڑے کاموں کے لئے جن کے لئے وہ خاص طور سے موزوں تھے، وقت نہیں نکلتا تھا۔ کئی دفعہ تنہائی میں ان سے اس مسئلہ پر بات چیت ہوئی۔ میں نے اُن سے اصرار کیا کہ قوم ہی کی خاطر، بڑی باتوں کے لئے وقت زیادہ نکالئے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو چھوڑ دیئے۔ اپنی صحت اور آرام کا خیال کیجئے۔ تاکہ زیادہ عرصہ تک آپ وہ کام انجام دے سکیں جو صرف آپ ہی کر سکتے ہیں۔ مولانا مجھ سے متفق ہو جاتے تھے مگر اس بات پر عمل نہیں کر سکتے تھے اس میں تھوڑی سی بے مروتی کرنا پڑتی ہے اور وہ مروت کے پتلے تھے۔

ہماری قوم اپنے اچھے آدمیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی۔ محبت کا اظہار یا تو دعوتوں کی بھرمار سے ہوتا ہے یا وقت بے وقت گھنٹوں ایسے مسائل پر تبادلۂ خیالات سے جن پر پہلے سے غور نہیں ہوا ہے اور جن کے متعلق کوئی ذاتی تجربہ نہیں ہے صرف ایک جذبہ ہے پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بات ہندوستان کے مستقبل، مسلمانوں کے عروج و زوال اور سیاسیات کے نشیب و فراز سے شروع ہوئی اور بہت دیر کے بعد اس مبتدا کی خبر یہ نکلی کہ کسی ہندو افسر نے محض تعصب کی بنا پر کسی بیچارے مسلمان کو معطّل کر دیا ہے اب مولانا اس

بات کی تحقیقات کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ افسر متعصب نہ تھا، یہ صاحب ہی گئے گزرے تھے۔ ایسی بھی مثالیں سامنے آئیں جہاں لوگ اپنے حق سے زیادہ مانگتے تھے اور نہیں ملتا تھا تو تعصب اور تنگ نظری کی دُہائی دیتے تھے۔ تعصب اور تنگ نظری خاصی عام ہے اور اچھی ہندو ہوں یا مسلمان عموماً اس سے بلند نہیں ہو سکے ہیں۔ ہاں اچھے آدمی ہر گروہ اور جماعت میں مل جائیں گے انھیں کے دم سے ہمارا بھرم قائم ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ حقیقی اور ٹھوس کام کرنے والوں کو اس لئے وقت نہیں ملتا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں لوگ الجھا لیتے ہیں۔ مولانا کی بڑائی یہ ہے کہ ان میں گرفتار رہنے کے باوجود ہمیشہ بڑی باتوں پر نظر رکھتے تھے اور اُن کے لئے کوشش بھی کرتے رہتے تھے۔

مولانا بڑی دلنواز شخصیت کے مالک تھے اور اُن میں بڑی وضعداری تھی۔ وہ جن لوگوں سے محبت کرتے تھے، اُن کے لئے بہت کچھ کرتے تھے۔ جن لوگوں سے زیادہ لگاؤ نہ تھا، اُن کے ساتھ بھی ایک باوقار رشتہ تھا۔ وہ دو سال سے ہماری اگزکٹیو کونسل کے ممبر تھے۔ ایک دفعہ ایک مسئلہ پر میرا اُن سے سخت اختلاف ہوا۔ میرے جو جی میں آیا میں نے کہا۔ مولانا نے بھی خلافِ معمول نہایت تند و تیز لہجے میں تقریر کی۔ میٹنگ کے بعد باتیں ہونے لگیں تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ بات وہیں ختم ہو گئی۔ میرا اور مولانا کا رشتہ اور تعلق جو محبت کی بنا پر تھا بدستور رہا۔ ایسے عالی ظرف لوگ سیاست کے اس کارزار میں کم دیکھے جاتے ہیں۔

مولانا اس پر اکثر افسوس کرتے تھے کہ قومی کاموں اور عملی مسائل نے اُن سے تصنیف و تالیف کا محبوب مشغلہ چھڑا دیا۔ کون جانے کون خسارے میں رہا اور کون فائدے میں۔ علم و ادب کے نقصان اور زندگی و سیاست کے نفع کو کیا ایک میزان میں تولا جا سکتا ہے۔ یہ موقع اس پر بحث کرنے کا نہیں ہے۔ ہاں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ مولانا نے اپنے خلوص اور عمل سے خدمت کی جو روایت قائم کی، اُسے عبادت میں شمار کرنا چاہئے۔

مولانا علماء کی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ اس برادری کی شاندار خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے۔ مگر اس برادری کے بہت سے افراد کا وقت ایک دوسرے کی تکفیر، چھوٹی چھوٹی باتوں پر ذہنوں اور دلوں میں دیواریں بنانے اور وصل کی بجائے فصل کی طرف لے جانے میں صرف ہوا ہے۔ مولانا کی شان دوسری تھی، وہ اُن ہندوستانیوں میں سے تھے جو مسلمان ہونے پر کبھی شرماتے نہیں، اُن مسلمانوں میں سے تھے جنہوں نے ہر حال میں قومی مقاصد کو پیش نظر رکھا اور اس پر فخر کیا۔ وہ پرانی وضع کے، پرانی نسل کے، پرانی چال کے، سیدھے سادے آدمی تھے۔ مگر نئے خیالات، نئے تقاضوں، نئی ضروریات سے انھوں نے آنکھیں کبھی بند نہیں کیں۔ ہر جماعت اور گروہ میں اُن کی عزت کرنے والے اور اُن سے محبّت کرنے والے موجود تھے۔ انھوں نے جس طرح ایک وضع، ایک دھن، ایک لگن کے نشے میں زندگی گزاری اُسی طرح مَوت کا بھی نہایت وقار اور تحمل سے استقبال کیا، وہ تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں مگر جسے بھی انہیں دیکھنے، اُن سے ملنے، اُن کے کچھ قریب آنے کا فخر نصیب ہوا ہے، وہ اُن کو بھلا نہیں سکتا اور نہ ان قدروں کو نظر انداز کر سکتا ہے جن کے وہ علمبردار رہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب۔ صدر انجمن ترقی اردو۔ حیدر آباد دکن۔

اب سے تقریباً دس سال پہلے جمعیۃ العلمائے ہند کا سالانہ جلسہ حیدر آباد میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں اردو کے تعلق سے جو قرارداد مرتب کی گئی تھی، اُسے کھلے اجلاس میں پیش کرنے کا کام بحیثیت سکریٹری انجمن ترقی اردو حیدر آباد میرے سپرد تھا۔ اس موقعہ پر مجھے پہلی مرتبہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔ اور پھر یہ نیاز مندی کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔

گذشتہ دسمبر میں مولانا حیدر آباد تشریف لائے تھے۔ اُس وقت یہاں آندھرا پردیش اردو کانفرنس کے اجلاس ہو رہے تھے۔ میری درخواست پر مولانا اردو ہال تشریف لائے اور تھوڑی دیر کے لئے اجلاس کو مخاطب کیا۔ اُس وقت کسی کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ ہمارا یہ عظیم رہنما اِس کے بعد پھر کبھی حیدر آباد نہیں آئے گا۔

مولانا کی زندگی عمل پیہم کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ اوّلاً جد و جہد آزادی میں اور تقسیم کے بعد مصیبت زدہ مسلمانوں کے مسائل حل کرنے میں انہوں نے اپنی حیات کا تقریباً دو تہائی حصّہ صرف کر دیا۔ اور اس ساری تگ و دو میں اپنی ذات کے لئے کچھ بھی حاصل نہیں کیا۔ ایثار و بے غرضی کی ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی۔

مولانا ہمیشہ قومی نقطۂ نظر کے حامی رہے۔ لیکن ان کا یہ نقطۂ نظر مظلوم مسلمانوں کی حمایت کرنے میں مانع نہیں ہوا۔ آزادی کے بعد صرف اُنہی کی ذات گرامی ایسی تھی جس کی بدولت حکومت کے ایوانوں میں مسلمانوں کے حقیقی احساسات و جذبات کی ترجمانی ہوتی تھی۔ اب اُن کی جگہ لینے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

مسافرانِ حرم کیلئے مجاہد ملتؒ کی مساعی جمیلہ

الحاج احمد غریب صاحب
ممبر پورٹ حج کمیٹی بمبئی سکریٹری انجمن خدام النبی
مینیجنگ ٹرسٹی محمد حاجی صابو صدیق مسافرخانہ بمبئی

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے ہندوستان کے مسلمانوں کی جو خدمات انجام دی ہیں، ان کی ایک شاخ مذکورہ بالاعنوان ہے۔ حرمین شریفین کے مسافروں کے لئے ان کی خدمات اظہر من الشمس ہیں خصوصاً سنٹرل حج کمیٹی جو ایک مشورتی ادارہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی از سرنو تعمیر کرنا اور اس میں عملی روح پھونکنا یہ صحیح معنوں میں مولانا مرحوم کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا

حرمین شریفین۔ حجاج۔ مسافرخانہ۔ جہازوں کے آنے جانے کے پروگرام۔ حجاج کے آرام و آسائش کی باتیں، ہوائی جہاز کے مسائل۔ بمبئی اور جدہ کی بندرگاہ پر حجاج کے سامان کسٹم، مزدور جگہ وغیرہ مسائل، حرمین پر ہندوستانی رباطوں، مسافرخانوں کے قضیے۔ سعودی عرب میں ہندوستانی سفارت خانے کے امور۔ جہازران کمپنی۔ دہلی میں وزارت خارجہ کے متعلق امور حج کی چھان بین۔ حجاج کے ساتھ لے جانے اور لانے کی اشیاء پر غور و فکر۔ حجاج کے ساتھ لے جانے کی رقم، جہازوں میں حجاج کے کھانے اور جگہ کی تکالیف کا احساس، مسافرخانہ بمبئی میں حجاج کو آرام پہنچانے کی فکر اور ان کے علاوہ اسی طرح کے آئے دن سامنے آنے والے حجاج کے مسائل و معاملات میں مولانا کو عملی اور دائمی دلچسپی رہا کرتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا ان ہی کاموں کے لئے وقف ہیں حالاں کہ جیسا اوپر کہا گیا یہ ان کی بیش بہا خدمات کی ایک شاخ تھی۔ اور ان کی خدمات کا صرف ایک رُخ تھا۔ کیوں کہ وہ تو ہندوستانی مسلمانوں کے چھوٹے بڑے کام کرنے میں آگے آگے رہتے تھے اور ان کو کامیابی کے ساتھ انجام بھی دیا کرتے تھے۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ تانہ بخشد خدائے بخشندہ۔

حجاج کے کاموں سے مجھے تقریباً تیس سال سے قرب رہا ہے اور یہ میدان ایسا ہے کہ جس میں وہی شخص کامیابی کے ساتھ پار اتر سکتا ہے جس کو ان اجری الا علی اللہ پر یقین کامل ہو۔ اس میں شہرت اور ناموری قریب نہیں آتی۔ بہت دور سے اس کا واسطہ پڑتا ہے۔ یہ میدان سیاست سے علیحدہ رہا۔ اور جب تک علیحدہ رہا اس میدان میں مسلمانوں کی یا یوں کہیئے کہ حجاج کی خدمت کا تانتا لگا رہا۔ اب اس میدان کو بھی سیاسی اکھاڑا بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس میدان کو اپنے حفظ و امان میں اور پناہ میں رکھے۔ انجمن خدام النبی بمبئی کی حج اور حجاج کی خدمات کا سلسلہ ۱۹۱۲ء سے شروع ہوا اور اب تک الحمد للہ جاری ہے۔ درمیان میں ایک دور اس کے مٹانے کی خواہش رکھنے والوں کا بھی آگیا۔ اس وقت مولانا مرحوم ہی تھے جنھوں نے دکھلائے جانے والے سیاہ رُخ کو ہی نہیں دیکھا بلکہ اس کے سفید رُخ کو بھی دیکھنے کی کوشش کی اور جب ان کو اطمینان ہوگیا تو پھر اس کی حمایت میں پوری قوت لگادی۔ یہ جرأت و ہمت افزائی بہت شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے۔

ان کے ساتھ کام کرنے میں ایک لطف محسوس ہوتا تھا۔ کیوں کہ کام کرنے والوں کو یہ اطمینان رہتا تھا کہ ان مسائل کو حل کرتے ہوئے اگر حکومت کا کوئی شعبہ یا وزیر مقابلہ پر آ جائے گا تو مولانا اس کا مقابلہ کریں گے۔ جو ہر لیڈر نہیں کر پاتا۔ ان کا حال تو یہ دیکھا کہ پنڈت جواہرلال نہرو سے قریبی تعلقات ہونے کے باوجود وہ ان کے ساتھ بھی لڑنے پر آمادہ ہو جاتے جہاں حجاج کا معاملہ سامنے آجاتا۔

ایک واقعہ کا مجھے ذاتی علم ہے کہ وزارت خارجہ کے ایک بڑے عہدہ دار کے ساتھ ان کی جھڑپ ہوگئی تھی اور اس کا علم جب پنڈت جی کو ہوا تو وہ بھی خاموش ہو گئے تھے

حجاج کے لئے جب انکم ٹیکس کلیرنس سرٹیفیکیٹ کا معاملہ درپیش ہوا اور ان کی بمبئی کی تشریف آوری کے وقت ان کے گوش گزار یہ بات میں نے کی تو بے چین ہوگئے اور اس کام کے پیچھے لگ گئے تا وقتیکہ یہ سرٹیفیکیٹس رد کر دیئے گئے۔

سنٹرل حج کمیٹی میں میٹنگ میں بطور ممبر اور صدر ضرور شریک ہوتے اور ایک وقت تو ان کو غیر حاضر رکھنے کے لئے تاریخ بھی بدلنی پڑی تھی۔ جس میٹنگ میں وہ شریک نہیں ہوتے تھے اس میں خلا نظر آتا تھا۔

ان کی بمبئی کی ایک حاضری میں ان کو حجاج سے خطاب کرنے کے لئے گزارش کی گئی جو باوجود کم فرصت کے انھوں نے بصد شوق قبول فرمائی اور حجاج کو بہت سی کام کی باتیں بتلائیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ان کا خاص موضوع ہے۔ تقریر کے اختتام پر ایک حاجی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بہت کم باتیں آپ نے بتلائی ہیں تو حاجی کو خوش کرنے کے لئے انھوں نے سیرۃ النبی پر ایک گھنٹہ تک ایسی تقریر کی کہ لوگوں کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جو بھی موضوع ہو اس پر وہ بلا جھجک بہت اچھی تقریر کر سکتے تھے اور حجاج کے معاملہ میں تو گویا ایک مخصوص انداز تھا جو سیرۃ کی تقریر میں ان کا انداز رہتا تھا۔

جدہ کے سفارت خانہ کے متعلق جب میں نے شکایات پیش کیں تو سن کر ان کو فوراً مان نہیں لیا بلکہ اس وقت کا انتظار کرتے رہے کہ بذات خود جا کر ان شکایات کی تحقیقات کریں۔

خدام النبی نے جمعیۃ علما ہند کے ساتھ پورا تعاون کر کے بمبئی میں دینی تعلیمی کنونشن کرنے کا فیصلہ کیا۔ صرف مولانا مرحوم و مغفور کی ذات تھی جس نے ناچیز کے ساتھ وقتی اور فروعی اختلافات کے باوجود اخلاقی طور سے اس پر مجبور کیا کہ وہ اس کام کی ذمہ داری لے اور الحمدللہ کہ جو ذمہ داری مولانا مرحوم نے دینی تعلیمی کنونشن کے سلسلہ میں عائد کی اسے پوری حد تک کامیابی کے ساتھ اس ناچیز نے ادا بھی کی۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مولانا مرحوم کی ایک ہی بات نے سارے معاملات کو رفع دفع کر دیا، اور وہ بات یہ تھی کہ "باہمی اختلافات اپنی جگہ پر ہیں۔ اس وقت اس کام میں ہمارا ساتھ دیں۔ بعد میں بیٹھ کر گفتگو کر لی جائے گی۔

حجاج کے کام سے جب بھی بمبئی تشریف لائے تو مجھ جیسے ناچیز کارکن سے بغیر ملے ہوئے نہیں گئے اگر سنٹرل حج کمیٹی کے ایجنڈا میں کوئی اہم بات ہوتی تو میٹنگ سے قبل ملاقات کر لیتے۔ ان ہی مسافران حرم کے لئے کئی مرتبہ یہ مشورہ بھی ہوا کہ میں ان کے ساتھ حج کے موسم کے علاوہ وقت میں بادشاہ سعود کے یہاں ایک وفد کی صورت میں جاؤں اور حجاج کی جو شکایات حکومت سعودیہ سے متعلق ہیں ان کے بارے میں بادشاہ سعود سے براہ راست گفتگو کی جائے۔ مگر اس کا کوئی موقع نہیں آیا کہ ہم دونوں اس کام کو انجام دیں۔ حالاں کہ مولانا مرحوم نے اپنی مصروفیات کے باوجود مجھ سے یہ کہہ دیا تھا کہ تم جب بھی کہو گے میں ساتھ چلنے کو تیار رہوں۔

حجاج کے ایک ایسے مخلص خادم کی میت پر مسافران حرم کے دل رنج و غم سے بھر نہ جائیں تو اور کیا ہو۔ حجاج اور ان کے خدام کے لئے ان کی وفات کافی پریشانی کا باعث بن گئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنی رہے گی۔ کیوں کہ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بمبئی میں حجاج کے لئے محمد حاجی صابو صدیق مسافر خانہ اپنی نوعیت کا ایک ہی بلکہ یوں کہئے کہ دنیا میں ایک ہی مسافر خانہ ہے۔ جب بھی کسی کام سے بمبئی تشریف لاتے تو مسافر خانہ میں ضرور ایک وقت حاضری دیتے اور اوپر کی منزل تک خود چڑھتے اور جو اصلاحات سمجھ میں آتیں وہ مجھ تک ضرور پہنچاتے۔ اسی طرح خدام النبی کے دفتر میں ضرور تشریف لاتے اور کارکنان سے مل کر خوش ہوتے جیسا اوپر کہا گیا ہے کہ جب خدام النبی کو دنیا کے سامنے غلط پیش کیا جا رہا تھا اور حالت یہ تھی کہ

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

ایسے حال میں مولانا کی ذات تھی کہ مولانا نے خدام النبی کی حمایت میں اپنے آپ کو پیش کیا اور یہاں تک کوشش کی کہ اس کے سکریٹری کو حج کمیٹی کی صدارت دی جائے۔

مولانا کے ساتھ بعض غلط فہمیوں کی بنا پر میرے تعلقات بہت گہرے نہ تھے، مگر اس زمانہ میں کئی

جب حجاج کا سوال پیش آیا یا ان کے متعلق کوئی شکایت پیدا ہوئی تو وہ فوراً ایسے گھل مل جاتے تھے جیسے ہم دونوں کے تعلقات بہت گہرے، بہت قدیم اور بہت ہی قریب کے ہیں

پروردگار عالم حرمین کے بے شمار مہمانوں کے طفیل میں ان کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے ان کی قبر کو منور کر دے۔ ان کی خدمات کو قبول فرمائے۔ ساتھ ہی ہندوستانی مسلمانوں کو اس قحط الرجال کے دور میں مولانا مرحوم جیسے بے باک و بے لاگ، جری و فہیم رہبر عطا کرے۔ پس ماندگان کو صبر جمیل دے۔ ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے والا نعم البدل مرحمت فرمائے۔ مسلمانوں کو ہمت و توفیق سے نوازے اور سچا اور عملی مسلمان بنا دے۔

وَمَا ذَالِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْز
اللّٰھُمَّ اغفر لہ۔ وارحمہ رحمۃ واسعۃ
برحمتک یا ارحم الراحمین

مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم

شری ایس، پی سنہا ایڈووکیٹ سپریم کورٹ
سابق جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ

مجھ سے یہ فرمائش کی گئی ہے کہ میں مولانا مرحوم کے متعلق اپنے تاثرات اور مشاہدات پیش کروں یہ بہت مشکل کام ہے۔ میں اپنے کو اس قابل نہیں پاتا۔ دہلی آنے کے بہت عرصہ کے بعد مولانا سے تعارف ہوا۔ میری معلومات بہت محدود ہیں۔ لیکن ارشاد کی تعمیل بھی بہت ضروری ہے۔

انگلستان کے صف اول کے ایک شاعر ٹینسن TENNYSON نے اپنے ایک دوست ہیلم HALLAM کی وفات پر ایک بے مثل نظم تصنیف کی۔ اس کے عنوان کا مفہوم یہ ہے۔

دنیا نے ہیلم کا سوگ منایا اس سے میرے دل کا
بوجھ ہلکا نہیں ہوا۔ وہ اپنی جگہ پر ہے

ایسے ہی کچھ میرے بھی تاثرات ہیں۔

ملک اور قوم نے مولانا کی وفات پر سوگ منایا
یہ ان کا فرض تھا۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوا

میری پہلی ملاقات مولانا سے ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔ اس کے بعد اکثر ملاقاتیں ہوئیں ۱۹۴۷ء کے محشر انگیز زمانہ میں جو خدمات مولانا نے ادا کی تھیں ان کا تذکرہ میں سن چکا تھا۔ ان کی عظمت میرے دل میں پہلے ہی سے تھی۔ قریب آنے پر وہ عظمت اور بڑھ گئی۔ مولانا انگریزی نہیں جانتے تھے، لیکن سیاسیات خوب سمجھتے تھے۔ سیاسیات سمجھنے والے تو بہت ہیں لیکن ایثار اور قربانی کا جذبہ کتنوں میں ہے! شاید لاکھوں میں ایک یا دو ہیں۔ مولانا ان خوبیوں کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔

قانونی مسائل میں وہ اکثر مجھ سے مشورہ لیتے تھے۔ آخر میں تو ان کا کرم اس قدر بڑھ گیا تھا کہ ان مسائل پر میری رائے ان کی نظروں میں فیصلہ کن ہوتی تھی۔ ہر شخص کی مدد کرنا۔ دوسرے کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھنا۔ یہ باتیں تو میں مولانا میں برابر دیکھتا تھا۔ اکثر میں نے اپنے مضامین انگریزی اور اردو میں مولانا کی تعریف کی۔ لیکن ۱۹۶۱ء میں جب بھوپال، جبل پور، ساگر وغیرہ میں قیامت خیز واقعات ہوئے۔ اس وقت میں مولانا کی ہمت، استقلال اور جذبۂ انسانیت کو دیکھ کر حیران ہوگیا۔

اس وقت انھوں نے اپنے کو دامے درمے سخنے میں قربان کر دیا۔ جبل پور سے لوٹنے کے بعد ایک بدحواسی کے عالم میں انھوں نے مجھ سے ساری کیفیت ٹیلیفون پر بیان کی، مجھ سے پوچھا جبل پور جا کر پیروی کروگے اور یہ بھی کہا کہ "عنایت ہوگی"۔ میں نے جواب دیا "عنایت کس بات کی، یہ تو میرا فرض منصبی ہے"۔ یہ جواب سن کر میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ انھوں نے یہ فرمایا کہ "مجھ کو یہی امید تھی"۔

اس کے بعد انھوں نے جو کارہائے نمایاں کئے وہ دنیا جانتی ہے۔ لیکن ان واقعات نے سخت پیچیدگیاں پیدا کردی تھیں۔ ایک طرف ہر مسلمان کے دل میں خوف وہراس اور احساس کمتری پیدا ہوگیا تھا یہ ملک کے لئے بڑے خطرے کی بات تھی۔ دوسری طرف ہندو مہاسبھا جن سنگھ راشٹریہ سیوک سنگھ میں یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ اس ملک میں اقلیتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر کاٹجو نے اپنی تحریر، تقریر، اپنے طرز عمل سے اس خیال کو تقویت پہنچائی۔ اس آگ کے پھیلنے کا سخت اندیشہ ہوگیا تھا۔ سچیدرا جوشی۔ سوشیلا نیر۔ انیس قدوائی نے موقع پر جاکر اس آگ کو بجھایا۔ مولانا کا ہاتھ بٹایا۔ پرائم منسٹر نے ان واقعات کی سخت مذمت کی، بار بار کی۔ لیکن مسلمانوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ مجموعی طور پر مرکز نے اپنی ذمہ داری پورے طور پر محسوس نہیں کی اور اپنا فرض ادا کرنے میں قاصر رہا۔ یہ وقت بہت نازک تھا، مولانا کو اس وقت مسلم کنونشن Muslim Convention

کا خیال پیدا ہوا۔ مسلم کنونشن کو اس وقت ایک بُرا خیال کیا گیا۔ اکثریت کے صرف انھیں لوگوں نے نہیں جو ہمیشہ اور ہر موقع پر مسلمانوں کے خلاف رہتے ہیں، بلکہ بہت سے آزاد خیال لوگ بھی اس کے خلاف تھے، یہی نہیں بلکہ خود مسلمانوں میں کچھ ایسے لوگ تھے جو اس کے سخت مخالف تھے۔ لیکن مولانا کی منشا دوسری تھی، وہ ایک پلیٹ فارم بنانا چاہتے تھے جس پر سب مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر فرقہ واری کے دائرہ میں محدود رہ کر اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کریں۔ احساس کمتری جو ملک کے لئے خطرۂ عظیم ہے دل سے نکال دیں۔ دوسری طرف اکثریت اور حکومت کو پوری طرح یہ محسوس ہو جائے کہ مسلمانوں پر زیادتیاں ہو رہی ہیں ان کو وہی حق اس ملک میں رہنے کا ہے جو اکثریت کو ہے اب ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا ہے۔

مولانا نے مجھ کو اپنے خیالات سے مطلع کیا۔ میں نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔ اردو اخبارات میں میں نے متعدد مضامین لکھے۔ لیکن میں نے اس کو کافی نہیں سمجھا انگریزی کے ایک صف اول کے اخبار کی تائید ضروری تھی۔

شکر ہے کہ ہندوستان ٹائمز نے مجھ سے اتفاق کیا اور میرے مضامین چھاپے۔ آج مولانا نہیں ہیں۔ لیکن وقت نے ان کی رائے کو صحیح ثابت کر دیا۔ مسٹر لال بہادر شاستری نے خود تسلیم کیا کہ مولانا کی رائے صحیح تھی۔ آج مسلم کنونشن کو بُرا کہنے والا کوئی نہیں ہے۔ مسلمانوں کے لئے کنونشن نے آئندہ کے لئے ایک صحیح راستہ کھول دیا۔

محنت، جانفشانی، بے پناہ دوڑ دھوپ کا مولانا کی تندرستی پر سخت اثر ہوا شدید مواجس کا اندیشہ تھا۔ لیکن جب تک صاحب فراش نہیں ہو گئے مولانا ہر جگہ موجود تھے۔ میرٹھ، چندوسی، مرادآباد، علی گڑھ ہر جگہ۔ میری قطعی رائے ہے کہ مسلم یونیورسٹی پر اگر مجموعی طور پر کوئی آنچ نہیں آئی تو بہت کچھ مولانا کے اثر اور اقتدار کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر تری گنا سین اور مسٹر دتار نے جو تقریریں علی گڑھ میں کیں۔ ان کا طرز عمل۔ خود یونیورسٹی کے جو فروش گندم نما لیڈروں کا طرز عمل۔ ان سب نے ہر مسلمان کے دل میں ایک ہراس پیدا کر دیا تھا۔ لیکن حسب معمول پنڈت نہرو نے اپنے کو بہت اونچا ثابت کر دیا۔ دشمنوں کو جواب مل گیا۔ لیکن دنیا شاید پورے طور پر نہیں جانتی کہ پنڈت نہرو کو صحیح واقعات بتانے، صحیح رائے دینے اور صراط المستقیم پر قائم رکھنے میں مولانا کا کتنا ہاتھ و حصہ تھا۔

یوں تو ہر موقع پر مولانا سینہ سپر ہوتے تھے۔ لیکن دو ایک باتوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ خاص کر اردو کا۔ اُردو ہماری سب کی زبان ہے۔ اُردو ہمارا مشترکہ سرمایہ ہے۔ یہ سب باتیں تو ہمارے دلوں پر نقش ہیں ان کو دہرانا بیکار ہے ہمارے ہی دلوں پر نہیں بلکہ مخالفین کے دلوں پر بھی، چاہے وہ زبان پر نہ لائیں میں چند الفاظ میں یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ آزادی کے بعد سے اُردو کس مشکل دور سے گذری۔ اس پر کیا کیا ظلم ڈھایا گیا۔ مولانا نے کیا کیا خدمات کیں۔

محبان اردو کو یاد ہو گا کہ کچھ ایسے لوگ بھی تھے اور ہیں جو اس کے وجود ہی سے منکر تھے اور ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر سمپورنا نند حالاں کہ شاید اس کو لوگ نہیں جانتے کہ وہ خود بھی ایک نہایت اچھے اُردو کے شاعر ہیں۔ ایک ایسی جماعت بھی تھی جس کا طریقہ نہایت مخدوش تھا۔ مثلاً مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن۔ ڈاکٹر رگھبیر سیٹھ گوبند داس۔ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا یہ مولانا ہی کا کام تھا۔ یہ لوگ اُردو کو مسٹر جناح اور مسلم لیگ کی زبان کہہ کر بدنام کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کی وجہ سے پاکستان بنا۔ اگر یہ ختم نہ کر دی جائے گی تو اس ملک میں اور بہت سے پاکستان بن جائیں گے یہ کہہ کر ایک ہوا کھڑا کر دیا گیا تھا۔ کہ مسلمان اس سے مرعوب ہو جاوے اور قریب قریب کامیاب ہو گیا تھا۔ لیکن کچھ محبان اردو ایسے تھے جنھوں نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس میں حسب معمول مولانا پیش پیش تھے۔ یوں تو مولانا نے بہت سی تقریریں کیں۔ لیکن سب سے زوردار اور مدلل تقریر وہ تھی جو انھوں نے پارلیمنٹ میں ۲۹ مارچ ۱۹۶۳ء کو کی تھی جس سے مسٹر ٹنڈن، سیٹھ گوبند داس کے الزامات اور مولانا کا جواب پوری طرح سے ظاہر ہو جائے گا۔

(۱) .... دوسروں کو مرعوب کرنے کا یہ ڈھنگ نکالا ہے کہ فوراً ہی پاکستان، مسٹر جناح اور مسلم لیگ تین بھوت سامنے کھڑے کر دیئے جائیں گویا اگر کوئی دوسرا شخص ٹنڈن جی یا سیٹھ گوبند داس کے خلاف بولنا چاہے تو مرعوب ہو کر وہ جرأت ہی نہ کر سکے۔

(۲) اسپیکر صاحب آج اس گمراہ کن طرز عمل کے خلاف پر زور احتجاج کرنے اور یہ بتانے کھڑا ہوا ہوں کہ حق کی آواز ٹنڈن جی کا یہ طریق کار ہرگز نہیں دبا سکتا

(۳) ہم نہ پاکستان کے لفظ سے مرعوب ہو سکتے ہیں اور نہ مسلم لیگ اور مسٹر جناح سے۔ اس لئے کہ ہماری قوم پروری پنڈت نہرو اور دوسرے چوٹی کے لیڈروں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

(۴) اُردو زبان کی تحریک جو یو۔پی میں چلائی جا رہی ہے اس کی مخالفت کرنے والا خود فرقہ پرست ہے۔

(۵) پاکستان اُردو نے نہیں بنایا۔ بلکہ سیاسی بے ایمانوں اور دلوں کے کھوٹ تنگ نظری اور تنگ دلی نے اس کو چار چاند لگائے۔

(۶) تاریخ بتاتی ہے کہ جب یہ مسئلہ کانگریس کے اجلاس میں زیر بحث تھا، اس وقت لیڈروں کی تقریروں کے بعد پہلا شخص میں تھا جس نے پورے زور کے ساتھ کہا کہ بزدلانہ طریقہ پر انگریز کی کرائی ہوئی تقسیم کو قبول نہیں کرنا چاہئے

یوں تو تمام تقریر بہت راست گفتاری۔ دلیل کا کرشمہ ہے۔ لیکن یہ چند ٹکڑے اپنی جگہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا کے کارہائے نمایاں تو ہر شعبہ میں پائے جائیں گے۔ لیکن میں نے اردو کا خاص طور پر تذکرہ اس وجہ سے کیا ہے کہ اب بھی اس کی مخالفت در پردہ کی جا رہی ہے۔ سیٹھ گوبند داس اور ڈاکٹر رگھبیر اب بھی ہیں۔ مسٹر گوپالا ریڈی نے ریڈیو کی مشکل ہندی کو آسان بنانے کی کوشش کی اس پر ایک طوفان برپا ہو گیا۔ حال ہی میں ایک جلسہ بھی اس مقصد سے کیا گیا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بھی اس پر اپنی مہر ثبت کر دی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے اردو کے حق میں پچیس لاکھ کی دستخطی درخواست کو ردی کے ٹوکرے میں پھینک دیا تھا۔ عرضداشت کا جواب بھی انھوں نے نہیں دیا۔ مسلمانوں میں بھی کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو ہندی کی خوشامد میں اردو کے رسم الخط کو ہی مٹانا چاہتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے۔ ان کا جواب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے خوب اور مدلل دیا ہے۔ مولانا کو اس کا کس قدر خیال تھا کہ انھوں نے بستر مرگ سے بھی ایک خط اس کے متعلق چیف منسٹر یو۔پی کو حال ہی میں

لکھا تھا۔ وقت اپنا انتقام لیتا ہے۔ قانون قدرت اپنا کام کرتا ہے۔ جب انگریزی کا پھر بھی سارے ملک میں حملے شروع ہوئے تو سارے ہی ملک میں پریشانی پھیل گئی مدراس نے جس طرح اس کا مقابلہ کیا وہ سب جانتے ہیں۔ مسٹر راج گوپال آچاری نے جو جواب حامیان ہندی کو دیا وہ دہرانے کے قابل ہے۔ انھوں نے یہ کہا:۔

"آپ لوگوں کا طریقۂ عمل جو اُردو کے ساتھ ہوا اور ہے
اس کے بعد کس کو اطمینان ہو سکتا ہے کہ آپ ہماری زبانوں
کو مٹا نہ دیں گے "

یہ ہے جواب قانون قدرت اور یہ ہے انتقام وقت ۔

مولانا کی وفات پر جو تعزیتی جلسہ زیر اہتمام جمعیۃ علماء صوبہ دہلی ہوا تھا اس میں مسٹر گلزار زتشی نے ایک نہایت معرکۃ الآرا نظم پڑھی تھی۔ ایک شعر اس کا مجھ کو خاص طور پر پسند آیا۔

روحیں قاسم اور کفایت کی بھی رنجیدہ ہیں آج
ان کی بزم ناز کا کیا ارمغاں جاتا رہا

مسٹر زتشی کی اجازت سے اس پر ایک گرہ لگانا چاہتا ہوں۔

روحیں گاندھی اور نہرو جی کی رنجیدہ ہیں آج
ان کی بزم ناز کا کیا ارمغاں جاتا رہا

عربی کا ایک مقولہ ہے سیّد القوم خادمھم۔ قوم کا جو خادم ہے وہی سردار قوم ہوتا ہے۔ مولانا نے اپنے کو قوم اور ملک کی خدمت میں مٹا دیا۔ قوم نے ان کو اپنا سردار مانا۔ بستر مرگ پر پڑے ہوئے وہ امروہہ کے الیکشن میں کامیاب ہوئے۔ یہ قوم اور ملک کا ایک سپاہی تھا اور ان کی خدمت میں تھا۔

مضمون طویل ہو گیا چند الفاظ میں اس کو ختم کروں گا۔ انگریزی کے ایک شاعر نے کہا ہے:۔

موت تو سب کو آتی ہے، لیکن ایسا شخص کبھی نہیں مرتا
جو مرنے کے بعد دوسروں کے دلوں میں اپنی یادگار چھوڑ جائے

یہ شعر مولانا کے بالکل حسب حال ہے۔

ایک مورخ نے لکھا ہے کہ مرنے کے وقت نپولین کے لبوں پر یہ الفاظ تھے

My Country میرا ملک Josephence جوزیفنس

France فرانس

جن لوگوں کو یہ سعادت نصیب ہوئی ہو گی کہ وہ مولانا کے قریب آخر وقت میں تھے تو انھوں نے شاید ان کے لبوں پر یہی الفاظ سنے ہوں گے۔

ملک۔ قوم خدا وند ان کو اپنی آغوش رحمت میں رکھنا۔

لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ ان کی یادگار قائم کی جائے۔ ان کے کارنامے ان کی بہترین یادگار رہیں۔

" ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما "

لیکن اگر یادگار کا خیال ہے تو میری رائے میں ایک اول درجہ کا انگریزی روزنامہ ان کی بہترین یادگار رہے گا۔ مولانا کو خود اس کا بے انتہا خیال تھا۔ اگر وہ کچھ روز اور زندہ رہتے تو وہ یقینی طور پر اس کو کر کے دکھا دیتے۔ مجھ سے بارہا انھوں نے اس کا تذکرہ کیا۔ وہ جو کہتے تھے کر کے دکھا دیتے تھے۔ اگر ان کے فرمانوں سے متاثر ہو کر لوگوں نے یہ کام کیا تو میرے بزرگ حشتی کان پوری کا شعر حسب حال ہو گا

موت ہی سے ہو اگر زیست کا پیدا ساماں
ایسی اک مرگ پہ صد زیست ہماری قرباں

اَللّٰہ غفارٌ لہٗ

۱۳۸۲ ھ

الولی، یحیی و یمیت وھو علیٰ کل شیءٍ قدیر

۱۳ ھ ۸۲

قطعہ تاریخ وفات جانکاہ

۱۹ ۶۲

آہ محبّ اسلام مجاہد ملت نور اللہ مرقدہٗ

۱۳ ھ ۸۲

عزم و عظمت کا نشاں فخر زماں جاتا رہا
حفظ رحمٰن نازش اسلامیاں جاتا رہا
سرنگوں ہے لے ثمر اب قصر ملّت کا علم
"دین و ملّت کا عزیز پاسباں جاتا رہا"

نیاز آگیں ہیچمداں ثمر چھپاروی علی گڑھ

۱۹۶۲ء

مسٹر محمد احمد ایڈووکیٹ

پیغامِ جاوداں

۱۹۴۷ء ہندی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک یادگار سال ہے
جو لوگ اس سال کی ہولناکیوں میں ڈوب کر ابھرے وہ کبھی اس سال کو بھول نہیں سکتے۔
۱۹۴۷ء کیا تھا؟ خاک و خون کی ہولی تھی؟ یا موت کا بھنگڑا ناچ تھا؟
جہاں یہ سال ہمارے لئے ایک کڑی آزمائش تھی
وہاں یہ ہماری سخت جانی کا ایک عظیم الشان مظاہرہ بھی تھا۔
زمانہ نے تیر آزمائے ہم نے جگر آزمایا
خنجر نے حلقوم ہی نہیں کاٹے حلقوم نے خنجر کی باڑھ کو بھی موڑ دیا ہے
آزمائش اور مصیبت میں انسان کے جوہر ابھرتے ہیں۔
۱۹۴۷ء کے صبر آزما دور میں ملت کا بھی ایک جوہر ابھرا۔
جتنی زبردست اور کڑی آزمائش تھی اتنا ہی زبردست اور عظیم الشان جوہر ابھرا۔
وہ جوہر تھا ——— حفظ الرحمٰن۔!
صدیوں میں خاک کے پردہ سے ایسا انسان نکلتا ہے۔
چاروں طرف جمود طاری تھا اور حفظ الرحمٰن سراسر حرکت تھا
اور عمل پیہم۔
چاروں طرف بے حسی تھی اور حفظ الرحمٰن احساس کامل تھا
ہر طرف موت چھائی تھی اور وہ صور اسرافیل تھا
ہم گواہ ہیں اس کی بے مثال شجاعت کے!
لوگ پناہ کے لئے دوڑتے تھے۔ اور وہ پناہ گاہوں سے نکل کر میدانوں کی طرف دوڑتا تھا۔
موت سے وہ نہیں ڈرا۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ گرجا۔
جہاں دہشت تھی اور خطرہ تھا وہ وہیں پہونچا۔ اس کے قدم کبھی نہ لڑکھڑائے راہِ حق میں۔

وہ احد اور بدر کے مجاہدوں کے جذبہ سے سرشار تھا
ہم گواہ ہیں کہ اس میں منصور کی شوریدہ سری تھی
اس میں سرمد کی سرشوریدگی تھی۔ اس میں دار و رسن کا خوف نہ تھا۔
اس کی زبان کبھی طاقت سے مرعوب نہ ہوئی۔
مصلحت کوشی اس کی جرأتِ حق کو کبھی مغلوب نہ کر سکی۔
وہ مظلوم کی زبان تھا۔ وہ بانگِ درا تھا اس ملت کا
ہم گواہ ہیں کہ وہ عمر بھر جلتا رہا
شمع سوزاں کی طرح جلتا رہا،
اوروں کو روشنی پہونچانے کے لئے
ہم گواہ ہیں کہ اس عظیم ملک کے جس گوشہ سے اس نے کسی زخمی کی کراہٹ کی آواز سنی، وہ بے چین دوڑا گیا اس کی طرف
جس نے اسے پکارا اسے غافل اور سوتا ہوا نہیں پایا۔
وہ سرتاپا درد تھا اور اضطراب۔
وہ ناآشنا تھا سکون سے اور آرام سے
وہ برق تپاں تھا
ہم کو یاد ہے اس کی بے داغ محبت۔
اس کا خلوص بے پایاں۔ اس نے دولت کے آگے کبھی سر نہ جھکایا۔
وہ جیتا تھا اوروں کے لئے اس نے اپنی زندگی کا ایک دن اپنے لئے نہیں گزارا۔
اس کا سارا ورثہ اس کا پیغام ہے
حفظ الرحمٰن فتح تھی ملت کی موت پر!
کیا موت نے اس پر فتح پائی۔
کیا ظلمت نے شمع سوزاں کو مغلوب کر لیا؟
کیا حرکت کو سکون آگیا؟

جس ملت کے لئے وہ جیتا تھا اور
تڑپتا تھا عمر بھر کیا وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا ؟
کیا کینسر کے ایک زخم نے حفظ الرحمٰن کو ختم کر ڈالا ؟
کیا ایک چنگاری نے آتشکدہ کو پھونکدیا ؟
ہم کو یاد ہیں اس کی بیماری کے آخری دن بھی !
اس دل مضطرب نے اس سے کہا ۔
تیری ساری زندگی پیغام تھی یہ بیماری بھی ایک پیغام ہو!
کینسر کی ٹیسیں — جانکنیاں — لیکن
ہجوم احباب میں اس کی محبت اور مروت بدستور تھی ۔
وہ صبر و رضا کا مجسمہ ہر ایک کو خوش آمدید کہتا تھا ۔
مرض کی انتہائی سختیوں میں اس کی استقامت اور خندہ پیشانی
قائم تھی ۔

اس کی استقامت اور صبر میں جھلک تھی اس صبر و استقامت
کی جو مدینہ کے زمین و آسمان نے چودہ سو برس پہلے دیکھی تھی ۔
موت کے سائے گہرے ہوتے جاتے تھے ۔
لیکن وہ مایوس نہ تھا ——— وہ ملت کے حال سے بھی غافل
نہ تھا ۔ وہ عیادت کرنے والوں سے ملت کے حال کا پُرساں تھا ۔
ہم گواہ ہیں کہ ہم نے آخری دنوں تک اس کی شگفتہ پیشانی
پر موت کا خوف نہیں دیکھا ۔
سانس بے قابو ہو رہا تھا لیکن ہمت سینہ سپر تھی ۔
وہ موت سے لڑتا رہا ، وہ مجاہد تھا ملت کا ۔
حفظ الرحمٰن کی زندگی ایک پیغام ہے ۔
اس کی موت بھی ایک پیغام ہے — ایک پیغام جاوداں ۔

امیر دھامپوری

نوحۂ دل

تم سے بس اتنا ہی اے اہل وطن کہنا ہے
آج ملت کے مجاہد نے کفن پہنا ہے

پیکر خلق و مروت نے کفن پہنا ہے
قوم کے صاحب خدمت نے کفن پہنا ہے
اُمتِ بیضا کی عظمت نے کفن پہنا ہے
آج اک غازی کی میت نے کفن پہنا ہے
آج اک غازیٔ ملت نے کفن پہنا ہے

آج مسلم کی سیاست نے کفن پہن لیا
ولی اللّٰہی طریقت نے کفن پہن لیا
کیا کہوں دیں کی امانت نے کفن پہن لیا
آج احمدؐ کی نیابت نے کفن پہنا ہے
آج اک غازی کی میت نے کفن پہنا ہے

آج ایک اہلِ شریعت نے کفن اوڑھ لیا
آج اک صاحبِ نسبت نے کفن اوڑھ لیا
آج اک اہلِ حقیقت نے کفن اوڑھ لیا
آج اک غازیٔ اُمت نے کفن پہنا ہے
حفظ الرحمٰن کی میت نے کفن پہنا ہے

تھا جسے درد یتیموں کا کفن پوش ہے آج
تھا جو بیواؤں کا ہمدرد کفن پوش ہے آج
فخر ملت وہ جوانمرد ، کفن پوش ہے آج
تم سے بس اتنا ہی اے اہل وطن کہنا ہے
آج ملت کے مجاہد نے کفن پہنا ہے

مولانا حفظ الرحمٰن بحیثیت محسن قوم وزبان

از الحاج۔ خان بہادر۔ الطاف احمد خیری۔ آر۔ اے۔ ایس (ریٹائرڈ)
صدر انجمن ترقی اردو۔ راجستھان جے پور

مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم یوں تو اپنی زندگی کے تقریباً چالیس سال تک ملک وقوم کی بے مثال خدمات انجام دیتے رہے مگر ان کی وہ خدمات جن کی بنا پر مجھے مولانائے مرحوم سے ایک غیر معمولی اور شروع میں غائبانہ محبت ہو گئی تھی۔ وہ تھی ان کی وہ خدمت جو ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے موقع پر انھوں نے مسلمانوں کی کی اور اس کے بعد سے جو مسلسل جد وجہد وہ کرتے رہے اور جس سوجھ بوجھ کے ساتھ انھوں نے مسلمانوں کی رہبری اور رہنمائی کی۔

ملک کے تقاسمہ سے پہلے مولانا حفظ الرحمٰن نے ہمیشہ دو قومی نظریہ کی اور ملک کے تقاسمہ کی مخالفت کی مگر آزادی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی کبھی انھوں نے حق بات کہنے سے گریز نہیں کیا۔ ان کی دو صفتیں مجھے خاص طور سے پسند ہیں۔ ایک ان کا نڈر پن یا بے باکی اور دوسری ان کی حق گوئی۔ وہ کبھی بڑی سے بڑی ہستی سے مرعوب نہیں ہوئے اور باوجود کانگریس پارٹی کے ممبر ہونے کے اور پنڈت جواہر لال نہرو سے خاص عقیدت اور محبت رکھنے کے۔ مولانا کبھی کسی فرد یا پارٹی کی وجہ سے حق بات کہنے سے باز نہیں رہے۔

تیسری بات جو ان میں خاص تھی وہ تھی ارادے کی پختگی۔ ہر بات میں ان کا طریقہ کار تعمیری اور مصلحانہ ہوتا تھا۔ مگر جب کوئی بات اچھی طرح غور وخوض کے بعد طے کر لیتے تھے تو پھر اس پر جمے رہتے تھے

مولانا حفظ الرحمٰنؒ نے جو زبردست عزت اور مرتبہ پایا اور لوگوں کے دلوں میں جو جگہ حاصل کی ظاہر ہے کہ وہ انھوں نے ملک اور قوم کی بے لوث ومخلصانہ اور حقیقی خدمت سے کی۔ مولانائے مرحوم سے لوگوں کو کس درجہ محبت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ مستورات جو گھر میں بیٹھی رہتی ہیں اور جن کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں وہ "الجمعیۃ" پڑھتی تھیں تو سب سے پہلے مولانا کی صحت کا بلیٹن پڑھتی تھیں۔ نیز ۲ اگست کی صبح کو جبکہ مولانا کا انتقال دہلی میں ہو چکا تھا۔ مگر ابھی اعلان نہیں ہوا تھا اس وقت بھی یہاں جے پور میں اور ملک کے ہر شہر میں فجر کی نماز کے بعد مجھ جیسے بے شمار بندگان خدا نے روزانہ کی طرح مولانا کی صحت اور درازیٔ عمر کی دعائیں کیں۔

مولانا مرحوم سے میری ابتدائی ملاقات بھی غالباً اردو کے تحفظ کے سلسلہ میں ہوئی۔ اور اس کے بعد سے ان سے زیادہ تر تبادلۂ خیالات اردو ہی کے بارے میں ہوا۔ مولانا نے کبھی ہندی کی مخالفت نہیں کی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ہمیشہ یہ کوشش کی کہ اردو کو اس کا جائز مقام ملے اور اس کو بھی ملک کی ایک قومی زبان کی حیثیت سے پھلنے پھولنے کا موقع حاصل ہو۔ وہ نہ صرف انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس عاملہ کے ممبر تھے اور اپنے مفید مشورے انجمن کو دیتے تھے۔ بلکہ انجمن کے باہر بھی وہ ہر ممکن طریقے سے اردو کی حمایت کرتے رہتے تھے۔ امریکہ سے اردو کی حمایت میں جو خط انھوں نے اترپردیش کے وزیر اعلیٰ کو اور ملک کے وزیر اعظم کو بستر علالت سے بھیجے وہ غالباً اردو کے لئے ان کی آخری خدمت تھی۔

آزادی کے بعد سے مولانا کی زندگی کا مشن ہی یہ تھا کہ ایک طرف تو ملک ترقی کرے اور ملک میں اتحاد واتفاق ہو وہ اردو کو بھی اتحاد کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں کو بحیثیت ہندوستانی شہری جو حقوق قانوناً حاصل ہیں ان سے فائدہ اٹھانے کا عملاً پورا پورا موقع ان کو ملے اور مسلمانوں کے ساتھ بے انصافیاں اور ظلم وزیادتیاں نہ ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ مسلمان اپنے آپ کو ہندوستان کا ویسا ہی شہری سمجھیں جیسے دوسرے فرقوں کے لوگ ہیں اور ان میں کسی قسم کا خوف وہراس اور احساس کمتری نیز یاس وناامیدی پیدا نہ ہو۔

اس وقت جب کہ مولانا حفظ الرحمٰن کے انتقال کو پندرہ ہی دن ہوئے ہیں، میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ قوم یتیم ہو گئی اور قوم کا کوئی مخلص خادم اور رہبر نہ رہا۔ اور ان کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ مگر ظاہر ہے کہ مولانائے مرحوم کے مشن کو پورا کرنا ہے۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے لوگوں کو آگے بڑھنا چاہئے۔

مولانا حفظ الرحمٰن میری نظر میں

(شری گوپی ناتھ امن لکھنوی)

یوں تو ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں میرٹھ جیل میں مولانا بشیر احمد اکثر مجھ سے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا ذکر کیا کرتے تھے کہ کس طرح وہ ڈابھیل کے مدرسہ کو چلانے کے ساتھ ساتھ جدوجہد آزادی میں حصہ لے رہے ہیں۔ لیکن مولانا سے میری ملاقات ۱۹۳۴ء میں دہلی میں ہوئی۔ جب میں ادارۂ تیج سے وابستہ ہو کر غازی آباد سے یہاں آگیا۔ ٹھیک ٹھیک تو یاد نہیں لیکن رائے بہادر رام کشور کی صدارت میں اردو کے متعلق کوئی جلسہ تھا جس میں تعارف ہوا۔ جب سے مولانا نے دہلی ہی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ اس وقت سے مجھے ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہوتا رہا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جو کہ سیاسی میدان میں اس درجہ حق و صداقت پر قائم ہوں چونکہ مولانا کی کیفیت یہ تھی کہ "نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ" ان کے جو کچھ دل میں ہوتا تھا وہی زبان پر ہوتا تھا حق بات کہنے سے کبھی نہیں جھجکتے تھے۔ اور باطل سے مرعوب کبھی نہیں ہوتے تھے۔ وہ مصلحت جسے مولانا آزاد نے ایمان کی موت کہا ہے کبھی ان کے آس پاس ہو کر نہ نکلتی تھی۔ کبھی کبھی ان کی تلخ نوائی غالب کا یہ شعر یاد دلاتی تھی۔ ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف ؎ آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

کئی جلسوں میں مولانا کو پاکستان بلایا گیا۔ اُن میں سے ایک دو میں میں بھی گیا۔ لیکن مولانا تشریف نہیں لے گئے میں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا۔ کیا کہوں کچھ جی نہیں چاہتا۔ مولانا کا کام بہت مشکل تھا۔ ایک طرف تو جمیعت العلماء کے لیڈر کی حیثیت سے مسلمانوں کے جائز حقوق کی حفاظت کرنا اور دوسری طرف انہیں فرقہ پرستی سے باز رکھنا۔ ماننا پڑے گا کہ یہ دونوں کام مولانا نے بہ درجہ احسن سر انجام دیئے۔

بہ حیثیت مقرر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا درجہ بہت بلند تھا۔ محفل میلاد ہو کہ سیاسی جلسہ کوئی دینی اجتماع ہو یا پولٹیکل کانفرنس ان کی شخصیت چھا جایا کرتی تھی۔ ان کی زبان میں اثر تھا اور ان پر یہ مصرع صادق آتا تھا۔

کسی کی آنکھ میں جادو تری زبان میں ہے۔

میں نے بے شمار جلسوں میں انہیں سنا اور یہی کیفیت پائی۔

محفل میلاد کے کئی جلسوں میں انہیں میرے ساتھ شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ اور جب کبھی ان کے بعد تقریر کرنی پڑی تو میں چند منٹ سے زیادہ نہ بول سکا کیونکہ ذہن میں ان کی تقریر گونجتی رہتی تھی یاد ہے سال یوم غالب پر جب انہوں نے حضرت غالب کے اس مطلع کی تشریح کی کہ "نقش فریادی ہے کس کی شوخئ تقریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا" تو تمام مجمع سے صدائیں بلند ہوئیں خواجہ حسن نظامی صاحب کی رحلت پر درگاہ نظام الدین میں جو تعزیتی جلسہ ہوا اس میں مولانا نے اسی انداز میں تقریر فرمائی جیسے کہ خواجہ صاحب مرحوم کیا کرتے تھے ۱۹۳۸ء میں شری سبھاش بابو کی صدارت میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا تو مولانا نے اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں جس انداز سے اپنی تقریر پیش کی وہ انہیں کا حصہ تھا۔

ایک بار محفل میلاد شریف شروع ہونے سے قبل میں مولانا کے قریب بیٹھا تھا۔ میں نے عرض کی کہ آپ کو جس طرح سیاسی اور دینی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہے یہ بات بڑی مشکل سے کسی کے حصے میں آسکتی ہے مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ مگر امن صاحب اس کا دوسرا پہلو بھی ہے مولویوں کے حلقہ میں مجھے شبہہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ یہ تو سیاسی آدمی ہے۔ اور سیاسی حلقوں میں مجھے ملائے مکتب سمجھا جاتا ہے اسی طرح مولانا بہت سی باتیں بذلہ سنجی کے الفاظ میں کہہ جایا کرتے تھے۔

ایک بار کسی سیاسی جلسہ سے ہم واپس ہو رہے تھے میرے ساتھ میری اہلیہ بھی تھیں۔ مولانا کی جیپ میں بیٹھتے وقت میں نے کہا۔ مولانا آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ کوئی عورت آپ کی جیپ میں بیٹھ جائے مولانا نے جواب دیا میں بھی کون سا ایسا مرد ہوں جو مجھے اعتراض ہوگا۔ مولانا جس انجمن میں رہے اس کو فیض پہنچاتے رہے

گلشن میں سرو فوج میں مثل نشاں رہے
ہم بھی تو سربلند رہے ہیں جہاں رہے

جمیعتہ العلماء کی وہ جان تھے میری آنکھوں کے سامنے بار بار ان کی تصویر آتی ہے میری نظر کے سامنے بار بار وہ نقشہ آجاتا ہے کہ مولانا جمیعت کے دفتر میں بیٹھے ہیں سامنے عقیدتمندوں اور ضرورتمندوں کا ایک جھرمٹ ہے اور مولانا سب کی باتوں کا جواب دے رہے ہیں کسی کے لئے کسٹوڈین کے محکمے کو خط لکھ رہے ہیں کسی کے لئے کسی اور افسر کو۔ اس نوعیت کے خطوط میرے پاس بھی آیا کرتے تھے

یوں تو مولانا جس انتخاب میں کھڑے ہوئے کامیاب ہوئے لیکن امسال پارلیمنٹ میں ان کی کامیابی بڑی حیرت انگیز تھی کیونکہ اپنی بیماری کی وجہ سے وسط جنوری کے بعد اپنے حلقہ انتخابات میں نہ جا سکے۔ ایک طرف فرقہ پرست ہندوؤں سے مقابلہ تھا تو دوسری طرف فرقہ پرست مسلمانوں سے۔ مولانا کی غیر حاضری کے باوجود ان کی حمایت میں بڑے شاندار جلسے ہوتے اور ایک مخالف امیدوار

کی ضمانت بھی ضبط ہوگئی جب میں مولانا کو مبارکباد پیش کرنے گیا تو انہوں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک ہندو فرقہ پرست اخبار کا بھی تذکرہ کیا جس نے ان کے حق میں مضامین لکھے تھے۔ میں نے عرض کی حضور یہ حبِ علیؓ نہیں بغضِ معاویہ ہے۔

جواب دیا کچھ بھی ہو جس نے کلمۂ حق کہا ہے اس کا شکریہ تو ادا کرنا ہی چاہیئے۔

یہ تھی مولانا کی ذہنیت یہ تھا ان کا اندازِ فکر۔ صحبت کے قانون بھی اخلاقی قانون کی طرح اٹل ہیں۔ مولانا نے حیثیت کے باہر محنت کی ان کے دروازے ہمیشہ غریبوں اور حاجتمندوں کے لئے کھلے رہتے تھے صبح سے آدھی رات تک کام کرتے رہتے تھے ملک کے مختلف حصوں میں دورے کیا کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی رحلت کے بعد انہی پر مسلمانوں کی نظریں جاتی رہتی تھیں بڑے سے بڑے قومی مسائل کے ساتھ ساتھ انہیں چھوٹی سے چھوٹی باتوں پر توجہ دینی پڑتی تھی۔ کہیں کسی کانفرنس کی صدارت کرنی ہے وہاں کے لوگ دعوت نامے لے کر آئے ہیں کہیں کسی کے مکان پر ناجائز قبضہ ہوگیا ہے وہ کھٹا کر تے پہنچے سامنے کھڑے ہیں مولانا خوش ہو رہے ہیں کہ پہلے میرے پاس کیوں نہیں آئے اسوقت معاملہ بہ آسانی سلجھ جاتا۔ خیر مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے کردوں گا۔

دہلی میں کل ہند اردو کانفرنس ہوئی تو مولانا استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے اور میں سکریٹری۔

مولانا کا خطبہ بڑے معرکہ کا تھا ساتھ ہی ان میں تنظیم کی قوت بھی بلا کی تھی۔ اس کانفرنس کا افتتاح شری جواہر لعل نہرو نے کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی تقریر فرمائی اور اس کے ایک ہفتہ بعد مولانا آزاد سپردِ خاک ہوگئے۔ اب یہ سب داستانیں ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا جسم خاکی ہمارے آگے نہیں بلکہ ان کے کارنامے باقی ہیں۔

سراپا درد و اخلاص

(از: حکیم محمد مختار اصلاحی۔ مدیر مسیحا بمبئی)

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم جنگ آزادی کے ایک بہادر سپاہی، ملک کے ایک مخلص رہنما۔ ملت کے ایک عظیم مجاہد۔ بہترین خطیب، خوش بیان مقرر۔ بلند پایہ مصنف و ادیب، مدبر و مفکر اور اسی طرح کی اور دوسری بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے۔ ان کی تمام صفات میں میرے نزدیک انہیں جو چیز دوسرے رہنماؤں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا "سراپا درد و اخلاص" ہے۔ آزادی سے پہلے دل میں آزاد ہونے کی تڑپ رہی اور آزادی ملنے کے بعد ہمہ وقت یہ غم ستاتا رہا۔ کہ ملک کے لوگ صحیح راستہ پر کیوں نہیں چلتے۔

مولانا کو میں نے دور سے بھی اور قریب سے بھی دیکھا۔ دینی تعلیمی کانفرنس میں۔ بمبئی کے مختلف اجتماعات میں۔ سورت کے تاریخی اجلاس میں اور دہلی کے مسلم کنونشن میں، ہر موقع پر میں نے یہ محسوس کیا کہ مولانا کا اخلاص اور درد نکھر کر ظاہر ہو رہا ہے۔

مسلم کنونشن میں یہ دیکھا کہ جن سے اتفاق تھا انہیں بھی اور جن سے اختلاف تھا انہیں بھی پکڑ پکڑ کر اسٹیج اور اونچی کرسیوں پر بٹھلاتے تھے اور خود اپنے لئے نیچی کرسی پسند کرتے تھے۔ یہی ان کے اونچے ہونے کی دلیل تھی۔ مقصد ایک ہی پیش نظر تھا کہ کسی صورت میں بھی مل بیٹھ کر مسائل حل ہو جائیں۔ یہ کنونشن جس نازک موڑ سے گذرا اور مولانا نے اسے جس سلیقے سے بچایا یہ انہیں کے بس کا کام تھا۔

جب کبھی ملکی و ملی حالات پر ان سے گفتگو ہوتی۔ درد و غم سے بھرا پایا

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

امیرؔ کا یہ شعر خود کے کتنا حسب حال تھا نہیں معلوم! لیکن مولانا کے بالکل حسب حال تھا۔ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا عیسائی ظلم کسی پر بھی ہو مولانا تڑپ اٹھتے تھے اور ہر طرح سے اس کی مدد کرتے تھے۔ بناوٹ و تکلف سے ہمیشہ دور رہے۔ سادہ زندگی اور وضعداری ان کا شعار رہا۔ سیاسی زندگی کے ابتدائی دنوں میں جب بمبئی تشریف لاتے تو حاجی عبداللہ عرب کے مہمان رہتے۔ حاجی صاحب نے جس خلوص و محبت کا ثبوت دیا مولانا کے دل پر بھی اس کا اتنا ہی گہرا اثر رہا۔ مجھے علم ہے کہ مولانا کی شہرت و مقبولیت کے بعد بہت سے لوگوں نے یہاں انہیں اپنا مہمان بنانا چاہا لیکن مولانا نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ حاجی صاحب کو تو میں نے اپنا "مستقل میزبان" بنا لیا ہے اب کسی اور جگہ قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جن سے ان کے اخلاص اور وضعداری کا پتہ چلتا ہے۔

اب ہماری کچھ یہ عادت ہوگئی ہے کہ ہم اپنے عظیم رہنماؤں کی زندگی میں جیسی چاہیئے قدر و عزت نہیں کرتے لیکن مرنے کے بعد چند دن خوب روتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لئے بھول جاتے ہیں۔ یہ عادت ہمیں چھوڑ دینا چاہیئے ملکی و ملی خدمات کے سلسلہ میں مولانا کا ایک عظیم ریکارڈ ہے اس کو فراموش کر دینا بڑی ناسپاسی ہوگی۔ پورے ملک کا یہ فرض ہے کہ جلد ان کی ایک ایسی یادگار قائم کی جائے جس سے آئندہ نسل بھی مولانا کو

آخری قندیل جو بجھ گئی

جناب احمد فاطمی۔ مدیر بھوداں تحریک

مولانا حفظ الرحمٰن کی موت، امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رحلت کے بعد ملک اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا حادثہ ہے۔

ملک کی آزادی کی لڑائی کے دوران ہندوستانی مسلمانوں میں سے ایک ایسی بھی قیادت ابھری تھی جس کی جڑیں مذہب میں تھیں اور جس کے لئے ملک کی آزادی جزو ایمان کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ لوگ جتنے اچھے مسلمان تھے اتنے ہی اچھے ہندوستانی بھی تھے۔ ان کی "مسلمانی" اور ان کی "ہندوستانیت" میں کوئی ٹکراؤ نہ تھا۔ بلکہ پوری ہم آہنگی اور مطابقت تھی۔ وہ جہاں ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق سے آگاہ تھے وہاں مسلمانوں کے فرائض کی طرف سے بھی ان کی آنکھیں اوجھل نہیں تھیں۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید اور ان جیسے دوسرے بزرگوں نے حب وطن اور مسلمان دوستی کی جو ایک روایت قائم کی تھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن اس کی آخری نمایاں کڑی تھے۔ مولانا مرحوم کے انتقال کے ساتھ اس شاندار روایت کی آخری قندیل بجھ گئی!

مولانا حفظ الرحمٰن کو قوم نے مجاہد ملت کا خطاب دیا تھا۔ وہ سچ مچ مجاہد ملت تھے ان کی ساری زندگی جہاد کرتے گذری، جہاد ملک کی غلامی کے خلاف۔ فرقہ پرور مسلمانوں اور ہندوؤں کے خلاف ملک کے دشمنوں کے خلاف! غیروں نے ان کی ذات پر حملے کئے۔ انھوں نے انھیں طعن و تشنیع کا شکار بنایا فرقہ پرور مسلمانوں نے انھیں ہندوؤں کا غلام بتایا۔ فرقہ پرست ہندوؤں نے انھیں فرقہ پرور مسلمان کہا۔ لیکن اس مرد مجاہد کے مضبوط قدم ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی جگہ سے نہیں ڈگمگائے۔ وہ ملک کی غلامی کے دوران انگریز سامراجیہ کے خلاف بدستور سینہ سپر رہے اور ملک کی آزادی کے بعد ملک کے بناؤ کی تدبیروں کی طرف حکومت اور عوام کی توجہ دلاتے رہے وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ ملک صحیح معنوں میں تبھی ترقی کرے گا جب سماج کے کل اعضاء یکساں ترقی کریں گے۔ اور ملک کو ترقی یافتہ بنانے کی تگ و دو میں تمام عناصر کو مساوی حصہ لینا اور کوشش کرنی چاہئے۔ اسی لئے وہ جہاں ایک طرف مسلمانوں کو ملک کی مجموعی زندگی میں برابر کا حصہ لینے اور ترقی کی کوششوں میں پورے طور پر شریک ہونے کے لئے اکساتے رہے وہاں دوسری طرف حکومت کی کوتاہیوں اور فرقہ پرور ہندوؤں کے تنگ نظرانہ خیالات کے مہلک اثرات ڈٹ کر اجاگر کرتے رہے۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ملک کی آزادی کے بعد مسلمانوں کے حقوق کی نگہبانی اور ان کے مفاد کی حفاظت کی سعی و جستجو میں مولانا آزاد کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن سب سے مضبوط ستون تھے۔

ملک کی بہبودی اور بہتری میں انھوں نے اپنی شخصیت کو ضم کر دیا تھا اور اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی وہ اس کی طرف سے غافل نہیں رہے۔ تین زبانوں کے فارمولا بمدد زیر اعلیٰ اترپردیش کے نام امریکا سے جہاں وہ بستر علالت پر پڑے تھے۔ ان کا خط اس کی مثال ہے۔ موت واقع ہونے سے کوئی ایک ہفتہ قبل بھوداں کا یہ خادم مولانا مرحوم کی خدمت میں عیادت کی غرض سے دوبارہ حاضر ہوا تھا اور اس کے دل پر اس بات کا گہرا اثر ہوا تھا کہ ایسے وقت بھی جب کہ موت دروازے پر کھڑی تھی، مولانا کا ذہن ملکی مسائل پر سوچ رہا تھا۔

مولانا مرحوم کے تدبر اور احساس ملی کی عالیہ مثال دلی میں مسلم کنونشن کا انعقاد ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ اس کنونشن کے روح رواں مولانا تھے مسلمانوں کے مسئلے اور ان کی شکایتوں کو منظم اور مربوط ڈھنگ پر ملک اور حکومت کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہی مولانا نے کنونشن کی داغ بیل ڈال دی۔ اس کنونشن کے انعقاد سے پہلے ملک کے ایک طبقے نے بہت شور و واویلا مچایا اور اس کے بعد بعض اپنوں اور پرانے رفیق کاروں کو بھی ان سے غلط فہمی پیدا ہوتی۔ لیکن مولانا مرحوم پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا انھوں نے دونوں محاذوں پر جم کر مقابلہ کیا اور بالآخر وہ بادل چھٹ کر رہا۔

انڈین مسلم کنونشن میں جن لوگوں نے شرکت کی تھی، وہ مولانا مرحوم کے حسن و تدبر کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے اس سے کچھ ہی روز پہلے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے ان فسادوں کی وجہ سے مسلمانوں کے دل دکھی تھے۔ کئی لوگوں کے جذبات مشتعل تھے۔ مولانا کی حکمت عملی یہ رہی کہ کنونشن کے کھلے اجلاسوں میں انھوں نے دل کا بخار اتارنے میں مندوبین کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ لیکن بند اجلاس میں انھوں نے اپنی ساری توجہ اس بات پر مرکوز کر دی کہ مندوبین کے اذہان قومی تقاضوں سے دور نہ جا پڑیں مشتعل ڈیلیگیٹ چونکہ کھلے اجلاس میں اپنے دل کی بھڑاس نکال چکے تھے اس لئے فیصلہ کرتے وقت وہ حضرات بھی مسئلہ کو ٹھنڈے دل دماغ سے سوچنے کی حالت میں آ چکے تھے۔ نتیجۃً کنونشن میں جو تجویزیں منظور ہوئیں ان کی معقولیت ہر گوشہ میں تسلیم کی گئی۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ اگر کھلے اجلاس کی طرح

خدمت کا ایک اعلیٰ نمونہ

مولانا عبیدالرحمن شروانی علی گڑھ

بند اجلاسوں میں بھی اخبار نویسوں کو شریک ہونے کی اجازت دی گئی ہوتی تو تنقید کے بدلے مولانا مرحوم کے تدبر کی توصیف اخباروں میں شائع ہوتی۔

ایک ایسے وقت میں جب کہ عام انتخاب میں ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے غرض مندانہ اصحاب جوڑ توڑ کر رہے تھے۔ مولانا نے مسلم کنونشن کے انعقاد کی تیاری شروع کی۔ ان دنوں دلی کے بعض حلقوں میں یہ عام چرچا تھا کہ آنے والے عام چناؤ میں مولانا کو پارلیمنٹ کے لئے ٹکٹ نہیں ملے گا اور اگر کسی طرح ٹکٹ مل بھی گیا، تو ان کا ہارنا یقینی ہے۔ لیکن مولانا کے سامنے پورے ملک کا مفاد تھا۔ انھیں اس کی ذرہ برابر بھی فکر نہیں تھی کہ انھیں ٹکٹ ملے گا یا نہیں اور ملے گا تو ان کا کیا انجام ہوگا، خوشی کی بات ہے کہ دونوں شبہے غلط ثابت ہوئے۔ انھیں ٹکٹ بھی ملا اور اس کے باوجود کہ اپنی علالت کے سبب اپنے الیکشن میں وہ کوئی کام نہیں کر سکے ان کی بہت ہی شاندار جیت ہوئی۔

مولانا مرحوم کی خاموش اور تعمیری خدمت کا ایک باب جو بہتوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہے جمعیۃ علمار ہند کی قیادت کا ان کا دور ہے۔

آزادی حاصل ہونے کے بعد ملک کی جس ایک جماعت کے ساتھ سب سے زیادہ ناانصافی ہوئی ہے، وہ ہے جمعیۃ علمار ہند۔ دنیا کے کسی حصے کا مولوی ہندوستان کے مولویوں جتنا انقلابی شاید ہی رہا ہو، غالباً ہندوستان کی تنہا مثال ہے، جہاں کے عالم طبقہ نے ملک کی غلامی کے خلاف منظم طور پر حکومت سے مسلسل ٹکر لی ہو۔ اس ملک کی آزادی کی جدوجہد میں شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید بریلوی سے لے کر حسین احمد اور حفظ الرحمن تک یہاں کے علمار کا بڑا حصہ ہے۔ لیکن آزادی حاصل ہونے کے بعد جب یہاں کے مسلمانوں میں سیاسی لیڈرشپ قائم کرنے کا سوال پیدا ہوا، اس وقت کانگریس نے، جس کے دوش بدوش علمار کی اس جماعت نے قربانی پیش کی تھی، جمعیۃ علمار یا نیشنلسٹ مسلمانوں کی لیڈرشپ قائم کرنے کے عوض رجعت پسند مسلم لیگ کے سابق لیڈروں سے ساز باز کر لی۔ چنانچہ آج نئی پیڑھی کو اس کی بھی خبر نہیں کہ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا آزاد، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، مولانا احمد سعید اور بہت سے دوسرے اکابر کی رہنمائی میں جمعیۃ علمار نے ایک طرف مسلمانوں میں ملی اور ملکی شعور بیدار کیا تھا اور دوسری طرف ان کے دلوں میں آزادی کی جوت جلائی تھی۔

جمعیۃ علمار کی قیادت جس وقت مولانا حفظ الرحمن کے حصہ میں آئی اس وقت جمعیۃ علما بجا طور پر شکست امید کے ملال میں گرفتار تھی۔ مایوسی اور ملال کے سبب کئی لوگوں کے سوچ میں تشدد اور انتہا پسندی پائی جانے لگی تھی۔ لیکن یہ مولانا حفظ الرحمن کی ہی قیادت کا کمال تھا کہ انھوں نے نہ تو جمعیۃ علما کو ٹوٹنے دیا اور نہ انتہا پسندوں کے رجحانات کو ایک حد سے تجاوز ہونے دیا۔ ملک کی قومی زندگی پر مولانا مرحوم کا یہ بہت بڑا احسان ہے۔

دنیا کی کوئی کمی ناقابل تلافی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ سچ ہے کہ مولانا حفظ الرحمن کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اسے پوری کرنے والا آج کوئی نہیں ہے۔ مولانا مرحوم کے عقیدت مندوں کی اس دیس میں کمی نہیں ہے ان کے عقیدت مند مولانا کی سجھائی ہوئی واضح راہ اختیار کر کے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کریں، اس سے بہتر مولانا کی دوسری کوئی یادگار نہیں ہو سکتی۔

مولانا مرحوم مغفور کی ابدی مفارقت سے جو خلا ہوگیا اس کے پر ہونے کی شکل نظر نہیں آتی اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم مغفور کو غریق بحر رحمت فرمائے قدرت جس سے جو کام جتنے دن چاہتی ہے لے لیتی ہے مولانا نے مسلسل جد و جہد پیہم عمل اور شبانہ روز محنت بنی نوع انسان کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی ہمت اور توفیق ارزاں فرمائے۔ آمین

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی

ایک سچا ہندوستانی، سچا مسلمان اور اونچے درجہ کا انسان

از پنڈت سندر لال صاحب

سب مذہبوں نے اور خصوصاً اسلام نے آدمی کے دو طرح کے فرائض صاف صاف بتائے ہیں ایک وہ فرائض جو ہر انسان کے اپنے خالق اور پروردگار کی طرف ہیں اور دوسرے وہ جو ہر انسان کے باقی تمام انسانوں اور تمام مخلوق کی طرف ہیں سورہ نساء ۶ میں اللہ نے کہا ہے "اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک مت کرو اور نیکی کرو اپنے والدین کے ساتھ، اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ۔ یتیموں کے ساتھ مسکینوں یعنی ضرورت مندوں کے ساتھ، اپنے اُن پڑوسیوں کے ساتھ جنھیں تم جانتے ہو۔ اور ان پڑوسیوں کے ساتھ جنھیں تم نہیں جانتے یا جو دور کے ہیں اور اپنے پاس کے ساتھیوں کے ساتھ اور راہ چلتوں کے ساتھ جو تمھیں مل جاویں اور اُن سب کے ساتھ بھی جن پر تمھارا اختیار ہے۔ کیوں کہ اللہ ان لوگوں سے پیار نہیں کرتا جو دوسروں کے ساتھ بُرا برتاؤ کرتے ہیں یا جو گھمنڈ کرتے ہیں۔"

اوپر کی آیتوں میں ہمارے دونوں طرح کے فرائض کا صاف صاف ذکر کیا گیا ہے اور دوسرے انسانوں کی طرف ہمارے فرائض میں مذہب یا ملت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔

یہ دونوں طرح کے فرائض کلام مجید میں بار بار اور جگہ جگہ بیان کئے گئے ہیں۔ ایک حدیث اس مضمون کی بھی ہے کہ اللہ اپنی طرف انسان کے فرائض کو خاص صورتوں میں معاف کر سکتا ہے لیکن دوسرے انسانوں یا مخلوق کی طرف فرائض میں کوتاہی کو معاف نہیں کر سکتا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ دوسرے انسانوں کی طرف ہمارے فرائض وقت اور حالات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ اب اگر ہم فی زمانہ دنیا کے ان حالات کی طرف نظر ڈالیں تو دو باتیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس زمین کے قریب پونے تین ارب انسان چھوٹے بڑے بے شمار مذہبوں اور سینکڑوں قوموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ دوسری یہ کہ تمام انسانی قوم کی یگانگت یعنی مساوات انسانی یا اخوت انسانی کو عملی جامہ پہنانے کی طرف دنیا آج جس تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی نظر آرہی ہے تاریخ میں پہلے شاید کبھی نظر نہیں آئی دنیا کے مختلف ممالک میں آنا جانا جتنا آج بڑھا ہوا ہے پہلے کبھی نہیں تھا۔ آج آسانی سے ایک آدمی صبح کا کھانا دہلی میں کھا کر شام کا کھانا۔ نیویارک میں جا کر کھا سکتا ہے۔ چوبیس گھنٹے میں ہم پورے کرہ زمین کا چکر لگا سکتے ہیں جس منزل کی طرف انسانی دنیا آج بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے اس کا ذکر قرآن پاک میں صاف صاف الفاظ میں آچکا ہے۔ کلام مجید کا کہنا ہے :۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (۲-۲۱۳) یعنی تمام بنی نوع ایک اُمت یعنی ایک قوم تھے۔ یہ خیال کلام مجید میں قریب قریب ان ہی الفاظ میں کئی جگہ آیا ہے۔ مفسروں کی یہ بھی رائے ہے کہ ماضی کا صیغہ کَانَ عربی محاورہ میں تاریخی حقیقتوں اور عالمگیر سچائیوں کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ سورۃ المائدہ ۵ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ:۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا وَّلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ إِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (۵-۵۱)

یعنی "تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے الگ الگ شرع اور منہاج بنا دیئے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت (یعنی ایک ہی شرع اور منہاج کے ماننے والے) بنا دیتا۔ لیکن وہ چاہتا ہے کہ جس کو جو طریقہ بتا دیا گیا ہے اسی میں اُسے آزماوے۔ اسی لئے نیک کاموں کے کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرو۔ تم سب کو اللہ ہی کی طرف جانا ہے۔ اس وقت وہ تم پر ان باتوں کی حقیقت ظاہر کر دے گا، جن کے بارے میں تم میں آپس میں اختلاف ہے۔"

آیت لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (۲-۲۵۶) کا بھی یہی منشا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ عربی لفظ اُمت کئی الگ الگ مفہوموں میں استعمال کیا جاتا ہے اور قرآن اور دیگر اسلامی کتب میں بھی الگ الگ مفہوموں میں آیا ہے

مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کی وفات پر ملال پر اپنے رنج والم کا اظہار کرنے کے لئے جو جلسہ عام جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے ہوا تھا۔ اس میں ایک بھائی نے یہ یاد دلایا تھا کہ مولانا مرحوم اپنی تقریروں میں موجودہ انسانی دنیا کا اور خصوصاً اپنے پیارے وطن کا موازنہ ایک ایسے باغ کے ساتھ کیا کرتے تھے جس میں الگ الگ رنگوں اور الگ الگ خوشبوؤں کے پھولوں کی الگ الگ کیاریاں اپنے اپنے رنگ اور اپنی اپنی خوشبو سے پورے باغ کی زینت اور اس کی شان کو بڑھاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی تمثیلیں خاص حدود کے اندر ہی درست مانی جا سکتی ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مولانا مرحوم کا یہ

خیال قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق اور مشیت ایزدی کی سچی تصویر ہے۔ اس کے خلاف تخیّل اور عمل کی کوشش مشیت ایزدی میں مداخلت اور لا اکراہ فی الدین کے حکم کی خلاف ورزی ہے جلال الدین رومی نے اپنی مثنوی میں جسے "قرآن در زبان پہلوی" کہا گیا ہے۔ قرآن کے اسی مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

ہندیاں را اصطلاحِ مادہ اند سندھیاں را اصطلاحِ دیگر اند

قرآن کریم نے ان لوگوں میں جو اس طرح کے حالات میں اللہ کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ نو اوصاف کا ہونا لازمی بتایا ہے — (۱) وہ ایمان والے ہوں (۲) انھیں اللہ پر پورا بھروسہ ہو (۳) وہ اپنے یا دوسروں کے خلاف سنگین جرم یعنی ظلم کرنے سے اور خواہش سے بچتے ہوں (۴) دوسروں کے قصور کرنے پر باوجود غصہ آجانے کے (خود اپنی کوتاہیوں پر نظر رکھتے ہوئے) انھیں معاف کر دیتے ہوں (۵) ہر وقت اللہ کے حکم اور اللہ والوں کی نصیحت کو سننے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کو تیار رہتے ہوں (۶) ہمیشہ اللہ سے دعا مانگتے رہتے ہوں (۷) زندگی میں اپنے معاملات کو ان لوگوں سے ایسی صلاح ومشورہ کر کے طے کرتے ہوں جن کے ساتھ ان معاملات کا تعلق ہے (جیسے گھریلو معاملات میں گھر والوں سے۔ تجارتی معاملات میں ساجھی داروں سے، ملکی معاملات میں حکام وقت یا اہل کاروں یا دوسرے ساتھیوں سے وغیرہ) (۸) اللہ نے جو کچھ انھیں دیا ہے اس میں سے ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہوں اور (۹) ان پر اگر کوئی بڑی زیادتی کی جاوے تو گھبرا کر ظلم کے سامنے کبھی جھکنے کو راضی نہ ہوں۔ کیوں کہ جو جس کو نقصان پہنچا دے اس کو اس کے بدلے میں اتنا ہی نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص معاف کر دے اور اپنے کو نقصان پہنچانے والے کے ساتھ صلح کر لے تو اسے اللہ سے اس کا اچھا اجر ملتا ہے۔ سچ مچ اللہ دوسروں پر ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا (۴۲ سے ۳۶ سے ۴۰ تک)

قرآن کے بتائے ہوئے ان اوصاف میں جن دوسروں کے ساتھ برتاؤ کا ذکر کیا گیا ہے ان میں مسلم یا غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ جو لوگ مولانا مرحوم کے خیالات، جذبات اور ان کے کام کے طریقوں سے واقف تھے انھیں معلوم ہے کہ مولانا مرحوم کو ان اوصاف سے بھرپور حصہ ملا ہوا تھا مولانا حفظ الرحمٰن کو مجاہد ملت کہا جاتا ہے۔ جہاد لفظ کے اونچے سے اونچے معنی میں مولانا مرحوم سچے مجاہد تھے۔ ہو سکتا ہے کہ 'جہاد' کے اور بھی مرد میدان موجود ہوں جن سے مجھے نیاز حاصل نہیں ہوا۔ لیکن جہاں تک میں واقف ہوں مجھے اس وقت مولانا حفظ الرحمٰن سے بڑھ کر مجاہد اس ملک میں نظر نہیں آتا۔ جہاد کے اعلیٰ ترین معنی کے لئے قرآن کی آیتیں اور احادیث نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری نظر اس وقت صرف آزادی کے بعد کے زمانہ پر ہے۔

ایک واقعہ اپنے ذاتی تجربہ کا اس جگہ دہرانا مجھے ضروری معلوم ہوتا ہے ۱۹۴۷-۴۸ء میں ملک کی آزادی کے ٹھیک بعد ہمارے کچھ بڑے بڑے اہل وطن اس بات کے درپے تھے کہ ملک کے دو ٹکڑوں میں سے پاکستان کو ہندوؤں سے اور ہندوستان کو مسلمانوں سے خالی کر دیا جائے۔ گاندھی جی نے دونوں طرف سے اس کارروائی کو روکنا چاہا۔ اس کے لئے انھوں نے مجھے پاکستان بھیجا۔ میں لاہور پہنچا۔ لاہور سے میں نے جہلم اور چکوال تک کا دورہ کیا۔ اس سارے خطے کے حالات کو آنکھوں سے دیکھا واپس آکر لاہور میں میں نواب زادہ لیاقت علی خاں، راجہ غضنفر علی خاں اور دوسرے مسلم لیڈروں سے ملا۔ گفتگو ہوئی پاکستان کے سب مسلم لیڈر اس بات پر راضی ہو گئے کہ پاکستان سے باقی ہندوؤں کا نکلنا اور ہندوستان سے باقی بچے مسلمانوں کا نکلنا دونوں فوراً بند کر دیئے جائیں۔ اتفاق سے مسٹر جناح بھی لاہور میں موجود تھے۔ انھوں نے بھی اس تجویز سے پوری طرح اتفاق کیا۔ ایک معاہدہ تحریر میں لایا گیا۔ اس قلمبند معاہدہ کی ایک کاپی راجہ غضنفر علی کے پاس چھوڑ کر دوسری اپنے ساتھ لے کر میں فوراً دہلی آیا۔ معاہدہ کی کاپی میں نے گاندھی جی کو دکھائی۔ انھوں نے اسے غور سے پڑھا۔ بے حد خوش ہوئے، مجھے شاباش دی۔ صاف الفاظ میں انھوں نے کہا کہ:— "یہ تو بڑی اچھی چیز ہے مجھے یہ منظور ہے"۔ میں نے اجازت چاہی کہ میں راجہ غضنفر علی کو گاندھی جی کی منظوری کا تار بھیج دوں تاکہ دونوں طرف سے اس پر عمل درآمد فوراً شروع ہو جائے۔ راجہ غضنفر علی نے میرے لاہور سے چلنے پر متعدد ایسی اسپیشل ٹرینوں کی روانگی پاکستان سے روک دی تھی جن میں ہندو شرنارتھی بھر بھر کر بھارت بھیجے جا رہے تھے۔ اسی لئے معاہدہ کی اس طرف سے منظوری کی اطلاع کا جلد از جلد لاہور پہنچنا ضروری تھا گاندھی جی نے میرے اجازت مانگنے پر کچھ سوچا اور کہا "ذرا ٹھہر جاؤ، میں ولبھ بھائی سے بات کر لوں، صبح تار دے دینا"۔ میں چلا آیا۔ صبح کو پھر میں گاندھی جی کے پاس پہنچا۔ میں نے پھر لاہور منظوری کا تار بھیجنے کی اجازت چاہی۔ گاندھی جی نے نہایت درد کے ساتھ جو درد ان کے چہرے کے ایک ایک رؤئیں سے ٹپک رہا تھا سرد آہ بھر کر مجھے جواب دیا "کیا کروں بھئی ولبھ بھائی نہیں مانتا، اچھا ذرا اور ٹھہرو۔ ذرا دیکھو ......"۔ میں شکستہ دل ہو کر گھر لوٹ آیا۔ اس وقت کا وہ صدمہ آج تک میرے دل میں موجود ہے، مجھے یقین ہے، گاندھی جی کے دل پر بھی اس کا

آخر مرتے دم تک رہا ہوگا، جو معاہدہ اس وقت لاہور میں قلمبند کیا گیا تھا اور جسے پاکستان کے لیڈروں اور مسٹر جناح تک نے منظور کر لیا تھا اس کی نقل ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ غالباً اس کی کوئی نقل پاکستان میں بھی ضرور ہوگی۔

گاندھی جی اور ان کے ہم خیال لوگوں کے لئے اب صرف یہ باقی رہ گیا تھا کہ جہاں تک ہوسکے بھارت کو مسلمانوں سے خالی نہ ہونے دیا جائے۔ اس معاملہ میں دلی بھارت کی گردن تھی۔ میوات کا علاقہ دلی سے ملا ہوا تھا اور بہ کثرت مسلمانوں سے آباد تھا۔ زبردست اور منظم کوششیں کی گئیں کہ دلی اور میوات کو مسلمانوں سے خالی کر دیا جائے۔ حکومت کی زیادہ تر طاقتیں بھی اسی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اگر دلی اور میوات مسلمانوں سے خالی ہو جاتے تو باقی بھارت بھر میں شاید ہی کہیں کوئی مسلمان باقی رہ جاتا۔ گاندھی جی نے اپنی پوری طاقت اس کوشش میں لگا دی کہ دہلی اور میوات مسلمانوں سے خالی نہ ہونے پائیں۔ انہی زبردست آزمائش کے دنوں میں میں برابر گاندھی جی کے ساتھ تھا۔ ان کے حکم سے میں نے کئی بار میوات کا بھی دورہ کیا۔ دلی کی بھی گلیوں کے چکر لگاتے ظاہر ہے کہ اگر کوئی سربرآوردہ مسلمان لیڈر ان حالات میں گاندھی جی کی پوری پوری مدد کے لئے کھڑا نہ ہو جاتا تو گاندھی جی کی نیک کوششیں ہرگز کامیاب نہ ہوسکتیں۔ ان نازک حالات میں محض ہندوؤں کی مخالفت ہی نہیں خود مسلمانوں کی لعن طعن برداشت کرکے اور گالیاں سن کر جس مرد میدان نے گاندھی جی کا ساتھ دیا وہ حفظ الرحمٰن تھا۔ ان دنوں مولانا حفظ الرحمٰن اپنے دو تین نیک طینت اور باہمت ساتھیوں کے ہمراہ روز مہاتما گاندھی سے ملا کرتے تھے۔ ان گفتگوؤں میں میں برابر شریک رہتا تھا۔ ایک دن کی گفتگو میں مولانا ابوالکلام آزاد، ولبھ بھائی اور جواہر لال بھی شامل تھے۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان نازک حالات میں اگر دہلی اور میوات کو مسلمانوں سے خالی نہ ہونے دیا گیا اور اس طرح سارے ہندوستان کو مسلمانوں سے خالی ہونے سے بچایا جا سکا نیز ہمارے ملک کے سیکولرزم کے دعوی میں کچھ بھی اصلیت باقی رہ سکی تو اس زبردست کام کا سہرا مہاتما گاندھی کے بعد اگر کسی انسان کے سر پر باندھا جا سکتا ہے تو وہ مرحوم بھائی مولانا حفظ الرحمٰن کے سر پر ہی باندھا جا سکتا ہے۔

جلال الدین رومی کا جو شعر میں نے اوپر نقل کیا ہے اسی کے سلسلے میں مولانا روم نے یہ اشعار بھی کہے ہیں:۔

مذہب عشق از ہمہ ملت جدا است   عاشقاں را مذہب و ملت خدا است
موسیا آداب داناں دیگر اند   عاشقاں سوز دروناں دیگر اند
تو برائے وصل کردن آمدی   نے برائے فصل کردن آمدی

معلوم ہوتا ہے کہ دانستہ یا نادانستہ انسانی قوم کے قدم اسی مذہب عشق کی طرف بڑھ رہے ہیں جس کی طرف جلال الدین رومی نے اوپر کے اشعار میں اشارہ کیا ہے اور جو اس فقیر کی رائے میں حقیقی اسلام یا مذہب اسلام کا جوہر ہے۔ گزشتہ تقریباً چالیس سال سے میں مولانا حفظ الرحمٰن سے کافی نزدیک سے واقف تھا۔ اپنی واقفیت کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا مرحوم اس مذہب عشق سے بے گانہ نہیں تھے۔ میری نظروں میں مولانا حفظ الرحمٰن ایک سچے ہندوستانی، سچے مسلمان اور اونچے درجے کے انسان تھے، محبت، یکجہتی اور رواداری کے جس راستے پر چل کر انھوں نے اپنی جان دی وہی ایک راستہ اس ملک کے موجودہ حالات میں سب کی سلامتی اور بہبودی کا راستہ ہے۔ میری رائے میں وہی عین اسلام ہے۔ اس کے دائیں اور بائیں کے دو راستے ایک لامذہبی کا اور دوسرا غلط قسم کی مذہبی عصبیت کا۔ یہ دونوں راستے غلط، خطرناک اور اسلام کی روح کے منافی ہیں۔ اللہ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کے نقش قدم پر چل کر اپنے پیارے وطن اور بنی نوع دونوں کی سچی خدمت کر سکیں۔

ایک اُولوالعزم شخصیّت

سیّد اوصاف علی صاحب
سابق ایڈیٹر "میسیج" ویکلی

جن ممتاز قوم پرور مسلم رہنماؤں نے اولوالعزمی کے ساتھ جنگِ آزادیٔ وطن میں بھی حصہ لیا اور آخر دم تک تقسیم ہند کے داعی مسٹر جناح کے دو قومی نظریہ کی برملا مخالفت بھی کی، مولانا حفظ الرحمٰن کی شخصیت اُن اولوالعزم رہنماؤں کی صف میں آخری شخصیت تھی۔

پاکستان کی تخلیق اور ملک کی تقسیم اگرچہ ان رہنماؤں کے نقطۂ نظر اور فکر و یقین کے لئے ایک بڑا حادثہ تھا۔ پھر بھی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے دل برداشتہ ہو کر قومی خدمت سے منہ نہ موڑا۔ بلکہ اسی جوش اور جذبۂ عمل کے ساتھ وہ مسلمانانِ ہند کی خدمت گذاری میں لگ گئے اور اس راہ میں عزم و ثبات کے وہ حیرت انگیز نمونے دنیا کے سامنے پیش کئے کہ بجا طور پر انھیں مسلمانِ ہند کا مخلص ترین اور واحد رہنما تسلیم کیا گیا اور آج جب کہ وہ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں مسلمانانِ ہند میں یہ عام احساس ہے کہ ان کا پشت پناہ جاتا رہا۔

مولانا مرحوم کی پیدائش بجنور کے ایک قصبہ میں بیسویں صدی کے پہلے سال میں ہوئی جب کہ تحریک آزادی کی پَو پھوٹ رہی تھی اور حریت پسندی کی فضاؤں میں یہ نغمہ گونج رہا تھا۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

مولانا موصوف نے اس فضا میں ہوش سنبھالا تو بہت ہی جلد وہ ان نغمات کی کشش سے مانوس اور آشنا ہو گئے اور اس قوت اور محویت کے ساتھ کہ سچ مچ ایک سرفروش مجاہد کی تصویر بن گئے۔ اور زبانِ خلق نے اُن کو "مجاہدِ ملّت" ہی کے لقب سے پکارا۔

مولانا موصوف ایک صاحب فکر سیاس ہونے کے ساتھ ساتھ علم و فضل، اعلیٰ خطابت اور تدبیر و فراست غرض مختلف اوصاف کا مجموعۂ کمال بھی تھے۔

جو شخص ایک بار بھی ان سے ملا، ان کی عظیم شخصیت کو عمر بھر فراموش نہ کر سکا۔ ان کے جاری کئے ہوئے میسیج ویکلی کا ایڈیٹر ہونے ہوئے مجھے بہت قریب سے ان کو دیکھنے اور سمجھنے ہی کا موقعہ نہیں ملا بلکہ بارہا سیاسیات سے فلسفیات تک مختلف موضوعوں پر بات چیت کرنے کے مواقع بھی میسر آئے۔ خالص فلسفیانہ عنوانوں پر بھی جب کبھی ان سے گفتگو ہوئی اُن کی فاضلانہ تنقیدات کو سنکر میں حیران رہ جاتا تھا اور ایسا محسوس کرتا تھا کہ فلسفۂ قدیم و جدید کا کوئی عنوان ایسا نہیں ہے جس پر انھیں عبور نہ ہو۔ ایک بار انھوں نے خود بتایا کہ ایک بار جیل میں انھیں مولانا آزاد کے ساتھ کبھی مغربی فلسفہ پر طویل بحث و گفتگو کا موقعہ ملا تھا۔ مسلسل سیاسی اور ہنگامی مشاغل نے لکھنے پڑھنے کی مہلت اور سکون سے اُن کو محروم کر دیا تھا۔ رات دن سیاسی کارکنوں، ضرورت مندوں اور مصیبت زدوں کا ہجوم اپنے اپنے مسائل و معاملات کی خاطر انھیں اس طرح مصروف رکھتا تھا کہ اپنی دلی خواہش کے باوجود وہ اس زندگی میں قلم و کاغذ کے شغل سے آشنا نہ ہو سکے "اسلام کا اقتصادی نظام" اور "قصص القرآن" جیسی بلند پایہ اور ضخیم کتابیں بھی بڑی حد تک انھوں نے یا اپنے سفروں میں مکمل کیں یا کچھ جیلوں میں۔

مسلمانانِ ہند کے متعلق مولانا مرحوم کا تأثر بھی حقیقت سے بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے شعور و مزاج میں استقلال سے شاید بہت دور جا چکے ہیں۔ بعض دفعہ تو اس تیزی سے وہ بدل جاتے ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر مولانا محمد علی مرحوم کا واقعہ سناتے ہوئے مولانا نے بتایا کہ میں نے وہ دن بھی دیکھے ہیں جب یہی مسلمان مولانا محمد علی مرحوم کو سونے چاندی میں تولنے کے لئے جان چھڑکتے تھے اور پھر وہ دن بھی دیکھا کہ وہی مولانا محمد علی اپنے گھر کی دو دو چار چار آنے کی ضروریات کبھی اُدھار لینے کے لئے دکان دکان خود چکر لگاتے تھے۔

اس تجزیہ کی روشنی میں اگر غور کیا جائے کہ مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات کے بعد مسلمانانِ ہند کا سیاسی شعور و رجحان اپنا کونسا رُخ بنائے گا کوئی پیشگوئی بہت دشوار معلوم ہوتی ہے۔ اب تک تو مولانا مرحوم ہی کی ذات تھی جس کے کمال فکر و تدبیر نے مسلمانانِ ہند .... کو جماعتی طور پر کانگرس سے وابستہ کر رکھا تھا اور اتنا قریب کر دیا تھا کہ پچھلے تین جنرل الیکشنوں میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے جہاں تہاں کانگرس کا ساتھ دیا لیکن مستقبل کیلئے اب پھر یہ سوال کھڑا ہو سکتا ہے۔ مولانا مرحوم کی عظیم شخصیّت کو بنانے میں میرے خیال کے مطابق دو عنصر بہت دخیل ہوئے ہیں صاف دماغی اور صدق دلی۔ ہر معاملہ کے نشیب و فراز پر غور کر کے وہ اپنی ایک رائے خود قائم کرنے اور مضبوطی سے اس پر جم جانے کے عادی تھے اور پھر کوئی بھی قوت انکے موقف کو بدل نہیں سکتی تھی۔ حال ہی میں مسلم کنونشن کا سوال سامنے آیا اور اس پر مخالف و موافق تنقیدیں ہوئیں مولانا نے بھی معاملہ پر اپنے تئیں غور کیا اور جب اُن کی یہ رائے مستحکم ہو گئی کہ کنونشن کا انعقاد نہ صرف مسلمانوں بلکہ پوری ہندوستانی قوم کے لئے مفید ہی ہو گا۔ تو پھر وزیر اعظم ہند بھی انکی رائے کو بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ غرض مولانا حفظ الرحمٰن اپنے عزم و ارادہ میں ناقابلِ تسخیر لیکن اپنے جذبات کے لحاظ سے بہت متحمل اور متواضع واقع ہوئے تھے۔ ایسی عظیم صفات کی حامل شخصیتیں اس دنیا میں رونما ہوتی ہیں مگر بہت ہی کم ؛

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا

ذیل کا مضمون "قومی آواز" کے ایک اڈیٹوریل کا اقتباس ہے، جو مولانا مرحوم کے آخری الیکشن کے زمانہ میں گزشتہ سال لکھا گیا تھا جب کہ مولانا مرحوم حلقہ امروہہ سے پارلیمنٹ کے اُمید وار تھے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ادارہ

یوں تو مولانا حفظ الرحمٰن جمعیۃ علمائے ہند کے سب سے بڑے لیڈر ہیں۔ اسی جماعت کی وجہ سے مولانا کو ہندوستان نے پہچانا ہے، اور اب اس جماعت کی سرگرمی کا بڑا حصہ مولانا ہی کی شخصیت کا مرہون منت ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن کی شخصیت کا حدود دارلعہ اب اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ وہ جمعیۃ کے نہیں قوم کے مسلمہ لیڈر بن چکے ہیں۔ صوبوں کی تقسیم، آسام کا فساد زبانوں کے اختلافات، پست اقوام کے مسائل، کانگریس کی صفوں میں نشستوں کی تقسیم ان سب معاملات میں مولانا کی رائے کا وزن پڑتا ہے اور حکومت اور سیاست کے با اثر حضرات اس اثر کو محسوس کرتے ہیں۔ ہندوستان کے مستقبل کا ڈھانچہ جو حال کے سانچے میں ڈھل رہا ہے، کی آہن گری میں جو دس بارہ فولادی ہاتھ کام کر رہے ہیں۔ ان میں ایک ہاتھ مولانا حفظ الرحمٰن کا بھی ہے اور یہ ہاتھ اس بننے والے ڈھانچے میں اقلیتوں، کمزوروں اور بے سہارا لوگوں کے لیے جگہ پیدا کر رہا ہے۔

یہ واضح رہے کہ جمہوریت کی بناوٹ کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اگر مستقبل کے ڈھانچے میں صرف ایک ہی اقلیت کے لیے جگہ پیدا کی جائے تو بھی اس کی شکل کچھ ایسی بن جائے گی کہ تمام اقلیتوں اور بے آواز لوگوں کے لئے اس میں جگہ نکل آئے گی۔ مولانا حفظ الرحمٰن اس ڈھانچے کی بناوٹ میں اسی طرح کا لوچ پیدا کر رہے ہیں۔

آج ہندوستان میں بہت سی مذہبی اقلیتیں ہیں لیکن ان میں سے کسی کے پاس بھی ایسی وزنی شخصیت نہیں ہے جو ہندوستان کے مستقبل پر اثر انداز ہو سکے۔ کسی اقلیت کے پاس اگر مفکر ہے تو وہ عوامی نہیں ہے اگر عوامی ہے تو اس کا ماضی اس طرح کا ہے کہ وہ کبھی اس پارٹی میں رہا، تو کبھی اس میں ..... اگر وہ مفکر بھی ہے اور اس کا ماضی استقلال سے بھرپور ہے تو پھر آزادی کے بعد کی تبدیلیوں میں وہ اپنی اہمیت کھو چکا ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کی یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ ان کے پاس مولانا حفظ الرحمٰن کی ایسی ذات موجود ہے جس کے پس منظر میں عظیم ملکی خدمتیں بھی ہیں استقلال رائے بھی ہے۔ یہ ذات خود غرضیوں اور کھوکھلی باتوں سے پاک بھی ہے۔ اور اس میں حق کی بے باکانہ جرأت بھی ہے۔ ساتھ ساتھ وہ ۳۰۔ ۳۵ سال سے عوامی لیڈر رہے۔ اور آج اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی بلکہ پہلے سے دوگنی تگنی ہو چکی ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن اپنی ان خصوصیتوں کی وجہ سے قوم و ملک کی تعمیر میں بہت عظیم حصہ لے رہے ہیں اور اُن کی ساخت میں ایسا لوچ پیدا کر رہے ہیں جس کا فائدہ تمام اقلیتوں اور کمزور جماعتوں کو پہونچ رہا ہے اور پہونچتا رہے گا۔ اور مولانا جو قدم بھی اُٹھاتے ہیں۔ وہ اس احساس کے ساتھ اُٹھاتے ہیں کہ دوسری اقلیتوں کا بھی بھلا ہو۔ یعنی حکومت کی نظروں میں تمام مذہب اور اقلیتیں برابری کا درجہ رکھنے لگیں۔

۲۰۔ ۲۵ سال سے مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی اتنی عوامی رہی ہے جتنی ہندوستان کے بہت کم لیڈروں کی ہو گی۔ دہلی کی گلی قاسم جان میں ایک اوسط درجہ کا مکان ہے، جو حفظان صحت کے نقطۂ نظر سے نہ کافی ہوا دار ہے۔ اور نہ کافی روشن اور صاف، اس مکان کے ایک وسیع کمرے میں مولانا فجر کی نماز کے بعد بیٹھ جاتے ہیں اور لوگ آ رہے ہیں، جا رہے ہیں۔ مولانا ان کی باتیں سُن رہے ہیں۔ خط پڑھ رہے ہیں۔ اُن کے جواب لکھ رہے ہیں۔ اخبار پڑھ رہے ہیں۔ ایک جلسے کے بعد دوسرے میں اور دوسرے کے بعد تیسرے میں حصہ لے رہے ہیں۔ یہیں سے اُٹھ کر پارلیمنٹ میں یا جلسوں میں جاتے ہیں اور پھر واپس آ کر یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی کمرے میں ناشتہ ہے اور یہیں کھانا ہے اور یہیں نماز ہے۔ اس طرح رات کے گیارہ بج جاتے ہیں۔ پھر وہ سوتے چلے جاتے ہیں۔ بس اس نیند ہی کو ان کا آرام سمجھ

لیجئے رچا ہے عیش۔

مولانا کا کھانا اور ناشتہ وہ ہوتا ہے جو معمولی اوسط درجے کے گھروں میں ہوتا ہے۔ کوئی چیز بھی قیمتی نہیں ہوتی ہے، اس میں اکثر مہمانوں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔

مولانا دوروں پر اور سفر پر جاتے ہیں تو وہاں بھی ان کا یہی پروگرام رہتا ہے کہ مقامی جمعیۃ کے دفتر میں کسی جگہ بیٹھ گئے اور گفتگو اور مشورے اور بحثیں اور جلسے وغیرہ شروع ہو گئے۔

عجیب اسلامی مساوات اور جمہوریت کی فضا رہتی ہے مولانا حفظ الرحمٰن کے گرد نماز کی ایک ہی صف میں محمود و ایاز کھڑے تو ہوا کرتے ہیں۔ لیکن یہاں بیٹھتے بھی ہیں، سوتے بھی ہیں اور رہتے سہتے بھی ہیں اور کام بھی اسی اسپرٹ سے کرتے ہیں، اسی چٹائی پر وزیر بھی آکر بیٹھتے ہیں اور کلرک اور والنٹیر بھی بیٹھتے ہیں اور سب کی بات پوری طرح سنی جاتی ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن اپنے ماتحتوں کو اُن کی غلطیوں پر ٹوکتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے ماتحت کہیں پر مولانا کی غلطی کو محسوس کرتے ہیں تو وہ بھی اس بات کے اظہار میں کسی طرح کی بے ادبی محسوس نہیں کرتے ہیں مولانا حفظ الرحمٰن جب بھی اپنی غلطی محسوس کرتے ہیں۔ تو فوراً مسکرا کر تسلیم کر لیتے ہیں۔

قبرستان کی خبریں، اسکولوں کی زمین، پارلیمنٹ کے ٹکٹ، ریاستوں کی سیاست مصر و روس کی خارجہ سیاست اور کشمیر پر متحدہ اقوام کی قرار دادوں سے لے کر حکومت کے معمولی افراد کے ساتھ بے انصافیاں یہ سب مولانا کے سامنے آتی ہیں، یہاں سوشلسٹ، پرجا سوشلسٹ کمیونسٹ، غیر سیاسی سب ہی طرح کے لوگ آتے ہیں اور سب اپنی اپنی باتیں کہتے ہیں۔ مولانا کو متعلقہ کاغذات کا بھی مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور ہر طرح کی باتیں بھی سُنتے ہیں۔

اور مولانا یہ سب کام ان تھک مشین کی طرح بلا اپنے سن و سال اور صحت کے ساتھ مروت کئے کرتے چلے جاتے ہیں۔ اسی زندگی میں طول طویل سفر بھی شامل ہے۔ جو جاڑے برسات گرمی، ہر موسم میں آسام سے گجرات تک اور دہلی سے جنوبی ہند تک ہوتے رہتے ہیں۔

مولانا کے اہل و عیال جس مکان میں جو گلی در گلی میں ایک تنگ جگہ واقع ہے۔ بیس سال پہلے رہتے تھے اسی میں اب بھی رہتے ہیں۔ اور اُن کا کھانا پینا اور رہن سہن بھی جیسا پہلے تھا ویسا ہی اب بھی ہے۔ آزادی کے بعد ان چیزوں میں اگر اضافہ ہوا ہے، تو ناخواندہ مہمانوں کا یا غیروں کی فکروں اور ذمہ داریوں کو اوڑھنے کا ؎

ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

آج ہندوستان کے کسی گوشہ میں بھی ایسی سیاسی خانقاہ نہیں ہے۔ جیسی مولانا کے گرد بسی رہتی ہے۔

جو لوگ عوامی زندگی کا تجربہ رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ کسی باعمل احتجاجی سیاسی جماعت کو تعمیری غیر سیاسی بنانا کتنا مشکل کام ہے۔ تحریک آزادی کے زمانہ میں احتجاجی سیاسی جماعتوں میں وہی لوگ ہوتے تھے جو پلیٹ فارم سے بیخوفی سے پُرجوش تقریریں کر سکتے یا بہادری سے قانون شکنی کر کے جیل جا سکتے تھے۔ لیکن تعمیری اور غیر سیاسی کام کے لئے نہ پرجوش تقریروں کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ جیل جانے والی قربانیوں کی بلکہ ان کاموں کے لئے بالکل ہی دوسرے قسم کے مزاجوں اور عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ آزادی کی جدوجہد کے زمانے میں بہت سی احتجاجی سیاسی جماعتیں تھیں۔ جب آزادی مل گئی تو ان میں سے بہتوں کے لئے صرف یہ راہ رہ گئی کہ وہ اپنے کو تعمیری، اصلاحی اور غیر سیاسی بنا دیں اس قسم کی جماعتوں میں سے سوائے جمعیۃ کے کوئی بھی ایسی تبدیلی کے ساتھ اپنے کو زندہ نہ رکھ سکی۔ یہ مولانا حفظ الرحمٰن کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے جمعیۃ کو تعمیری جماعت بنا کر ۱۹۴۷ء کے بعد بہت سے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ مسلمانوں کے مسائل کو تو صرف اسی نے اُٹھایا اور حل کیا۔ اور آج بھی وہ ایسے کاموں میں لگی ہوئی ہے۔

مجاہد ملت کا تصنیفی درجہ

(از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ایڈیٹر معارف)

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم کی شخصیت بڑی جامع تھی، اُن کے کارنامے بڑے گوناگوں ہیں۔ وہ نامور سیاسی لیڈر بھی تھے اور ممتاز عالم دین بھی پرجوش خطیب بھی تھے اور خوش بیان واعظ بھی۔ ماہر و تجربہ کار معلم و مدرس بھی تھے اور مشاق مصنف و صاحب قلم بھی، انھوں نے مختلف اوقات میں دارالعلوم دیوبند مدرسہ اسلامیہ ڈابھیل اور مدرسہ اسلامیہ کلکتہ میں تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دی متعدد علمی کتابوں کے مصنف تھے۔ مگر ان کی طوفانی سیاسی زندگی نے ان کے ان کمالات کو اتنا چھپا دیا تھا کہ مخصوص طبقہ کے علاوہ شاید عام لوگوں کو اس کا علم بھی نہ ہوگا۔ اس مضمون کا مقصد ان کی علمی و تصنیفی حیثیت کا مختصر تعارف اور اس پر تبصرہ ہے۔ ان کا اور ان کے رفیق کار اور میرے محترم دوست مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ندوۃ المصنفین دہلی کا قیام ہے۔ دارالمصنفین کے بعد یہ دوسرا ادارہ ہے جس نے مختلف علوم و فنون اسلامیات پر بڑا مفید اور وقیع ذخیرہ فراہم کر دیا ہے، جس کے ذریعہ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کا علمی فیض ہمیشہ جاری رہے گا۔ وہ خود بھی ایک اچھے اور ممتاز مصنف اور اہل قلم تھے۔ اگر وہ علمی زندگی اختیار کرتے تو ہندوستان کے مشہور مصنفین میں ان کا شمار ہوتا اور یہ بھی ان کا کمال ہے کہ اپنی طوفانی سیاسی زندگی کے باوجود انھوں نے متعدد اہم تصانیف بھی یادگار چھوڑیں، ان میں سب سے اہم قصص القرآن ہے۔

کلام اللہ میں عبرت و بصیرت کیلئے بہت سے انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کی امتوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں، مگر ان کا مقصد تاریخ اور سوانح نگاری نہیں، بلکہ سبق آموزی اور عبرت پذیری ہے۔ اس لئے ان میں تاریخی اور سوانحی ترتیب و تسلسل نہیں ہے اور نہ ان کی تفصیلات میں پڑا گیا ہے بلکہ صرف عبرت و بصیرت کے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اور موقع و محل کے لحاظ سے جہاں جن پیغمبروں اور ان کی امتوں کے جس قدر حالات کی ضرورت تھی ان کو بیان کر دیا گیا ہے اس لئے کلام مجید میں تاریخ و سوانح کی طرح ان کے مرتب اور مفصل حالات نہیں ملتے اور جس قدر ہیں وہ بھی یکجا نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف سورتوں اور مختلف آیات میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کے حالات کا دوسرا ماخذ احادیث نبوی، تفسیری روایات عہد عتیق کے صحیفے، قدیم تاریخی کتابیں، تاریخی آثار اور اسرائیلی روایات ہیں۔ جن کی مدد سے ان انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے حالات مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ مگر عہد عتیق کے صحیفے محرف ہیں۔ ان میں اور کلام مجید کے بیانات میں بعض اختلافات ہیں۔ اسرائیلیات میں خرافات کا حصہ بھی شامل ہے۔ اس لئے ان سے اخذ و استفادہ میں بڑی احتیاط اور تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے۔ عربی میں تو اس نقطۂ نظر سے قصص القرآن پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اردو میں قصص الانبیاء وغیرہ جیسی غیر معتبر اور افسانوی کتابوں کے علاوہ کوئی مستند کتاب نہیں تھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے قصص القرآن لکھی۔ اس میں کلام مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں کلام مجید میں مذکور انبیاء علیہم السلام کے حالات لکھے ہیں اور جا بجا دوسرے ماخذوں سے بھی مدد لی ہے اور جہاں ان کے اور کلام مجید کے بیان میں اختلاف ہے وہاں دلائل سے کلام مجید کے بیانات کی صحت و صداقت ثابت کی ہے اور مستشرقین کے اعتراضات کے تحقیقی جوابات بھی دیئے ہیں۔ اور کلام مجید کے اصل مقصد عبرت و بصیرت کے پہلوؤں کو خاص طور سے نمایاں کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کی تاریخ بھی ہے اور عبرت و بصیرت کا صحیفہ بھی۔

دوسری اہم تصنیف بلاغ مبین ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پورے عالم انسانیت کے لئے سراج منیر اور رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے تھے اور آپ کی بعثت کا مقصد ساری دنیا کو اسلام کے نور سے منور کرنا تھا۔ اسی لئے جزیرۃ العرب میں اسلام کے فروغ کے ساتھ ہی آپ نے عرب کے قرب و جوار کے حکمرانوں اور امراء و حکام کو اسلام کی دعوت دی اور ان کے نام تبلیغی خطوط ارسال فرمائے۔ اس دعوت پر بعضوں نے اسلام قبول کر لیا بعض نے انکار کیا اور بعض عناد اور مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ یہ تبلیغی مکاتیب اور ان کے نتائج احادیث و سیر اور تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور عہد رسالت میں دعوت اسلام کی اہم کڑی ہیں۔ اس لئے سیرت کی تمام کتابوں میں ان کا ذکر ہے۔ مگر کسی ایک کتاب میں ایک جگہ جمع نہیں ہیں بلکہ مختلف کتابوں اور مختلف جگہوں پر بکھرے

ہوئے ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ان کو جمع کر کے بلاغ مبین کے نام سے ان کا مجموعہ مرتب کر دیا ہے۔ مگر یہ محض مکاتیب کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں اور بہت سی ضروری بحثیں بھی آگئی ہیں۔ چنانچہ یہ مجموعہ تین حصوں میں تقسیم ہے پہلے حصہ میں کلام مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں بڑی تفصیل سے تبلیغ اسلام کے اصول تحریر کئے گئے ہیں جن کی حیثیت دعوت و تبلیغ کے نصاب کی ہے۔ دوسرے حصہ میں مکاتیب مبارکہ ہیں۔ ہر مکتوب کے ضمن میں مکتوب الیہ کے ضروری حالات اور اس کی دعوت کے سلسلہ میں جو واقعات پیش آئے ان کی تفصیل ہے۔ تیسرے حصہ میں نتائج کے عنوان سے اس تبلیغ کے اثرات و نتائج کی تفصیل اور تبلیغ اسلام کے متعلق بعض اصولی باتیں تحریر کی گئی ہیں اور اس سلسلہ میں جو شکوک و سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب دیا گیا ہے دوسرے اور تیسرے حصہ میں تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں مخالفین اسلام کے اعتراضات اور ان کے جوابات کا خاص طور سے لحاظ کیا گیا ہے اور ان کی مدلل تردید کی گئی ہے۔ اس لئے یہ کتاب تنہا مکاتیب کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ دعوت و تبلیغ کا نصاب بھی ہے، عہد رسالت میں دوسری اقوام و مذاہب میں اس کی تاریخ بھی ہے اور تبلیغ اسلام پر مخالفین اسلام کے اعتراضات کا محققانہ جواب بھی ان مسائل سے متعلق بعض اور ضروری مباحث بھی آگئے ہیں جن کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔

تیسری کتاب اسلام کا اقتصادی نظام ہے۔ اس دور کا سب سے بڑا مسئلہ اقتصادیات اور مختلف طبقوں میں دولت کی تقسیم کا ہے، جس نے دنیا کو مختلف گروہوں اور مختلف نظاموں میں تقسیم کر دیا ہے اور سرمایہ و محنت میں ایک مستقل کش مکش برپا ہے۔ اسلام نے صدیوں پہلے اس مسئلہ کو حل کر دیا تھا اس کا اقتصادی نظام اس قدر متوازن ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو سرمایہ داری اور غربت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نہ کوئی اتنا بڑا سرمایہ دار بن سکتا ہے کہ قارون بن جائے اور نہ کوئی مفلس و محتاج باقی رہ سکتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اسلام کے اقتصادی نظام پر ایک مستقل کتاب لکھی اس میں بڑی تفصیل کے ساتھ اسلام کے اقتصادی نظام کو پیش کیا ہے اور دکھلایا ہے کہ یہ نظام اتنا متوازن ہے اور اس میں تقسیم دولت کے اصول اتنے عادلانہ ہیں کہ اس سے سرمایہ داری اور غربت و افلاس کے سارے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ نہ اس کے لئے کسی سوشلزم کی ضرورت رہتی ہے اور نہ کمیونزم کی۔

رسول کریم = یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے سیرت نبوی پر اوسط استعداد کے طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس میں سوانح نبوی کے ساتھ آپ کے خصائص و شمائل، اخلاق اور اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا مختصر مگر مؤثر انداز میں ذکر ہے۔ ہر بحث کے خاتمہ پر اس کا خلاصہ اور اس کے متعلق سوالات دیدیئے ہیں طلباء کے لئے سیرت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے یہ کتاب ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

آہ مجاہد ملّت

عثمان احمد قاسمی جون پوری

صفِ ماتم بچھی ہے کیوں زمینوں آسمانوں میں
یہ کس نے آہ منہ موڑا وطن کے مہربانوں میں
خدا کا کون بندہ آگیا جنت کے باغوں میں
فرشتے حور و غلماں سب ہیں جس کے میزبانوں میں
مکانِ خلدِ بریں کے اس قدر آراستہ کیوں ہیں
مجاہد دینِ حق کا ہے خدا کے میہمانوں میں
ترے سینے کے اندر خالدؓ جرّار کا دل تھا
تری جرأت کا ڈنکا بج رہا ہے آسمانوں میں
ابھی تک کانپتی ہے تجھ سے استبداد کی دنیا
ابھی تک زلزلہ برپا ہے باطل کے مکانوں میں
ہمیشہ سر بکف ہو کر کے کی ہے قوم کی خدمت
ترا پہلا قدم ہوتا تھا مشکل امتحانوں میں
گلستاں میں لگی ہے آگ ویرانی کا عالم ہے
کوئی بلبل نظر آتا نہیں اب آشیانوں میں
قیامت تک سبق لیتے رہیں گے تیری باتوں سے
حیاتِ جاوداں کا درس ہے تیرے فسانوں میں
ترا فرمان دنیا کے لئے مہرِ ہدایت ہے
تری باتیں لکھی جائیں گی سچی داستانوں میں
تری حقّانیت اے کاش سیکھیں قوم کے خادم
ترا سوزِ دروں آئے مؤذن کی اذانوں میں
وہی عثمان جو نغمہ سرا تھا تیری مدحت میں
وہ دن آیا کہ تیرے غم میں ہے وہ نوحہ خوانوں میں

مجاہد ملت کی پارلیمانی زندگی

محمد سلیمان صابر۔ مدیر معاون روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمان کی پارلیمانی زندگی کا آغاز حصول آزادی کے بعد اس وقت سے ہوتا ہے جب وہ دستور ساز اسمبلی کے ممبر چنے گئے جس کی تشکیل ملک کے لئے برطانوی دور کے فرسودہ آئین کی جگہ ایک جمہوری آئین وضع کرنے کے لئے عمل میں آئی تھی۔

آئین ساز اسمبلی کی ممبری کو عام لوگ ایک بڑا اعزاز کہہ سکتے ہیں لیکن حضرت مولانا نے کسی اعزاز کی خاطر نہیں بلکہ اس لئے آئین یا قانون ساز اسمبلی کی ممبری قبول کی کہ وہ شروع ہی سے ایک قومی کارکن رہے تھے۔ برطانوی دور میں ملک کو آزاد کرانے کا ایک اہم مقصد سامنے تھا۔ اور حصول آزادی کے بعد سب سے اہم کام یہ تھا کہ ملک کو ایک ایسا جمہوری آئین دیا جائے کہ بلا تخصیص مذہب کسی باشندے کو کسی دوسرے پر فوقیت یا برتری حاصل نہ ہو، بلکہ قانون کی نظر میں وہ سب برابر ہوں۔ یہ حضرت مولانا جیسے وسیع النظر ممبروں ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ملک کو ایک سیکولر آئین دیا گیا۔ اگرچہ انھیں ہمیشہ اس بات کا قلق رہا تھا کہ ہندوستانی زبان کو جس کے فروغ کے لئے مہاتما گاندھی آخر وقت تک کوشش کرتے رہے اور جسے وہ قومی زبان سمجھتے تھے آئین میں کوئی درجہ نہ مل سکا۔ اس کی جگہ ہندی نے لے لی۔

حضرت مولانا کی پارلیمانی سرگرمیاں صرف ایوان پارلیمنٹ میں حاضری تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ اس کے باہر بھی وہ ہر وقت مصروف رہتے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کے دفتر کے اجتماعات، وزیر اعظم ہند، مولانا آزاد اور دوسرے قومی لیڈروں سے ملاقاتیں، یہ سب ان کی پارلیمانی سرگرمیوں کا حصہ تھیں۔ ملک کے طول و عرض میں سال کے زیادہ حصہ میں ان کے دوروں کو بھی ان ہی سرگرمیوں کا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ان ہی دوروں میں انھیں عوام اور خاص طور سے اقلیتی فرقہ کے مسائل کو جاننے اور سمجھنے اور پھر ان کی بنیاد پر آئین ساز اسمبلی یا پارلیمنٹ میں بولنے کا موقع ملتا تھا۔

حضرت مولانا ان بیک بنچروں میں نہ تھے جن کا مہر سکوت کبھی نہیں ٹوٹتا۔ جب کبھی موقع ملتا اور کوئی اہم مسئلہ سامنے آتا وہ لازماً وقت لیتے اور بولتے تھے۔ خاص طور پر وزارت تعلیم اور وزارت داخلہ کے معاملات پر ہمیشہ بولنے کے لئے بے چین رہتے۔ کیونکہ یہ دو محکمے ایسے ہیں جو عوام کی تعلیمی ثقافتی اور سماجی زندگی پر خاص طور سے اثر انداز ہوتے ہیں۔

پارلیمنٹ ہاؤس کی پریس گیلری سے میں نے بارہا حضرت مولانا کو بولتے سنا، وہ ایک وجیہہ انسان تھے۔ طویل قامت اور چھریرہ بدن، خوبصورت داڑھی، گرمی سردی کی رعایت سے سفید کھدر یا گرم پوٹو کی شیروانی، اور کھدر یا فر کی ٹوپی میں ملبوس۔ جب تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو ایک پُر وقار شخصیت نظر آتے تھے۔ ان کے ہاتھ لانبے اور مضبوط تھے ـــ ایک قومی سپاہی کے ہاتھ ـــ جو تقریر کے دوران مسلسل حرکت کرتے رہتے تھے۔ ان کے ہاتھوں کی یہ جنبش ان کی بے قرار توانائی کا مظہر تھی، جسے باہر نکلنے کے لئے خواہ اس پر کتنا ہی کنٹرول کیوں نہ ہو، راستے کی ضرورت تھی ـــ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ان کے منہ سے نکلی ہر بات کی تائید ہوتی تھی اور ظاہر ہوتا تھا کہ ان کا ہر جملہ ایک حقیقت اور سچائی ہے۔ وہ انتہائی صاف گو اور بیباک تھے۔ ٹکسالی اُردو میں چچے تُلے الفاظ بولتے کہ معلوم ہوتا تھا، منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ وہ جس مسئلہ پر بولتے، خوب بولتے اور پورے ایوان کو مسحور کر دیتے۔ فن خطابت میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔

بعض اوقات تقریر میں الفاظ کی تکرار ہوتی تھی۔ مگر اس کا مقصد اپنی بات میں زور پیدا کرنا ہوتا تھا۔ اکثر انگریزی الفاظ کو بھی شامل کر دیتے۔ تاکہ جنوبی ہند کے ممبران بھی پوری طرح سمجھ جائیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مدھیہ پردیش کی حکومت کو تنبیہہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا:۔

> "آج مدھیہ پردیش کی سرکار فیلیور ہوئی ہے۔ بھوپال سے لے کر آج تک کے جو واقعات ہوئے ہیں، انھیں دیکھ کر کہنا چاہئے کہ اسے حکومت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس طریقہ سے تباہ کر کے، کرش کر کے، برباد کر کے یہاں رکھا جائیگا تو یقینی طور پر اس کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔ اس طرح کے طریقوں کو بدلنا ہوگا اور صحیح معنی میں سیکولرزم کو لانا ہوگا۔"

ان کی تقریر موقع محل کے مطابق ہوا کرتی تھی۔ مذہبی اجتماع میں مذہبی، عوامی جلسوں میں عوامی اور پارلیمنٹ میں پارلیمانی۔ پارلیمانی تقریریں کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ کسی جگہ بھی . . . .

. . . حضرت مرحوم نے پارلیمانی ضابطے کی خلاف ورزی کی۔ قانون داں نہ ہونے کے باوجود ایسی ایسی قانونی موشگافیاں فرماتے تھے کہ اچھے اچھے وکلا حیران رہ جاتے تھے۔ آج کل ممبران اور خاص طور پر بعض مخالف ممبران موقع بموقع اور بعض اوقات غیر پارلیمانی زبان میں بول کر شہرت حاصل کرنے کی کوشش کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ لیکن حضرت مولانا مرحوم کا طرزِ عمل بالکل جدا تھا۔ وہ ایک بُردبار اور سنجیدہ ممبر پارلیمنٹ تھے۔ تمام سنجیدہ مسائل پر انتہائی سنجیدگی اور دلائل کے ساتھ بولتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نظریاتی اختلاف رکھنے والوں تک کو ان کے طرزِ تخاطب کی تعریف کرتے سنا گیا۔

حضرت مولانا ایک نڈر، جری اور بہادر انسان تھے، یہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ ملک کے اندر کسی کے ساتھ بے انصافی اور ظلم ہو، وہ نہایت صفائی اور بے خوفی سے سچی بات کہتے اور بعض اوقات نام نہاد "پارٹی ڈسپلن" تک کی پروا نہ کرتے تھے۔

وزارتِ داخلہ کے معاملات پر بولتے ہوئے، حضرت مولانا نے مدھیہ پردیش کی حکومت کو ایسے جراٗتمندانہ انداز میں للکارا کہ اُس وقت کے وزیرِ اعظم ڈاکٹر کاٹجو بے چین ہو گئے تھے۔ فرمایا :-

"جبل پور میں ساگر، دموہ اور کٹنی میں فسادات ہو جائیں، اور جو منسٹر ہیں وہ اسی طرح بیٹھے رہیں، کرسیوں پر قائم رہیں اور لوگوں کی جان و مال اور آبرو برباد ہوتے دیکھتے رہیں یہ اُن کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے چاہے اقلیتوں کا سوال ہو چاہے اکثریت کا۔ ہمیں سب ہی کی حفاظت کرنی ہے اور خاص طور پر اقلیتوں کی پوری قوت اور مضبوطی کے ساتھ کرنی ہے۔ میں ایمانداری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ پورے ملک کا سوال ہے، ملک کی آزادی کا سوال ہے، ملک کے وقار کا سوال ہے۔ ملک کی شانتی کا سوال ہے اور ملک کی سالمیت کا سوال ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس طرف خاص توجہ دی جائے۔

یہ صحیح ہے کہ حضرت مولانا آئین ساز اسمبلی یا پارلیمنٹ میں صرف مسلمانوں کے نمائندہ بن کر نہیں گئے تھے، بلکہ وہ پوری قوم کے نمائندے تھے۔ اس لئے کہ قومی بنیاد ہی پر اُن کا انتخاب عمل میں آیا تھا لیکن جہاں کہیں اقلیت کے ساتھ بے انصافی دیکھی۔ انھوں نے اس کے خلاف آواز اٹھانا اپنا فرض سمجھا۔

فسادات مدھیہ پردیش کے زمانے میں پارلیمنٹ میں اکثریتی فرقہ سے تعلق رکھنے والے ممبروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :-

"اگر سیٹھ گووند داس (جبلپور کے نمائندہ) نہیں بولیں گے تو حفظ الرحمان کو بولنا پڑے گا"

حضرت مولانا کو اکثر اقلیتی معاملات پر اسی بنا پر بولنے کے لئے مجبور ہونا پڑتا تھا کہ بہت کم دوسرے ممبروں کو اس بارے میں بولنے کی جراٗت ہوتی تھی۔ حق و انصاف کے لئے لڑنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں کہ وہ اقلیتی مسائل کے علاوہ کسی اور مسئلہ پر بولتے ہی نہ تھے۔

فروری ۱۹۶۱ء میں انھوں نے جو زوردار تقریر کی، اس میں انھوں نے نہ صرف مدھیہ پردیش کے واقعات پر ہی روشنی ڈالی بلکہ ہند چین کے تعلقات اور کانگو جیسے ملک کے اہم مسائل سے بھی بحث کی۔ چین کے معاملے میں واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ اُس نے :-

"ہندستان کے وسیع علاقہ پر قبضہ کر کے ہندستان کے ساتھ بے وفائی کی ہے۔ اور شرافت سے گری ہوئی زندگی کا ثبوت دیا ہے"

حضرت مولانا قدرے تیز اور مسلسل بولتے تھے۔ کہیں درمیان میں اٹکنے کا نام نہ تھا، اس لئے بعض نامہ نگاروں کو خاص طور پر انھیں جو اُردو زبان سے اچھی طرح واقف نہ تھے، کچھ دقت ہوتی تھی، لیکن انھیں حضرت مولانا کی تقریر سے خاص دلچسپی تھی، بڑی توجہ سے سنتے، اور کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو دوسروں سے پوچھ کر اپنے اپنے اخباروں میں بھیجتے۔

جب کبھی معلوم ہو جاتا کہ حضرت مولانا کو پارلیمنٹ میں بولنا ہے، میں بڑے اہتمام سے پریس گیلری میں پہونچتا۔ لیکن کبھی کبھی ایسا ہوا کہ اپنی بعض دفتری مصروفیات کی بنا پر نہ پہونچ سکا تو حضرت مولانا تقریر کو یا تو زبانی بتا دیتے اور یا پھر سرکاری طور پر آئی ہوئی تقریر کی نقل حوالے کر دیتے مگر ساتھ ہی ہدایت فرما دیتے کہ تحریر کو اچھی طرح دیکھ لینا۔ یہ اسٹینوگرافر لوگ بعض اوقات کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔

حضرت مولانا کو اپنی کسی پبلسٹی کا شوق نہ تھا، لیکن حالات کا تقاضا تھا اور خود قارئین الجمعیۃ اور عام لوگوں کی، جنھیں اقلیتوں سے خصوصی دلچسپی ہے، خواہش رہتی تھی کہ حق وانصاف اور ملک میں حقیقی جمہوریت کے قیام کے لئے پارلیمنٹ میں جو باتیں بھی ہوں اخبار میں تفصیل کے ساتھ آئیں۔ حضرت مولانا پارلیمنٹ میں جو کچھ فرماتے اس کی تفصیل کا تقاضہ بھی رہتا تھا اور ایسی تقریروں کے لئے تو قارئین بے چین رہتے جن میں ان کے دُکھ درد کی باتیں بیان کی جائیں۔ خود مولانا بھی پریس کی اہمیت سے واقف تھے، اور حکومت کو توجہ دلانے کے لئے کسی بھی مظلوم طبقہ کی شکایات ومطالبات کی اشاعت کو ضروری سمجھتے تھے۔

لیکن اگر اس راہ میں کارکنانِ الجمعیۃ کی طرف سے کبھی غفلت برتی گئی تو اس کا حضرت مولانا نے کبھی خیال نہ فرمایا۔ وہ انتہائی معتدل مزاج، متواضع اور خلیق انسان تھے۔ ان کے اندر وہ ضبطِ نفس تھا جو دارالعلوم دیوبند کا خاصّہ ہے جہاں کے وہ فارغ التحصیل تھے ایک مرتبہ پارلیمنٹ میں حضرت مولانا کی ایک معرکتہ الآرا تقریر ہوئی، جس کی مسلم نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت تھی، بدقسمتی سے تقریر کے دوران میں غیر حاضر تھا، کئی مرتبہ ایسا ہو چکا تھا کہ مولانا سے ان کی تقریر حاصل کی گئی، مگر اس مرتبہ مجھے ان کے پاس جانے میں تامّل ہوا مبادا دل میں کچھ خیال فرمائیں، حالانکہ یہ میرا خیال ہی خیال تھا وہ ایسی باتوں کی پرواہ نہ کرتے تھے — مولانا کو پریس گیلری سے میری غیر حاضری کا علم تھا، لیکن صبح کو جب ان کی پوری تقریر الجمعیۃ میں شائع ہوئی تو حیران ہوئے۔ ملاقات ہونے پر پوچھنے لگے کہ اتنی جلدی تقریر کہاں سے حاصل کی؟ اور جب میں نے بتا دیا تو بہت خوش ہوئے۔

حضرت مولانا جب دلّی میں ہوتے تو بڑی پابندی سے پارلیمنٹ جاتے تھے اگرچہ ان کی دوسری بے انتہا مصروفیات انھیں ہر روز وہاں پورے وقت نہ بیٹھنے دیتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود جب کبھی کوئی اہم معاملہ ہوتا تو وہ ہاؤس نہ چھوڑتے تھے۔

حضرت مولاناؒ کو سنٹرل ہال میں بھی بہت کم بیٹھنے کا موقع ملتا تھا لیکن جب بیٹھتے تو ان کے گرد ممبروں کی ایک بھیڑ ہوتی تھی۔ سرکردہ مسلم ممبران تو سبھی جمع ہو جاتے اور ان مسائل پر اہم مشورے کرتے تھے جن کا خاص طور پر اقلیتی حقوق سے تعلق ہوتا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات بالخصوص جبلپور، ساگر، علی گڑھ، میرٹھ اور چند دسی وغیرہ۔

ہنگاموں کے زمانہ میں اسی ہال میں ان کی نشست بڑھ گئی تھی کیونکہ یہاں ہر طبقہ وخیال کے ممبروں سے انھیں تفصیلی گفتگو کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

آج سنٹرل ہال کی مجموعی چہل پہل میں شاید کوئی کمی محسوس نہ کیجائے لیکن ملک کے اتحاد و یکجہتی اور ایکتا کے حامی ان ممبرانِ پارلیمنٹ کو یہ ہال ضرور خالی نظر آتا ہے جو گویا حضرت مولانا کو اپنا رہنما سمجھتے تھے، کم از کم دو ممبر خواتین — آپا انیس قدوائی (ممبر راجیہ سبھا) اور بہن سبھدرا جوشی (ممبر لوک سبھا) — ایسی ضرور موجود ہیں جن کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ایک جگہ بیٹھیں اور حضرت مولانا مرحوم کو یاد نہ کریں۔ فرقہ وارانہ ہنگاموں کے موقعوں پر ان دونوں خواتین ممبروں نے جو خدمات انجام دیں، حضرت مولانا مرحوم کے دل میں ان کی بڑی قدر تھی۔ دونوں کو حضرت مولانا کا پورا پورا اعتماد حاصل تھا۔

پارلیمانی زندگی میں، میرا حضرت مولانا سے پندرہ برس کا واسطہ رہا۔ اکثر وہ اکیلے جاتے اور میں پہلے یا بعد کو پریس گیلری میں پہنچتا لیکن کبھی کبھی ساتھ بھی ہو جاتا یا واپسی میں ان کی ہمراہی، اور پارلیمنٹ میں زیر بحث مسائل پر گفتگو کرنے کا موقع مل جاتا۔ کاش اس زمانے کی ان مختصر گفتگوؤں کے، جو کبھی کبھی پارلیمنٹ ہاؤس سے لال کنوئیں تک یا لال کنوئیں سے پارلیمنٹ ہاؤس تک ہوا کرتی تھیں، ریکارڈ میرے پاس محفوظ ہوتے اور اس ملک کے رہنے والے معلوم کر سکتے کہ حضرت مولانا کے دل میں قوم وملت کا کتنا درد تھا

حضرت مولانا جب آخری بار پارلیمنٹ کے لئے منتخب ہوئے تو وہ اپنی علالت کے باعث اپنے ووٹروں کے پاس نہ جا سکے اور وہ کام نہ ہو سکا جو آج کل کی الیکشن بازی کا حصہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ تقریباً ۷ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ یہ ان کی ہر دلعزیزی اور اپنے حلقہ کے عوام میں مقبولیت کا ثبوت تھا۔

جس وقت نتیجہ کا اعلان ہوا، حضرت مولانا بستر علالت پر تھے ہم لوگ پہونچے اور خبر سنائی۔ مولانا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے — انھیں خوشی اس بات پر تھی کہ بے انتہا مخالفانہ پروپیگنڈہ کے باوجود ابھی تک عوام کو ان پر اعتماد تھا۔

لیکن افسوس کہ قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ اپنے حلقہ اور پورے ملک کے باشندوں کی خدمت کے لئے ابھی کچھ اور دن ہمارے درمیان

رہیں۔ کینسر کی ناپاک بیماری نے انھیں آگھیرا اور بہتر سے بہتر علاج کے باوجود ان کی طبیعت بگڑ گئی، اور آخر میں روس اور امریکہ کے ڈاکٹروں سے مشورے ہوئے، تمام ڈاکٹری ریکارڈ دونوں ملکوں میں بھیجے گئے۔ روسی ماہرین نے ریکارڈ دیکھ کر حضرت مولانا کو روس آنیکا مشورہ نہیں دیا۔ لیکن امریکی ڈاکٹروں نے کچھ امید دلائی اور امریکہ جانے کا پروگرام بن گیا۔

حضرت مولانا جس دن روانہ ہونے والے تھے، اس دن پارلیمنٹ میں انھوں نے حلف اٹھایا۔ بہن سبھدرا جوشی صبح ہی انھیں لینے کیلئے حافظ ابراہیم (وزیر برقیات) کی کوٹھی پر پہونچ گئی تھیں، جہاں حضرت مولانا کا قیام تھا۔

پارلیمنٹ کے دروازے پر اُترے تو ان کے نیازمندوں نے جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا، ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ کمزور و نحیف تھے اور بمشکل سے چل سکتے تھے۔ لیکن جری۔ مضبوط ارادے کے مالک اور مستقل مزاج انسان تھے — ان کی انتہائی خطرناک علالت بھی انھیں پارلیمنٹ میں جانے سے نہ روک سکی۔

اسپیکر پارلیمنٹ کو حضرت مولانا کی علالت کا علم نہیں تھا انھیں متوجہ کیا گیا اور انھوں نے حضرت مولانا کو ان کی باری سے پہلے ہی حلف لینے کی اجازت دیدی تاکہ وہ جلد واپس جاسکیں۔

جوں ہی وہ اپنی سیٹ سے اُٹھے، میں پریس گیلری سے نیچے دوڑا اور انھیں دروازہ تک سہارا دینا چاہا — حضرت مولانا نے انکار فرمایا۔ لیکن ان کا یہ انکار ان کے ایک پرانے نیازمند کو اپنے فرض کی انجام دہی سے نہ روک سکا۔ ڈاکٹر سوشیلا نائر (وزیر صحت) اور مسز سبھدرا جوشی حضرت مولانا کے ہمراہ تھیں۔ مولانا موٹر میں سوار ہوئے اور اس ایوان پارلیمنٹ سے جس میں گزشتہ پندرہ برسوں میں ان کی جرأت و بے باکی اور حق و انصاف کے لئے آخر وقت تک جد و جہد کرنے کا مظاہرہ بہت سی بار دیکھنے میں آیا تھا وہ رخصت ہو گئے۔ پارلیمنٹ میں یہ حضرت مولانا کی آخری حاضری تھی — یا یوں کہئے کہ یہ ان کی پارلیمانی زندگی کا اختتام تھا — اسی شام حضرت مولانا بغرض علاج امریکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ جہاں وہ دو ماہ سے کچھ زیادہ عرصہ تک رہے۔

راقم الحروف جب امریکی حکومت کی دعوت پر ایک پریس پارٹی میں شامل امریکہ روانہ ہوا تو وہ میڈیسن میں زیر علاج تھے۔ خیال تھا کہ میں حضرت مولانا کو ہندوستان کے کروڑوں باشندوں کا پیغام محبت پہنچاؤنگا لیکن نہ صرف یہ کہ امریکہ میں حضرت مولانا سے ملاقات نہ ہو سکی، بلکہ واپس آنے کے بعد بھی ان کے دیدار سے محروم رہا۔ میری واپسی سے قبل ہی وہ ابدی نیند سو چکے تھے — ملک و ملت کا وہ روشن ستارہ غروب ہو چکا تھا۔ شاید ایسا روشن ستارہ ہم پھر کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔

؎ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اللہ تعالیٰ مرحوم کی قبر کو نور سے بھرے اور انھیں جنت الفردوس میں داخل کرے۔

آمین ثم آمین

میرے مشاہدات!

از جناب کنور مہندر سنگھ بیدی آئی اے ایس
ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سنگرور

۱۹۴۲ء میں میری پہلی بار دہلی تعیناتی ہوئی۔ میں ان دنوں نیشنل ازفر کا انچارج تھا۔ دہلی میں آنے کے فوراً ہی بعد مجھے مختلف سیاسی جماعتوں کے ارکین سے تعلقات قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ فرائض منصبی کی ادائیگی کے لئے بھی میرے لئے ایسا کرنا مناسب تھا۔ چنانچہ اسی سلسلے میں ایک روز گلی قاسم جان جمعیت کے دفتر پہنچا۔ وہاں بہت سے اصحاب موجود تھے۔ ایک لاغر جسم لیکن باوقار انسان مجھ سے ملنے کے لئے اٹھے۔ ان کے کتابی چہرے، نورانی ریش اور چمکدار آنکھوں سے متانت، تدبر اور استقلال کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ یہ تھے مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم و مغفور۔ بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور جب میں نے تخفیف تصدیعہ کہہ کر رخصت حاصل کی تو باہر تک مجھے پہنچانے آئے۔ پہلی ہی ملاقات میں مولانا نے میرے دل پہ ایک گہرا نقش چھوڑا۔

مجھے دہلی میں تقریب گیارہ برس سرکاری طور پہ رہنے کا موقع ملا۔ اس اثنا میں سینکڑوں بار مولانا سے ملنے کا اتفاق ہوا کئی بار سیاسی معاملات کی خاطر ملنا پڑا۔ بارہا دنیوی سلسلے میں ملاقاتیں ہوئیں۔ کئی بار میں نے ان سے ذاتی معاملات میں بھی مشورہ حاصل کیا۔ ہر ملاقات میں مولانا کی شخصیت، گفتگو اخلاق، تہذیب، مشرقیت، ذہانت اور سنجیدگی سے متاثر ہوا۔ مولانا کے ویسے تو ہزاروں نیازمند تھے۔ لیکن مجھ سے مولانا بڑی محبت سے پیش آتے تھے اور اپنے عزیز ترین نیازمندوں میں شمار کرتے تھے، ۱۹۴۷ء کے فسادات کے فوراً ہی بعد جب میں دہلی میں بطور سٹی مجسٹریٹ تعینات ہوا تو مولانا ایک روز غریب خانہ پہ تشریف لائے۔ ان کے دل و دماغ پہ ایک بوجھ سا تھا جیسے وہ کسی بڑی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ فرمانے لگے میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ باڑہ ہندوراؤ میں مسلمانوں کا اجتماع ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ وہاں چل کر ان کی ڈھارس بندھائیں۔ وہ آپ پہ اعتماد رکھتے ہیں۔ مولانا کے ہر حکم کی تعمیل کرنا میں اپنا فرض سمجھتا تھا اور پھر یہ تو مسئلہ بھی نہایت ضروری تھا۔ چنانچہ میں ساتھ ہو لیا۔ مولانا نے رسمی طور پہ مجمع سے میرا تعارف کرایا اور مجھے تقریر کرنے کے لئے فرمایا جلسہ کے اختتام پہ جب ہم گھر لوٹے تو مولانا نے اس خلوص اور محبت کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا جیسے میں نے ان کی گردن سے کوئی بھاری بوجھ اتار دیا ہو۔

فسادات کا یہ دور مولانا کے لئے نہایت اہم اور نازک تھا۔ دہلی کے مسلمان گھبرائے ہوئے تھے۔ بہت جا چکے تھے، باقی جانا چاہتے تھے۔ مولانا محسوس فرماتے تھے کہ ان کا دہلی سے ان حالات میں جانا جہاں ان کے اپنے مفاد کے خلاف ہوگا، وہاں ہندوستان کی بین الاقوامی شہرت اور عزت کے لئے بھی مضر ثابت ہوگا۔ چنانچہ چوبیس گھنٹے اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے تھے اور اس کوشش میں تھے کہ فضا ہموار ہو اور سبھی قومیں پھر سے پہلے کی طرح شیر و شکر ہو کر رہیں۔ اس دور میں مسلمانوں کی صحیح نمائندگی کا بوجھ یا تو امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اٹھا سکتے تھے یا مولانا حفظ الرحمٰن۔ اس لئے نہیں کہ دہلی یا ہندوستان میں اور کوئی صحیح دماغ مسلمان لیڈر نہیں تھا بلکہ اس لئے کہ مولانا آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن پہ سب قومیں اعتماد رکھتی تھیں اور ان کی ہر تجویز کو محض اس لئے نہیں ٹھکرا دیا جاتا تھا کہ ان میں کسی تعصب یا انتقام کا عنصر ہے۔

ان دنوں مجھے وقت بے وقت دہلی کے گلی کوچوں میں گشت کرنی پڑتی تھی۔ کبھی کبھار مولانا بھی ہمراہ ہوتے تھے۔ فضا مایوس کن ہونے کے باوجود مولانا کو ہندوستان کا مستقبل تاریک نظر نہیں آتا تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ہمارا ملک سیکولرزم کی صحیح مثال دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے اور کرے گا۔ چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ مولانا کی یہ پیشین گوئی کس قدر درست ثابت ہوئی۔

جو شخص اپنے عقائد کا پکا ہو بہادر بھی ہوا کرتا ہے۔ اسی جذبے نے دنیا میں غازی اور شہید پیدا کئے ہیں۔ مولانا بھی اپنی دھن کے پکے تھے، اور کبھی کسی مصیبت یا رکاوٹ سے گھبراتے نہیں تھے۔ میں نے ان کو کئی بار مخدوش علاقوں میں اکیلے چکر کاٹتے دیکھا۔ ایک بار لال کنواں بازار کی ایک گلی میں کسی پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ میں پولیس لے کر فوراً موقع پہ پہنچا، دیکھا کہ مولانا پہلے سے ہی وہاں موجود ہیں۔ میں نے گذارش کی کہ اب آپ تشریف لے جائیے۔ میں یہاں کی دیکھ بھال کر لوں گا۔ میں نے ہرچند چاہا کہ پولیس ساتھ کر دوں تاکہ مولانا کو گلی قاسم جان تک پہنچا آئے۔ لیکن مولانا نے انکار کر دیا اور فرمانے لگے کہ میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔ میں نے تعمیل حکم میں پولیس کو کہیں اور گشت کے لئے بھیج دیا۔ مولانا پیدل ہی واپس گلی قاسم جان کی سمت چل پڑے۔ بظاہر تو میں نے مولانا سے رخصت چاہی۔ لیکن جب وہ تھوڑی دور چلے گئے، تو میں آہستہ سے اُن کے پیچھے ہو لیا تاکہ راستے میں کہیں کوئی اور واقعہ نہ پیش آ جائے مولانا کی زندگی ہمارے لئے ایک بیش بہا سرمایہ تھی، جیسے ہم کسی قسم کے خدشہ

میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ اس واقعہ کا ذکر آج میں پہلی بار کر رہا ہوں۔ مولانا کو بھی اس کا علم نہ تھا۔ مولانا کی تمام عمر اسی جدوجہد میں گزری کہ ہم ہندوستانی بلا تفریق مذہب و ملت باہم اُنس و اخلاق سے رہیں اور اپنے محبوب وطن کی فلاح و بہبود کے لیے شانہ بشانہ کام کریں۔ جب لسانی مسئلہ نے نازک صورت اختیار کی اور یہ ایک مذہبی سا مسئلہ بن کر رہ گیا، اس وقت بھی مولانا نے اس طوفان بدتمیزی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انھیں ایام میں وِدیا شنکر جی آئی سی ایس سردار پٹیل کے سکریٹری تھے، بلکہ دست راست تھے۔ انھوں نے ایک روز مجھے یاد فرمایا اور کہا کہ سردار پٹیل یہ چاہتے ہیں کہ زبان کا مسئلہ تعصب سے بری رہنا چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ چند ایسے لوگ میدان میں آئیں جن کا کردار ہمیشہ سے غیر متعصب رہا ہے دونوں زبانوں کو نزدیک لانے کی کوشش کی جائے۔ ہندی کو بسر و چشم قومی زبان تسلیم کیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی پنپنے کا موقع دیا جائے۔ میں نے اس بارے میں جن معدودے چند حضرات کو ہم راز بنایا ان میں سے ایک مولانا حفظ الرحمٰن تھے اور دوسرے منشی گوپی ناتھ امن۔ ان دونوں کے مشورے سے دہلی میں اردو سبھا کا انعقاد ہوا۔ کچھ دیر تک اردو سبھا نے اس سلسلہ میں بہت اچھا کام کیا اور مولانا نے ہمیشہ اس کی سرپرستی فرمائی۔

مولانا مرحوم اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود ادبی سرگرمیوں کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے۔ ان کے ایماء سے درجنوں ایسے مشاعروں کا انعقاد ہوا جو اپنی مثال آپ تھے۔ شاعر حضرات انھیں خدا رکھے) اکثر زود رنج مشتعل مزاج ہوتے ہیں۔ ان مشاعروں میں اور ان کے علاوہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان لوگوں کو تعلقات بگاڑنے اور بنانے کے کافی مواقع ملتے ہیں۔ جب کبھی بھی شعراء میں ناچاقی ہو جاتی تھی۔ مولانا مرحوم کو ثالث بنا دیا جاتا تھا۔ اور دونوں فریق مکمل طور پر مطمئن ہو کر شیر و شکر ہو جاتے۔ ایک بار لال قلعہ میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس میں قبلہ جوش ملیح آبادی نے ایک نظم پڑھی۔ جس میں منتظمین مشاعرہ سے یہ گزارش کی گئی تھی کہ وہ سیاست کو ادب میں نہ گھسنے دیں۔ ادبی لحاظ سے نظم بہت اچھی تھی۔ لیکن اس مشاعرہ کے پس منظر کے نقطۂ نظر سے نہ پڑھی جاتی تو اچھا تھا۔ اس نظم سے مشتعل ہو کر میرے ایک اور عزیز دوست شاعر نے ایک قطعہ براہ راست جوش صاحب کے خلاف پڑھ دیا۔ جو کسی لحاظ سے بھی مناسب نہ تھا۔ ہم سب کو اس شاعر کا ایسا کرنا ناگوار گزرا۔ لیکن چونکہ جوش صاحب صرف میرے ہی اصرار پر اس مشاعرے میں شریک ہوئے تھے، میں مشاعرے سے اُٹھ کر چلا گیا۔ مولانا نے بھانپ لیا کہ میں احتجاج کے طور پر کنارہ کش ہوا ہوں۔ چنانچہ فوراً ہی میرے پیچھے اٹھ کر آ گئے اور فرمانے لگے کہ واقعہ افسوسناک ہے۔ لیکن میرے یوں اٹھ کر چلے جانے سے اور بھی زیادہ افسوسناک ہو جائے گا۔ یہ فرماتے ہوئے مجھے بازو سے پکڑ کر واپس لے آئے۔

مولانا کو ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل کبھی بھی تاریک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور وہ ہر مناسب موقع پر صاف صاف کہہ بھی دیا کرتے تھے ۱۹۵۵ء میں پاکستان سے تاجروں اور اخبار نویسوں کا ایک خیر سگالی وفد ہندوستان آیا۔ بھاٹک حبش خاں میں حافظ یوسف صاحب نے اس وفد کو چائے پر مدعو فرمایا۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ بڑی پر تکلف چائے تھی، اِدھر اُدھر سے بڑی لچھے دار تقریریں ہوئیں۔ مقررین نے دونوں ملکوں کے تعلقات بہتر ہونے کی دعائیں مانگیں۔ ہم سب نے آمین کہی۔ جب مولانا حفظ الرحمٰن کی باری آئی تو انھوں نے فرمایا اگر پاکستان والے ہندوستان کے مسلمانوں کی بہتری چاہتے ہیں اور اگر صحیح معنوں میں ان کے ہمدرد ہیں تو ہندوستان کے مسلمانوں پر رحم کریں اور اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دیں۔ ہندوستان کے مسلمان خود ہی اپنے حقوق کی دیکھ بھال کرنے کے اہل ہیں۔ وقتی طور پر شاید اس تقریر کا اثر پاکستانی وفد پر اچھا نہ پڑا ہو لیکن وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ مولانا نے کتنی اچھی بات کہی تھی

مولانا میں سب سے بڑا وصف جو میں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ ان کے دل میں کبھی بھی بے جا نام و نمود کی خواہش پیدا نہ ہوئی۔ اگر وہ چاہتے تو سرکاری طور پر کئی قسم کے اعزازات حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے کبھی اس کی پروا اس لیے نہیں کی کہ ایسا کرنے سے شاید وہ عوام کی اتنی خدمت نہ کر سکیں۔ آج کل کی سیاسی دنیا میں ایسے لوگ اگر نایاب نہیں تو نادر ضرور ہیں۔

مولانا کی طویل علالت کے دوران میں ان کے ہزاروں لاکھوں بہی خواہوں نے کیا کیا نہ دعائیں مانگیں، لیکن جو عدم سے وجود میں آئے ہیں انھیں واپس لوٹنا پڑتا ہے۔ دستِ اجل سے آج تک سوائے خدائے پاک کی ذات کے اور کوئی مفر حاصل نہ کر سکا۔ مہاتما گاندھی گئے، سردار پٹیل گئے، مولانا آزاد گئے، رفیع احمد قدوائی گئے، پنڈت پنت گئے۔ اب مولانا حفظ الرحمٰن چل بسے، خدا جانے اب اور کس کی باری ہے۔ ہمارے لیے اب اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے کہ صدق دل سے خداوند تعالیٰ کے حضور میں دعا مانگیں اور علامہ اقبال کا یہ شعر دہرائیں۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی

مولانا کی یاد

ہز ہائی نس
نواب سرور علی خاں
آف کوروائی

محترمی قبلہ انیس الحسن صاحب۔ السلام علیکم

میں پاکستان سے پہلے ہفتہ ستمبر میں واپس آیا۔ تو آپ کا عنایت نامہ ملا اور اب آپ کی یاد دہانی بھی وصول ہوگئی۔ قبلہ مرحوم کے لئے کیا عرض کروں۔ اللہ تعالےٰ نے کیسی ہستی کو ہمارے پاس سے بلالیا ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسی عظیم ہستی تھی کہ اس پر موت کے غلبہ کا یقین ایک دم مشکل سے آتا ہے۔ خاص کر ایسے زمانہ میں جب کہ قوم کو اس کی نازک حالت میں ان کی شدید ضرورت تھی۔ برصغیر ہند و پاکستان کا کونسا گوشہ ہوگا جہاں کے لوگ چاہے وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہوں مولانا مرحوم کے کمالات انسانی کی وجہ سے ان سے بخوبی واقف نہ ہوں۔ ویسے تو مولانا گزشتہ چالیس سے قومی زندگی میں ایک نمایاں حصہ ادا کرتے چلے آرہے تھے جس کے باعث ملک میں وہ ایک جانی پہچانی ہستی تھے اور لوگوں کے دلوں میں اپنے کارناموں کے نقوش ثبت فرما چکے تھے۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد کے پندرہ سال سے تو ان کی توانائیاں کچھ اس طرح نمایاں ہوئیں کہ قوم اور ملت کے جاذب نظر بن گئے۔ سنہ ۱۹۴۸ء سے قبل میں قبلہ مولانا کے بارے میں کچھ اخباری معلومات رکھتا تھا۔ مولانا کی تقاریر وغیرہ اکثر اخبارات وغیرہ میں نگاہ سے گزرتی تھیں، جس سے میرے دل میں مولانا کی طرف بے حد کشش پیدا ہوئی اور مجھے یہ آرزو ہوئی کہ مولانا کی فیضِ صحبت سے کچھ استفادہ حاصل کروں۔ اس شوق کی تسلی کے لئے میں نے مولانا کو چند یوم کے لئے کوروائی تشریف لانے کی دعوت دی۔ مولانا کے اخلاق کا یہ کیا کم کمال تھا کہ انھوں نے باوجود اپنی اہم مصروفیات کے میری دلی آرزو پہ لبیک کہہ کر شرف قبولیت بخشا اور کوروائی دو مرتبہ تشریف لائے اور اپنی فیض صحبت سے مجھے اور کوروائی کے باشندوں کو مستفید فرمایا۔ یہاں کے دوران قیام میں، میں ایک واقعہ بھول نہیں سکتا جس کا اثر میرے دل پہ ہمیشہ رہے گا۔ کوروائی میں ایک جناب حشمت حسین صاحب ملازمت سے ریٹائر ہوکر رہتے ہیں۔ بہت غربت میں بسر اوقات کرتے ہیں اور قبلہ مولانا کے دور کے رشتہ دار ہیں۔ مدت سے مولانا سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ البتہ مولانا کو علم تھا کہ وہ کوروائی ہی میں ہیں۔ مولانا کا قیام میرے محل پر تھا اور جناب کی آمد کا خیر مقدم اور استقبال بھی کافی شاندار ہوا جیسے ہی استقبال وغیرہ کا پروگرام ختم ہوا تو مجھ سے فرمایا کہ نواب صاحب میرے ایک رشتہ دار جن کا نام حشمت حسین ہے کوروائی میں رہتے ہیں۔ بہت عرصہ ہوا ان کا خط میرے پاس آیا تھا۔ وہ کثیر العیال ہیں اور غریب ہیں۔ لیکن میرے رشتہ دار ہیں ممکن ہے وہ مجھے بھول گئے ہوں لیکن میں انھیں نہیں بھولا۔ ان سے میں ملنا چاہتا ہوں۔ اتفاق سے اس روز حشمت حسین صاحب علالت کی وجہ سے مولانا مرحوم کے استقبال میں نہیں آسکے تھے۔ میں نے مولانا سے کہا کہ میں ان کو موٹر بھیج کر بلاتا ہوں۔ اس پہ فرمایا کہ "میرے لئے ان کا محل پر بلانا ان کی توہین ہوگی مجھے ہی ان کے پاس بھیج دیجیے"

اس کے بعد مولانا خود ان کے گھر گئے اور دوران قیام میں دو مرتبہ گئے۔ اس سے مرحوم کے اخلاق کا اندازہ ہوگا اس کے بعد ویسے تو کئی مرتبہ مجھے حاضری کا موقع ملا۔ لیکن اجین میں جمعیۃ علما کی جو کانفرنس ہوئی تھی۔ جس میں قبلہ مرحوم نے مجھے استقبالیہ کا صدر بنا دیا تھا وہاں کی شرکت کے ایام میں مولانا کی صحبت کا جو کچھ تاثر مجھ پہ ہوا وہ تو میرا دل ہی محسوس کرتا ہے، اس کے بعد کچھ میری زندگی ہی بدل گئی اور اب بفضلہ تعالےٰ اور مرحوم کی توجہات کی بنا پہ میں جو، میری زندگی ہے اور دینیات میں دینی ادائے ہیں یہ سب ان کا طفیل ہے اور اللہ تعالےٰ کا فضل

سب سے پہلے مولانا کی شخصیت خود ایک جاذب نظر تھی ان کی گفتگو و کردار لوگوں کو قدرتی طور پہ اپنی جانب متوجہ کر لیتا تھا اور ان سے ملنے کے بعد۔ ان سے گفتگو کرنے کے بعد ان کے سمجھانے کے بعد کوئی یہ نہیں کہتا تھا کہ "یہ کام میرے بس کا نہیں۔ یا میں اس کام کے قابل نہیں"۔ کچھ عجیب قابلیت اور ہمت اور استعداد وہ پیدا کر دیا کرتے تھے مجھے ہی دیکھئے۔ کہاں میں اور کہاں ممبری سنٹرل وقف بورڈ اگر مرحوم نہ کہتے تو عمر بھر نہ میں اس کو قبول کرتا اور نہ اپنے آپ کو اس قابل سمجھتا۔ پھر ماشاء اللہ ان کا تبحرِ علمی سونے پہ سہاگے کا کام دیتا تھا۔ الجھی سی الجھی بات کو ذرا سی دیر میں صاف فرما دیتے تھے۔ خطابت کی صلاحیت اور کمال تو قدرت کی طرف سے ماشاء اللہ ان کو خاص طور پہ ودیعت کیا گیا تھا۔ علم اور خاص کر علم دین کے وہ بحرِ بے کراں تھے صحیح معنوں میں انسان تھے۔ جس طرح علم دین میں وہ چوٹی کے عالموں میں شمار ہوتے تھے۔ اسی طرح سیاست کے بھی مردِ میدان تھے۔ پارلیمنٹ میں اور اس کے باہر ان کی بے باکانہ تقاریر اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ دوسری خصوصیت ان کی سادگی تھی مرحوم کی طبیعت کچھ اس قدر سادہ واقع ہوئی تھی کہ ان کے ملنے والوں پر ان کے تبحر علمی کا ذرا رعب نہ پڑتا تھا۔ اور

ہر شخص کو ان سے کوئی بات پوچھنے میں ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔ مرحوم نہایت نرمی سے ہر بات کو اس طرح سمجھا دیتے تھے کہ سننے والا مطمئن ہو جاتا تھا۔ ان کی ایک اور خصوصیت جس نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا وہ ان کی تواضع اور وضع کی پابندی تھی۔ باوجودیکہ مولانا ہندوستان کی چوٹی کی ہستیوں میں سے تھے مگر اتنے اونچے مقام پر ہونے پر بھی ان میں اپنی بڑائی کا احساس ذرا بھی نہ تھا۔ اجین میں بحیثیت صدر استقبالیہ میں نے مولانا مرحوم کے لئے اور دیگر علماء مہمانوں کے لئے ان کی مصروفیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے انتظام یہ کر دیا تھا کہ ان کا کھانا ان کے کیمپ میں پہنچا دیا جائے۔ لیکن کیا مجال۔ قبلہ مرحوم اصرار کے ساتھ جہاں عام لوگ کھانا کھاتے تھے وہیں آتے اور اسی حوض میں سے جہاں دو چار بیٹھے کھانا کھا رہے ہوتے ان کے ساتھ بسم اللہ کر کے شریک ہو جاتے۔ انداز گفتگو کچھ ایسا کہ پرزور ہوتا تھا۔ اس سے بعض لوگوں کو ضرور یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید مولانا کو احساس برتری ہے۔ مگر قریب کے جاننے والے بخوبی سمجھتے تھے کہ یہ ادعائے علم یا اپنی بڑائی کی بنا پر نہیں ہوتا تھا، بلکہ اخلاقی جرأت اور اپنی صلابت اور مضبوطی رائے کے باعث ہوتا تھا۔ جس بات کو مولانا اپنی صحت رائے کی بنا پر درست و مناسب سمجھتے تھے اس کے اظہار اور اس کے منوانے میں اپنی پوری صلاحیت اور زور کلامی سے کام لینے میں ذرا پس و پیش نہ فرماتے تھے ایسے معاملات میں مخالفت چاہے کسی بڑی سے بڑی ہستی کی ہو۔ مولانا اپنے موقف سے ایک انچ بھی ہٹنے پر راضی نہ ہوتے تھے۔ یہ طرز گفتگو ان کا فطری تھا جس میں تکلف کا ذرا شائبہ نہ تھا جس طرح ان کی خطابت اور گفتگو تکلف سے عاری تھی، اسی طرح وہ اپنے ملنے والوں سے بھی نہایت بے تکلفی سے ملتے تھے۔ مولانا کی حق گوئی اور بیباکی ان کا طرۂ امتیاز تھی۔

مولانا کی زندگی جو حقیقتاً ایک مجاہد کی زندگی تھی اور کہنا چاہئے کہ زندگی کا نچوڑ تھا وہ ان کی آخری پندرہ سالہ زندگی تھی جس میں انھوں نے ملت کی وہ ان تھک خدمات انجام دیں کہ ایک مجاہد کی طرح اپنی جان عزیز ملت کی خاطر قربان کر دی اور ملت سے مجاہد کا خطاب جو ان کو ملا تھا اس کو اپنی جان دے کر ثابت کر دیا اور مجاہد ملت کے مقام سے تجاوز کر کے شہید ملت کے درجہ پر فائز ہو کر رہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ہم پس ماندگان کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین

قطعات

شوکت دھام پور

(۱)

زندگی کے حسیں شبستاں سے
روشنی دور ہوتی جاتی ہے
تیرے جانے کے بعد محفل میں
شمع بے نور ہوتی جاتی ہے

(۲)

غم میں تیرے مجاہد ملت
دل پہ پژمردگی سی چھائی ہے
صرف میں ہی نہیں ہوں گریہ کناں
آج ہر آنکھ ڈبڈبائی ہے

حضرت مجاہد ملت میری نظر میں

منشی محمود قاسم۔ ترکیسر ضلع سورت

حضرت مولانا کو خداوند کریم نے یوں تو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ لیکن ایک خاص چیز جو آپ کو حاصل تھی وہ بہت کم کہیں نظر آ سکتی ہے۔ وہ آپ کا بے لوث خلوص اور سادگی ہے۔ وہ واقعی اسلامی لشکر کے جنرل تھے ۱۹۶۰ء کے موسم سرما میں جب اوجین میں جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس ہوا تھا اس موقع پر میری طبیعت ناساز تھی، سفر کی تکالیف برداشت کرنے کی مجھ میں بالکل طاقت نہ تھی، اس لئے دل کے بہت چاہنے کے باوجود اس میں شرکت کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ لیکن جب حضرت مجاہد ملت کی طرف سے ان الفاظ میں دعوت نامہ ملا کہ تمھیں جو بھی کام ہو اس کو چھوڑ کر اجین کے اجلاس میں حاضر ہو جاؤ تو میں نے کمزوری کے باوجود جلسہ میں شرکت کرنے کا ارادہ کر لیا یہ بات جب میرے دوست احباب کو معلوم ہوئی تو انھوں نے کہا تمھارے اندر کافی ضعف ہے تم کو اجین جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جمعیۃ علماء ہند کو میں مجاہد فی سبیل اللہ جماعت سمجھتا ہوں اور جب اسلامی امیر کا حکم حاضر ہونے کا ہوا تو میں اس کو جہاد سمجھ کر اس میں شرکت کیلئے جا رہا ہوں۔

بفضلہ تعالیٰ یہ مولانا کی کرامت تھی کہ نہ راستہ میں مجھے کوئی تکلیف ہوئی اور نہ اجین میں۔ اجین کا اجلاس بہت کامیاب رہا۔ اجین میں میں نے دیکھا کہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب لشکر اسلام کو لے کر شہر کے باہر جنگل میں چھاؤنی ڈالے ہوئے یو۔پی کے ڈیلی گیٹوں کے تنبو میں سب کے ساتھ زمین پر فرو کش ہیں۔ باوجودیکہ آپ کے لئے بہترین آرام گاہ میسر ہو سکتی تھی مگر آپ نے بے نظیر خلوص اور سادگی سے اسلامی مساوات اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا نمونہ پیش کر دیا

یادِ مجاہد ملّت۔ ایک سبق آموز عنوانِ حیات

(شاعر انقلاب علّامہ انور صابری صاحب)

دورِ حاضر میں زندگی کے ہر تقاضے کو سمجھ کر عوام کی خدمت کا جذبۂ لطیف حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو قدرت نے اپنی خاص عنایتوں کی بنیادوں پر عطا کیا تھا۔

وہ مذہبی اعتبار سے بالغ نظر عالم۔ ادبی لحاظ سے بلند پایہ صاحبِ طرز ادیب۔ اور سیاسی میدان کے مخلص، نڈر اور بیباک مجاہد تھے۔

میں انھیں ۱۳۴۵ھ سے جانتا ہوں۔ وہ اُس وقت مجھے عربی کی ابتدائی کتابیں دارالعلوم دیوبند میں پڑھاتے تھے۔ ۳۶ سال کی ملاقاتوں کا تجرباتی دَور اپنی ایک مستقل تاریخ رکھتا ہے۔

درسگاہ شیخ الہند کے تربیت یافتہ حلقوں میں ایمان و اسلام کے ساتھ عشق اور سرزمینِ وطن سے محبت کا جو حقیقی ہوش و جوش نصیب ہوا تھا، مولانا اس کی زندہ جاوید تفسیر تھے۔

ان کی گفتگو میں سنجیدگی و متانت کا شکوہ تھا اور نگاہوں میں پاک دامن شوخی، تبسم کی حسین موجوں میں زندگی کے تمام اہم اور صبر آزما مسائل کو بہا کرلے جاتے تھے۔

عمر بھر قومیت متحدہ اور تبلیغ دین کی راہوں پر چل کر اُنھوں نے کبھی تھکن محسوس نہیں کی جبر و تشدد ظلم و استبداد کے ہر لباس سے انھیں بغض تھا۔

انگریز کے فرعون مزاج دورِ حکومت میں اُنھوں نے وہ سب کیا جس کی توقع ایک حوصلہ مند، انسانیت نواز رہنما سے کیجا سکتی تھی۔ ”زبان و قلم“ سے برستے ہوئے سب انگارے برطانوی اقتدار کی جانب پھینکے اور جب تک اسے خاکستر ہوتے نہیں دیکھ لیا، اُن کی روحِ بیقرار کو سکون نہیں ملا۔

وہ دشمن کی ایذا رسانی کو عروجِ ایمان کا وسیلہ سمجھتے رہے اور اپنوں کی مخالفتوں میں منصفانہ روش سے کبھی نہیں ہٹتے تھے۔

سیرت پر بولتے تھے تو قرونِ اولیٰ کی سچّی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی تھی۔ سیاست پر تقریر ہوتی تھی، تو دلوں کے ولولوں کو قابو میں رکھنا مشکل ہوجاتا تھا۔

انگریز کی غلامی اور آزادی کے بعد ماحول کی یاس انگیزی کے زمانوں میں اُنھیں کبھی توحش نہیں ہوا۔ وہ ہر دور کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے اور ساتھیوں کی افسردہ دلی کو اولوالعزمی میں تبدیل کرتے رہے۔

محمود الحسن کے فکر و عمل، حسین احمد کے جہاد حریت۔ اور ابوالکلام کی ژرف نگہی فراست کو جب بھی یکجا کر کے دیکھیں گے تو اس ہیولے کا نام حفظ الرحمٰن صاحب کے سوا کیا ہوگا۔

میں نظری طور پر نہایت لااُبالی، قلندر منش اور آزاد طبع رہا ہوں میری ان تمام عیوب کے باوجود نہ جانے وہ آخر وقت تک کیوں مجھ سے محبت کرتے رہے ان کا خیال تھا کہ میں ”حفظ الرحمٰن“ کے نقطۂ فکر کو سمجھتا ہوں اور وقت کے دھارے کو پہچان کر، دماغوں کے سفینوں کو اشعار کی آہنگ دے کر صحیح رُخ پر لے جاتا ہوں۔

میری اور اُن کی بسا اوقات ایسی ملاقاتیں بھی ہوئیں جو نتیجہ کے اعتبار سے ظاہر بین نگاہوں میں شاید آخری ملاقاتیں کہی جاتیں۔ لب و لہجے کی کوئی تلخی ایسی نہ تھی جو در و نمانہ ہوئی ہو لیکن چند ساعتوں کا سکوت ان سب تلخیوں کو بھول جاتا تھا۔ اور جب وہ ”حسین و جمیل“ انداز نظر کے ساتھ دیکھ کر آبدیدہ ہوجاتے تھے تو میں اُن کی نگاہوں کو اپنے آنسوؤں میں جذب کرنے پر مجبور ہوجاتا تھا۔ وسعتِ قلب اور پُر خلوص رواداری کے معاملے میں وہ اپنی نظیر آپ تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر حسین احمد اور ابوالکلام کو بخاری کی زبان، اور حفظ الرحمٰن کی جرأت کردار نہ ملتی تو شاید مساعدتِ وقت کا وہ سماں نہ دیکھنے کو ملتا جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی رات میں فضاؤں کا حُسن بڑھاتا رہا۔

کردار و عمل کی تاریخ میں امروہہ کا اجلاس اپنی عظمتوں کا عظیم اجلاس تھا۔ اپنے مخالف بہکانوں کی سنگینیں چاروں طرف بلند۔ اچھے اچھے اربابِ شجاعت کے دل بھر آئے مگر شیخ الاسلام مولانا حسین احمدؒ کی حیات افروز صدارت، حفظ الرحمٰن کی عدیم المثال ہمت اور بخاری کی لازوال خطابت اس عمارت کا سنگِ بنیاد رکھ گئی، جو آج آزادی کے قصر رفیع کی صورت میں ہمارے

سامنے ہے اور قومی یکجہتی کا تصور اسی وقت سے پروان چڑھ کر آج روحوں اور دلوں کی تمناؤں کا مرکز بنا ہوا ہے۔

۴۷ء سے پہلے ہمارے مسائل کچھ اور تھے اور ۴۷ء کے بعد ان میں ہمت شکن تبدیلیاں آئیں عمل کے اس ماضی و حال میں حفظ الرحمٰن وہی تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ درحقیقت مولانا مرحوم اپنی موت کے بعد ایک ایسا عنوان چھوڑ گئے ہیں جس پر مسلسل لکھتے رہنا بھی کافی نہ ہوگا۔

اُن کی موت، پورے ایک دورِ عمل کی موت ہے۔ ولی اللّٰہی مشن کیلئے وجہ اضطراب اور مستقبل کے خطرات سے بچنے کی اُمیدوں کے چہرے کا رنگ ملال ہے لیکن اگر ہم میں حفظ الرحمٰن کی حقیقی تقلید کا جذبہ ہے تو پھر یہ موت ہماری نئی زندگی کا پیش خیمہ بھی ہے۔ دیکھیے یہ سوال کب اپنا جواب پاتا ہے۔

چند بیقرار آنسو

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن رح کی مرگِ ناگہاں پر

زہرۂ سخن سیدہ اختر

ہند سے اک رہنمائے باصفا رخصت ہوا
اک مجاہد ایک "مردِ لا الٰہ" رخصت ہوا

ہر تڑپتی جان کا کیف و سکوں گم ہوگیا
ہر دھڑکتے قلب کا اک آسرا رخصت ہوا

کشتیِ ملت چلی جاتی تھی جس کے ساتھ ساتھ
بحرِ جہد و عزم کا وہ ناخدا رخصت ہوا

ہوگئی افسردہ مہرِ حریت کی روشنی
اُف یہ کیسا "آفتاب حق نما" رخصت ہوا

کارواں کے واسطے ایک ایک راہ شوق میں
چھوڑ کر اپنے وہ روشن نقشِ پا رخصت ہوا

جس سے ایوانِ سیاست لرزہ براندام تھا
وہ صداقت وہ حقیقت آشنا رخصت ہوا

ابتدائے جہد میں اک جان جس سے پڑگئی
تھا جو خود اپنی جگہ اک انتہا رخصت ہوا

حفظِ رحمٰن پاگیا دامانِ رحمٰن و رحیم
جانبِ خلدِ بریں وہ پارسا رخصت ہوا

الغرض اختر فروغِ آدمیت جس سے تھا
آہ وہ انسانِ اخلاص و عطا رخصت ہوا

سرآمد روزگارے آں فقیرے

جنابہ حمیدہ سلطان صاحبہ انجمن ترقی اُردو، دہلی

"بولی اَمّاں محمد علیؒ کی
جان بیٹا خلافت پہ دیدو"

بجنور میں ایک بہت بڑا ہجوم ہماری کوٹھی کے سامنے کھڑا زور، زور سے گا رہا تھا۔ اور میں اپنے اور بھائیوں بہنوں کے ساتھ گول کمرے کی کھڑکی سے اس ہجوم کو حیرت و شوق کی نظروں سے تک رہی تھی۔ کوٹھی کے دونوں پھاٹک بند تھے۔ مسلح سنتریوں کی پوری ٹولی پہرہ دے رہی تھی۔ ہجوم اب نعرے لگا رہا تھا:۔

"ٹوڈی بچہ ہائے ہائے۔ انگریز نوکر شاہی چھوڑ دو۔"

اور یہ ہنگامہ اس لئے تھا کہ ابا جان بجنور کے سول سرجن تھے اور بجنور جیل بھی قاعدے کے مطابق ان کی نگرانی میں تھی۔

مولانا حفظ الرحمٰن اور غالباً حافظ محمد ابراہیم صاحب نیز کچھ اور سیاسی کارکن دو دن قبل بجنور جیل میں زیرِ حراست لے لئے گئے اور اس سلسلے میں ہماری کوٹھی کے سامنے اظہارِ ناراضگی کرتے ہوئے عوام پورے جوش و خروش سے مظاہرہ کر رہے تھے۔

میرے کان میں بی مغلانی کی آواز آئی۔ وہ والدہ صاحبہ سے کہہ رہی تھیں" اے بی بی! یہ نگوڑے کیوں بیکار اُتلم مچا رہے ہیں۔"

والدہ صاحبہ نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا:۔

"بُوا! کیا کہوں؟ مجھے تو خود اس کا افسوس ہے نہ جانے کیسے کیسے شریف لوگ ملک اور قوم کی خاطر قیدی دان بنے ہیں، مہینہ رمضان کا ہے۔ اور جو مسلمان ہوں گے، وہ اس گرمی میں روزے رکھ رہے ہوں گے۔ میں تو آج صاحب سے کہوں گی کہ ان بیچاروں کو پنکھے اپنے پاس سے منگوا کر دیں۔ کورے گھڑوں اور سحری کے لئے دودھ کا انتظام بھی خود کر دیں۔"

یہ ۱۹۲۲ء کا ذکر ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب خود فرماتے تھے کہ دودھ سحری کے لئے جو آپ کی والدہ نے مقرر کرایا تھا۔ وہ پھیکا ملتا تھا مگر یہ بھی غنیمت تھا کہ اس سے کچھ تسکین تو ہوتی تھی۔

مولانا صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ جیل کے احاطے میں کبھی کبھی انھوں نے اس زمانے میں مجھے اپنی آپا کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی سیاسی زندگی کے متعلق تو ان کے ساتھی اور سیاسی رہنما ہی لکھیں گے۔ میری بساط کیا ہے کہ جو اس عظیم انسان کی خدمات جلیلہ پر کچھ لکھوں، لیکن اتنا جانتی ہوں کہ مولانا کی طرح کے بہت کم قوم پرست ہوں گے جو عنفوانِ شباب میں ہی اپنے ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کیلئے جان کی بازی لگا بیٹھے تھے۔ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد مولانا کو مسلم آزاد کانفرنس کے زمانے میں دیکھا۔ ہمارا قیام ان دنوں ۲۳۔ سر یرام روڈ۔ سول لائن میں تھا۔ آکا بھائی[1] سے ملنے اور مشورے کرنے اکثر مولانا صاحب اُن دنوں تشریف لاتے تھے۔ مولانا کی رہائش جب قرول باغ میں تھی۔ مجھے کچھ ایسا شعور نہیں تھا کہ اُس وقت مولانا کے کاموں کی اہمیت سمجھ سکتی۔ ایک مذہبی رہنما سمجھ کر اُن سے عقیدت البتہ تھی میری واقفیت دراصل مولانا سے ۱۹۴۸ء سے ہوئی۔ اس زمانے میں دلّی، دلی والوں سے خالی ہو چکی تھی اور جو لوگ یہاں رہ گئے تھے وہ مایوس، غمزدہ، پریشان اور گھبرائے ہوئے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن اگر اس وقت ان مصیبت زدوں کو سہارا نہ دیتے، دُکھے دلوں کے لئے آسرا نہ بن جاتے تو دلّی میں مسلمان جم نہیں سکتے تھے۔ مولانا کی پُرنور مُسکراتی ہوئی صورت اور مشفقانہ اندازِ گفتگو صبح سویرے سے رات گئے تک غمزدہ مایوس لوگوں کو ڈھارس بندھاتا رہتا تھا۔ وہ ایک ایسے مسیحا تھے جنھوں نے جاں بلب قوم کو از سرِ نو زندگی بخشی۔ اور جمہوری نظام کو بحال کرنے کے لیے ہر وقت کام کیا۔ دورے، ملاقاتیں۔ ٹیلیفون۔ تقریریں، یہاں اور وہاں، سوتے اور جاگتے کام ہی کام اور آرام کا نام نہیں۔ اس انتھک محنت نے اس غازی مرد کو آخر جامِ شہادت پینے پر مجبور کر دیا۔ اب کہ مولانا کا جسدِ خاکی ہمارے سامنے نہیں، اِنکے

---

[1] فخر الدین علی احمد۔

کام، ان کا جذبۂ عمل، ان کی خود اعتمادی یقیناً ہمارے لئے مشعلِ راہ رہنی چاہئے۔ انسان اگر چاہے تو اپنے عزم سے، ہمت سے ہر مصیبت کو ختم کر سکتا ہے، مشکلات پر قابو پالیتا ہے۔ مولانا نے مسلمانوں کو سکھایا کہ وہ کبھی مایوس نہ ہوں، کبھی اپنا دل چھوٹا نہ کریں۔ ہمت و حوصلہ سے کام لیں اور زمانے کو اپنے ساتھ ساز کرنے کے لئے مجبور کریں۔

۱۹۵۰ء سے مولانا حفظ الرحمٰن انجمن ترقی اُردو شاخ دلّی کی مجلس عاملہ میں شامل ہوئے۔ بارہ سال مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ان بارہ سالوں میں مولانا نے شاخ دلّی کے لئے کیا کام کیا اور کس طرح اپنے مفید مشوروں سے ہماری رہنمائی کی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں تو ان کی اولوالعزمی اور کام کرنے کی بے پناہ طاقت پر حیران تھی۔ باوجود تمام مصروفیتوں کے انجمن کی مجلس عاملہ کی شاید ہی کوئی میٹنگ ایسی ہو گی جس میں مولانا تشریف نہ لائے ہوں۔ بیماری کے عالم میں بھی اکثر میٹنگ میں چلے آتے تھے۔ آخری میٹنگ مجلس عاملہ کی ۲۵ رنومبر ۱۹۶۱ء کو انکی صدارت میں ہوئی۔ اُس دن مولانا کا عالم یہ تھا کہ ان کو خاصا بخار تھا۔ کمبل لپیٹ کر آئے تھے۔ کھانسی دم بھر چین نہ لینے دیتی تھی۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ ان کا یہ حال دیکھ کر میں گھبرا گئی اور عرض کیا:۔

"خدا کے لئے مولانا! آپ آرام کیجئے، اتنا بھی کام کیا کہ انسان اپنا بالکل خیال نہ کرے۔ اس حالت میں تشریف لاکر آپ نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن آپ کی زندگی ملک کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔"

مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر فرمایا:۔

"ہاں، بھئی! ہاں، میں بھی سوچ رہا ہوں فرصت ملے تو کچھ دن آرام لے لوں۔ اب یہ الیکشن سر پر آگیا اس کے بعد میں ضرور آرام کروں گا۔"

پھر وہ اُردو کے مسائل پر گفتگو فرمانے لگے اور اپنی بیماری کو اس طرح بھول گئے گویا وہ بیمار ہی نہیں۔ اس عالمِ خود فراموشی نے مولانا کو موت کے چنگل میں قبل از وقت پھنسا دیا۔

مرکزی اُردو کانفرنس دلّی میں جو ہوئی۔ یہ مولانا حفظ الرحمٰن کی بدولت ہی اتنی شان سے ہوئی۔ اس کانفرنس میں جو لوگ شامل تھے۔ شاید پھر کسی اور کانفرنس میں نہ ہو سکیں۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ کا آخری دیدار بہت سے اُردو دوستوں نے جو باہر سے آئے ہوئے تھے اس کانفرنس میں کیا۔ اور اُن کی وہ آخری تقریر دلپذیر بھی سُنی جو حاصلِ کانفرنس تھی۔ اور اس دن بہت سے وہ لوگ جو مولانا آزاد کی ذاتِ گرامی پر اعتراض کرتے تھے ان کا کلمہ پڑھنے لگے اور یہ شاندار کارنامہ مولانا حفظ الرحمٰن کا تھا۔ اگر دلّی میں اُردو کانفرنس نہ ہوتی تو اس طرح لوگ کیسے مولانا کو دیکھ سکتے تھے اور سُن سکتے تھے۔ یوں تو بہت لوگ مجلس استقبالیہ میں شامل تھے اور ان میں سے اکثر ایسے عہدیدار اصحاب تھے جو اُردو کی خیر خواہی کا دم اُٹھتے بیٹھتے بھرتے رہتے ہیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس عظیم الشان کانفرنس کے لئے چندے کی فراہمی کا بوجھ بہت زیادہ مولانا حفظ الرحمٰن پر پڑا۔

میں خود کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ کئی سال تک مولانا کے ساتھ مل کر کام کرنے کا مجھے موقعہ ملا۔ جب بھی کوئی مشکل مسئلہ دلی شاخ کیلئے ہمارے سامنے آتا، مولانا کے ناخنِ تدبیر سے سُلجھ جاتا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کے لئے دلّی شاخ کی طرف سے تعزیتی جلسہ ہوا تو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے فرمایا:۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن ابھی آئیں گے۔ ایک دھواں دھار تقریر کریں گے۔ اپنے دلکش اندازِ بیان سے ہمیں نیا ولولہ اور ہمت کام کرنے کے لئے دیں گے۔"

میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں کہ مولانا اس دنیا سے نہیں سدھارے، کہیں لمبے سفر میں حسبِ معمول گئے ہوئے ہیں۔ کچھ ہی دن بعد ان کی مسکراتی صورت ہمیں دیکھ کر اطمینان ہو گا۔ ان کے مفید مشورے اُلجھے مسائل کو سُلجھا دینگے۔ وہ مجھے کچھ تنبیہہ فرمائیں گے۔ پھر مشفقانہ انداز میں زمانے کے نشیب و فراز بتائیں گے، اور اُردو کے لئے کسی مخصوص نشست میں اس طرح بے دھڑک بولیں گے کہ جس سے اُردو والوں کو نیا عزم ملے گا، دوست خوش ہوں گے اور مخالف اُن کا منہ تک کر رہ جائیں گے۔ کاش! یہ میرا خیال صحیح ہوتا۔ مولانا اپنے لمبے سفر سے واپس آکر ہماری رہنمائی فرما سکتے۔ لیکن اب تو ان کی مقدّس روح باری تعالیٰ کے حضور میں پہنچ گئی۔ مسلسل کام نے ان کو قبل از وقت ابدی آرام لینے پر مجبور کر دیا۔ بقولِ جگر؎

دل کو سکون روح کو آرام آگیا

وہ اپنے دوست کے پاس پہنچ گئے۔ لیکن ان کا کام، ان کا جذبۂ ایثار و عمل ہمارے سامنے ہے۔ اس عالم میں بھی کہ مولانا چند دن کے مہمان تھے اور کمزوری کا عالم یہ تھا کہ چند منٹ بات کرنے سے تھک جاتے

تھے۔ ان کے پاس تری پورہ سے مسلمانوں کا وفد آیا، اور ان سے کہا کہ وہاں سے مسلمانوں کو نکالا جارہا ہے، تو تڑپ گئے۔ مجھ سے اور انیس[1] باجی سے فرمایا "تری پورہ والوں کے لئے کچھ ہونا چاہیئے۔"

آکا بھائی[2] آسام سے آئے، مزاج پرسی کیلئے گئے تو ان سے بھی بہ اصرار کہا — کہ ان مظلوموں کی مدد کیجئے۔"

معاملہ چونکہ بنگال کا تھا، اس لئے انھوں نے کہا "مولانا! یہ کام تو مرکزی حکومت ہی کرسکتی ہے۔ ہم لوگ مجبور ہیں۔"

آخری مرتبہ میں ان کی خدمت میں وفات سے چار دن قبل حاضر ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا "آپ اچھی ہیں؟"

میں نے عرض کیا "مولانا! میں تو ٹھیک ہی ہوں آپ کی علالت نے البتہ ہم سب کو فکرمند کردیا ہے۔ خدا آپ کو صحت دے۔

مسکرا کر خاموش ہوگئے، اسی وقت ڈاکٹر سیّد محمود اور حافظ محمد ابراہیم صاحب تشریف لے آئے۔

حافظ صاحب سے مولانا نے فرمایا "میرے کشمیر جانے کا جلدی انتظام کرادیجئے۔"

اس کے چار دن بعد بجائے جنتِ ارضی کے مولانا جنت الفردوس سدھار گئے — لیکن اُن کی روح اب بھی یقیناً اپنی قوم و ملک کے لئے بے چین ہوگی۔

[1] بیگم انیس قدوائی [2] فخرالدین علی احمد وزیر مال آسام

زبیر فاروقی جونپوری

مرنے والے تری ہر ایک ادا پر شاہد — سرزمینِ وطن ہند کا ہر ذرّہ ہے
ہوگیا تیرا فدائی وہ ہمیشہ کے لئے — تیری پُرسحر نگاہوں نے جسے دیکھا ہے

تیرے احساس نے بخشی تھی تجھے روحِ عمل — تو نے باطل کے سہاروں کو گوارا نہ کیا
تیز دھاروں سے عزائم ترے لڑتے ہی رہے — تو نے خوابیدہ کناروں کو گوارا نہ کیا

مرنے والے ترے اوصاف کہاں سے لاؤں — بات جو تجھ میں تھی اوروں میں کہاں ملتی ہے
زور جو تیری زباں میں تھا کہیں اور نہیں — پختگی تیرے ارادوں کی کہاں ملتی ہے

چاہنے والے ترے، جاننے والے تیرے — اب کہاں جائیں علاجِ غمِ دوراں کے لئے
تھے جو ارباب معانی وہ اُٹھے جاتے ہیں — بدنصیبی ہے یہ اس دور کے انساں کے لئے

مجاہد ہے سویا ہوا آج رَن میں

از مولانا ابوالحسن حیدری الحسینی ـــ الہ آباد

وہی جس نے توڑا غلامی کا بندھن
وہی جس کو کہتے ہیں، سب مردِ آہن
وہی جس سے اسلام کا نام روشن
چھپائے ہوئے مُنہ کو اپنے کفن میں
مجاہد ہے سویا ہوا آج رَن میں

ہزاروں ہیں طوفاں نہیں ہو کنارا
کہاں بے سہاروں کا کوئی سہارا
نہیں وہ تو کوئی نہیں ہے ہمارا
اُداسی اُداسی ہے، ہر انجمن میں
مجاہد ہے سویا ہوا آج رَن میں

پڑھائے گا اب کون درسِ اخوت
ہوئی وقت سے پہلے افسوس رحلت
بہاروں میں بھی ہے وطن کی یہ حالت
خزاں جیسے آئی ہوئی ہو چمن میں
مجاہد ہے سویا ہوا آج رَن میں

جو تھا ٹوٹی کشتی کا طوفاں میں ساحل
جو بھارت میں تھا رہبرِ راہ منزل
اُجالی تھی ایمان کی جس سے محفل
شریعت کا وہ چاند آیا گہن میں
مجاہد ہے سویا ہوا آج رَن میں

جو سوئے تھے غافل انھیں یوں جگایا
کہ کھا کھا کے زخم آدمی مُسکرایا
نہ خطروں سے اس کو کبھی خوف آیا
خود آیا ہوا دام و دار و رسَن میں
مجاہد ہے سویا ہوا آج رَن میں

وہ ہمّت برابر جو آفت سے کھیلی
ہماری بلا اپنے سر بڑھ کے لے لی
مصیبت ہمارے لئے کتنی جھیلی
کمی پھر بھی آئی نہ کچھ بانکپن میں
مجاہد ہے سویا ہوا آج رَن میں

مجاہدِ ملّت مولٰینا حفظ الرحمٰن سہواروی ایک مصنّف کی حیثیت سے

از مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی

یوں تو قرآن کریم کو خدا کی آخری کتاب اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی تسلیم کرنے کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہی ہے کہ اسلام تاریخ عالم کے ہر موڑ پر بہترین رہنما ہے اور اسلام کی تعلیمات سیاسی اقتصادی و معاشی انقلابات کی اندھیریوں کے ہر طوفان میں شمع فروزاں بن کر انسانیت کے قافلہ کو منزل مقصود تک پہنچانے کی ضامن ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ ایک عقیدہ ہے جسے ایک مسلمان اپنے سینے سے لگا کر اپنی انفرادی حیثیت میں اپنی نجات کا وسیلہ بنا سکتا ہے۔ جب اسے دنیا کے سامنے دعوی کی صورت میں پیش کیا جائے گا تو اس کا ثبوت بھی پیش کرنا ہوگا۔

سائنس کے اس دور میں جب کسی بات کی واقعیت اور صحت کو تسلیم کرنے کے لئے اس کا مشاہدہ میں آجانا ضروری سمجھا جاتا ہے یہاں تک کہ خدا ملائکہ اور عالم غیب کے دوسرے حقائق کا بھی اس لئے انکار کردیا جاتا ہے کہ خوردبینوں اور دوربینوں سے ابھی تک ان کا نظارہ نہیں کیا جا سکا، یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ یہ دعوی کرتے رہیں کہ اسلام ہر زمانہ میں دین و دنیا کی صلاح و فلاح کا بہترین ضامن ہے مگر نہ دنیا کے نقشہ پر انگلی رکھ کر آنکھوں سے مشاہدہ کرا سکیں کہ اس ملک میں اسلام کا نظام جاری ہے اور یہاں سیاسیات، اقتصادیات واجتماعیات کے جو نظریات بروئے کار لائے جا رہے ہیں انھوں نے اس ملک کو رشک جنت بنا دیا ہے اور اس سے نیچے اتر کر یہ سمجھا بھی نہ سکیں کہ اگرچہ مسلمانوں کی بدقسمتی سے اس وقت اسلام کی جامعیت وکاملیت وکفایت کا کوئی عملی نمونہ ہم پیش نہیں کر سکتے مگر جہاں تک دلائل وبراہین علمیہ کا تعلق ہے ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اگر دنیا آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پرچم کے نیچے آجائے اور اسلام کے بنائے ہوئے نقشہ پر اس کی تعمیر کی جائے تو وہ طبقاتی ونسلی ولسانی جھگڑوں سے نجات پا سکتی ہے اور انسان اپنی اجتماعی وانفرادی زندگی میں امن و اطمینان کی دولت سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ گذشتہ تیرہ صدیوں میں جب بھی دنیا کسی اہم انقلاب سے دوچار ہوئی، امت محمدیہ کی صفوں میں سے کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ اٹھا اور اس نے کتاب وسنت کی مشعل روشن کرکے ضروریات وقت کی پیچ در پیچ وادیوں میں انسانیت کے قافلہ کو منزل مقصود کا راستہ دکھایا۔ ان میں سے بعض مجددیت کے منصب رفیع پر فائز ہوئے اور بعض نے یہ مقام بلند تو نہ پایا، مگر ان کے نقش قدم پر چلے اور ان کے شروع کئے ہوئے کام کو انجام تک پہنچایا۔

آج سے دو صدی قبل جب ہندوستان میں مسلم حکومت کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ کفر و شرک و بدعت کی اندھیریاں ہر طرف چھا رہی تھیں مسلمانوں کی اخلاقی و معاشرتی زندگی دم توڑ رہی تھی، کفر و اسلام کے اختلاط سے فرق باطلہ کے نئے نئے بھیانک چہرے نمودار ہو رہے تھے دوسری طرف یورپ میں علوم جدیدہ کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا، فلسفہ ومنطق ونفسیات ومعاشیات وسیاسیات کی بنیادیں نئے انداز پر اٹھائی جا رہی تھیں، تحقیقات وانکشافات جدیدہ نے پرانے نظریات کی دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی۔ ان علوم وفنون جدیدہ کی بنیادوں پر نئے نظام فکر وعمل مرتب ہو رہے تھے جنھوں نے آگے چل کر دنیا کا نقشہ ہی بدل دیا۔

ایسے وقت میں شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) جیسا بالغ نظر حکیم الاسلام پیدا ہوا، جس نے ان خارجی وداخلی فتنوں کا گہری نگاہ سے جائزہ لیا۔ پھر اپنی خدا داد فراست سے کام لے کر ملت کے ایک

ایک مرض کی نشاندہی کی اور اس کا علاج کتاب الٰہی کی کتاب شفا سے تجویز کیا۔

دوسری طرف حضرت شاہ صاحب نے اسلام کے اعتقادی، اخلاقی، اجتماعی اور فقہی نظام کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا اور ہر عقل سلیم پر اللہ تعالیٰ کی "حجۃ بالغہ" پوری کردی۔

شاہ صاحب کے پیش کئے ہوئے اسلام کے اس نقشہ کو سامنے رکھکر آج بھی اسلام کو ایک متحرک اور زمانہ حاضر کے مطالبات کو پورا کرنے والا مذہب ثابت کرنا مشکل نہیں ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے بعد اُن کے شروع کئے ہوئے کام کی تکمیل اپنے اپنے انداز پر اُن کے علمی خانوادہ کے دوسرے محترم ارکان نے کی جن میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا شاہ عبدالقادر مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید اور مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ ممتاز ہیں۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی

حضرت شاہ صاحب کے تقریباً ایک صدی بعد، وہ گھٹائیں برس چکی تھیں جو شاہ صاحب کے زمانہ میں اُفق مغرب سے اٹھی تھیں۔ انگریزی حکومت کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ اسلامی اقتدار کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہو چکا تھا۔ ہندوستانیوں کے جسموں کو برطانوی سنگینوں نے فتح کرلیا تھا، مگر دل و دماغ ابھی ان کی گرفت میں نہ آئے تھے۔ ان حالات میں اپنے اقتدار کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لئے مدبرینِ انگلستان نے یہ تدبیر سوچی کہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنالیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے عیسائی مشنریوں کی کھیپ کی کھیپ انگلستان سے ہندوستان آنے لگی اور جگہ جگہ مناظروں اور مباحثوں کے جلسے رچانے لگی۔ ان مشنریوں نے صرف تعلیماتِ اسلام ہی کو اعتراضات کا ہدف نہیں بنایا بلکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اطہر پر بھی ہر قسم کی گندگی اُچھالی گئی۔ عیسائی مشنریوں کی پشت پر حکومت کی پوری طاقت ہوتی تھی اور صوبوں کے گورنر تک ان کی ہر قسم کی مدد کرتے تھے۔ چنانچہ سر ولیم میور نے اپنی مشہور کتاب لائف آف محمدؐ (Life of Mohammed) ایک پادری ہی کی فرمائش پر لکھی۔

عیسائیوں کی دیکھا دیکھی برادرانِ وطن کے ایک گروہ نے جس نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہندو دھرم کی تجدید کا بیڑا اُٹھایا تھا اسلام پر حملے شروع کردیئے۔

"تاریخ کے اس نازک دور میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رح (م ۱۲۹۷ھ) میدان میں اُترے اور آپ نے فریضۂ جہاد و تجدید انجام دیا۔ آپ نے جہاد بالسیف اور جہاد باللسان والقلم کے دوگونہ فرائض ادا کئے معرکۂ شاملی میں آپ نے انگریزی فوجوں کا مسلح مقابلہ کیا اور شاہجہان پور اور دوسرے مقامات پر مذہبی معرکوں میں اسلام کا اس قوت سے دفاع کیا کہ مخالفین کے منھ پھیر دیئے۔

آپ نے اپنے مشن کو مستقل طور پر جاری رکھنے کے لئے ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی۔ ایشیا کی یہ سب سے بڑی دینی اسلامی درسگاہ بیک وقت مجاہدین ملت کا مضبوط قلعہ بنی رہی اور اسلامی علوم و فنون کا گہوارہ اور اسلامی ثقافت و روحانیت کا سرچشمہ بھی۔ دارالعلوم دیوبند نے گذشتہ سو سال میں جو فضلا پیدا کئے اُن میں سے اکثر نے بانی دارالعلوم کے اُسوہ کی تقلید میں سیاسی و دینی دونوں محاذوں پر کام کیا۔ ان میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن اور اُن کے ارشد تلامذہ مولانا عبیداللہ سندھی مولانا مفتی محمد کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی رحمہم اللہ تعالیٰ بہت ممتاز ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے تلامذہ کے تیسرے سلسلہ میں دیوبند کی بساط سے جو اصحاب علم و قلم اٹھے ان میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا نام سرِعنوان ہے۔ مولانا مرحوم میں اپنے بزرگوں کے دونوں رنگ موجود تھے۔

آزادیٔ وطن کے سلسلہ میں ان کی خدمات کا ذکر سورج کو آئینہ دکھانا ہے۔ برطانوی حکومت کی قہرمانی کے خلاف جس جرأت و بے باکی کے ساتھ انھوں نے کلمہ حق بلند کیا اور اس کی پاداش میں قید و بند کی جیسی سختیاں برداشت کیں وہ تاریخ آزادیٔ وطن کا سنہری باب ہیں۔ وطن عزیز کی آزادی کے بعد بھی انہیں چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا، وہ مرتے دم تک ان اصولوں کی خاطر جنگ کرتے رہے جنہیں تحریک آزادیٔ وطن کے رہنماؤں نے اپنی تحریک کا عنوان بنایا تھا اور اس جرم کی پاداش میں ہندوستان کی فرقہ پرست جماعتوں کی لعن طعن کا ہدف بنے رہے۔

مولانا کی زندگی کا یہ رُخ اُن کے دوسرے اوصاف و کمالات میں خصوصی حیثیت رکھتا تھا اس لئے عوام و خواص میں وہ " مجاہد ملت کے لقب سے

مشہور ہوئے۔ مجھے مولانا کی زندگی کے اس پہلو سے بحث کرنا نہیں، یہ کام دوسرے اہل قلم انجام دے چکے اور دیں گے، تاہم یہ عرض کرتا چلوں کہ ہندوستان کے ممتاز نقاد اور بلند پایہ مورخ، ڈاکٹر سیّد عابد حسین صاحب نے مولانا کی وفات کے دن مولانا کے فضائل کا ذکر کرتے ہوئے احقر کو مخاطب کر کے فرمایا:

" میری نظر ہندوستان کی گزشتہ نصف صدی کی سیاسی تاریخ پر ہے، میری رائے میں اس طویل مدت میں مسلمانانِ ہند پر کوئی عظیم شخصیت اس قدر اثر انداز نہیں ہوئی جس قدر مولانا حفظ الرحمٰن کی"۔

مجھے اس وقت مولانا کی زندگی کے اس پہلو پر ایک سرسری نظر ڈالنی ہے جو دب کر رہ گیا ہے۔ یعنی مولانا کی زندگی کا تصنیفی پہلو۔

دیوبند اور ڈابھیل کی تعلیمی زندگی

مولانا حفظ الرحمٰن جب دیوبند آئے تو اس وقت یہ گلستانِ علم حضرت الاستاذ علامہ انور شاہ کاشمیریؒ کے نغموں سے گونج رہا تھا۔ دیوبند کے قدیم اساتذہ کا یہ طریقہ تھا کہ وہ طلبہ کی صلاحیتوں پر گہری نظر رکھتے تھے اور جسے جوہر قابل سمجھتے تھے اسے چمکانے اور جگمگانے کی کوشش کرتے تھے۔ علامہ کشمیری کی نگاہِ انتخاب نے جلد ہی مولانا کو اپنی آغوش میں لیلیا اور مولانا علامہ کشمیری کے منظور نظر طلبہ میں شامل ہو گئے۔

ہم طلبہ کو مولانا کے اس تقرب کا اندازہ اس وقت ہوا جب حضرتؒ نے بحیثیت صدر جمعیۃ علماء ہند، اجلاس پشاور میں فارسی زبان میں خطبہ پڑھا اور اس کی اردو ترجمانی کا فرض اپنے اس ہونہار شاگرد کے کاندھوں پر ڈالا۔

اس کے بعد جب ۱۹۲۸ء میں دیوبند میں دارالعلوم کے انتظامی امور پر کشمکش ہوئی اور حضرت علامہ کشمیری، مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن دیوبندی اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے دیوبند چھوڑ کر ڈابھیل جانے کا فیصلہ کر لیا تو اس وقت ان بزرگوں کے ساتھ جن لوگوں نے رخت سفر باندھا ان میں مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (صاحب فیض الباری) مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب دیوبندی، مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کے علاوہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی بھی تھے۔ علامہ کشمیری کے یہ تلامذہ خاص اس وقت مدرسین کے زمرہ میں شامل ہو چکے تھے۔

ڈابھیل کے گوشہ عزلت میں بیٹھ کر مولانا حفظ الرحمٰن اور ان کے رفقاء کو حضرت شاہ صاحب اور علامہ عثمانی رحمہما اللہ تعالیٰ کے فیض صحبت سے مستفیض ہونے کا بڑا موقعہ ملا اور اس زمانہ میں یہ شیشے جلا پاکر آئینہ بن گئے۔

کچھ عرصہ بعد ڈابھیل کی یہ مجلس علمی منتشر ہو گئی اور پھر غالباً مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو درس و تدریس کی بساط پر بیٹھنے کا موقعہ نہ ملا۔ مگر اب مولانا نے اپنی علمی سرگرمیوں کے لئے تحریر کا میدان انتخاب کیا۔

ندوۃ المصنفین کا تصنیفی دور

۱۹۳۸ء میں فضلاء دیوبند کی اس نوجوان پارٹی نے قرول باغ میں 'ندوۃ المصنفین' کے نام سے ایک تصنیفی و تالیفی ادارہ قائم کیا، فضلاء دیوبند کے متعلق بعض حلقوں میں کہا جاتا تھا کہ وہ میدان تحریر میں پس ماندہ ہیں۔ درس و تدریس اور وعظ و تقریر کے ہی مرد میدان ہیں یہ اعتراض اس لحاظ سے تو غلط تھا کہ بعض فضلاء دیوبند کا تنہا تصنیفی و تالیفی کام بڑے بڑے اداروں کے کام پر بھاری ہے۔ مگر اس پہلو سے یہ نکتہ چینی درست تھی کہ اکابر دیوبند کی سرپرستی میں کوئی اجتماعی کام اس سلسلہ میں نہیں ہوا تھا۔

'ندوۃ المصنفین' کے قیام سے دارالعلوم دیوبند کی علمی و دینی خدمات کا یہ پہلو بھی نمایاں ہو کر سامنے آگیا۔

بہرحال 'ندوۃ المصنفین' قائم ہوا اور حضرت حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہما اللہ تعالیٰ کے انداز فکر و نظر پر وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلام کے احکام کی تشریح و تعبیر اور مستشرقین مغرب ریسرچ ورک کے پردہ میں اسلامی علوم و روایات اور اسلامی تہذیب و تمدن پر جو ناروا حملے کرتے رہتے ہیں ان کی مدلل تردید اس کا مقصد قرار پایا۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اس مجلس کے رفیق اعلیٰ اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ناظم، اور مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی، مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی اور مولانا حامد الانصاری غازی کے ساتھ ساتھ اس خاکسار کو بھی رفاقت کی عزت حاصل ہوئی۔ مولانا سیوہاروی کو اس زمانہ میں مجھے بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا اور ان کی علمی و عملی صلاحیتوں کا خوب اندازہ ہوا۔

مولانا کا قیام اس زمانہ میں 'ندوۃ المصنفین' کے دفتر کے قریب ہی شیدی پورہ کے ایک مکان میں تھا متعلقین بھی ساتھ ہی رہتے تھے۔ مولانا صبح و شام باقاعدگی کے ساتھ دفتر میں آتے تھے۔

'ندوۃ المصنفین' کا دفتر فیض روڈ (قرول باغ) پر ایک چھوٹی سی خوبصورت کوٹھی میں تھا۔ کوٹھی کے ہال میں بالکل وسط میں ایک خوشنما قالین پر ایک خوبصورت ڈیسک لگا رہتا تھا۔ یہ مولانا کی نشست گاہ تھی۔ اس کے دونوں پہلوؤں میں دوسرے رفقاء کی نشستیں تھیں۔ ہال میں چاروں طرف دیوار سے لگی ہوئی شاندار الماریاں کھڑی تھیں۔ قیمتی اور نادر کتابیں جن کی جلدوں کے سیاہ پشتوں پر سنہری حروف میں ان کے ناموں کے ٹھپے جگمگاتے تھے، الماریوں کے شفاف شیشوں میں سے جھانک جھانک کر اصحاب ذوق کو دعوت نظارہ دیتی تھیں

مولانا اپنے مقررہ اوقات پر تشریف لاتے۔ اپنی کھدر کی صاف ستھری شیروانی اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیتے، اپنی نشست پر جاتے اور ضرورت کی کتابیں ارد گرد پھیلا کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔

کچھ عرصہ بعد (۱۹۴۵ء میں) تو مولانا کے کاندھوں پر جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ کے منصب جلیل کی گرانبار ذمہ داریاں پڑ گئی تھیں۔ مگر اس سے پہلے بھی وہ جمعیۃ علماء ہند کے صف اول کے لیڈر اور مجالس دینی کے سحر بیان خطیب ہونے کی حیثیت سے ہندوستان گیر شہرت و عظمت حاصل کر چکے تھے اس لئے مولانا کو دور دراز شہروں کے سفر بھی کرنا پڑتے تھے اور قیام کے زمانہ میں باہر سے آنے والے احباب و معتقدین ملنے کے لئے بھی برابر آتے رہتے تھے۔ کام کے ساتھ ساتھ یہ ملاقاتیں جاری رہتی تھیں۔ اسی طرح سفر کے دوران میں تصنیفی کام بھی جاری رہتا تھا مولانا کے دوسرے اسباب کے ساتھ کتابیں بھی ضروری سامان سفر کی حیثیت سے ساتھ جاتی تھیں۔

مولانا نے اسی "خلوت در انجمن" میں "قصص القرآن" اور "اسلام کا اقتصادی نظام" جیسی معرکۃ الآرا علمی تحقیقی کتابیں لکھیں جن پر اردو لٹریچر ہمیشہ نازاں رہے گا۔ اس مختصر گنجائش میں مولانا کی بلند پایہ تصنیفات پر سرسری نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

قصص القرآن

معاندین اسلام کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وحی الٰہی کے اس ماہ تاباں پر جو چودہ سو سال سے آسمان صداقت پر جگمگا رہا ہے کسی طرح خاک ڈال سکیں اور اس کی حقانیت کے چشمۂ صافی کو اپنی کلوخ اندازی سے گدلا کر کے اپنی عداوت کی پیاس بجھا سکیں۔ اسلام کے نکھرے اور ستھرے عقائد روح پرور اور نظرافروز عبادات اور دلکش و دلآویز اخلاق کو تو ہدف اعتراض بنانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کی یہ کوششیں بھی ہمیشہ جاری رہی ہیں۔ مگر قرآن کریم کی حقانیت کو مشکوک کرنے کا ایک سہل طریقہ انھوں نے یہ بھی نکالا ہے کہ قرآن کریم کے بیان کردہ قصص و واقعات کو جدید تاریخی تحقیقات اور انکشافات کی آڑ میں غلط یا بے اصل ثابت کر دیا جائے۔

ان کی یہ کوشش اس لئے بھی ضروری تھی کہ قرآن کریم بیان قصص میں جا بجا توریت و انجیل سے اختلاف کرتا ہے اور انبیاء کرام کی مقدس زندگیوں کو جن معصیتوں سے ان کتب مقدسہ محرفہ میں ملوث کیا گیا ہے ان سے ان کے دامان عصمت کو پاک قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔ اس میں ملل و اقوام کے عروج و زوال کے جو واقعات اور اہل حق اور اصحاب باطل کے جو قصص و حکایات بیان کئے گئے ہیں ان کا مقصد محض تذکیر و موعظت ہے۔ تاہم جو واقعہ جس طرح کتاب الٰہی میں آ گیا ہے اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے اور اس زمانہ میں علماء اسلام کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ ان واقعات کی صحت کو معترضین کے جدید تاریخی و جغرافیائی مسلمات کی روشنی میں ثابت کریں۔

مصر میں رشید رضا مصری نے اپنی تفسیر "المنار" میں اور ہندوستان میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے 'ترجمان القرآن' میں ان گوشوں پر قلم اٹھایا ہے اور بعض بعض مقامات پر تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے مگر بدقسمتی سے یہ دونوں تفسیریں نصف قرآن سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ پھر جو کچھ ان میں ہے وہ ضمنی مباحث کے طور پر ہے۔ ضرورت تھی کہ "قصص القرآن" کو موضوع بنا کر قرآن کریم کے تمام قصص و واقعات پر تحقیق و تنقید کی نظر ڈالی جائے اور قرآن کریم کے روشن چہرہ سے معترضین کی اڑائی ہوئی ہر گرد کو صاف کر دیا جائے اس موضوع پر سب سے پہلے تو علامہ عبدالوہاب النجار مصری نے قلم اٹھایا اور "قصص الانبیاء" کے نام سے ایک متوسط درجہ کی کتاب مرتب کی۔ یہ دراصل ان کے ان لکچروں کی کتابی صورت تھی جو انھوں نے ۳۰ھ اور ۳۱ھ میں جامع ازہر کے قسم تخصص کے طلبہ کو دیتے تھے۔

علامہ نجار کا یہ علمی کام خاصہ اہم ہے مگر بہرحال 'نقش اول' ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یوں تو اس کتاب میں صرف انبیاء کرام ہی کے واقعات سے تعرض کیا گیا ہے۔ تمام قصص قرآنی سے بحث نہیں کی گئی۔ دوم اس

کتاب میں بحث ونظر کا دائرہ بہرحال محدود ہے۔ ساری کتاب (تیسرا ایڈیشن) ۷۶۴ بڑی تقطیع کے صفحات پر مشتمل ہے۔

مصر میں اس موضوع پر ایک اور کتاب مولا بک جادہ کے قلم سے قصص القرآن کے نام سے بھی شائع ہوئی ہے۔ مگر یہ کتاب صرف ادبی حیثیت رکھتی ہے علمی وتحقیقی قطعاً نہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے اس وادی میں قدم رکھا اور "قصص القرآن" کے نام سے اسے باغ وبہار بنا دیا۔ انشاء اللہ تعالیٰ مولانا کی نجات کے لئے ان کی یہ قرآنی خدمت کافی ہے۔

کتاب بے حد مقبول ہوئی اور مصنف کی محنت آخرت ہی میں نہیں، دنیا میں بھی مشکور ہوئی۔ خود مصنف رح نے اپنی اس محنت کو سرسبز ہوتے دنیا میں دیکھا اور اب انشاء اللہ تعالیٰ باغ جنت میں اس کے ثمرات سے متمتع ہو رہے ہوں گے۔

مولینا کتاب کے تیسرے حصّہ کے مقدمہ میں ارقام فرماتے ہیں:۔

"قصص القرآن کا یہ تیسرا حصّہ ہدیہ ناظرین ہے۔ پہلے اور دوسرے حصّہ کی افادیت اور قدیم وجدید علمی طبقوں میں ان کی مقبولیت، خدائے برتر کا وہ فضل وکرم ہے جس کے اظہار شکر کے لئے میرے قلم وزبان دونوں قاصر ہیں"

حقیقت یہ ہے کہ قصص القرآن کی اس جدید ترتیب وتدوین کے ساتھ اہل علم کا شغف، مصنف کی محنت وکاوش کا نتیجہ نہیں، بلکہ قرآن عزیز کی برکت وعظمت کا ثمرہ ہے، مسلمانوں کا کلام الٰہی کے ساتھ والہانہ ذوق اگر اس محنت کو مفید اور پسندیدہ سمجھتا اور اس کاوش کو بنظر استحسان دیکھتا ہے تو فالحمد للہ علیٰ ذٰلک و ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء"

قصص القرآن کے چار حصے ہیں اور پوری کتاب بڑی تقطیع کے ۱۴۰۸ صفحات میں سمائی ہے۔ مختلف حصّوں کی تقسیم اس طرح ہے۔

حصّہ اوّل:۔ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت موسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء کرام کے حالات وواقعات

حصّہ دوم:۔ حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ تک تمام پیغمبروں کے مکمل سوانح حیات اور ان کی دعوت حق کی محققانہ تشریح وتفسیر

حصّہ سوم:۔ بعض انبیاء کرام کے سوانح زندگی کے علاوہ دیگر قصص قرآنی، اصحاب الکہف والرقیم، اصحاب القریہ، اصحاب السبت اصحاب الرس، بیت المقدس اور قوم یہود، اصحاب الاخدود، اصحاب الفیل اصحاب الجنۃ، ذوالقرنین، سد سکندری، سبا اور سیل عرم وغیرہ کا مورخانہ ومحققانہ انداز میں بیان۔

حصّہ چہارم:۔ حضرت عیسیٰؑ اور خاتم الانبیا علیہما الصلوٰۃ والسلام کی مقدس سیرتوں کا بیان اور قرآن کریم کی روشنی میں اہم مباحث پر تبصرے۔

کتاب کا انداز ترتیب اور اس کی خصوصیات تالیف یہ ہیں:۔

(۱) بیان واقعات میں قرآن کریم کی تصریحات کو بنیاد واساس قرار دیا گیا ہے۔ پھر صحیح احادیث اور معتبر تاریخی روایات سے ان کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے۔

(۲) اہل کتاب کی کتب مقدسہ یا مغربی مورخین کی تحقیقات جدیدہ اور قرآن کریم میں جہاں تعارض نظر آیا ہے وہاں یا دلائل واضحہ سے دونوں کے درمیان تطبیق کی گئی ہے یا براہین قطعیہ سے قرآن کریم کی صداقت کو ثابت کیا گیا ہے۔

(۳) اسرائیلی روایات کی خرافات اور معاندین اسلام کی باطلیت کو حقائق مسلمہ کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے

(۴) تفسیری، حدیثی اور تاریخی مطالب ومباحث میں حتی الوسع سلف صالحین کے مسلک قدیم کو نہیں چھوڑا گیا اور آزادی فکر ورائے کے گھوڑے نہیں دوڑائے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ قصص القرآن کی یہ آخری خصوصیت کتاب کی روح ہے اور اس کا وہ امتیاز ہے جو اسے دوسرے جدید مصنفین اسلام کی کتابوں سے ممتاز کرتا ہے۔

ہندوستان اور مصر میں جن اہل علم وقلم نے جدید معترضین اسلام کے رد میں قلم اٹھایا ہے اور قرآن کریم کے چہرہ روشن سے ان کے اڑائے ہوئے گرد وغبار کو صاف کرنے کی کوشش کی ہے، انھوں نے بعض مواقع پر اس کے خدوخال کو ہی بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ حدیث صحیح حتیٰ کہ احادیث بخاری کی بھی ان کے ہاں خاص اہمیت نہیں۔ ان کا جچا تلا جواب ایسے مواقع پر یہ ہوتا ہے کہ

"ایک روایت پر صحت کی کتنی ہی مہریں لگ چکی ہوں لیکن بہرحال غیر معصوم انسانوں کی ایک شہادت اور غیر معصوم ناقدوں کا ایک فیصلہ ہے۔ ایسا فیصلہ ہر بات کے لئے مفید

حجت ہو سکتا ہے مگر یقینیات وقطعیات کے خلاف نہیں ہو سکتا"۔

پھر وہ "یقینیات وقطعیات" سے اپنا فہم اور اپنی تعبیر و تفسیر مراد لے کر ہر روایت صحیحہ کو رد کر دیتے ہیں۔

بے شک اس طرح وہ معترضین اسلام کے بعض حملوں کا دفاع کر دیتے ہیں اور اُن کا یہ فعل بڑا مخلصانہ اور ہمدردانہ ہوتا ہے، مگر اس کا ایک خطرناک نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ خود مدعیان اسلام میں ایسے گروہ پیدا ہوگئے ہیں جنھوں نے اپنی فاسقانہ زندگی پر اس اصول سے قرآن کریم کی مہر تصدیق ثبت کر لی ہے اور احادیث صحیحہ کو جو اسلامی زندگی کی تشکیل کرتی ہیں ناقابل اعتبار قرار دے کر اس کی جکڑ بند سے آزاد ہوگئے ہیں۔

مولانا سیوہاروی، مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنا سیاسی رہنما سمجھتے تھے اور اُن کے علمی و ادبی کارناموں کا بڑا احترام کرتے تھے، مگر سلف صالحین اور قدماء مفسرین کی تصریحات کے مقابلہ میں اُن کی تحقیقات جدیدہ کو اس وقت تک قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے جب تک اسے علم و تحقیق کے کانٹے میں تول نہ لیں۔ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں ذوالقرنین کی شخصیت اور سدّ یاجوج و ماجوج کے تعین کے سلسلہ میں جو معرکۃ الآراء بحث کی ہے اس کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا سیوہاروی لکھتے ہیں:۔

"تفسیری مطالب کے سلسلہ میں ہم کو موصوف کے ساتھ شدید اختلاف بھی رہتا ہے اور اتفاق بھی، لیکن اس خاص مسئلہ میں چونکہ ان کی رائے علماء سلف سے بالکل مختلف تھی اس لئے کڑی تنقیدی نظر کی محتاج تھی چنانچہ کافی غور و خوض اور گہری نظر کے بعد اس کی صحت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اور جب کہ یہ طے شدہ امر ہے کہ علماء سلف کی جلالت قدر اور علمی عظمت و برتری کے باوجود علمی تحقیق کا دروازہ بند نہیں ہے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں علماء متاخرین نے علماء متقدمین سے سیکڑوں مسائل علمی میں اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے، خصوصاً تاریخی مباحث میں اور جدید معلومات نے ایسے انکشافات کئے ہیں جن کے ذریعہ ہم بہت سے ایسے مسائل کو بآسانی حل کر لیتے ہیں جو علماء سلف کے زمانہ میں لاینحل رہے ہیں تو ہم کو مولانا آزاد کی اس تحقیق کا (خواہ وہ تاریخی لحاظ سے کتنی ہی وقیع کیوں نہ ہو) محض اس لئے انکار نہیں کر دینا چاہیئے کہ وہ ان کی اپنی تحقیق ہے"۔

پھر اسی کے ذیل میں بطور نوٹ لکھتے ہیں:۔

"اس مسئلہ کی پوری تحقیق میں ہم کو مولانا آزاد کے اس حصہ بیان سے سخت اختلاف ہے جو انھوں نے علماء سلف کے خلاف یاجوج و ماجوج کے آخری خروج کے متعلق تحریر فرمایا ہے اس لئے یہ حصہ تحقیق بلاشبہ باطل ہے۔"

(قصص القرآن جلد سوم ص ۱۵۶)

افسوس ہے کہ اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ورنہ ہم مثالیں دے کر واضح کرتے کہ مولانا کا معیار، رد و قبول علم و تحقیق رہا ہے جہاں انھوں نے مولانا آزاد یا کسی اور جدید محقق کی رائے کو قبول کیا ہے تو تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر کس کر، اور جہاں اسے رد کیا اور معترضین سابقین کی رائے سے اتفاق کیا ہے تو وہ بھی علم و تحقیق کی روشنی میں۔ نہ مفسرین قدیم کی آراء جلیلہ کو انھوں نے تقویم پارینہ قرار دیا ہے اور نہ محققین جدید کی تحقیقات حدیثہ کو شجر ممنوعہ۔

مولانا کی یہ کتاب چونکہ ان کی تمام کتابوں پر گل سرسید کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی گئی۔ اب مختصر طور پر دوسری کتابوں پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے۔

اسلام کا اقتصادی نظام

محنت اور سرمایہ کی ہمارے زمانہ میں جو کشمکش جاری ہے اور اس سلسلہ میں اقتصادی و سیاسی لائنوں پر جو گروہ بندیاں ہو رہی ہیں اس نے ساری دنیا کو میدانِ جنگ میں تبدیل کر دیا ہے۔ نئے نئے اقتصادی نظام، جاذب نظر عنوانات کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آ رہے ہیں اور دلفریب اور سامعہ نواز نعرے فضاؤں میں گونج رہے ہیں، مگر دنیا امن و راحت سے محروم ہے اور دلوں کو سکون نصیب نہیں۔

اسلام کو جو لوگ ہر دور میں انسانیت کی مشکلات کا حل اور امن و سلام کا پیغام قرار دیتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اس دعویٰ کو ثابت کریں اور بتائیں کہ فرعونیت اور قارونیت کے خنجروں سے تڑپتی ہوئی دنیا رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے پرچم کے سایہ میں ہی امن و

اطمینان کی دولت پاسکتی ہے۔ غالباً مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ؒ نے سب سے پہلے اس فرض کفایہ کو ادا کرنے کے لئے اردو زبان میں قلم اٹھایا اور ۱۹۳۹ء میں ان کی کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" کا پہلا اڈیشن شائع ہوا۔ چھ سال بعد ۱۹۴۵ء میں اس کا مکمل اڈیشن شائع ہوا اور اس طرح اس اہم موضوع پر جو عام طور پر ہمارے علماء کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہے، ایک بلند پایہ کتاب سامنے آگئی۔

مولانا اپنی اس مایۂ ناز محنت کو پیش کرتے ہوئے اس کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں :۔

"بہرحال میری اس نگارش میں نہ سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والوں کو دستِ غیب کا کوئی نسخہ ہاتھ آسکتا ہے اور نہ ان مذہب نما انسانوں کے لئے کوئی پیغام جانفزا دستیاب ہو سکتا ہے جن کے نزدیک دنیا کے یہ موجودہ ظالمانہ نظام ہی خدا کی مرضی اور اس کا منشا ہیں۔

میری یہ محنت صرف ان ٹوٹے دلوں کے لئے ہے جو موجودہ ظالمانہ نظام کی دستبرد سے مایوس ہو کر حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں اور کسی عادلانہ نظام کے بروئے کار آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

اور میری یہ پکار مذہب سے ناآشنا اور یورپ کے انقلاب سے مرعوب ان نوجوانوں کے لئے ہے جو الحاد کے جھوٹے مگر چمکتے ہوئے نگینوں کو جوہر گوہر جاننے اور دنیا کے اس ظالمانہ کردار کا ردعمل کبھی ہیگل اور کارل مارکس کے فلسفہ سوشلزم اور کمیونزم میں سمجھتے ہیں اور کبھی نیشنلزم اور یورپ کی ڈیماکریسی کو کعبۂ مقصود یقین کرنے لگتے ہیں۔

وہ دیکھیں اور غور و انصاف کی نگاہ سے دیکھیں کہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم کے بتائے ہوئے اور سلجھائے ہوئے نظام میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ظالمانہ نظام کے خلاف محنت و سرمایہ کی کشمکش اور طبقاتی جنگ سے نجات دلاتا ہے اور جس سے انسانوں کی آزادی اور عام خوشحالی کی ضمانت ہوتی ہے"۔

مولانا کی یہ محنت رائگاں اور یہ پکار بیکار نہ گئی۔ کتاب خاصی مقبول ہوئی اور اصحابِ ذوق نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مگر ضرورت ہے کہ اس کا انگریزی اڈیشن شائع کیا جائے تاکہ کتاب اپنے مقصد کو پورا کر سکے۔

مولانا کی اس کتاب کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں اور بھی کئی کتابیں اس موضوع پر لکھی گئیں۔ مثلاً مولانا گیلانی کی کتاب "اسلامی معاشیات" اور ڈاکٹر محمد یوسف کی کتاب "اسلام کے معاشی نظریے"۔ ان کتابوں کا بھی اپنا اپنا مقام ہے مگر الفضل للمتقدم۔

مولانا کی اس کتاب کا چوتھا اڈیشن بڑے سائز کے چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور مباحث ذیل پر دادِ تحقیق دی گئی ہے۔

(۱) اقتصاد و علم الاقتصاد
(۲) معاشیات کے جدید نظریئے
(۳) اصول معاشیات قرآن عزیز کی روشنی میں
(۴) انفرادی معیشت
(۵) اجتماعی نظام معیشت
(۶) بیت المال اور اس کے مصارف
(۷) زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت
(۸) مال گزاری، خراج اور
(۹) زمینداری
(۱۰) ربوا اور اس کے اقسام و احکام
(۱۱) بینک، کوآپریٹیو سوسائٹیاں اور مضاربت
(۱۲) کانیں، اجارہ داری کی کمپنیاں، ملیں اور کارخانے
(۱۳) زکوٰۃ، صدقات، وراثت اور اوقاف
(۱۴) اسلامی نظام کا دیگر اقتصادی نظاموں سے موازنہ
(۱۵) ہندوستان میں معاشی مسئلہ کا حل

یہ دراصل مختصر فہرست ابواب ہے مفصل فہرست مضامین نہیں۔ تاہم اس سے کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے

اخلاق و فلسفہ اخلاق

مولانا کی تیسری اہم علمی کتاب "اخلاق و فلسفہ اخلاق" ہے۔ "اخلاقیات" اسلام کے جامع نظامِ زندگی کا ایک اہم باب ہے۔ جملہ انبیائے کرام کا خاص مشن یہ رہا ہے کہ وہ انسانوں کو حسن عمل نیک کرداری اور نکوکاری کے زیورات سے آراستہ کریں اور دنیا کو محبت و رافت اور امن و راحت کا گہوارہ بنائیں۔ سیدالانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنی بعثت کا مقصد اعلیٰ ہی یہ قرار دیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا۔

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مکارم الاخلاق

اس لئے قرآن کریم کے علاوہ جملہ کتب حدیث میں مسائل اخلاق کے گلشن کھلے ہوئے ملتے ہیں۔

تاہم اخلاقیات کا تعلق دنیوی صلاح و فلاح کے لئے بھی اتنا ہی ہے جتنا آخرت کی سعادت وکرامت سے اس لئے ہر دور میں فلاسفہ نے بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے اور فلسفیانہ انداز میں مسائل اخلاق کی وضاحت کی ہے

حکمائے اسلام امام رازی، امام غزالی، عارف رومی، شیخ سعدی، حافظ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہم اللہ نے دونوں کے ڈانڈے ملا دیئے ہیں اور اخلاقیات اسلام کو فلسفیانہ انداز بیان میں اس شان سے پیش کیا ہے کہ بادۂ ناب رنگیں ساغر بلّوریں میں آکر روح پرور ہونے کے علاوہ نظر افروز بھی ہو گئی ہے۔

پھر جدید تحقیقات علمیہ کے اس دور میں یہ موضوع بھی انکا یہ جدیدہ سے سیراب ہو رہا ہے۔ ضرورت تھی کہ ان سرچشموں سے بھی موتی چن لئے جائیں اور ان سب کو ایک لڑی میں پرو دیا جائے تاکہ انبیائے کرام کی اخلاقی تعلیمات کے لعل و گوہر کی برتری و بہتری آفتاب کی کرنوں کی طرح عالم آشکارا ہو جائے۔ عالم اسلام میں اس طرف بہت کم توجہ کی گئی اور اردو زبان کا دامن تو اس گوہر مقصود سے بالکل خالی ہی تھا۔

مولانا سیوہارویؒ نے اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے قلم اٹھایا اور اس کا حق ادا کر دیا۔

مقدمہ کتاب میں مولانا فرماتے ہیں:-

"اردو میں اس سلسلہ میں جس قدر تالیفات موجود ہیں وہ جدا جدا نظریوں کے ماتحت تالیف کی گئی ہیں - جن حضرات کو مذہبی ذوق ہے انھوں نے جدید نظریہ ہائے اخلاق سے جدا ہو کر اپنی معروضات کو ایک ہی طرز میں ادا کیا ہے اور جن ارباب قلم کو جدید علمی نظریوں سے شغف ہے انھوں نے صرف ان ہی نظریوں کی تحقیق و تفتیش اور شرح و بسط کو اپنا منتہائے مقصد بنایا ہے۔ لیکن وقت کا تقاضا یہ تھا کہ اس سلسلہ میں ایک ایسی کتاب مرتب کی جائے جس میں ایک جانب جدید اکتشافات علمی کا مفید ذخیرہ محفوظ ہو اور زبردستی کے تعصب اور ہٹ دھرمی سے اس کے ساتھ معاندانہ روش اختیار نہ کی جائے اور دوسری جانب اسلامی اخلاقی تعلیم کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ صرف حسن ظن کی بنا پر نہیں بلکہ علمی دلائل و براہین کی روشنی میں اسلام کے نظریۂ اخلاق اور اسلامی تعلیمات کی برتری واضح ہو جائے۔

جہاں تک بیان و ترتیب کی اس نوعیت کا تعلق ہے "علم اخلاق" پر ایسی کوئی تالیف نظر نہ آئی۔ یہ دیکھکر اپنی بے بضاعتی علم کے باوجود عزم و ارادہ کی قوت نے ابھارا اور وجدان وضمیر نے پکارا۔

توفیق باندازۂ ہمّت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا"

یہ کتاب اپنی ترتیب کے لحاظ سے چار حصوں پر مشتمل ہے:-

(۱) پہلے حصہ میں علم النفس اور نفسیاتی مباحث ملکہ، وجدان، ارادہ وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

(۲) دوسرے حصہ میں اخلاق کے معیاری نظریات اور ان کے متعلقات نیز علم الاخلاق کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

(۳) تیسرے حصہ میں اخلاق کے عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے

(۴) چوتھے حصہ میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے کہ علمی و عملی دونوں اعتبارات سے دلائل و براہین کی روشنی میں ان کا کمال و تفوق ظاہر ہو جاتا ہے۔

بہرحال مولانا کی یہ تالیف بھی جو بڑی تقطیع کے تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ہے اردو زبان کے خزانہ میں ایک متاع گراں بہا کا اضافہ کرتی ہے اور مولانا اس کی ترتیب و تدوین پر علمی دنیا کی طرف سے خراج تحسین و تبریک کے مستحق ہیں۔

مولانا سیوہاروی کی یہ تینوں معرکۃ الآرا کتابیں ندوۃ المصنفین کے تصنیفی و تالیفی پروگرام کے تحت مرتب ہو کر شائع ہوئیں اور ندوۃ المصنفین کے علمی ذخیرہ میں ان کو "گل ہائے سرسبد" کی حیثیت حاصل ہوئی۔

ان کے علاوہ مولانا کے قلم سے ندوۃ المصنفین کے وجود میں آنے سے قبل دو اور کتابیں بھی نکلیں۔

(۴) البلاغ المبین فی مکاتیب سید المرسلین۔ اس کتاب میں

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان خطوط و پیغامات کو جمع کر دیا گیا جو آپ نے اپنے عہد کے سلاطین و امراء عالم کے نام لکھے۔ ان کا پس منظر اور ضروری تشریحات بھی اس انداز سے پیش کر دی گئی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق تبلیغ و دعوت وضاحت کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آجائے اور ہمارے علماء و مبلغین اس کو نمونہ و اسوہ بنا سکیں۔

یہ کتاب اس وقت نایاب ہے۔ راقم الحروف نے بھی اس کی اشاعت کے زمانہ ہی میں اسے دیکھا تھا۔ بڑی تقطیع کے غالباً دو سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔ ضرورت ہے کہ اسے پھر شائع کیا جائے۔

(۵) نور البصر فی سیرۃ خیر البشر۔ اس کا دوسرا نام "سیرت رسول کریم" ہے اور اسی نام سے معروف ہے۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ مبارکہ پر ۳۵۰ صفحات کی ضخامت کا رسالہ ہے جسے آپ نے ڈابھیل کے قیام کے زمانہ میں اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کی نصابی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تحریر فرمایا۔

انداز ترتیب یہ ہے کہ دلچسپ اور موثر انداز بیان اور مختصر الفاظ میں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کی مکمل تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ ہر عنوان کے تحت اس کے مناسب آیۂ قرآنیہ درج کر دی گئی ہے تاکہ واقعۂ مذکورہ اس آیۃ کی تفسیر بن کر سامنے آجائے۔ حیات طیبہ کے حسین و جمیل خد و خال کی عکاسی کے علاوہ نظام اسلامی کے نقش و نگار بھی واضح کئے گئے ہیں۔ یہ رسالہ آپ نے اپنے استاذ عالی مقام حضرت علامۃ الاستاذ مولینا انور شاہ کشمیری کے ایماء پر تالیف کیا۔ پہلے ایڈیشن کو حضرت ممدوح کی خدمت میں پیش کر کے اُن کی رائے گرامی بھی حاصل کی جسے تبرکاً درج کیا جاتا ہے۔ وھو ھذا!

"نور البصر فی سیرۃ خیر البشر" مولفہ جناب مستطاب مولینا مولوی حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی دام عزہ احقر کے اصرار پر تالیف ہوئی ہے۔ احقر کا خیال تھا کہ کوئی متوسط سیرت ایسی تالیف ہو کہ مدارس عربیہ اور مدارس قومیہ کے طلبہ اس سے بسہولت مستفید ہو سکیں اور حدیث شریف کے مشتغلین کو اجمالی بصیرت نصیب ہو اور کتب معتبرہ سے ماخوذ ہو اور اہل حق اور سلف کے طریقہ کے خلاف نہ ہو۔ بحمداللہ یہ مختصر کتاب ایسی ہی واقع ہوئی ہے۔ حق تعالیٰ مؤلف کو جزائے خیر نصیب کرے اور ان کی یہ خدمت بارگاہ خداوندی اور بارگاہ نبوت میں قبول ہو۔ آمین۔

محمد انور شاہ کشمیری عفا اللہ عنہ۔ یکم جمادی الاخری ۱۳۵۱ھ

کتاب کافی مقبول ہوئی۔ اس کا آخری مکمل ایڈیشن گزشتہ سال شائع ہوا ہے۔ "ٹائیٹل" کے لئے ڈیزائن پر غور و خوض کے وقت راقم الحروف کو بھی شریک مشورہ ہونے کی عزت حاصل ہوئی تھی۔ اس ایڈیشن میں سرورق پر مختصر نام "سیرۃ رسول کریم" درج کیا گیا ہے۔ پہلے ایڈیشن پر صرف "رسول کریم" تھا۔ اس سلسلہ میں مولینا مرحوم نے ایک لطیفہ بھی سنایا۔ فرمایا کہ "جب کتاب پہلی مرتبہ چھپی اور میں نے اپنے بچپن کے ایک اُستاد کو پیش کی (جو غالباً سیوہاروی تھے) تو وہ سرورق پر رسول کریم دیکھ کر بہت بگڑے۔ فرمانے لگے کیا اب "رسول کریم" کو فروخت کرو گے؟ چنانچہ میں نے محض اپنے اُستاد کے تعمیل ارشاد میں دوسرے ایڈیشن میں "سیرت" کا لفظ اضافہ کر دیا۔

میں نے عرض کیا یہ تو عام دستور ہے کہ سیرت کو صاحب سیرت کے نام سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ احقر کی کتاب کا نام بھی "نبی عربی" ہے جو ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی ہے۔ مولینا نے ہنس کر فرمایا، مگر میں اپنے اُستاد کو ناراض کرنا نہیں چاہتا۔

ان کتابوں کے علاوہ مولینا نے بالکل ابتدائی زمانہ میں ایک کتاب مناظرانہ رنگ میں حفظ الرحمٰن لمذہب ابی حنیفۃ النعمان بھی لکھی تھی۔ اس کا علم مجھے حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی زبانی ہوا، مگر مولانا بہت جلد فرقہ وارانہ نزاعات کے مقام سے بلند ہو گئے اور مولینا کی یہ کتاب بھی نسیاً منسیاً ہو گئی۔

اختتام کلام

مولانا سیوہاروی کی تصنیفی و تالیفی زندگی نے صرف دس سال کی مختصر مدت پائی۔ ۱۳۵۷ھ (ندوۃ المصنفین کا سال تاسیس) سے یہ دور شروع ہوا اور ۱۹۴۷ء کے ہولناک انقلاب پر ختم ہو گیا۔ اسی مختصر مدت میں یہ عظیم الشان تصنیفی کارنامے آپ نے انجام دیئے جن کو ہندوستان کے صف اوّل کے ادباء و مصنفین کی بہترین علمی خدمات کے مقابلہ پر بے تکلف پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے ممتاز اصحاب قلم کی طرح اگر مولانا کو قومی خدمات سے یکسو ہو کر اس میدان میں قلم کی جولانیاں دکھانے کا اور بھی موقع ملتا تو آپ کا مقام کیا ہوتا۔؟

انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد تو مولانا کی حالت یہ تھی کہ شعلۂ جوالہ بنے ہوئے ہندوستان کے ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک ناچتے پھرتے تھے۔ ملی زندگی کا کون گوشہ ایسا تھا جہاں مولانا مصروف عمل نہ ہوں۔ مسلم یونیورسٹی میں مولانا یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد کے تحفظ کے لئے جان لڑا رہے تھے، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اس کی انتظامی گتھیوں کو سلجھانے میں اپنی اصابت رائے کے جوہر دکھا رہے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کو سخت سے سخت مشکلات کے بھنور سے نکالنے میں اپنے اثر ورسوخ کو کام میں لا رہے تھے۔ حج کمیٹی میں حجاج کو آرام وآسائش پہنچانے کے لئے سرگرم عمل تھے۔ اصلاح اوقات کے لئے، وقف بورڈوں میں مولانا کی رہنمائی نشان منزل تھی۔ انجمن ترقی اردو کے لئے مولینا کی قیادت خضر راہ تھی اور پارلیمنٹ کے ایوان میں آپ کا نعرۂ حق ملت کے دکھے ہوئے دلوں کے لئے سرمایۂ سکون تھا۔

ان مسائل ملی کے سلسلہ میں مولینا ہندوستان کے کونہ کونہ کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔ پھر جب سفر کا یہ سلسلہ ٹوٹتا اور مولینا کا دہلی میں قیام ہوتا تو مولینا کا دربار عام خود مصروفیات کا خارزار ہوتا۔ وہ دیکھئے جمعیۃ علماء ہند کے دفتر کا صحن ہے۔ ایک طرف چبوترہ ہے جس پر چٹائی کا فرش بچھا ہوا ہے۔ ایک طرف مولینا کے رفقاء کرام حضرت مولانا محمد میاں اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن وغیرہ تشریف فرما ہیں۔ دوسری طرف ضرورتمندوں کا ہجوم ہے۔ برابر میں دو کرسیاں آمنے سامنے لگی ہوئی ہیں۔ ان پر معزز ملاقاتی بیٹھے ہیں چبوترہ کے مقابل دوسری طرف ایک کھری چارپائی بچھی ہے جو کبھی بستر سے آشنا نہیں ہوئی۔ البتہ ایک گاؤتکیہ ضرور ہے اور مولانا اس سے سہارا لگائے بیٹھے ہیں اور سب سے مسکرا کر باتیں کر رہے ہیں۔

کوئی بنگال سے آیا ہے تو کوئی گجرات سے۔ کوئی ہندو ہے یا کوئی مسلمان پارلیمنٹ کے ممبر بھی ہیں اور ملوں کے مزدور بھی۔ مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی مولانا ہر ایک کی بات باری باری توجہ سے سن رہے ہیں، کسی کو تسلی دے رہے ہیں، کسی کے لئے سفارشی خط لکھوا رہے ہیں، کسی کے کام کے لئے حکام سے ٹیلیفون پر بات کر رہے ہیں۔ سب مطمئن ہو کر واپس جا رہے ہیں۔ یہ لیجئے وہ ٹیلیفون آیا۔ فلاں مقام پر فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ بس اب مولینا کو قرار کہاں؟ بستر تو بندھا ہوا رہتا ہی ہے، ٹکٹ کی پارلیمنٹ کی ممبری کی وجہ سے ضرورت ہی نہیں، اب مولینا ہیں اور فساد کا شعلہ زار

گذشتہ سال اسی زمانہ میں علی گڑھ کے بعد میرٹھ فساد کی بھٹی بنا ہوا اکتوبر کی صبح صبح قیامت بن کر نمودار ہوئی۔ شام ہوتے ہوتے کرفیو لگا دیا گیا اور سارا شہر، شہر خموشاں بن گیا۔ کرفیو کی مہیب خاموشی میں جو "مرد مجاہد" شہر کی خطرناک گلیوں کا چکر لگا رہا تھا وہ یہی "حفظ الرحمٰن" تھا وہ واقعی "حفظ الرحمان" تھا جو مظلوموں کی دادرسی کر رہا تھا، اور مجروحوں کو تسلی وتشفی دے رہا تھا، حکام سے لڑ رہا تھا اور وزراء پر بگڑ رہا تھا۔

ان حالات میں کوئی بے وقوف ہی مولانا سے کہہ سکتا تھا کہ آپ اپنے قدم کی بجائے قلم کو گردش دیجئے۔ ہندوستان کے طول وعرض کو ناپنے کی بجائے ندوۃ المصنفین کے دفتر میں آ بیٹھئے۔ تاہم یہ بے وقوفی اس خاکسار نے کئی مرتبہ کی۔ مگر ہر مرتبہ مولانا نے آہ سرد بھر کر یہی جواب دیا:

"قاضی صاحب! جی تو میرا بھی چاہتا ہے کہ کچھ وقت
نکال کر "ندوۃ المصنفین" میں بیٹھا کروں اور لکھنے پڑھنے
کے کام کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑوں۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں
بات اپنے بس کی نہیں"

بے شک جس کے بس کی بات تھی اس کو مولینا سے وہ کام لینا تھا جو قسمت والوں ہی سے لیا جاتا ہے اور جس کا موقعہ تاریخ عالم میں صدیوں کے بعد ہی آتا ہے

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

تغمدہ اللہ برضوانہ ورحمتہ واسکنہ باعلیٰ
منازل جنتہ

مجاہد ملت رح بمبئی میں

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میرا غائبانہ اور عقیدت مندانہ تعلق اس وقت ہوا جب کہ میں عربی کی بالکل ابتدائی تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں حاصل کر رہا تھا۔ اس زمانے میں ہمارے مدرسہ میں جمعیۃ الطلبہ کا نیا نیا قیام ہوا تھا اور محی السنۃ حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارکپوری (متوفی ۵ ربیع الاول [illegible]ھ) رحمۃ اللہ علیہ کے دامن شفقت میں ہم لوگ علمی اور ذہنی پرورش پا رہے تھے۔ جمعیۃ الطلبہ کے کتب خانہ میں اردو کی بہت سی نئی اور معیاری کتابیں منگائی گئیں۔ ان ہی میں ایک کتاب "البلاغ المبین فی مکاتیب سید المرسلین" نام کی تھی جو مولانا ابوالقاسم محمد حفظ الرحمٰن صاحب صدیقی سیوہاروی کی لکھی ہوئی تھی۔ ان دنوں جو کتابیں آئی تھیں ان سب میں میرے بچپن کے ذوق کے مطابق یہ کتاب سب سے اہم اور بہتر تھی۔ میں نے اسے خوب خوب پڑھا اور بار بار پڑھا۔ یہ پہلا نقش تھا جو مولانا مرحوم کا میرے دل پر بیٹھا اور اسی وقت سے ان سے عقیدت پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ان کی دوسری کتاب "رسول کریم ﷺ" دیکھی اور پڑھی جو سیرت میں نہایت جامع اور مختصر تھی۔ یہ کتاب دراصل ایک عربی کتاب کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی مگر اس طرح کہ نہ ترجمہ، نہ اقتباس اور خلاصہ بلکہ مستقل تصنیف تھی۔

حضرت مولانا شکر اللہ صاحب ناظم جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور بڑے جوش و جذبہ کے بزرگ تھے ان کی ذات نے اپنے یہاں بڑا انقلاب پیدا کیا۔ تحریک خلافت میں جیل جا چکے تھے۔ قومی اور سیاسی تحریکات میں کانگریس اور جمعیۃ علماء کے ہمنوا بلکہ جمعیۃ علما کے فدائی تھے۔ پھر مقامی طور پر بدعات و خرافات اور ظلم و جبر کے خلاف زبردست محاذ قائم کر رکھا تھا۔ ان گوناگوں تحریکات و اصلاحات کی وجہ سے مبارکپور ان دنوں ارباب علم و فضل اور اہل سیاست کا مرکز بنا ہوا تھا۔ آئے دن جلسے جلوس ہوا کرتے تھے۔ جامعہ عربیہ احیاء العلوم کا سالانہ اجلاس ہر سال بڑی شان و شوکت سے ہوتا تھا اور اپنے سلسلے کے تقریباً تمام اکابر بڑے ذوق و شوق سے اس میں شریک ہوا کرتے تھے جس سے مبارکپور کی علمی، دینی، اصلاحی اور سیاسی فضا میں عجیب کشش اور زندگی پائی جاتی تھی۔ تمام جمعیتی اکابر و اصاغر اور علما عام طور سے آتے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں کہنا چاہئے کہ مشرقی یو۔پی میں مبارکپور مجاہد ملت کے لئے گھر کی طرح ہو گیا تھا۔ آئے دن تشریف لاتے تھے۔ مشرقی یو۔پی اور بہار وغیرہ آنے جانے حسب موقع ایک آدھ روز یا گھنٹہ دو گھنٹہ ہی کے لئے آجاتے۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ ایک ٹرین سے آئے اور دوسری سے واپس گئے۔ بہ صورت حال مولانا شکر اللہ صاحب کی زندگی تک برابر قائم رہی۔ اور ہم نیازمند مولانا مرحوم سے اس طرح گھل مل گئے تھے جیسے استاذ شاگرد بن گئے ہوں۔ ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۵۱ء تک راقم الحروف امرتسر، لاہور، بہرائچ اور ڈابھیل (ضلع سورت) میں رہا۔ اس پانچ چھ سال کی مدت میں مجاہد ملت سے ملاقات کا بہت کم موقع رہا مگر بعض بعض معاملات میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا اور بعض ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ یہاں تک کہ جب راقم بمبئی آیا اور یہاں پر مستقل قیام کی صورت ہو گئی تو مجاہد ملت سے تمام پچھلی ملاقاتوں سے بڑھ کر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ گویا تعلقات میں نئے باب کا اضافہ ہوا۔

مجاہد ملت کی بمبئی میں تشریف آوری سال میں کئی بار ہوا کرتی تھی پہلے تو جمعیۃ علماء صوبہ بمبئی کے اجلاسوں اور بعض دوسرے اہم کاموں کے سلسلے میں آنا ہوتا تھا۔ مگر بعد میں جب "میسیج" نکالنے کی باری آئی تو اس کے لئے رقم کی فراہمی کے سلسلے میں کئی مرتبہ آنا ہوا اور بعض اوقات مولانا مرحوم کو اس کام کے لئے ہفتوں ہفتوں ٹھہرنا پڑا۔ سنٹرل حج کمیٹی کی بمبئی میں میٹنگ، حجاج کی روانگی کا معائنہ، غیر ملکی اسفار اور مسلمانوں کے ضروری کام بار بار بمبئی آنے کا سبب بنتے رہے۔

—— ॥ ✻ ॥ ——

بمبئی میں مولانا مرحوم کا قیام شروع سے آخر تک یہاں کے مشہور عرب بزرگ، علمائے دین کے فدائی اور مخلص حاجی عبداللہ عرب سمکری صاحب خان منزل کھانڈیا محلہ کے گھر پر رہا۔ دونوں بزرگوں کی وضعداری آخر تک برابر قائم رہی۔ مولانا مرحوم جب یہاں تشریف لاتے تو بمبئی کے ہر طبقہ کے بڑے بڑے لوگوں کی آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ حکام، وزراء، علماء، سرمایہ دار، لیڈر، معتقدین، متعلقین، جان پہچان والے، ضرورت مند اور ہم جیسے حلقہ نشین اور خوشہ چین سب ہی زیادہ سے زیادہ مولانا کی مجلس میں رہنے کی کوشش کرتے اور مولانا مرحوم سب سے یوں ملتے اور بات چیت کرتے۔ جیسے سب سے ذاتی اور خصوصی تعلقات ہیں۔ بے تکلفی اور ادب کی ملی جلی یہ مجلسیں بڑی معلوماتی اور دلکش ہوا کرتی تھیں محترم حاجی عبداللہ عرب صاحب کے اسلامی اور عربی اخلاق کی وجہ سے ہر طبقہ کے لوگ ان کے گھر آنے جانے میں کوئی تکلیف نہیں محسوس کرتے تھے۔ حاجی صاحب بھی شروع سے لے کر آخر تک بڑی وضعداری اور اخلاص کا برتاؤ مولانا مرحوم کی طرح دوسروں کے ساتھ کرتے رہے اور اس میں سرمو فرق نہیں آنے دیا۔ مولانا مرحوم کو بڑے بڑے لوگوں نے اپنے یہاں ٹھہرنے کی بارہا پیش کش کی، مگر مولانا نے اپنی وضع نہیں بدلی اور بڑی

بے نیازی سے ہمیشہ معذرت فرمائی۔

میں عام طور سے فجر کی نماز کے وقت مولانا مرحوم کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ اس وقت اکثر مولانا حکیم اعظمی اور مولانا حامد الانصاری غازی بھی پہنچ جاتے تھے اور بھیڑ بھاڑ سے اس خالی وقت میں مولانا مرحوم کے ساتھ ہماری خصوصی مجلس ہوا کرتی تھی۔ عام طور سے کسی خاص علمی و دینی موضوع کی باتیں چھڑ جاتی تھیں پھر شام کو بھی عصر سے لے کر مغرب بعد عشا تک ہماری اسی قسم کی مجلس ہوا کرتی تھی۔ یہ اوقات ملنے جلنے والوں سے عام طور سے خالی رہتے تھے اور اگر یہ لوگ آتے تو ہماری باتوں میں شریک ہو جاتے۔ ان مجلسوں میں مولانا مرحوم عالمانہ رنگ میں ظاہر ہوا کرتے اور مختلف علمی اور دینی موضوعات پر گفتگو میں کھل کر حصہ لیتے۔

مولانا مرحوم کی زندگی ہمیشہ ایک رنگ میں گزرتی تھی۔ سفر ہو یا حضر اس میں فرق نہیں آتا، بے تکلفی، سادگی اور حقیقت پسندی کا یہ حال تھا کہ بمبئی جیسے شہر میں جہاں کے لوگ عموماً پوزیشن کا بے حد خیال کرتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ اس کی پوزیشن دیکھ کر ملتے جلتے ہیں۔ مولانا کی سادگی اور بے تکلفی بہت عام تھی تعلیم یافتہ، سرمایہ دار سیاسی اور سرکاری افراد کا مجمع ہو یا ہم لوگوں کی خصوصی مجلس مولانا ہر جگہ یکساں نظر آتے تھے۔ ایک مرتبہ شام کو مالا بار ہل پر تفریح کے لئے تشریف لے گئے۔ ساتھ میں ہم لوگ بھی تھے اور اونچے طبقے کے تعلیم یافتہ، مالدار اور صاحب حیثیت بھی تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے پہاڑ کی انتہائی بلندی پر ناز ہوٹل میں سب لوگ پہنچے جہاں سے مغرب بعد شہر بمبئی بقعہ نور نظر آتا تھا۔ غالباً سات آدمی تھے۔ آئس کریم کھانے کا بل چودہ روپیہ سے زائد آیا پھر نیچے اتر کر سب لوگ ٹہلتے رہے۔ مولانا نے سڑک کے کنارے ایک چنے بیچنے والے کو دیکھا تو لپک کر آگے بڑھے اور دو آنے کے بھنے ہوئے نمکین چنے لے کر ٹہلتے ٹہلتے کھاتے جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس میں جو مزا ہے وہ آئس کریم میں کہاں ہے؟ مولانا کی دیکھا دیکھی جن لوگوں نے شاید کبھی ایسا چنا نہ کھایا ہو، انھوں نے بھی خریدا اور کھانا شروع کیا، اسی طرح بے تکلفی کی اور بہت سی باتیں مولانا میں تھیں۔ ایک مرتبہ حاجی یحییٰ زبیر صاحب نے مولانا مرحوم کی پر تکلف دعوت کی۔ ہم لوگ بھی ساتھ تھے۔ انواع و اقسام کے یو۔پی کے طرز کے کھانے دستر خوان پر تھے اور یار لوگ بڑھ چڑھ کر ہاتھ مار رہے تھے۔ مگر مولانا مرحوم تھے کہ سب کچھ چھوڑ کر ارہر کی عمدہ دال اور سادے چاول کا مزا لے رہے تھے اور جب صاحب خانہ نے دوسرے کھانوں کے لئے اصرار کیا تو فرمایا کہ آج کئی دن کے بعد اپنے ذوق کی غذا ملی ہے۔ مہربانی کر کے مجھے کھانے دیجئے۔ اسی طرح اور بہت سے واقعات ہیں جن میں مولانا مرحوم بمبئی جیسے شہر میں بھی اپنی بے تکلفی ظاہر کرتے تھے۔ وہ بھی اس شان سے کہ دوسرے لوگ ان کو دیکھ کر سبق حاصل کریں۔

علمی اور دینی باتوں میں جو بات سمجھ میں آتی یا معلوم ہوتی نہایت صفائی سے فرما دیا کرتے۔ اگر ان کی ذاتی رائے ہوتی تو ساتھ ہی یہ فرماتے کہ میرا خیال یہ ہے مگر میں چونکہ مفتی نہیں ہوں اور نہ ان مسائل میں دخل دینا آج کل میرا منصب ہے۔ اس لئے مفتی حضرات جانیں اور اہل علم فیصلہ کریں۔ ایک مرتبہ ریڈیو اور ٹیلی گرام کے ذریعہ رویت ہلال کی خبر پر بحث چلی اور میں نے اس موضوع کو صبح کی مجلس میں پیش کیا۔ غالباً حکیم صاحب اور غازی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ لوگوں میں ان مسائل میں جرأت کی کمی ہے اور کھل کر کوئی فیصلہ نہیں کرتے ہیں جس کی وجہ سے عوام پریشان رہتے ہیں اور جب وہ کرنے لگتے ہیں تو آپ بھی اسے کرنے لگتے ہیں۔ یہ طریقہ اچھا نہیں ہے۔ اس معاملہ میں مولانا تھانویؒ کے متوسلین کا رویہ بہت اچھا ہے کہ ان میں جرأت ہے وہ ہر مسئلہ کی تحقیق کرتے ہیں اور جب تک بات سمجھ میں نہیں آتی اپنی رائے پر جمے رہتے ہیں اور جب تحقیق ہو جاتی ہے تو نہایت وسعت نظری کے ساتھ اس کا اعلان کرتے ہیں۔ مثلاً لاؤڈ اسپیکر اور تار اور ریڈیو کے ذریعہ چاند کی خبر کے عدم جواز پر وہ لوگ شدت سے مصر رہے۔ مگر ان کی تحقیق میں جب بات واضح ہو گئی تو اس کے جواز کا فتویٰ دیا اور بلا تردد اس کے حق میں ہو گئے۔

ایک مرتبہ ملکی و قومی مسائل کے سلسلے میں بات چلی، میں نے چند باتیں کھل کر کیں۔ مولانا مرحوم ان کے جوابات دیتے رہے اور سمجھاتے رہے۔ میں نے کہا کہ آپ کی یہ باتیں اطمینان بخش نہیں ہیں۔ بلکہ صرف اقناعی ہیں۔ یہ سن کر اپنے خاص رنگ میں آگئے اور کھڑے ہو کر بولے کہ میں آپ کی ان اصطلاحات سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔ بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ ہر بات اپنے خاص انداز و فکر ہی سے نہیں سوچی جاتی بلکہ حالات و واقعات کو سامنے رکھ کر اس پر غور کرنا پڑتا ہے۔

آخری مرتبہ جب علاج کے سلسلے میں بمبئی تشریف لائے تو ایک دن باتوں باتوں میں فرمانے لگے کہ الیکشن سے سالوں پہلے سے مجھ پر طرح طرح سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ میں یو۔پی کانگریس کمیٹی کا سکریٹری بن جاؤں۔ فلاں فلاں نے مل کر زور ڈالا، اور فلاں فلاں نے ٹیلیفون پر اصرار کیا۔ ظاہر ہے کہ صوبہ کے امیدواروں کی درخواست وغیرہ کا معاملہ کانگریس کمیٹی کے سکریٹری کے ہاتھ میں تھا۔ کانگریس کا سکریٹری بن جانا صوبائی حکومت مل جانے کے مرادف تھا۔ مگر میں نے اصرار کے ساتھ اس عہدہ سے اس لئے صاف انکار کر دیا کہ اس کے بعد پھر مسلمانوں کے معاملات میں کھل کر حصہ نہیں لے سکتا ہوں اور میری دوڑ دھوپ اور زبان بھی بند ہو جائے گی، مجھے عہدہ نہیں چاہئے، بلکہ خدمت چاہئے اسی جذبہ کے ماتحت میں امیدوارین کر کھڑا ہوا ہوں۔ میں بمبئی میں زیر علاج ہوں مگر میرے حلقے میں کہاں کہاں سے مخلصین آ کر کام کر رہے ہیں۔ اگر مجھے آرام کرنا ہوتا تو آج بھی اس کے بہت سے

مواقع ہیں، بلکہ پیش کش ہے۔

ان ہی ایام میں ایک دن میں نے کہا کہ یو، پی کے وزیر داخلہ نے آپ پر جو الزامات لگائے اور آپ نے جو صاف صاف جوابات دیئے اس کے نتیجہ میں آپ کے سرکاری اور سیاسی حلقہ کے لوگوں سے تعلقات کیسے ہیں؟ اور دہلی میں جو ایک گروپ جمعیۃ علماء کی شکایت اور شکایات میں پیش پیش رہ کر اپنے مفاد کے چکّر میں تھا اس کی دوڑ دھوپ کا اثر کچھ ہے یا نہیں، تو مولانا مرحوم نے فرمایا کہ جہاں تک وزیر داخلہ کے الزام اور میرے جواب کا تعلق ہے اس سے سرکاری یا سیاسی حلقہ پر کوئی خاص اثر نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ بلکہ اس سلسلہ میں کئی باتیں صاف ہوگئیں اور لوگوں کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہوگئیں۔ جمہوری سیاست میں ایسی باتیں عام طور سے مفید ہی ہوا کرتی ہیں اور جمعیۃ علماء کے مخالف گروپ کی سرگرمی اب تھک تھکا کر ٹھنڈی پڑ گئی ہے۔ ان بے چاروں نے جس مقصد کے لیے یہ سب کام کیا تھا وہ پورا نہ ہوا حتیٰ کہ الیکشن کے زمانہ میں حکومت کی طرف سے جو سیاسی جماعتوں کو ریڈیو پر اپنا پروپیگنڈا کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے اس میں کانگریس کے مقرروں میں حفظ الرحمٰن کا نام بھی رکھا گیا ہے جب کہ ان بے چاروں کا کہیں پتہ تک نہیں ہے۔ اختلافات اپنی جگہ پر ہوتے ہیں۔ ٹکراؤ ہوتا ہے اور شکوہ شکایت کی باری بھی آتی ہے۔ مگر کام کرنے والوں کو لوگ خوب جانتے ہیں اور وہی کام بھی آتے ہیں

مولانا مرحوم کا افریقہ جاتے آتے بمبئی میں رکنا ہوا تھا۔ واپسی پر کئی دنوں تک مقیم رہے۔ چونکہ چند ہفتوں کے لئے ملک سے باہر رہے اور ملکی معاملات وحالات سے متاثر نہیں تھے۔ اس لئے افریقہ کے دلچسپ حالات، وہاں کے فطری مناظر، سیر و تفریح، سیاسی اور ملکی حالات بڑے دلچسپ انداز میں بیان فرماتے تھے۔ متعدد راتوں کو اس کے لئے ہماری مجلسیں جمتی تھیں۔ میں سوالات کرتا اور مولانا معلومات بہم پہنچاتے اور مجمع غور و شوق سے سنتا ایسا معلوم ہوتا تھا ابن بطوطہ اپنے کوائف سفر کو ابن جری کے سامنے بیان کر رہا ہے اور وہ قلم بند کرتا جاتا ہے افسوس کہ میں نے یہ کوائف سفر قلم بند نہیں کئے۔ ورنہ شمالی افریقہ کے بارے میں ہمارے لئے اچھا خاصہ معلوماتی مقالہ تیار ہو جاتا۔ اب بھی مولانا کی بیان کردہ بہت سی باتیں ذہن میں موجود ہیں۔

ان تمام نجی مجلسوں میں عام طور سے محترم مولانا حکیم اعظمی صاحب صدر جمعیۃ علماء مہاراشٹر اور محترم مولانا حامد الانصاری غازی سکریٹری جمعیۃ علماء مہاراشٹر اور راقم ہوا کرتے تھے۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے عام طور سے میں بات نکالتا تھا۔ اگر الٹی سیدھی بات ہو جاتی تو اسی وجہ سے قابل درگذر بھی ہوا کرتی تھی۔ چونکہ مولانا مرحوم خود جرأت مند انسان تھے۔ اس لئے ہم چھوٹوں کی جرأت کی بڑی قدر فرماتے تھے اور کوئی بات مزاج کے خلاف بھی پڑتی تو برا نہیں مانتے تھے۔ البتہ اپنے خاص رنگ میں آکر سمجھانے کی کوشش فرماتے تھے۔

قیام بمبئی کے زمانے کی بہت سی دلچسپ معلوماتی اور اہم باتیں ہیں، جن میں سے بہت سی باتوں کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ مولانا ہم میں نہیں ہیں۔ مگر ان کی ایک ایک حرکت اور سکون نگاہوں کے سامنے ہے رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

گلہائے عقیدت

نتیجۂ فکر جناب شہباز صدیقی — امروہہ

رات رخصت ہو رہی تھی ساعت سہ کا تھا وقت
حفظِ رحمٰں نے کیا جب دارِ فانی سے سفر
پنجشنبہ کی تھی آمد تیسویں تاریخ تھی
سن تھا تیرہ سو بیاسی، ماہ تھا ماہِ سفر

رہبرِ دیں حفظِ رحمٰں کی وفات
باعثِ صد حزن و ماتم ہوگئی،
دیکھئے جس کو وہ ہے افسردہ جاں
مرگِ عالِم مرگِ عالَم ہوگئی

دے کر کمالِ جرأت ہمت کا اس نے درس
دل سے مٹایا قوم کے احساسِ کمتری
قطرہ میں جیسے بھر دیا طوفان کا خروش
ذرّہ کو جیسے بخش دی سورج کی ہمسری

واقفِ اسرارِ قرآں، محرمِ رازِ حدیث
عالمِ شرعِ پیمبر، حاجی بیت الحرام
بزم میں سردارِ محفل رزم میں سالارِ فوج
اوجِ منبر پر مقرر، صحنِ مسجد میں امام

(قاضی محمد عدیل عبّاسی ایڈوکیٹ بستی)

مردِ کامل مولانا حفظ الرحمٰنؒ

آفتابے کہ از تجلی او
افق ارم و شام نورانی

بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جو اس دُنیا سے گزرنے کے بعد ملک میں ایسا خلا پیدا کر جاتی ہیں جس کا پُر کرنا بہت دشوار ہوتا ہے اور کبھی کبھی ایک قرن، ایک صدی یا اس سے زیادہ کا انتظار کرنا پڑتا ہے" جبکہ مردے از غیب" نمودار ہو کر اس کمی کو پورا کرے جو موت کے ظالم لیکن ناگزیر ہاتھ نے پیدا کیا ہے۔ ایسی ہستیاں بالعموم ہمہ گیر ہوتی ہیں اور فکر و نظر میں بھی اور عمل و سعی میں بھی انقلاب آفرین ہوتی ہیں۔ اسی طرح کی ایک ہستی مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی تھی جو سیوہارہ ضلع بجنور کے گاؤں سے ایک کرن کی طرح نمودار ہوئی اور آفتاب بن کر تمام ہندوستان اور ہندوستان کے باہر ایشیا و افریقہ کے بلاد پر چمکی، زمانہ بہت سی کروٹیں لے گا زمین اپنے محور پر کتنے چکر کاٹے گی تب کہیں جا کر ایک ایسی جامع شخصیت کا وجود ہو سکے گا۔

آفرینندۂ عہد

مولانا کو بجا طور پر آفرینندۂ عہد کہا جا سکتا ہے۔ مولانا نے جب دُنیا میں آنکھ کھولی تو خلافت اسلامیہ اور اتحادِ اسلام کا پاکیزہ تصور پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ وقت آیا کہ ایک طرف علامہ شبلی مرحوم مرثیہ خواں تھے۔

سے حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اُٹھے گا دھواں کب تک

دوسری طرف علامہ اقبال دل گیر ہو کر پکار رہے تھے کہ ع
خاک و خون میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

ہندوستان میں مسلم فرقہ پرستی زوروں پر تھی۔ فرقہ پرستی دراصل خوف اور بے یقینی سے پیدا ہوتی ہے جب منزل کا پتہ نہیں لگتا اور ہمت جواب دے جاتی ہے تو انسان اپنے کو ایک حصار میں بند کرنا چاہتا ہے اسی سے تنگ نظری جنم لیتی ہے اور واہمہ کو ڈراؤنے خواب نظر آنے لگتے ہیں اسی لئے مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کو مخاطب کرکے کہا تھا "وہ وساوس ہیں جنھیں افکار کہتے ہو خطرات ہیں جنھیں عزائم کہتے ہو" مولانا ان وساوس اور خطرات سے بہت دور تھے اور اپنی زندگی میں قوم کو ان مہلک بیماریوں سے نجات دلانے کے لئے اُنھوں نے جو کچھ کیا وہ کوئی دوسرا نہ کر سکا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے اور ان کا مشن روز افزوں ترقی کے ساتھ جاری رہے گا۔

مسلمانانِ ہند میں فکر و نظر کی پختگی اور صحیح الخیالی پیدا کرنے کے لیے" کام پہلے سے ضرور شروع ہوا تھا۔ اور ایشیا کی وہ سب سے بڑی علمی و اسلامی درس گاہ جو دارالعلوم دیوبند کے نام سے موسوم ہے اور جس نے کبھی کسی حکومت سے امداد نہیں لی ان معتقدات کا سنگ بنیاد رکھ چکی تھی۔ مولانا محمود الحسنؒ نے انگریز حکومت کی موجودگی میں گاندھی جی کے بر سرِ عام آنے سے پہلے تمام قوموں کی ایک ملی جلی مشترک حکومت "عارضی جمہوریۂ ہند" کے نام سے قائم کر دی تھی۔ جمعیۃ علماء ہند کا بھی قیام عمل میں آچکا تھا جس نے متحدہ قومیت اور مشترکہ حکومت کو جائز اور آزادی و خود مختاری کے لئے سعی و جہد ضروری قرار دی تھی۔ مگر اس فکر و نظر کی تفصیلات کو طے کرنے سے ایک مجموعۂ دفعات قانون بنانے اور اس کی ہر مشکل گرہ کو کھولنے کا کام اور اسے عملی جامہ پہنانے کی خدمت مولانا حفظ الرحمٰن نے اسی طرح کی جس طرح لینن نے کارل مارکس کے نظریات کو تجربہ اور عمل میں لاکر کمیونزم کو عالم آشکارا کیا۔ آج جس کا نام ہندوستان میں نیشنلزم رکھا جاتا ہے اور جس کی مطابقت دیگر ملکوں سے کرکے اس کے حسن و قبح پر بحث کی جاتی ہے وہ مولانا حفظ الرحمٰن کے نزدیک ایک واضح اور بہترین مسئلہ کا انکشاف تھا۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں۔ اور جہاں پیروانِ اسلام عددی طور پر اقلیت میں ہیں، سوال یہ ہے کہ یہاں مسلمان کس طرح زندگی گذاریں۔ مولانا نے اس نظریہ کو ایجاد تو نہیں کیا کہ وہ پکے مسلمان ہوتے ہوئے پختہ ہندوستانی بنیں ملک و وطن کی خدمت میں سب سے آگے آگے رہیں، احساس کمتری کو ترک کر دیں اور اسلام پرستی و وطن دوستی میں کسی قسم کا تضاد تصور نہ

کریں۔ لیکن جو نظریہ پہلے سے موجود تھا اسے مدون کرنے اور اسے منظر عام پر بیباکی اور حق گوئی کے ساتھ لانے میں انھوں نے جو خدمت انجام دی، اس کی حیثیت "فکر و نظر" میں انقلاب پیدا کرنے کے مرادف ہے۔ وہ بہ یک وقت جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ۔ اسلامی جلسوں کے جادو بیاں مقرر؛ دار المصنفین" میں حقائق اسلام کو اجاگر کرنے والے مصنف اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر اور پارلیمنٹ کے رکن تھے۔ اپنے عالمانہ و محققانہ انداز۔ اپنی سحر آفرین خطابت۔ اپنی بے پناہ قوت تصنیف و انشا پردازی۔ اپنی اعلیٰ شخصیت، سادگی و پاکیزگی، جرأت و دلیری، جذبہ خدمت، اخلاق عالیہ، بسے ہوئے کلچر اور قربانی و ایثار سے وہ ہر جگہ چھائے رہتے تھے۔ کانگرس میں جاتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کے عظیم لیڈروں میں ہیں۔ اسلام کی خدمت تقریر اور تحریر سے کرنے پر آتے تھے تو اکابر علمائے روشن خیال میں نظر آتے تھے۔ اس طرح وہ اس زمانہ کو پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے جو ہندوستان کی سالمیت اور وحدت کو بھی قائم کرتا ہے اور ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کے لئے ایک شاندار مستقبل کی بھی نشان دہی ہے۔ قوم نے ناانصافی کی جو انھیں صرف "مجاہد ملت" کہا وہ اس سے بہت اونچے تھے۔

بصیرت اور روشن خیالی

مولانا نے لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کو متاثر کیا اس میں مذہب اور ذات پات کی قید نہیں ہے۔ مسلمان اور ہندو کا امتیاز نہیں ہے۔ جس کی وجہ ان کی بصیرت اور روشن خیالی تھی۔ ہندوستان سے متعلق جتنے معاملات آتے تھے۔ اُن میں وہ صرف ہندوستان کی بسنے والی پانچ کروڑ مسلم آبادی ہی کے مفاد کے تصور کے دائرے میں گھرے نہیں رہتے تھے بلکہ ۴۰ کروڑ ابنا ہند کے فائدے اور مستقبل کو مدنظر رکھتے تھے انھیں ہندوستان کے ایک ایک سے محبت تھی خواہ وہ کسی مذہب و ملت اور کسی ذات اور قوم کا ہو۔ سوائے ان معاملات کے جن کا تعلق مسلمانوں کے مذہب اور کلچر اور شعائر کے تحفظ و ترقی سے تھا۔ بقیہ دیگر امور یعنی اقتصادیات خوش حالی غریبی مرض وبا اور بہت سی مشکلات سے دوچار ہوتے اور ان پر قابو پانے میں وہ مسلمانوں کی تقدیر کو دوسری قوموں سے نہ صرف وابستہ سمجھتے تھے، بلکہ اس کا پورا پورا یقین رکھتے تھے اور نہایت صفائی کے ساتھ اس کی تلقین بھی کرتے تھے۔ غالباً مولانا حفظ الرحمٰن پہلے بڑے عالم ہیں جنھوں نے کانگرس کے الکشن دیگر کانگریسیوں کی طرح لڑائے اور ان کو ہر فرقہ کی تائید و مخالفت حاصل رہی۔ وہ اپنے ذہن و مزاج کے لحاظ سے عوامی تھے اور اسی لئے وہ عوام کی قیادت کرتے تھے۔ ان سے پہلے حضرت شیخ الہند بھی صوبہ کانگرس کے نائب صدر رہتے، مگر وہ اس بلندی پر تھے جہاں پارٹیوں کی اندرونی آویزش کا اثر نہ ہو سکتا تھا بلاشبہ حضرت شیخ کی کتاب متحدہ قومیت اور ان کا بحیثیت رکن کانگرس کے جلسوں میں شریک ہونا بڑے جرأت مندانہ اقدامات تھے۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا حضرت شیخ کتاب تھے اور مولانا حفظ الرحمٰن اس کی شرح۔ وہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھے۔ مگر ایسی کڑی تھے جس نے ساری زنجیر کو نمایاں کر دیا تھا۔ جب وہ کانگریس کے اندر الکشن لڑاتے تھے تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ہیں جن کی اسلام پر بصیرت افروز تقریروں اور تحریروں سے سارا ہندوستان گونج رہا ہے وہ اس وقت ایک پختہ کار کانگرسی ہوتے تھے میں نے ان کو انڈین نیشنل کانگرس کا نام ہمیشہ بڑی محبت سے لیتے سنا ہے اور وہ کانگرس کو کانگرس نہیں بلکہ ہمیشہ انڈین نیشنل کانگرس کے نام سے یاد کرتے تھے، عرصہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں کئی قسم کے لوگ ہیں ایک وہ ہیں جن کی سمجھ ہی میں نہیں آتا ہے کہ اسلام کے دعوے کے باوجود ایک متحدہ قومیت اور ایک مشترکہ حکومت کا تخیل قائم کیسے ہو سکتا ہے یہ لوگ تمام ان باتوں میں مجبوراً حصہ لیتے ہیں جو ان کی روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں مگر اسے خلاف اسلام بھی سمجھتے ہیں۔ اس لئے برابر اپنے کو گنہ گار تصور کرتے رہتے ہیں یہی وہ خیال ہے جو احساس کمتری پیدا کرتا ہے اور جس سے آگے چل کر بڑی بڑی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو ان باتوں کو جائز تو سمجھتے ہیں مگر انھیں رخصت کے اس درجے پر رکھتے ہیں جو کراہت کی حد کے قریب ہے میں جب ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ سے الیکشن لڑ رہا تھا تو اس صوبہ کے ایک ممتاز عالم میرے لئے ایک جلسہ میں تقریر کرنے آئے۔ وہ بڑے فصیح البیان مقرر تھے اور انھوں نے پاکستان کی خرابیاں طرح طرح سے ثابت کیں، اور کانگرس کی تائید کی مگر فخریہ لہجہ میں یہ بھی کہا کہ "میں کبھی کانگرس کا ہم آنے کا ممبر نہیں بنا"۔ مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانانِ ہند کی ایک کافی آبادی کو اپنی تبلیغ اور اپنے عمل سے اس تنگ نظری سے باہر نکالا اور ان میں ذوقِ یقین